جولائی 2016
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
عید مبارک

جولائی 2016

جلد 44 شمارہ 3

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

کہی ان کہی

خواتین ڈائجسٹ کا جولائی کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
عیدالفطر۔ رمضان المبارک میں کی جانے والی عبادت و ریاضت کے بعد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے لیے خاص تحفہ۔ باری تعالیٰ کا انعام۔
انعام و اکرام کا یہ دن دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے خوشی و مسرت کا پیغام ہے۔ یہ مل جل کر خوشیاں منانے کا دن ہے۔ مسکرانے کا دن ہے۔ دلوں کی کدورت مٹا کر گلے لگ جانے کا دن ہے۔
عید اجتماعی خوشی کا تہوار ہے۔ اس کا اصل لطف تب ہی ہے جب سب کے دل مسرور ہوں، سب مل کر خوشیاں منائیں۔ اپنے اردگرد نظر ڈالیں۔ کچھ لوگ آپ کی توجہ کے منتظر ہیں۔ اپنی خوشیوں میں انہیں بھی شامل کریں۔ آپ کی خوشیاں دوبالا ہو جائیں گی۔ سب سے پہلے آپ کے قریبی عزیز و رشتہ دار ہیں۔ اگر وہ مستحق ہیں تو انہیں جتائے بنا ان کا خصوصی خیال رکھیں۔ یاد رکھیں نیکی کر کے جتانے سے نیکی ضائع ہو جاتی ہے۔
آپ کی اعانت کے سب سے زیادہ حق دار آپ کے اپنے اور قریبی لوگ ہیں۔ ان کی دل داری اور غم گساری آپ کو حقیقی خوشیوں سے ہم کنار کرے گی۔
آپ سب کو ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے دلی عید مبارک۔
صبح عید آپ کے آنگن میں بہاروں کا پیام لے کر طلوع ہو۔ آپ کے دل مسرور و شاد اور آپ کے دستر خوان بھرے ہوں۔ آمین۔

مکمل ناول، لورشے،

سمیرا حمید نے جب بھی لکھا ہے، ہر بار نئے انداز سے سامنے آتی ہیں۔ اس ماہ ان کا ناول لورشے شامل ہے۔ یہ ان لوگوں کی کہانی ہے جو زندگی سے، زندگی کی خوبصورتیوں سے پیار کرتے ہیں، روشنی کی چاہ رکھتے ہیں۔ گیت، ساز، جنگل، تتلیاں اور جگنو ایک ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں تخیل اور حقیقت مل کر ایک خواب ناک اور سحر انگیز ماحول تخلیق کرتے ہیں۔
یہ ناول عام کہانیوں سے قدرے ہٹ کر گزرے زمانوں کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ آپ اسی ماحول اور زمانے کو ذہن میں رکھ کر یہ ناول پڑھیں ضرور لطف اندوز ہوں گے۔
ہم اس ناول کے بارے میں آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ نمل، ، سمیرا حمید کا مکمل ناول۔ لورشے،
- راشدہ رفعت اور کرن نعمان کے ناولٹ، ، عمیرہ احمد اور آمنہ ریاض کے ناول،
- تمثیلہ زاہد، سمابنت عاصم، شازیہ الطاف ہاشمی اور سینہ عمیر کے افسانے،
- ناول نگار، ڈراما نگار صائمہ اکرم چودھری سے ملاقات،
- ٹی وی فنکار عاصم محمود سے باتیں، ، آباد رہیں آنگن۔ قارئین سے عید سروے،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

عید نمبر آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

کرم و سخاوت کا اور اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے خیر (نیکی) کے کاموں پر خرچ کرنے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بدلہ دے گا۔“ سبا۔ 39

اور فرمایا۔ ”اور جو کچھ تم خرچ کرو گے تو اس کا فائدہ تمہیں ہی ہوگا اور تم جو بھی خرچ کرتے ہو اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے کرتے ہو اور تم جو کچھ خرچ کرو گے تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

نیز فرمایا۔ ”جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو یقیناً ”اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔“ (البقرہ)

فائدہ آیات

1۔ ان آیات میں خرچ کرنے سے مراد نیکی اور اللہ کی پسندیدہ راہوں میں خرچ کرنا ہے۔ اس کی بابت ایک بات تو یہ کہی گئی ہے کہ تمہارا خرچ کیا ہوا ضائع نہیں جائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کا بہترین بدلہ۔ (دنیا یا آخرت یا دونوں جگہ) عطا فرمائے گا تاہم یہ خرچ ریا کاری اور شہرت کی غرض سے نہ ہو کیونکہ اس صورت میں ثواب کی بجائے عذاب اور رضائے الٰہی کے بجائے اس کا غضب حصے میں آئے گا۔ اس لیے یہ خرچ صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ 2۔ تمہاری خرچ کی ہوئی ایک ایک پائی کا علم اللہ کو ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کا پورا پورا بدلہ عطا فرمائے گا۔

رشک

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”صرف دو آدمیوں پر رشک کرنا جائز ہے ایک وہ آدمی جسے اللہ نے مال دیا اور پھر اسے حق کی راہ میں خرچ کی ہمت و توفیق بھی دی۔ اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ نے علم و حکمت سے نوازا چنانچہ وہ اس کے ساتھ فیصلہ کرتا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔“

(بخاری و مسلم)

اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی پر رشک نہ کیا جائے سوائے ان ہر دو خصلتوں میں سے کسی ایک پر یعنی ان پر رشک کرنا درست ہے۔

فوائد و مسائل

1۔ حسد نہایت مہلک اخلاقی بیماری ہے۔ جو انسان کا امن و سکون برباد کردیتی ہے۔ حسد کے معنی ہیں کسی پر اللہ کا انعام دیکھ کر کڑھنا اور اس کے زوال کی آرزو کرنا۔ یہ حرام ہے اور اس سے انسان کی نیکیاں برباد ہوجاتی ہیں۔

2۔ ایک اور چیز غبطہ ہے جسے اردو میں رشک کرنا کہتے ہیں۔ یہ جائز ہے اور اس کا مطلب ہے کسی پر اللہ کا انعام دیکھ کر خوش ہونا اور یہ آرزو کرنا کہ اللہ اسے بھی یہ نعمت عطا فرمائے۔

3۔ بہرحال اس حدیث سے ایسے مال دار کی فضیلت واضح ہے جو اللہ کے دیے ہوئے مال کو صرف اپنی ذات ہی پر خرچ نہیں کرتا بلکہ اسے غرباء و مساکین اور دین کی نشرواشاعت پر خرچ کرتا ہے۔ اسی طرح دین کا علم حاصل کرنے والے کی فضیلت کا بیان ہے جو قرآن و حدیث کی روشنی میں لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرتا اور دوسروں کو بھی قرآن و حدیث کی تعلیم دیتا ہے۔ ہر شخص کو یہ آرزو کرنی چاہیے کہ مال کے ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کا وافر جذبہ بھی اسے ملے اور دینی علوم اور اس کی حکمت سے وہ بہرہ ور ہو تاکہ انبیاء کی جانشینی کا شرف اسے حاصل ہو اور اس کا حق اچھی طرح ادا کرسکے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے کون ہے جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟"

صحابہ رضی اللہ عنہ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم میں سے ہر شخص کو اپنا مال ہی سب سے زیادہ محبوب ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "انسان کا مال تو وہی ہے جو اس نے (صدقہ و خیرات کرکے) آگے بھیجا اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو وہ پیچھے چھوڑ گیا۔" (بخاری)

فوائد و مسائل

1۔ اس میں بڑے حکیمانہ انداز سے انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت کو اجاگر اور ذہن نشین کیا گیا ہے کہ انسان کا اصل مال تو وہی ہے جو وہ مال کی محبت کو نظرانداز کر کے اللہ کے حکم کے مطابق اللہ کی راہ میں اور اس کی پسندیدہ جگہوں پر خرچ کرے گا کیونکہ روز قیامت یہی مال اس کے کام آئے گا۔ اس کے علاوہ تو اس نے کھا پہن کر ختم کردیا اور اپنے پیچھے چھوڑ گیا جو اس کے ورثاء کے کام آگیا۔

2۔ اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ انسان کو اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہو تو اسے اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا چاہیے۔

آگ سے بچو

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم آگ سے بچو اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ساتھ ہی۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ

حسب استطاعت اللہ کی راہ میں تھوڑا سا خرچ کر کے بھی اللہ کی رضا حاصل کی جاسکتی ہے۔

سخاوت

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کا سوال کیا گیا ہو اور آپ نے جواب میں فرمایا ہو۔ "نہیں۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ

اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق کرامت نفس اور سخاوت کا بیان ہے کہ سائل کے سوال پر آپ کی زبان مبارک سے کبھی "نہیں" کا لفظ نہیں نکلا بشرطیکہ آپ کے پاس وہ چیز موجود ہوتی بلکہ بعض دفعہ آپ قرض لے کر بھی سائل کی حاجت پوری فرمادیتے' یہ بھی ممکن نہ ہوتا تو اس سے وعدہ فرمالیتے۔

دو فرشتے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہر دن جس میں بندے صبح کرتے ہیں' دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے اے اللہ! خرچ کرنے والے کو (بہترین) بدلہ عطا فرما۔ اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ! روک کر رکھنے والے کے حصے میں ہلاکت کر۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: 1۔ جس خرچ پر دعائے خیر کی نوید ہے اس سے مراد صدقات نافلہ وواجبہ کے علاوہ اہل و عیال اور مہمانوں وغیرہ پر خرچ کرنا ہے اور جس امساک (ہاتھ روک رکھنے) پر بد دعا ہے وہ زکوۃ' صدقات اور مستحبات پر خرچ نہ کرنا ہے۔ ہلاکت سے مراد مال کی ہلاکت یا بخیل کی اپنی ہلاکت بھی ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

2۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی پاک باز مخلوق ہیں جو کسی صورت بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ ایسے فرماں برداروں کی دعائیں ضرور قبول فرماتا ہے' اس لیے فرشتوں کی دعائیں ضرور لینی چاہئیں جو بغیر کسی مفاد کے خلوص کے ساتھ دعا کرتے ہیں۔

اللہ کی راہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ "اے آدم کے بیٹے! تو خرچ کر تجھ پر بھی خرچ کیا جائے گا۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ: اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے پر خرچ کیا جائے گا' کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ اسے فراخی اور بہترین بدلہ عطا فرمائے گا۔

کھانا کھلانا

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

"کون سا اسلام بہتر ہے؟" (یعنی اس کی کون سی خصلت یا کون سی خصلت والا شخص بہتر ہے؟)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم کھانا کھلاؤ' لوگوں کو سلام کرو' چاہے تم پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: 1۔ کھانا کھلانے میں کسی کو صدقے یا ہدیے کے طور پر یا مہمان نوازی کے طور پر کھلانا شامل ہے۔ علاوہ ازیں اس سے مراد ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کر دینا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بھوکا ہے تو اسے کھانا کھلایا جائے۔ ننگا ہے تو اسے لباس پہنایا جائے۔ بیمار ہے تو علاج کروایا جائے۔ مقروض ہے تو اسے قرض کے بوجھ سے نجات دلائی جائے۔ وعلیٰ ھذا القیاس۔

2۔ سلام کرنے سے مراد' کثرت سے سلام کا پھیلانا ہے۔ اس سے دلوں میں محبت پیدا ہوتی اور نفرت و عداوت دور ہوتی ہے۔

چالیس خصلتیں

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"چالیس خصلتیں ہیں ان میں سب سے اعلیٰ' دودھ کے لیے بکری کا عطیہ دینا ہے۔ جو شخص بھی ان خصلتوں میں سے کسی ایک خصلت پر ثواب کی امید سے اور اس پر کیے گئے وعدے کی تصدیق کرتے ہوئے عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔" (بخاری)

فائدہ: 1۔ منیحتہ اس جانور (بکری یا اونٹنی وغیرہ) کو کہتے ہیں جو صرف دودھ یا اون لینے کے لیے عطیہ کے طور پر دیا جائے اور اس کے بعد اسے لوٹا دیا جائے۔ یہ بھی ایک احسان اور اچھی خصلت ہے۔ حدیث میں وارد شدہ چالیس خصلتوں کو بعض علماء نے اپنے اپنے طور پر شمار کیا ہے لیکن حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں ہر خیر کی خصلت آجاتی ہے انہیں شمار کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مبہم رکھا ہے تو پھر دوسرا اسے کیوں کر متعین کر سکتا ہے؟ علاوہ ازیں اس ابہام میں شاید یہ حکمت ہو کہ کسی بھی نیکی کے کام کو حقیر نہ سمجھا جائے، چاہے وہ کتنا بھی تھوڑا اور معمولی ہو۔

حضرت ابو امامہ صدی بن عجلان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے ابن آدم! اگر تو زائد از ضرورت مال خرچ کر دے گا تو یہ تیرے لیے بہتر ہوگا۔ اور اگر تو اسے روک کر رکھے گا تو یہ تیرے لیے برا ہوگا۔ اور تجھے برابر سرابر روزی پر ملامت نہیں کی جائے گی۔ اور ابتداء اہل و عیال کے ساتھ کر اور اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے۔" (مسلم)

نومسلم پر خرچ کرنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام (کے نام) پر (یعنی نومسلم کی طرف سے) کسی چیز کا سوال کیا گیا تو آپ نے وہ ضرور دی۔

ایک آدمی آپ کے پاس آیا تو آپ نے دو پہاڑوں کے درمیان جتنی بکریاں تھیں اسے دے دیں۔ وہ اپنی قوم کے پاس گیا اور جا کر کہا "اے میری قوم! اسلام قبول کر لو اس لیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس شخص کی طرح عطا کرتے ہیں جسے فقر کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ یقیناً" ایک آدمی صرف دنیا حاصل کرنے کی غرض سے اسلام قبول کرتا لیکن تھوڑا ہی عرصہ گزرتا کہ اسلام اسے دنیا میں موجود تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہو جاتا۔ (مسلم)

فوائد و مسائل: اس میں مولفتہ القلوب (نو مسلموں) کو تالیف قلب کے طور پر مال دینے کا جواز ہے تاکہ وہ اسلام پر پختہ ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اگر ابتداء میں قبول اسلام میں حصول دنیا کا جذبہ شامل بھی ہوتا تو تھوڑے عرصے بعد یہ جذبہ دل سے نکل جاتا اور وہ نہایت مخلص مسلمان بن جاتا۔ اسی حکمت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے مولفتہ القلوب کو ایک مصرف زکوۃ بھی قرار دیا ہے، یعنی زکوۃ کی رقم بھی اس مد پر خرچ کی جاسکتی ہے۔

حلم

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک وقت وہ جنگ حنین سے واپسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے آرہے تھے کہ کچھ اعرابی (دیہاتی) آپ سے چمٹ کر سوال کرنے لگے یہاں تک کہ آپ کو مجبور کر کے کیکر کے ایک درخت کے پاس لے گئے۔ پس آپ کی چادر بھی اس (درخت کے کانٹوں) نے اچک لی (یعنی اس میں پھنس کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم سے اتر گئی۔) نبی صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے اور فرمایا۔

"میری چادر تو مجھے دو۔ پس اگر میرے پاس ان خاردار درختوں کے برابر بھی اونٹ (یا چوپائے) ہوتے تو میں یقیناً" انہیں تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا، پھر تم مجھے بخیل پاتے نہ جھوٹا اور نہ بزدل۔" (بخاری)

فوائد و مسائل: 1۔ اس میں بھی تالیف قلب کے طور پر دینے کے مسئلے کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کا بیان ہے کہ کس طرح آپ صبر و حلم کے ساتھ دیہاتیوں کی سختی اور ان کی بربریت کو برداشت فرماتے۔

2۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام کے اندر بخل، دروغ گوئی اور بزدلی جیسی مذموم صفات نہیں ہونی

چاہئیں' نیز بوقت ضرورت اپنی صفات حمیدہ کا ذکر کرنا بھی جائز ہے تاکہ جاہل لوگ بدگمانی کا شکار نہ ہوں۔ ایسے موقع پر یہ وضاحت فخر وریا میں شامل نہیں ہوگی۔

صدقہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''صدقے نے کبھی مال نہیں گھٹایا اور عفو ودر گزر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندے کی عزت میں اضافہ ہی فرماتا ہے اور جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اسے ضرور اونچا کرتا ہے۔'' (مسلم)

فائدہ: 1۔ اس میں تین حقیقتوں کا بیان ہے (ا) صدقے سے مال کم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بقیہ مال میں برکت عطا کرکے اس کی تلافی فرمادیتا ہے یا بعض دفعہ اس کا معاوضہ عطا کردیتا ہے۔ علاوہ ازیں آخرت میں اس پر جو اجر و ثواب ملے گا اس سے تو یقیناً'' اس کے مالی نقصان کی تلافی ہوجائے گی۔

(ب) انسان سمجھتا ہے کہ میں عفو ودر گزر سے کام لوں گا تو لوگ مجھے کمزور خیال کریں گے' اس میں میری سبکی اور توہین ہے لیکن اس حدیث میں اس کے برعکس یہ حقیقت بیان کی جارہی ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ عزت میں اضافہ ہی فرماتا ہے' کمی نہیں کرتا کیونکہ معاف کرنے سے لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام بڑھ جاتا ہے۔ یا اس عفو ودر گزر پر آخرت میں اسے جو اجر و ثواب ملے گا' اس سے اس کے مقام و منزلت میں اور زیادہ اضافہ ہوجائے گا۔

(ج) اس طرح تواضع اور فروتنی کرنے والوں کی عظمت ورفعت بھی اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے یا پھر آخرت میں انہیں بلند مرتبوں سے نوازے گا۔

باقی رہنے والا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک بکری ذبح کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔

''اس کا کتنا حصہ باقی ہے؟'' انہوں نے کہا: صرف ایک دستی باقی ہے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

''سب ہی باقی ہے' سوائے ایک دستی کے۔''

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے۔)

اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے دستی کے علاوہ سب صدقہ کردیا تھا تو آپ نے فرمایا ''صدقہ شدہ سارا حصہ ہمارے لیے باقی رہا کیونکہ آخرت میں اس کا اجر ملے گا۔ (اور دستی باقی نہیں رہی کیونکہ اسے خود کھایا جس پر آخرت میں اجر نہیں ملے گا۔)

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو خود ہی سب کچھ نہیں کھا جانا چاہیے بلکہ صدقہ و خیرات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا چاہیے تاکہ یہ چیز آخرت میں اس کے کام آئے۔

سورہ اخلاص سے محبت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا' اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سورت (قل ھواللہ احد) کو پسند کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اس کی محبت تجھے جنت میں لے جائے گی۔''

(اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے' یہ حدیث حسن ہے اور امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے اسے صحیح بخاری میں معلق ذکر کیا ہے۔)

امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے **تعلیقاً**'' بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سند کا پہلا حصہ وہ حذف کردیتے ہیں۔ سورہ اخلاص کی بیان کردہ فضیلت کی توجیہ بعض علما نے اس طرح کی ہے کہ علوم قرآن کی تین قسمیں ہیں۔ ایک توحید' دوسری تشریع اور تیسری قسم اخلاق۔ ان میں سے پہلی قسم توحید کا جامع اور مکمل بیان اس سورت میں ہے۔ اس کی اور بھی کئی توجیہات بیان کی گئی ہیں۔ امام ابن عبدالبر کے نزدیک اس قسم کی توجیہات سے سکوت بہتر ہے۔

پیت کے روگی سب کچھ بوجھے، سب کچھ جانے ہوتے ہیں
ان لوگوں کے اینٹ نہ مارو، کہاں دوانے ہوتے ہیں

آہیں ان کی اُمڈتے بادل، آنسو ان کے ابرِ مطیر
دشت میں ان کو باغ لگانے، شہر بسانے ہوتے ہیں

ہم نہ کہیں گے آپ ہیں پیت کے دُشمن، من کے کٹھور مگر
آ ملنے کے نا ملنے کے لاکھ بہانے ہوتے ہیں

اپنے سے پہلے دشت میں رہتے، کوہ سے نہریں لاتے تھے؛
ہم نے بھی عشق کیا ہے لوگوں، سب افسانے ہوتے ہیں

انشا جی چھبیس برس کے ہو کے یہ باتیں کرتے ہو؛
انشا جی اس عمر کے لوگ تو بڑے سیانے ہوتے ہیں

غزل

انشا جی

جہاں وقت نے اور بہت کچھ بدلا ہے وہیں عید منانے کی روایت میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ عید کارڈز بھیجنا تو اب قصہ پارینہ ہو چکا' ملنے ملانے میں بھی پہلے جیسی سادگی اور گرم جوشی نہیں رہی۔

ایک زمانہ تھا جب اہل محلہ' دوستوں اور رشتے داروں سے میل ملاقات عید کا لازمی حصہ سمجھی جاتی تھی۔ اس وقت گھر چھوٹے تھے مگر دل بہت وسیع تھے۔ آج نعمتوں کی فراوانی ہے۔ گھر بھی کشادہ ہیں مگر دل تنگ ہیں۔ وہ جو ایک بے غرض محبت اور خاطر داری کا رشتہ تھا۔ کہیں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ آج بھی احباب محبت سے ملتے تو ہیں مگر محبت کرتے نہیں ہیں۔ گزرتے روز و شب نے دنیا ہی بدل دی ہے۔ پہلے بچے چھوٹی چھوٹی چیزیں پا کر خوش ہو جاتے تھے۔ آج کے بچے بڑی سے بڑی چیز لے کر خوش نہیں ہوتے۔ اس بار عید سروے' کا سوال ہم نے بدلتے وقت کی ان ہی تبدیلیوں کے حوالے سے کیا ہے۔

س : اپنے بچپن کی عید اور آج کے بچوں کی عید میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟

آیئے دیکھتے ہیں' ہماری قارئین نے اس سوال کا کیا جواب دیا ہے۔

آباد رہیں آنگن

ادارہ

روبینہ شاہد۔۔۔۔ کراچی

وہ بچپن کی عیدیں اور پر مسرت لیل و نہار ان حسین وادیوں میں قدم رکھیں تو سنہری دریچوں سے جھانکتے سنہری روپہلے منظر سرخ' سبز' نارنجی' بسنتی' بنفشی' ارغوانی اور گلابی جاودانی رنگوں کے ساتھ لہراتے ہیں۔

بے فکری سی بے فکری تھی۔ رنگ تھے' خوشبوئیں تھیں۔ مہکتے پھول' تتلیاں' جگنو' اڑتے پنچھی' بادل' بارش سارے ہی منظر دل لبھانے والے جہاں فرمائش کبھی حسرت نہ بن سکی بات زباں سے ادا ہوتے ہی پوری ہو جاتی۔

نہ حالات و واقعات کی فکر نہ موسمی تغیرات کی خبر' سوچ فکر غم دکھ اور درد جیسے لفظوں سے ناآشنائی تھی بس چھوٹی چھوٹی فرمائشیں معمولی سی دیر ہونے پر مصنوعی دکھ سے آشنائی دیتی تھیں۔

کچھ خبر نہ تھی کہ ہمارے والدین ہمارے ہر دن کو عید اور ہر رات کو شب برات یا چاند رات بنانے کی تگ و دو میں کسی غم و دکھ اور کسی زرد موسم کو ہم تک پہنچنے ہی نہیں دیتے۔

عید کی آمد کی خبر دیتا ماہ رمضان اسلامی مہینوں کا ہر دل عزیز اور سب سے خوب صورت مہینہ نیکیوں کا موسم بہار۔ ہمارے پورے گھر پہ کچھ اس طرح چھا جاتا کہ رحمتوں اور برکتوں کی جھڑی سی لگ جاتی۔ ہر فرد واحد نیکیوں اور عبادات میں پورے خشوع اور خضوع کے ساتھ مشغول ہو جاتا اور تمام بچے بڑوں کی تقلید میں۔

عجب پر بہار روز و شب تھے کہ ہمارے والدین راوی سے ہمارے لیے چین ہی چین لکھوانے کے لیے' جانے کب سارے دکھ' سارے غم اور سارے ہی درد اپنے من کے نہاں خانوں میں چھپا لیتے اور ہمیں کچھ خبر نہ ہو پاتی کہ کب؟ کیا؟ کیسے ہوا؟ ہمیں تو بس اپنے عید کے کپڑے ہینگر میں پریس شدہ دکھائی دیتے۔ سینڈل' چوڑیاں' جیولری' پرس تمام چیزیں ہم گھر والوں کی نظر بچا کر چھوتے اور اسی غم میں مبتلا رہتے کہ گھر والے ادھر ادھر ہوں تو سینڈل پہن کر گھر کا چکر لگائیں مگر یہ معصوم سی خواہش اس بھرے گھر میں (جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے ہم) پوری ہونا مشکل ہو جاتی اور پھر عید کا ہی انتظار کرنا پڑتا۔

خدا خدا کر کے طویل انتظار کے بعد بالآخر عید کا دن آہی جاتا اور امی ڈھیروں مصروفیات کے باوجود ہمیں اس طرح سے سجاتیں' سنوارتیں کہ کوئی پرستان کی پری بھولے بھٹکے اس دیس میں آنکلتی تو ہمیں ننھی سی پری سمجھ کر اٹھا لے جاتی۔

جب یادوں کا گھوڑا سرپٹ دوڑتا ماضی کی گلیوں کا دورہ کرتا ہے۔ تو ایک واقعہ ہماری پکڑ میں آتا ہے اور ہمارے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے۔ اور ہماری امی ہر بار اس یاد پر آب دیدہ ہو جاتیں۔

اس وقت ہماری عمر سات اور آٹھ سال کے درمیان میں تھی۔ عید کا دن ماہ جنوری کی سرد و سہانی صبح کے ساتھ طلوع ہوا تھا۔ موسم سرد و بے حد خوشگوار تھا۔ اسی رمضان ہماری روزہ کشائی ہوئی تھی۔ سو ڈھیروں تحائف ملے تھے۔ اس عید پر ہم نے نانی کا دیا زرد پہلا کام کا گلابی غرارہ سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ اوپر سے امی نے خوب سجایا سنوارا۔ آنکھوں پہ چشمہ 'کندھے پر عیدی سے بھرا پرس ٹانگے ہم اپنی کزنز اور سہیلیوں کے ساتھ عید کے پر لطف لمحات کا لطف اٹھانے میں مصروف تھے۔ ہماری سہیلی سیما کی امی نے آواز دی تو وہ ہمارا ہاتھ پکڑے ہمیں اپنے گھر میں لے گئی۔ مگر ہم گیٹ سے اندر جا کر وہیں رک گئے۔ گھر کے اندرونی حصے کی طرف نہ گئے کہ سینڈل نہ اتارنے پڑ جائیں۔ کچھ دیر سیما واپس نہ آئی تو ہم کھلے گیٹ سے باہر آ گئے۔ یہ بارہ سے ساڑھے بارہ کا درمیانی وقت تھا۔ ہم باہر آئے تو گلی خالی تھی۔ تمام کزنز اور سہیلیاں شاید گھروں کو لوٹ چکی تھیں۔

ہم اپنے گھر سے سات آٹھ گھر دور کھڑے تھے کہ ہمیں اچانک سرخ و سفید رنگت 'مضبوط توانا جسم 'تیکھے نقوش اور روشن ذہین آنکھوں والی شخصیت نظر آئی 'سیاہ شیروانی' سفید شلوار اور سر پر جناح کیپ پہنے اپنی خوب صورت مخصوص چال کے ساتھ وہ شخصیت ہمارے قریب آ چکی تھی 'سو ہم نے اس سحر انگیز شخصیت سے کہا۔

"دادا! میں بھی چلوں؟" جی یہ ہمارے دادا تھے۔

دادا نے کہا "پہلے ماں کو بتا کر آؤ۔" "اب گھر واپس جانا ہمیں گوارا نہ تھا۔ سو ہم نے جلدی سے تجویز پیش کی۔

"سیما کو کہہ دوں۔ وہ امی کو بتا دے گی۔" سیما کا گھر گلی کا سیکنڈ تھا۔ دادا کو رکشہ مل گیا تھا۔ ہم جہاں پہلے کھڑے ہو کر آئے تھے۔ وہاں سے کئی آوازیں سیما کو دیں مگر وہ تو جانے کہاں گم ہو چکی تھی 'باہر نہ آئی۔ اور ہم اس جلدی میں کہ

کہیں دادا ہمیں چھوڑ نہ جائیں جلدی سے آ کر رکشے میں بیٹھ گئے نہ دادا نے ہم سے پوچھا کہ سیما کو کہہ دیا کہ امی کو بتا دے اور نہ ہم نے کچھ بتایا کہ سیما تو باہر ہی نہ آئی۔ ہمیں

کچھ خبر نہ تھی کہ دادا کہاں جا رہے ہیں ہم تو رکشہ میں بیٹھتے ہی شہر کے حسین نظاروں میں کھو گئے۔ دادا کے دوست ڈاکٹر صاحب کے گھر آئے تھے ہم۔ اتنا ہی ہمیں معلوم تھا اس گھر میں ہم دادا کے ساتھ پہلے بھی آ چکے تھے۔

سرسبز درختوں اور اور سبز نکھری بیلوں اور پودوں سے گھرا یہ گھر ہمیں پہلے بھی بہت پسند آیا تھا سو ہم تو یہاں بچوں کے ساتھ کھیل میں گم ہو گئے دادا اور ان کے دوستوں نے ظہر کی نماز پڑھی پھر کھانے کا دور چلا۔ ہم یہاں بہت خوش تھے مگن تھے۔

اور وہاں جب ہماری امی نے تمام کزنز کو گھر پایا تو ہمارے بارے میں کزنز سے استفسار کیا۔ سب نے ہی لاعلمی ظاہر کی۔ خیر ہماری ڈھنڈیا مچی ہر جگہ ڈھونڈا گیا پر ہمارا کوئی سراغ نہ ملا۔ تمام افراد گھر پر موجود تھے صرف دادا نہ تھے۔

ہماری امی نے دل کو تسلی دیتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ کہیں وہ دادا کے ساتھ نہ چلی گئی ہو۔ تب ہماری بڑی پھپھو (جو بیوگی کے بعد ہمارے ساتھ ہی رہتی تھیں) بولیں۔

"بابو تو اپنے دوست کے گھر گئے ہیں وہ بھی بالکل اکیلے۔ میں نے انہیں دروازے تک رخصت کیا ہے۔"

امی نے خیال ظاہر کیا کہ شاید باہر سے۔"

"چچ....چچ.... چل۔" اور ہماری بڑی پھپھو دھاڑیں۔

"کیا بابو (دادا) کو اتنا غیر ذمہ دار سمجھا ہے کہ وہ تمہاری بچی کو بغیر بتائے لے جائیں گے۔"

ادب مانع۔ امی خاموش.... دھیرے دھیرے گزرتا وقت سارے گھر کو پریشانی کی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ جہاں فون پر معلوم کر سکتے تھے کیا۔ جہاں خود جا سکتے تھے گئے۔ دادا کو کسی نے فون نہ کیا... کہ موبائل تو تھے نہیں اور ٹیلی فون موجود مگر دادا کے دوستوں کے نمبر کسی کو معلوم نہ تھے اور نمبرز والی ڈائری دادا اپنی کتابوں والی الماری میں لاک رکھتے اور چابی دادا کے پاس ہوتی۔ ایسا مسئلہ بھی پہلی بار پیش آیا تھا۔

ہماری امی نے ایک بار پھر اپنے گمان کو یقین کا روپ دینا چاہا۔ "مجھے لگتا ہے وہ بابو کے ساتھ گئی ہو گی اور کہیں نہیں جا سکتی۔"

ہماری بڑی پھپھو گرجیں۔ "ارے تمہیں کسی کی بات کا یقین نہیں آتا میں نے خود اپنی گناہ گار آنکھوں سے انہیں اکیلے جاتے دیکھا ہے۔"

پھر تو وہ خوب برسیں۔ "بچیوں کو سجا سنوار کر باہر نکال دیا۔ کوئی بھی اٹھا کر لے جائے۔ تائی اور دونوں چچیاں بھی ہم نوا ہوئیں ——— دادی ہماری سیدھی سادی تھیں۔ وہ خاموش پریشانی سے بار بار باہر دیکھتی تھیں۔

خیر جہاں تک ہماری گمشدگی کی اطلاع پہنچی تھی۔ لوگ جوق در جوق پہنچ رہے تھے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ جم غفیر میں اضافہ ہو رہا تھا اور جتنے منہ تھے۔ اتنی باتیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جلد از جلد رپورٹ لکھوائی جائے کہیں اغوا کار بچی کو لے کر دور نہ نکل جائے۔

ادھر دادا کے دوست نے شام کی چائے پر روک لیا تھا اور ادھر پولیس میں رپورٹ درج ہو گئی تھی۔ اب ہمارے گھر پر اغوا کار کے فون کا انتظار بھی کیا جا رہا تھا اور امید کی جا رہی تھی کہ وہ کسی رقم کا مطالبہ بھی کرے شاید۔

ہم وہاں مست مگن تھے۔ بعد نماز عصر چائے کا دور چلا۔ ڈاکٹر صاحب اور دادا کے کچھ اور دوست بھی تھے جب سب ساتھ نکلے تو دادا کے ایک لمبی گاڑی والے دوست ہمیں گھر ڈراپ کرنے چل پڑے۔ خیر ہم لمبی سرخ گاڑی میں گھر پہنچے تو ہم تو فوراً" اتر گئے۔ دادا دوست سے باتیں کر رہے تھے اور گاڑی میں بیٹھے تھے۔ دروازے پہ دو پولیس والے اور کچھ لوگ تھے۔

کسی بچے نے ہمیں دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ "آ گئی وہ۔" یہ دو لفظ تھے یا ایٹم بم۔ پورا گھر ہمارے استقبال کو مین گیٹ تک پہنچ گیا۔ اس والہانہ استقبال کا تصور کریں تو خود کو کوئی سیلیبریٹی تصور کرنے لگتے ہیں۔ کیونکہ تمام افراد نے الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کے نمائندوں کا کریکٹر سنبھال لیا تھا اور کر دی تھی ہم پر سوالات کی بوچھاڑ اور ہم نہ صرف حیران بلکہ پریشان تھے کہ آخر سب ہم سے ہی کیوں پوچھ رہے ہیں۔ "کہاں لے گئے تھے؟ کیسے چھوڑا؟" خیر دادا گھر میں داخل ہوئے تو معاملات کلیئر ہوئے۔ بھیڑ چھٹی تو دادا نے ہم سے پوچھا۔

"بیٹا! سہیلی کو نہیں بتایا تھا کہ امی کو بتا دے۔"

اور ہم نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "بہت آوازیں دیں مگر وہ آئی نہیں، پھر ہم آ گئے۔ آپ کو دیر ہو رہی تھی نا۔" اور دادا ہنسنے لگے۔

پھر تو ہماری بڑی پھپھو نے ہمارے خوب کان کھینچے۔

جانے کس طرح پولیس والوں سے جان چھڑائی۔ کیونکہ کسی نے رپورٹ بھی درج کروا دی تھی۔ اس واقعے سے ہم اور دادا تو محظوظ ہوتے، ہماری امی آب دیدہ ہوتیں اور ہماری بڑی پھپھو کے چہرے پر غصیلے سائے لہرانے لگتے۔

اب اگر آج کے دور کی بات کی جائے تو زمانے کی رفتار تیز تر ہو چکی ہے اور دنیا سمٹ کر انگلی کے اشارے پر آ گئی ہے۔

چاند رات سے ہی عید مبارک کے ایڈوانس پیغامات موصول ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ دیار غیر میں عزیزوں سے نہ صرف گفتگو ہو جاتی ہے بلکہ ماؤں سے ترکیبیں پوچھ کر پکوان بھی تیار کر لیے جاتے ہیں۔ تمام حالات و واقعات کی خبر پل بھر میں مل جاتی ہے، یہاں تک کہ گھر بیٹھے شاپنگ تک ہو جاتی ہے۔

وقت بدلا، انداز بدلے، ہم حیران ہوتے ہیں کہ بڑوں کی ڈانٹ پھٹکار سن کر ہم ایک لفظ نہ بول پاتے، بڑی پھپھو کے سامنے امی یا دادی کی کمر میں منہ چھپاتے اور اگر بڑی پھپھو اچانک سامنے آ جاتیں اور دادی اور امی کی کمر موجود نہ ہوتی تو کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے اور اس کے باوجود وہ اتنی زور سے کان کھینچتیں کہ آہ نکل جاتی۔ مگر آہ کی اجازت نہ تھی۔ اسے اندر گھونٹنا پڑتا۔

اور آج کی اس دوڑتی بھاگتی دنیا میں بچے بلا کے پر اعتماد ہیں ہر سوال کا جواب زبان کی نوک پر دھرا رہتا ہے۔

ہمارے بیٹے حسن اور اسد اپنے پپا کے ساتھ عید کی نماز پڑھ کر نکلے تو مدرسے کے پرنسپل صاحب بھی مل گئے۔ (جہاں سپارہ پڑھتے تھے)

اسد سے بولے۔ "کیوں بھئی کتنی شرارتیں کرتے ہو، تمہارا بھائی حسن کتنا سیدھا ہے۔ بالکل شرارتیں نہیں کرتا، اور تم بھائی کو تنگ کرتے ہو۔"

سات سالہ اسد نہایت اعتماد سے گویا ہوئے۔

"میں بچہ ہوں، میرا کام ہے شرارتیں کرنا، اب میں اپنی تعریف کے لیے شرارتیں کرنا چھوڑ کر اپنے بھائی کی طرح بچپن میں پچپن کا نہیں بن سکتا۔" ایک سات سالہ بچے کی گفتگو۔ یعنی اعتماد بھی بڑھا اور سہولیات زندگی بھی۔

مگر ہمارے لیے غور و فکر کے کئی در وا ہوتے ہیں، ہمارا شہر جو کبھی عروس البلاد تھا۔ آج اجڑا اور خستہ حال۔ ہر گلی، ہر شاہراہ، ہر چوک اپنی زبوں حالی کی داستان رقم کیے منوں کچرے کے ڈھیر تلے دبے کہہ رہا ہے۔ کیا مجھے نکھرنے اور

بجنے سنورنے کا کوئی حق نہیں۔ کیا بدلتے زمانے کی تیز رفتاری نے فرائض کی ادائیگی کا وقت بھی چھین لیا ہے۔ آہ کوئی ہے اس شہر کا پرسان حال جو اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت اس شہر کے لیے بھی نکالے کہ عید آئی ہے اور عید پر سب ہی بنتے ہیں' سنورتے ہیں' بجتے ہیں۔ یا پھر عید میرے لیے نہیں صرف میرے باسیوں کے لیے ہے۔

صبا آصف' کراچی

اپنے بچپن کی عید۔ واہ کیا یاد دلا دیا۔ کیسا خوب صورت اور پیارا منظر نمی کے ساتھ آنکھوں میں اتر آیا۔ "بچپن کی عیدوں" کی سنہری یادوں کے ساتھ ساتھ اسکول کے زمانے اور پاس پڑوس کی دوستیں بھی یاد آگئیں' ویسے میری دوستیاں کم ہی ہوتی تھیں' جو تھیں' یہ ان ہی کی محبت بلکہ ہمت تھی جو دوستی تھی' شروع ہی سے سڑی طبیعت ہوں۔ ہاں محبت اور خلوص کی قدر ضرور کرتی ہوں۔ عید گزرنے کے تین چار ماہ بعد سے ہی "عید" کا انتظار شروع ہو جاتا تھا۔ رمضان کے آخری دنوں میں تو بچوں کا پسندیدہ ٹاپک عید ہی ہوتا تھا۔ اسکول میں بھی فری پریڈ اور بریک میں یہی چل رہا ہوتا تھا۔ تم نے کیسے کپڑے بنائے؟ کیسی جیولری لی؟ کپڑے کس رنگ کے ہیں؟ پوچھنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ پوچھنے والا دوسرے رنگ کے بنالے یا اگر کسی کا غرارہ بنا ہے تو وہ شرارہ بنالے یا کسی کا چوڑی دار پاجامہ بنا ہے تو وہ شلوار سوٹ بنوالے۔ اس وقت نقل نہیں تھی۔ حسد نہیں تھا۔ مقابلہ نہیں تھا (بلاوجہ کا) ہماری کلاس میں دو بہنیں تھیں۔ رفعت فرحت (فیملی ٹرمز بھی تھے) وہ کہتی تھیں۔ "تم عید پر کیسے کپڑے لگاؤ گی (پہنو گی)؟" وہ کپڑے پہننے کو کپڑے لگانا کہتی تھیں اور سرمہ لگانے کو سرمہ پہننا کہتی تھیں آج بھی یہ بات لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے۔

چاند رات کو امی کپڑے استری کر کے ہینگ کر دیتی تھیں۔ ساتھ جوتے اور عید پر پہننے والی چیزیں بھی رکھ دیتی تھیں۔ ہم بار بار کپڑوں اور چیزوں کو دیکھتے تھے کہ کب صبح ہو گی اور ہم یہ کپڑے اور چیزیں پہنیں گے (ہمارے بچپن میں عید کے جوڑے بہت خوب صورت ہوتے تھے) اور صبح تھی کہ ہو کر نہ دیتی تھی۔

چاند رات کو امی سب کاموں سے فارغ ہو کر شیر خرما کے لیے میوہ کاٹتی تھیں۔ ہم سب بھی مددگار ہوتے تھے۔ امی کی مدد کرنے سے زیادہ میوہ کھانے میں دلچسپی ہوتی تھی۔ مجھ سے چھوٹا بھائی شاید ہم سب میں سبقت لے جاتا تھا۔ اس کی رفتار کو دیکھتے ہوئے بڑی بہن کوثر نے کہا۔ "روزہ رکھ لو۔ صبح چھوہارا کھا کر کھولنا۔" سو اس نے روزہ رکھ لیا اور میوہ کھانا بند کر دیا۔ ہائے ری معصومیت۔

ہمارا دور بڑا معصوم تھا اور پر خلوص بھی۔ ہم سب بھائی بہن اپنے دوستوں کو کارڈ دیتے تھے۔ تحائف دیتے تھے' جو ہم اپنی پاکٹ منی سے خریدتے تھے۔ تحفے معمولی ہوتے تھے۔ ہمیں بھی کارڈ اور تحفے ملتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بہل جانے والے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں خوش ہو جانے والے۔ اب یہ سب نہیں ہے اگر ہے بھی تو بہت کم۔

رات میں امی جان ہم بہنوں کے مہندی بھی لگاتی تھیں۔ عید کے دن ایک دوسرے کے کپڑوں کے ساتھ ساتھ مہندی بھی دیکھی جاتی تھی کہ کس کی مہندی زیادہ رچی ہے اور کس کی مہندی کا ڈیزائن زیادہ اچھا ہے۔ معصوم معصوم سے مقابلے۔ معصوم معصوم سی خوشیاں آج کل کے بچے تو ہوشیار ہیں۔ بچپن تو ہے ہی نہیں۔ بچپن میں ہی پچپن کے۔

ویسے آپس کی بات ہے۔ ہماری مائیں اور آنٹیاں بھی جب آپس میں بات کرتی تھیں ہم بچوں کے بارے میں تو وہ بھی ہمیں ایسے ہی یا اس سے ملتے جلتے القابات سے نوازتی تھیں۔ وہ اپنے دور کا مقابلہ ہم سے کرتی تھیں۔ یہ فرق ہر "نسل" ہر دور میں رہے گا۔ تبدیلی زندگی کا حصہ ہے۔

اچھا بھئی ہماری عید تو بہت ہو گئی بلکہ ہوئے ہی چلی جا رہی ہے۔ اب آتے ہیں آج کے بچوں کی عید کی طرف۔ آج کے بچوں کی عید ہمارے بچپن کی عید سے کافی مختلف ہے وجہ وہی سالوں کا فرق۔ تبدیلی نہ صرف ملبوسات اور کھانوں میں آئی ہے بلکہ تہوار منوانے کا انداز بھی بدلا ہے۔ اب عید سے زیادہ جوش و خروش سے چاند راتیں منائی جاتی ہیں۔ گھروں میں نہیں بازاروں میں۔ چاند رات منا کر اتنا تھک جاتے ہیں کہ مارے باندھے عید کی نماز پڑھ کر بقیہ دن سو کر گزرتے ہیں نہ دوستوں اور سہیلیوں سے ملنا ملانا نہ تحائف کا تبادلہ۔ پیارے بیٹے انس سے پوچھا۔ "انس بیٹے! آپ کو عید کیسے منانی اچھی لگتی ہے۔"

کہنے لگے "ماما! عید پر دل چاہتا ہے خوب گھومیں پھریں۔ ہمارے کپڑے سب سے اچھے ہوں۔ بہت ساری عیدی ملے اور ہماری عیدی کوئی نہ لے۔" یہ ہے بس زیادہ سے زیادہ بچوں کی سوچ۔

عید کے موقعوں پر مہمان داری نہ ہونے برابر ہے۔ میزبان بننا اور مہمان ہونا اب فرسودہ روایات میں شمار ہوتا ہے (عید کے موقع پر) کوئی بیچارا' محبت کا مارا' روایات کا مارا عید ملنے کسی کے گھر چلا جائے تو اس کی وہ پذیرائی نہیں ہوتی جو عید کے موقع پر مہمان کا حق ہے۔ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو کر دوبارہ نہ آنے کا عہد کرتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔ کم سے کم اس گھر میں آنے کی غلطی تو کرے گا نہیں' خاص طور سے عید کے موقع پر بچوں کو کہیں جانا ہے تو کے ایف سی جانا ہے۔ میلہ جانا ہے۔ قلعہ جانا ہے۔ ماموں کے گھر جانا ہے نہ خالہ کے پھوپھی نہ چچا کے گھر جانا ہے وہاں تو پلاؤ' قورمہ ملے گا۔ میلہ اور قلعہ میں تو ان کے پسند کے کھانے بھی ہوں گے۔ اب بچوں میں خود غرضی بہت آگئی ہے صرف اپنا خیال' اپنی فکر اور "میں" یہ بات نہیں ہے کہ سب بچے ہی ایسے ہیں' بہت سے بچے بچیاں بہت محبت والے ہیں۔ بات تربیت اور فطرت کی ہے۔ آج بھی عید بہت سے گھروں میں اسی روایتی جوش و خروش کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ صبح سے شام تک مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ میزبان بننا فخر اور اعزاز سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے زیادہ تر بچے جو آج اپنا تہوار غیر روایتی طریقے سے منا رہے ہیں وہ کل اپنے بچوں کو اس خوب صورت تہوار کے بارے میں کیا بتا سکیں گے۔

ملائکہ کوثر..... بسم اللہ پور

نگاہوں میں شوخی' لبوں پہ تبسم
وہ چوڑی کھنکتی تو جب عید ہوتی
وہ آنچل میں چہرہ چھپا کے جو چلتے
تو شرم و حیا کے سبب عید ہوتی

آپ بھی کمال کے لوگ ہیں۔ قلم کی ایک جنبش سے کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں انسان کو۔

اب ماضی کا بستہ کھول بیٹھی ہوں تو ہر کتاب سے یادوں کے جگنو اور تتلیاں اڑ اڑ کر فضا میں لہرانے لگیں۔ یہ جگنو تو بڑا گولڈن سا ہے چمکتا ہوا۔ یہ بچپن ـــــ کا جگنو۔ جس کی تابناکی سے دل و جان اب تک روشن ہیں۔ سے ہے عید کا' وہ بھی میرے بچپن کی۔ خوشبو بھری چاند رات ہے۔ رات کے ایک بجے ماموں کے ساتھ جاکر' شہر کے مین بازار سے سرخ رنگ کی کانچ کی چوڑیاں کلائی میں ڈلوائی ہیں۔ لیل و نہار چین و امن کی بانسری جو بجاتے تھے۔ امی جان نے گول ٹکیہ والی مہندی ہاتھوں میں لگادی ہے۔ میں نے امی کے ہاتھ کا سلا ہوا اپنا ڈیزائنر سوٹ الماری میں رکھ دیا ہے۔ سونے لیٹ گئی' ہوں پر نیند کی پریاں روٹھ گئی ہیں جیسے۔ توبہ رات کتنی لمبی ہے۔ بستر سے اٹھ اٹھ کر اجالا دیکھنے کی سعی۔

یہ صبح عید ہے.... عید ہے کہ نوید ہے یا عید حسن جمال ہے.... سوہنے رب کا کمال ہے۔ اماں جانی کے ہاتھ کی دودھ' میوے والی سویاں کھا کر بھائیوں اور ابو جانی کی انگلی تھام' نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ شہر سے باہر والی مسجد جو نہر کے پاس ہے۔ مسجد کے آس پاس' سرخ گلاب اور میٹھے شہتوت کی بہتات ہے۔ ڈھیر سارے دہکتے گلاب' نرم میٹھے شہتوت لے کر واپس آئی۔ سارا دن سکھی' سہیلیوں کی طرف آنا جانا لگا رہا۔ آتے جاتے رشتہ داروں سے پچاس یا تیس روپے عیدی بٹور کر خوش ہونے والے ہم معصوم قریبی بازار سے من پسند گول گپے' چاٹ اور ڈولی والا جھولا جھول کر پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے۔ ٹی وی دیکھنے کی فرصت تک نہ ملی۔ یہ تھی بچپن کی عید کی چھب' جھلک۔

اب اس زمانے کے بچوں کی عید۔ ایک بات تو طے ہے اس جدید زمانے کے بچے بہت جینئس ہیں۔ مثال کے طور پر میری بیٹی ثمرہ کو لے لیں۔ ماں کی محتاج بالکل نہیں' اتنی سی عمر میں خود ہی ڈیزائن سلیکٹ کر کے انٹرنیٹ سے سرچ کر کے سوٹ عید کا سلوا لیتی ہے بلکہ اماں کا بھی سلوا دیتی ہے۔ بھائیوں کے کپڑے' جوتے انتخاب کرنا بھی اس کی ذمہ داری۔

محلے کی بچیوں کو مہندی لگانے کے بعد اپنے ہاتھ پر بھی بیل بوٹے بنا لیتی ہے۔ کسی کی محتاج نہیں۔ بچے ملنے جلنے سے کتراتے ہیں۔ ٹی وی' انٹرنیٹ' فیس بک کی دنیا میں گم۔ یہ چیز مجھے ناپسند ہے۔ رویے کیسے بھی ہوں۔ ملتے رہنے سے خلوص بھی آہی جاتا ہے۔ میں بچوں کو زبردستی بھیجتی ہوں۔ چلو فلاں فلاں دوست کو مل کر آؤ۔ عید کا دن

تو مل جل کر خوشیاں بانٹنے میں گزارنا چاہیے۔ آج کے بچے ان سیکور بھی بہت ہیں خاص طور پر شہروں میں۔ فضا میں دہشت گردی کی بو و باس جو پھیلی ہوئی ہے۔ جس نے عید کی مسرتوں کو ہمارے زمانے کی نسبت خاصا ماند کر دیا ہے۔

ثمرہ احمد بٹ۔ پتوکی

بچپن کی عید کے کیا کہنے
کنگن، پھول، ہار سنگھار اور گہنے

بے حد خوب صورت، ان دیکھے سپنے، حقائق، چمکیلی خوشیاں، راتیں روشن عیدیں، روشن لمحے، روشن باتیں اور عید کی چاند راتیں، اپنا گھر سیالکوٹ قلعہ اور نانی جی کا گھر گوجرانوالہ B ماڈل ٹاؤن ملا کی دوڑ مسجد تک یعنی بچوں کی دوڑ نانا جی اور دادا جی کے گھر تک خوشیاں محدود مگر یادیں دائمی۔ چوڑیاں، الٹی سیدھی مہندیاں تنکوں سے لگاتیں خود ہی ڈیزائنر بن کر پھول ڈال کر ہاتھ رنگنا، جوتے، تلے والے کھسے، ننھی ننھی ہیئر پنز، کیچر، ایئر رنگز، فنگر رنگز چن چن کر من پسند اکٹھے کر کے بازار سے ابو جی، امی جی کے ساتھ لانا اور پھر ایک بڑے سے ڈبے میں تمام چیزوں کو سنبھال کر اپنے۔ ساتھ ساتھ رکھنا والدہ محترمہ اور نانی جی کی بھی تیاریاں عروج پہ دیکھنا سب کے کپڑے استری کر کے رکھنا، میٹھے پکوان، میٹھی عید الفطر کے لیے بنانا ایک غلغلہ سا ہوتا عید کا۔ عیدیوں کا انتہائی دلکشی، رعنائیاں قمقمے، حقیقی چاند راتیں اور پھر رمضان کو الوداع کرنا

ہمیشہ نانا جی کو اعتکاف سے گھر کے بالکل سامنے فاروقیہ مسجد محلے داروں کے جھرمٹ میں اٹھانے جانا۔ ان کو دوران اعتکاف شام کو کھانا پہنچانا۔ بدلے میں ان سے دعائیں سمیٹنا۔

دعاؤں کا میری زندگی میں بہت مقام رہا ہے۔ الحمدللہ یہ مجھے سمیٹ کر رکھ گئی ہیں۔

نانا جی کا گھر بہت وسیع و عریض تھا۔ آم کا گھنا پیڑ، امرود کا بڑا سا درخت اور منی پلانٹ کی بیلیں دیواروں پہ چڑھتے ہوئے وہیں کیاریوں میں موتیا کے پودے پر لگی کلیوں کی مہک آج بھی وہ بڑے سے صحن میں عید کی شامیں یوں روشن ہیں جیسے منڈیروں پہ کوئی سہاگن دیے جلائے گاؤں کی گوری اپنے ساجن کا راستہ امید سے تکتی ہو کہ ابھی ان کے آنے سے عید کی شام جگمگا کر روشنیاں دینے لگے گی۔

پھر عید کی صبح اپنے ماموں سے عیدی لینا، نانا جی، امی جی، نانی جی، ابو جی، ہم ماشاء اللہ سات بہنیں اپنے والدین کے گھر پیدا ہوئیں جناب تو سب کو تیار شیار کر کے امی فارغ ہو کر تیار ہوتیں۔ مرد حضرات بڑے بیبے بندے تھے نیک اور صالح نمازی اور پرہیزگار عجز و انکساری کے نمونے۔ نمازیں پڑھنے چلے جاتے۔ مسجد سامنے ہی تو بلاتی تھی۔

ادھر امام صاحب نے مسجد میں تکبیر کہی ادھر ہم گھر میں جائے نماز بچھائے عید الفطر کی نماز کے لیے تیار۔ پھر جو سلسلہ شروع ہوتا محبتوں کا، چاہتوں کا، کھانوں کا، پارک بالکل ماڈل ٹاؤن میں دو منٹ کی واک پہ تھا وہیں نانا جی کے ساتھ کون آئسکریم، گول گپے، چنا چاٹیں، چھلے، گٹے، برگر، پیٹیز، فروٹ کیک، پیسٹریاں، فانٹا بوتل، کوک بوتل، جھولے، سلائیڈز، پینگیں، آسمانی جھولا تمام جب تک لے نہ لیتے عید مکمل نہ ہوتی

اور ہاں عید کا خاص آئٹم ہمارے ننھے منے لمبی لمبی ایڑیوں والے جوتے نہ تھکن نہ تھکان بس گھوم گھوم کر کھائی کر ہلکان اور ایک اور اہم چیز ہمارے بٹوے نمارس۔ پانچ، دس، پچاس کے نوٹوں سے بھرے ہوئے مطمئن بہت مطمئن شاداں و فرحاں (آنے والے دکھوں سے بے نیاز) منہ پہ لالی پاؤڈر ناخنوں پہ نیل پالش۔

پھر ساتھ والی بڑی کوٹھی کوٹھی کوئی والی ہماری خاص سہیلی عظمیٰ بٹ کے ساتھ دیواروں پہ چڑھ کر ان کے گھر چھلانگ لگا کر آنا جانا ادھر کرسی رکھی۔ ادھر کرسی پہ کودنا اور پھر عید کی شام کو ایک خاص الخاص انتظار۔ جی ہاں وہ اپنی اکلوتی خالہ کا جس کے تین عدد بچے طاہر، کومل، قرۃ العین تھے۔ ان کا انتظار اتنا اتنا کہ بس آنکھیں گیٹ پہ لگی ہیں۔ آواز پہ دھیان ہے جیسے اب عید ساری کی ساری آنگن میں ایک آس، امید اور انتظار ہی میں سمٹ گئی ہے کیونکہ شام کا کھانا ان کے ساتھ ہوگا باہر آؤٹنگ ان ہی کے ساتھ ہوگی۔

عید کے دوسرے روز خالہ کی سہیلیوں کے گھر ساتھ چلوں گی وہ ہمیشہ مجھے ہی لے کر جاتی تھیں۔ بہت پیار کرتی تھیں۔ اور پھر عید کے تیسرے چوتھے دن جب بازار کھلتے تو خالہ جان پھر سے اپنی طرف سے شاپنگ کراتی تھیں۔ یہ عید کے ساتھ ہی دوسری خوشیوں بھری عید ہو جاتی۔ تانگے پر جانا آنا بڑا مزا تھا۔

اور پھر شادی ہو گئی۔ عید سسرال ہو گئی رکھ رکھاؤ، کچھ حقائق سے دور۔ فریبی فریبی سی لیکن میرے اندر سے بچپن کی دل فریبی نہ گئی اور اب جب عید کی شام ڈھلتی ہے تو بہت سے بچھڑے جلتے بجھتے دیوں کی صورت دل کی منڈیر پہ یوں آ کر براجمان ہو جاتے ہیں جیسے روشن چراغ۔
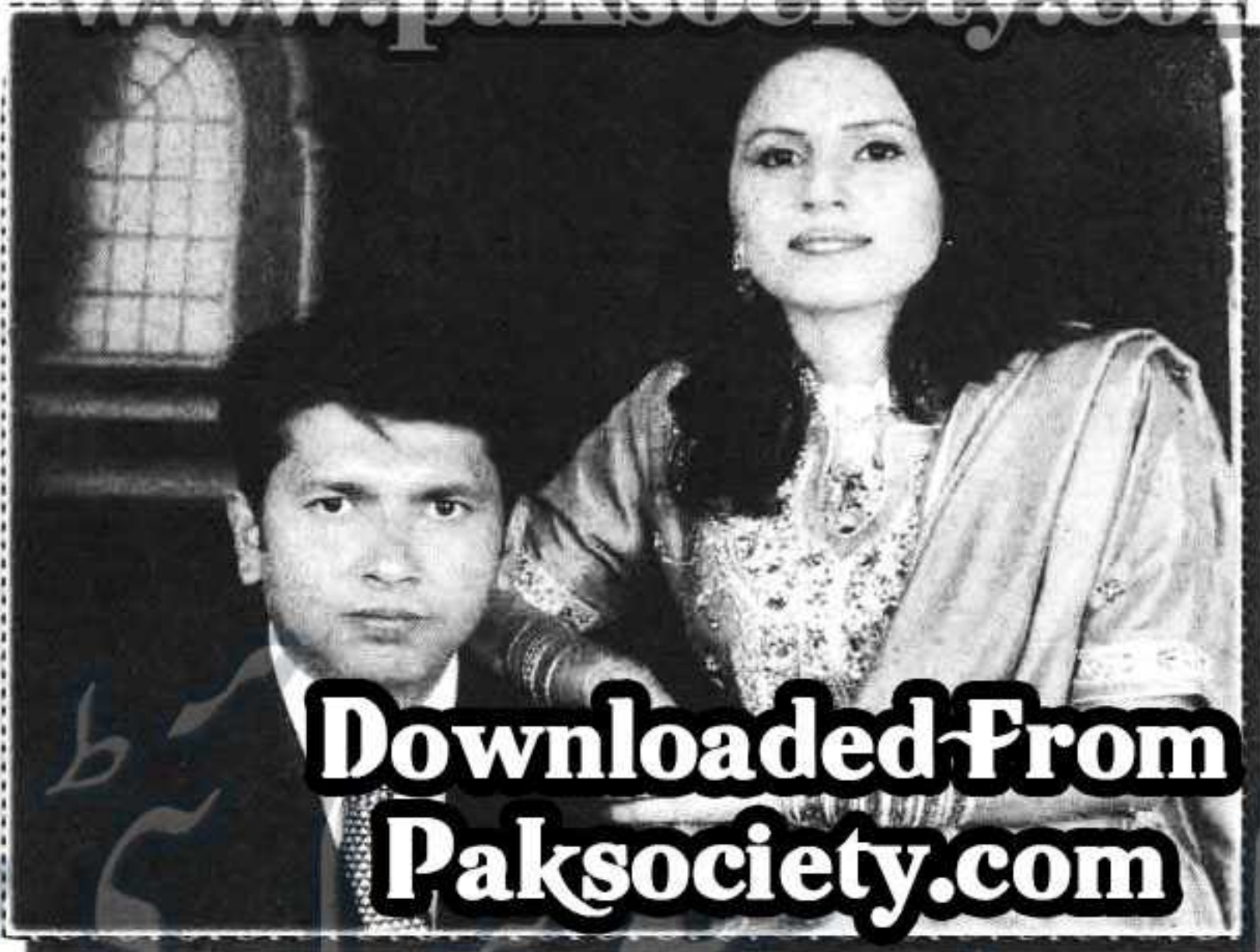
ناول نگار' افسانہ نگار' ڈراما نگار

صائمہ اکرم چوہدری سے ملاقات

شاہین رشید

کچھ نام تعارف کے محتاج نہیں ہوتے' جیسے "صائمہ اکرم چوہدری" جی.... ان کا نام پڑھتے ہی آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس بار انٹرویو کے لیے ہمارا انتخاب کون ہیں.... "صائمہ اکرم چوہدری" گوناگوں خوبیوں کی مالک ہیں۔ بیک وقت ہاؤس وائف' لیکچرار' افسانہ و ناول نگار اور اب ڈرامہ نگار کے فرائض بھی انجام دے رہی ہیں۔ اگرچہ ان کی ہر تحریر ان کی شہرت کا باعث بنی' مگر "دیمک زدہ محبت" اور "سیاہ حاشیہ" نے انہیں شہرت دوام بخشی۔

"کیا حال ہے صائمہ صاحبہ؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"بہت شکریہ کہ آپ نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے ہماری قارئین کے لیے ٹائم نکالا.... صائمہ آپ کا نام ماشاءاللہ خاصا بھاری بھرکم ہے۔ "صائمہ اکرم چوہدری" تو مزاج میں اور شخصیت میں چوہدریوں والی چوہدراہٹ بھی ہے؟"

"جی بالکل ہے.... میرا مزاج چوہدریوں والا شاہانہ ہی ہے۔ پہلے بہت شوخ و چنچل ہوا کرتی تھی' مگر.... اب وقت کے ساتھ ساتھ مزاج میں بہت تبدیلیاں آچکی ہیں.... جہاں تک میرے نام میں ہماری کاسٹ "چوہدری" کا تعلق ہے تو شروع میں میرا نام صرف صائمہ اکرم تھا اور میں نے بچوں کے لیے جتنا بھی ادب تخلیق کیا' اسی نام سے کیا.... لیکن ان ہی دنوں اسی نام سے میرے شہر کی ایک اور لڑکی نے چھوٹی موٹی چیزیں

اخبارات میں لکھنا شروع کردیں۔ تو میں نے اپنی شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے نام کے ساتھ ”چوہدری“ لگالیا۔۔۔“

”ایک ڈرامہ سیریل ”آذر کی آئے گی بارات“ بہت مقبول ہوا تھا۔ اس میں بھی ایک ”صائمہ چوہدری“ تھیں تو اس حوالے سے کسی نے چھیڑ چھاڑ کی‘ انجوائے کیا اس چیز کو آپ نے؟“

”جی۔۔۔ جب بشریٰ انصاری صاحبہ نے ”صائمہ چوہدری“ کا کردار کیا تو تب بے تکلف اور قریبی دوستوں نے بھی اس نام سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی‘ جسے میں نے خوب انجوائے کیا‘ لیکن اسٹوڈنٹس میں کبھی کسی کو اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ میرے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے‘ ویسے اب لوگ اس بات کو تسلیم کرچکے ہیں کہ یہ نام میرے نام کا حصہ ہے۔“

”صائمہ کچھ اپنے بارے میں‘ اپنی فیملی کے بارے میں بتایئے؟“

”میرا تعلق پنجاب کے آخری شہر ”صادق آباد“ سے ہے‘ لیکن میری پیدائش ”اوکاڑہ“ شہر کی ہے۔ دو بھائیوں اور دو بہنوں میں میرا نمبر دوسرا ہے۔ اپنے والد صاحب کی بہت لاڈلی اور چہیتی بیٹی ہوں۔۔۔ میں نے ڈبل ایم اے کیا ہے۔ پہلا ماسٹرز زکریا یونی ورسٹی ملتان سے ”ماس کمیونی کیشن“ میں سلور میڈل کے ساتھ اور دوسرا ماسٹرز اردو میں ”اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور“ سے کیا۔ اس کے بعد پانچ سال گورنمنٹ ڈگری کالج صادق آباد میں پڑھایا۔ پھر میری شادی ہوگئی۔

میرے میاں صاحب کا تعلق میڈیکل فیلڈ سے ہے اور وہ ماشاء اللہ سرجن ہیں۔ شادی کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال کراچی میں رہے اور پھر ہماری پوسٹنگ اسلام آباد میں ہوگئی۔ اسلام آباد میں‘ میں نے ”شفا نیوز میگزین“ میں دو سال جاب کی اور ساتھ ہی فیڈرل کمیشن کا لیکچرر شپ کا امتحان بھی پاس کیا اور میری پوسٹنگ ”کھاریاں کینٹ“ میں ہوگئی‘ جہاں میں نے تقریباً آٹھ ماہ اپنے میاں صاحب کے بغیر گزارے اور بہت مشکل سے گزارے‘ حالانکہ اسلام آباد سے کھاریاں کینٹ کا فاصلہ ڈھائی سے تین گھنٹے کا تھا اور میں ہمیشہ ویک اینڈ پر اسلام آباد سے کھاریاں جاتے ہوئے روتی تھی کیونکہ مجھے اپنے میاں کے بغیر رہنے کی عادت نہیں تھی۔ خیر جی۔۔۔ خدا خدا کرکے میری پوسٹنگ اسلام آباد ہوگئی اور اب الحمدللہ گزشتہ چار سال سے میں اسلام آباد میں ہی اپنے میاں صاحب کے ساتھ ہوں۔“

”میاں صاحب نے کہا نہیں کہ جاب چھوڑو اور اسلام آباد واپس آجاؤ اور اتنا کچھ کرتی ہیں‘ اپنے آپ کو ”چارج“ کس طرح رکھتی ہیں؟“

”نہیں۔۔۔ جی۔۔۔ میرے میاں ان مردوں میں سے نہیں کہ جو عورت کو گھر بٹھادیں۔ انہیں ایکٹو خواتین اچھی لگتی ہیں۔۔۔ اور میں تو پھر ان کی بیوی تھی۔۔۔ میں نے شادی سے پہلے بھی بہت ایکٹو لائف گزاری ہے اور شادی کے بعد شریک سفر بھی کچھ ایسا مل گیا کہ جس کا بس نہیں چلتا تھا کہ مجھے ”پی ایچ ڈی“ کروادے۔

میں کبھی بھی سکون سے گھر نہیں بیٹھی شادی کے فوراً" بعد میاں صاحب نے چھ ماہ کا ایک کمپیوٹر کورس کروایا اور اس کے بعد چھ ماہ کے لیے "نمل یونی ورسٹی کراچی کیمپس" میں انگریزی لینگویج سیکھنے کے لیے لگادیا۔ وہاں سے فارغ ہوئی تو فیڈرل اردو یونیورسٹی کراچی میں "ایم فل" میں ایڈمیشن کروادیا جو ہماری اسلام آباد پوسٹنگ کی وجہ سے پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ اسلام آباد آتے ہی فیڈرل کمیشن کا امتحان، جاب اور ساتھ ہی ڈرائیونگ کلاسز میں لگ گئی۔ شاید میرے میاں کو معلوم تھا کہ ان کی مصروف زندگی میں ایک مصروف بیوی ہی ان کا ساتھ دے سکتی ہے۔ اس لیے انہوں نے ہر کام میں میری دل کھول کر حوصلہ افزائی کی۔

میری امی خفا ہوتی تھیں کہ اب تو یہ سب کچھ چھوڑ دو اور میں ان کی باتیں سن کر ہنستی تھی۔۔۔ اور شفانیوز کی جاب کے دوران کبھی "چارسدہ" میں سیلاب کی رپورٹنگ کے لیے جاتی اور "کیس اسٹڈیز" کے لیے مختلف اسپتالوں میں منفرد کیس تلاش کرتی۔۔۔ شفانیوز چونکہ ایک ہیلتھ میگزین تھا اور میرے لیے ایک بالکل مختلف کام۔۔۔ میں نے ان دنوں "گائنی" "ذیابطیس" "کارڈیالوجی" اور بچوں کی صحت کے متعلق چھوٹی چھوٹی چیزوں کا شعور دینے کے لیے "کہانی گھر" کے نام سے ایک سیریز لکھی، لیکن میرے کسی بھی ایسے آرٹیکل کے بارے میں جب کولیگز یہ پوچھتے کہ اس میں تو آپ کے میاں نے ہیلپ کی ہوگی تو مجھے بہت مایوسی ہوتی تھی کیونکہ میری ساری محنت "ان" کے کھاتے میں ڈال دی جاتی تھی۔ خیر۔۔۔ اس دوران میں نے پاکستان کے مشہور و معروف ڈاکٹرز کے انٹرویوز بھی کیے۔

اپنے آپ کو چارج کیسے رکھتی ہوں تو۔۔۔ یہ میرے اللہ کی مہربانی ہے کہ اس نے مجھے ہمت دی ہوئی ہے۔۔۔ ان سارے کاموں کے ساتھ ساتھ اللہ کا شکر ہے کہ گھر بھی اچھا مینیج کیا ہوا ہے اور میرے میاں چونکہ پانچ سال یورپ میں رہ کر آئے تھے تو گھر کے کھانوں کے لیے ترسے ہوئے تھے۔ لہٰذا اب ان کا دل چاہتا ہے کہ کھانا گھر کا ہی ہو' چنانچہ ساری ایکٹیویٹیز کے ساتھ ساتھ کھانا پکانے کی ذمہ داری بھی احسن طریقے سے نبھا رہی ہوں۔۔۔ اتنے ڈھیر سارے کاموں کے بعد جب فارغ ہو کر اپنے بیڈ پر آتی ہوں تو خود بھی حیران ہوتی ہوں کہ یہ سارے کام میں کیسے کرلیتی ہوں' مگر پھر اللہ تعالیٰ کی اس بات پر یقین آتا ہے کہ "اللہ کسی پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔"

"بہت کمال کی بات ہے آپ اتنا کچھ کرتی ہیں' ورنہ خواتین کے تو بڑے نخرے ہوتے ہیں۔۔۔ خیر۔۔۔ آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

"آج کل میں لیکچرر شپ کے ساتھ ساتھ شعاع میں ایک سلسلے وار ناول "سیاہ حاشیہ" کے نام سے لکھ رہی ہوں۔ ٹی وی کے لیے ایک ڈراما سیریل کا اسکرپٹ بھی مکمل ہونے والا ہے اور ایک دوسرے چینل کے لیے بھی ایک سیریل شروع کر رکھا ہے۔۔۔ آج کل الیکٹرونک میڈیا میں بہت مصروف ہوں۔۔۔ میرے سیریلز "محبت اب نہیں ہوگی" "عنایہ تمہاری ہوئی" "میرے اجنبی" اور "میرا درد نہ جانے کوئی" کے بعد شاید ہی کوئی مہینہ ایسا ہو جس میں' میں نے مختلف چینلز کی اسکرپٹ رائٹنگ سے آفرز کی معذرت نہ کی ہو۔۔۔ اللہ نے مجھے میری توقع سے زیادہ نوازا ہے' میں لکھنا چاہتی ہوں مگر جاب اور گھر کی مصروفیات کی وجہ سے زیادہ لکھ نہیں سکتی۔"

"کب اور کیسے اک ہوا کہ آپ لکھ سکتی ہیں؟ پہلی تحریر کیا تھی اور کس طرح سلسلہ آگے بڑھا؟"

"مجھے بچپن سے ہی پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور یہ شوق مجھے اپنے والد کی طرف سے وراثت میں ملا۔ ہم چار بہن بھائیوں میں تین حد درجے ڈائجسٹ کے کیڑے تھے۔ میں کلاس فور میں تھی جب اخبارات سے اقوال زریں' لطیفے اور اس ٹائپ کی چیزیں ادھر ادھر سے کاپی کر کے "پھول اور کلیاں" اخبار میں چھپوانے

کے لیے بھیج دیتی تھی کہ اردو میں چھپ بھی جاتی تھیں۔

جب نویں کلاس میں آئی تو میرے مخالف گروپ کی ایک لڑکی کی لکھی ہوئی کہانی اخبار میں چھپ گئی تو میری دوستوں نے مجھے بھی جوش دلایا اور یوں میں نے پہلی کہانی چودہ پندرہ سال کی عمر میں لکھی اور جب وہ چھپ گئی تو بس پھر سلسلہ چل نکلا..... کالج میں آئی تو مجھے میری تحریروں کی وجہ سے ذرا دی آئی پی پروٹوکول ملنے لگا۔ ان ہی دنوں میں "ماہنامہ پھول" میں خوب لکھا اور میری کہانیاں آل پاکستان مقابلہ جات میں پوزیشنز لینے لگیں اور مجھے لاہور، فیصل آباد اور ملتان وغیرہ میں منعقد ہونے والی تقریبات میں انعام اور ایوارڈ لینے کے لیے بلایا جاتا تھا۔

ان ہی دنوں کی بات ہے جب ماہنامہ پھول میں ایک شاعری کا سلسلہ ترتیب دینے لگی' اس وقت میں صادق آباد میں رہتی تھی۔ ہر ماہ ایک بہت بڑا لفافہ مجھے موصول ہوتا تھا جس میں دنیا جہاں کی شاعری ہوتی تھی اور میں اس شاعری کو کانٹ چھانٹ کر ترتیب دیا کرتی تھی اور یہ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ ماہنامہ "پھول" والوں نے مجھے لاہور میں ہونے والی ایک تقریب میں گورنر پنجاب سے تین دفعہ بہترین کارکردگی کا ایوارڈ دلایا اس کے بعد اگلا قدم یونیورسٹی میں رکھا۔

پھر ڈائجسٹ میں لکھنا شروع کیا۔ میرا پہلا افسانہ ماہنامہ "حنا" اور دوسرا ماہنامہ "کرن" میں شائع ہوا۔

"گھر میں کس نے حوصلہ افزائی کی؟ گھر والوں نے کب آپ کی صلاحیتوں کو تسلیم کیا؟"

"شروع شروع میں تو والدین کو غصہ آتا تھا' مگر تب نہیں جب ماہنامہ "نونہال" "پھول" اور تعلیم و تربیت پڑھتی تھی بلکہ جب میں نے بہت چھوٹی عمر میں شعاع اور خواتین پڑھنا شروع کیا تب اعتراض ہوا..... کافی بار ابو جی سے ڈانٹ پڑی..... اور مزے کی بات یہ

کہ میں جب اسکول میں تھی تو اپنی کلاس کی مانیٹر تھی اور میری کلاس کی لڑکیوں کو معلوم تھا کہ میگزین پڑھنا میری کمزوری ہے تو سبق سننے کے دوران نکمی لڑکیاں مجھے پرانے ڈائجسٹ رشوت کے طور پر دے کر بیٹھ جاتی تھیں کیونکہ انہیں سبق یاد نہیں ہوتا تھا۔

میں ان ہی لڑکیوں سے دوستی کرتی تھی جن کے گھر میگزین اور ڈائجسٹ آتے تھے اور میں بہت سنبھال کے ان کے میگزین رکھا کرتی تھی۔ میں نے میٹرک کے دوران ممتاز مفتی' بانو قدسیہ' اشفاق احمد' منٹو "میکسم گورکی" اور "غلام عباس" کو پڑھا۔ وہ لٹریچر جو مجھے اب پڑھنا چاہیے تھا' وہ میں نے اسکول کے زمانے میں پڑھ لیا تھا۔ چونکہ پڑھائی میں اچھی تھی اور ہمیشہ پوزیشن لیتی تھی تو والد صاحب نے تنگ آکر مجھے منع کرنا چھوڑ دیا۔

ایف اے کے دوران بہت لکھا اور پڑھا..... ان ہی دنوں میں "پھول کلب" صادق آباد کی صدر بن گئی..... اور شہر میں بچوں کی غیر نصابی تقریبات کا اہتمام شروع کر دیا تب میرے والد کو احساس ہوا کہ میری یہ بیٹی باقی بچوں سے ذرا مختلف ہے۔ خیر..... جب میں لاہور میں منعقدہ سیمی نار میں جایا کرتی تھی تب اشفاق احمد اور بانو قدسیہ سے بھی ملنے کا شرف حاصل ہوا اور گفتگو کے دوران جب میں نے اشفاق احمد صاحب سے ممتاز مفتی کے "علی پور کا ایلی" پر بات کی تو وہ مسکرا کر بولے۔

"کس کلاس میں ہو۔"

میں نے کہا "فرسٹ ایر میں۔"

تو انہوں نے کہا "ایم اے" کے دوران اسے دوبارہ پڑھنا اور مجھے واقعی دوبارہ پڑھنے پر زیادہ سمجھ میں آئی..... اس طرح جب مجھے گورنر پنجاب سے تیسری مرتبہ ایوارڈ ملا تو فنکشن کے اختتام پر کسی نے میری امی سے کہا۔

"آپ کی بیٹی ماشاءاللہ بہت ٹیلنٹڈ ہے۔"

تو میری امی نے گورنر صاحب کے سامنے بے ساختہ کہا "فائدہ جب روٹی تو ڈھنگ سے بنانا نہیں آتی۔"

اس وقت تو میں بہت شرمندہ ہو گئی' مگر اب سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔"

"لکھنے سے پہلے پلاٹ کو اینڈ تک سوچ لیتی ہیں یا خیالات بدلتے رہتے ہیں؟"

"کہانی کا پلاٹ اور اینڈ میرے ذہن میں شروع سے ہی ہوتا ہے، لیکن واقعات سچویشن کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں اور بعض مرتبہ تو کہانی کا اینڈ بھی تبدیل کرنا پڑجاتا ہے، مکمل ناول لکھنے سے پہلے میں کہانی کو خلاصے کے طور پر لکھ لیتی ہوں اور کہانی کو کبھی بھی اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش نہیں کرتی، میرا ذاتی خیال ہے کہ بعض کہانیاں خود آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ سے لکھواتی ہیں۔ کہانی جتنی اپنے فطری انداز سے آگے بڑھے گی اتنی جان دار ہوگی۔"

"آپ اس معاشرے کی کہانیاں، اپنے مشاہدے کے تحت لکھتی ہیں یا دوسروں کی کہانیاں سن کر لکھتی ہیں؟"

"میں زیادہ تر اپنے مشاہدے اور تجربے پر ہی بھروسا کرتی ہوں۔ بعض لوگ اپنی کہانیاں لکھوانے کی ضد کرتے ہیں، مگر میرا مسئلہ یہ ہے کہ جب تک کسی چیز کو دیکھ کر یا سن کر مجھے "اندر" سے تحریک نہ ملے میں لکھ نہیں سکتی۔ میری زیادہ تر کہانیاں وہی ہیں جس کے کسی نہ کسی کردار کے کسی ایک جملے یا چھوٹی سی حرکت، مجھ سے پورا ناول لکھوالیتی ہے... "دیمک زدہ محبت" ناول میں نے ایک جملے کو سن کر لکھا اور "ابن آدم" مجھ سے ایک منظر نے لکھوایا اور "بنت حوا" "ایک لڑکی کا نم آلود لہجہ" مجھ سے لکھوا گیا۔"

"کیا پلاننگ کرکے لکھتی ہیں یا جب کہانی ذہن میں آگئی، لکھنے بیٹھ گئیں یا کوئی وقت مقرر ہے لکھنے کا؟"

"بہت دلچسپ سوال ہے... میرے لکھنے کے کوئی اوقات مقرر نہیں ہیں۔ بعض اوقات رات کو سوتے ہوئے کوئی کہانی ذہن میں آجاتی ہے تو فوراً" لائٹ جلا کر لکھنا شروع کردیتی ہوں اور اس معاملے میں میرے میاں بہت کوآپریٹو ہیں، کہتے کچھ نہیں بس کروٹ بدل کر سو جاتے ہیں۔ ایگزام ڈیوٹی کے دوران بہت سے آئیڈیاز آرہے ہوتے ہیں۔ ڈرائیونگ کے دوران، لیکچر کے دوران... تو پھر میں اہم پوائنٹ نوٹ کرلیتی ہوں۔ سفر کے دوران تو میاں کے نمبر پر SMS کرکے پوائنٹس لکھ لیتی ہوں... تو جناب تخلیق کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ جب اندر سے تحریک ملتی ہے تو الفاظ خود بخود "نوک قلم" پر آکر مچل جاتے ہیں۔"

"ٹی وی تک رسائی کیسے ہوئی... ؟ اور لیٹ انٹری کیوں دی؟"

"میرے خیال میں اللہ نے ہر چیز کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، مجھے اسکرپٹ رائٹنگ کا شوق تو تھا، مگر کوئی آئیڈیا نہیں تھا کہ کس طرح ان سے رابطہ کیا جائے۔ میری ایک دوست "نبیلہ ابر راجہ" کا ایک ڈرامہ ایک چینل سے آن ایر تھا، نبیلہ نے ہی مجھے کہا کہ تم ٹی وی کے لیے لکھو، چنانچہ میں نے ایک چینل سے رابطہ کیا۔ یوں میرا پہلا سیریل "محبت اب نہیں ہوگی" آن ایر ہوا اور اس کے بعد مختلف چینلز کے پروڈکشن ہاؤسز نے مجھ سے رابطے شروع کردیے اور یوں میں نے "عنایہ تمہاری ہوئی" اور "میرے اجنبی" لکھا... جس کی کامیابی کے بعد اب ہر اچھے چینل سے مجھے لکھنے کی آفرز ہیں۔"

"گزرے زمانے میں رائٹر اپنی تسکین کے لیے ڈراما لکھتے تھے، لیکن اب ڈراما بکتا ہے... آپ اس سے اتفاق کریں گی؟"

"میں آپ کی بات سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں۔ پرنٹ میڈیا میں تو رائٹرز کسی حد تک اپنا کتھارسس کرسکتا ہے، لیکن الیکٹرونک میڈیا کا رائٹر بہت سی ان دیکھی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ کہیں پیمرا کی بندش تو کہیں چینل کی پالیسی، اس کے بعد جو چینل ایک سیریل پہ لاکھوں، کروڑوں خرچ کرتا ہے، اس کا زیادہ فوکس اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح اپنا پیسہ وصول کرسکے۔ اس لیے وہ اپنی من پسند چیزیں لکھواتے ہیں اور اس وجہ سے ڈراما کمرشل چیز بن کر رہ گیا ہے۔"

"کیا آج کا ڈراما زوال کا شکار ہے؟"

"چینلز کی بھرمار میں اچھی اور بری دونوں چیزیں سامنے آرہی ہیں۔ پی ٹی وی کے دور میں لوگوں کے پاس کوئی آپشن نہیں تھا اور پرائم ٹائم میں ایک ہی ڈراما چلتا تھا' جس پر خوب محنت کی جاتی تھی لیکن بدقسمتی سے آج کل ایسا نہیں ہے۔ چینلز کی بھرمار میں لوگوں کے پاس کام تو بہت ہے' مگر کوالٹی اور انفرادیت کا فقدان ہے۔ آج جو چیز ہٹ ہوتی ہے' وہ ہی مارکیٹ میں نظر آنے لگتی ہے... اس لیے ڈرامے بھی ایک جیسے لگتے ہیں۔"

"آج کی عورت پڑھی لکھی اور اسٹرونگ ہے' آپ کی اپنی مثال سب کے سامنے ہے۔ پھر ڈراموں میں روتی پیٹتی عورت ہی کیوں دکھائی جاتی ہے؟"

"اس بات پر تو میں بھی اکثر اعتراض اٹھاتی ہوں' لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ آج کل کا ڈراما کمرشل ہے اور چینل والے ریٹنگ کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اور ڈرامے کی ریٹنگ خواتین کی وجہ سے آتی ہے' کیوں کہ خواتین ہی ڈراما شوق سے دیکھتی ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ روتی دھوتی عورت سے ہی دوسروں کو ہمدردی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں رویوں کو بدلنے کی ضرورت ہے' ویسے بھی ایک خود مختار عورت کو دیکھ کر مرد خود عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے ہیں... ہم رائٹرز سے ایسی ہی روتی دھوتی خواتین کی کہانیوں کی ڈیمانڈ کی جاتی ہے۔ میرے ڈراما سیریل "عنایہ تمہاری ہوئی" میں جب عنایہ روتی تھی تو سیریل کی ریٹنگ بڑھ جاتی تھی۔ ہم رائٹرز تو بہت کہتے ہیں کہ ہم سے رونا دھونا مت لکھوائیں' لیکن ہماری کوئی نہیں سنتا... ہم نہیں لکھیں گے تو وہ کسی اور سے لکھوالیں گے۔"

"سنا ہے کہ رائٹرز کے اسکرپٹ پر قینچی بہت چلتی ہے؟"

"نئے اور جونیئرز اپنے حق کے لیے اس لیے نہیں بولتے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ہمارا کنٹریکٹ کینسل نہ ہو جائے... لیکن سینئرز رائٹرز اپنے حق کے لیے خوب بولتے ہیں اور کچھ رائٹرز کے بارے میں تو میں نے سنا ہے کہ وہ اپنی لکھی ہوئی ایک لائن بھی کاٹنے نہیں دیتے... اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو الحمدللہ میں نے آج تک جن لوگوں کے ساتھ کام کیا ہے وہ اپنی فیلڈ کے خاصے منجھے ہوئے لوگ ہیں اور میں ان کی تجاویز کو نہ صرف غور سے سنتی ہوں بلکہ عمل کرنے کی کوشش بھی کرتی ہوں اور جو بات مجھے خود کو ٹھیک لگے تو اس پہ اسٹینڈ بھی لیتی ہوں۔"

"گھر والے آپ کے ڈراموں کی تعریف کرتے ہیں یا گھر کی مرغی دال برابر ہے؟"

"آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ میرے میاں میرے سب سے بڑے نقاد ہیں حالانکہ وہ پیشے کے لحاظ سے سرجن ہیں' لیکن جہاں کہیں میری کہانی اٹک جائے تو میں ان سے ضرور ڈسکس کرتی ہوں۔ میرے ڈرامے اسپیشلی بیٹھ کر نہیں دیکھتے' لیکن کھانا کھانے کے دوران اگر ڈراما لگا ہوا ہو تو ضرور دیکھ لیتے ہیں کچھ پسند آجائے تو خاموشی ہی تعریف ہوتی ہے اور کچھ ناگوار لگے تو وہ ضرور بتا دیتے ہیں۔"

"سسرال والے کیسا رسپانس دیتے ہیں۔ پسند کرتے ہیں آپ کے کام کو' آپ کے لکھنے کو؟ کچھ ان کے بارے میں بتائیے؟"

"الحمدللہ۔ بڑا قدردان سسرال ملا ہے۔ سب دیور اور نندیں شادی شدہ ہیں اور میں سب سے بڑی بہو ہوں' باقی اپنی جابز کی وجہ سے مختلف شہروں میں رہتے

ہیں۔ ہاں کسی ایونٹ پر ہم سب اکٹھے ضرور ہوتے ہیں۔ میری ساس کا میری شادی سے پہلے انتقال ہوچکا تھا' صرف سسر صاحب ہیں جو میری بہت کھل کر تعریف کرتے ہیں۔ جب بھی کراچی میں اپنے دوسرے بیٹے کے گھر ہوتے ہیں تو ہر دوسرے دن فون کرکے ضرور پوچھتے ہیں کہ کیا لکھا... شادی کے بعد کچھ عرصہ اپنی مصروفیات کے باعث لکھ نہیں پائی تھی تو شفقت بھرے انداز کہتے تھے کہ "اللہ نے تمہیں قلم کے ذریعے جو طاقت دی ہے اسے کبھی ختم مت کرنا۔" میری نندیں بہت شوق سے میرے لکھے ڈرامے دیکھتی ہیں اور ویسے بھی الحمدللہ ہر جگہ سے اچھا رسپانس ملتا ہے۔"

"جوائنٹ فیملی سسٹم ہے؟"

"اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ شادی سے پہلے جب امی کو مجھ پر غصہ آتا تھا تو وہ کہتی تھیں کہ بڑی فیملی میں بیاہوں گی تمہیں' تاکہ تم ہر وقت کچن میں رہو' تب تمہیں اپنے گھر کی قدر ہوگی.... اور ماشاءاللہ سے امی کی دعا قبول ہوئی' بڑے گھر میں شادی ہوئی' ماشاءاللہ سے میاں لوگ پانچ بھائی اور تین بہنیں ہیں' شادی کے ایک ماہ بعد ہی میرے سسر صاحب نے مجھے صادق آباد سے میرے میاں کے پاس کراچی بھجوا دیا تب سے ہم دونوں اکیلے ہی رہتے ہیں۔ میرے سسر اس بات کے قائل ہیں کہ بیوی کو میاں کے پاس ہی رہنا چاہیے۔ اس لیے ہمارا آبائی گھر اکثر بند ہی رہتا ہے' کیوں کہ سب علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں۔ میری نندوں نے کبھی کسی بھابھی کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کی۔ میرے سارے دیور بہت فرینڈلی ہیں اور اعلا تعلیم یافتہ ہیں اور میرے سسر کسی بھی بیٹے کے پاس رہیں' اپنے بیٹے سے زیادہ اپنی بہو کا خیال رکھتے ہیں... اس معاملے میں' میں بہت خوش قسمت ہوں۔"

"اب تک کتنے ناولز اور افسانے وغیرہ کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں اور عنقریب کون سا سیریل آن ایر ہونے والا ہے؟"

"الحمدللہ میرے چھ ناولز کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں اور ایک ناولٹس کا مجموعہ "اک رسم محبت" کے عنوان سے آیا ہے۔ شاعری کا بھی شوق رہا اور شادی سے پہلے بہت غزلیں اور نظمیں لکھیں' میرے ڈراما سیریل "میرے اجنبی" کی پہلی قسط کے پہلے سین میں میری ہی نظم "تیرا ملنا ضروری ہے" شامل ہے۔ میرے ناولز "دیمک زدہ محبت" "ابن آدم" "گم شدہ جنت" اور سیاہ حاشیہ کو بہت پذیرائی ملی اور آن ایر آنے والے سیریل میں ایک چینل سے "آدھی گواہی" تیار ہے باقی پر ورکنگ ہو رہی ہے۔"

"کوکنگ سے لگاؤ ہے؟"

"شادی سے پہلے اتنا زیادہ شوق نہیں تھا اور مزے کی بات بتاؤں کہ میں نے کوکنگ اپنے میاں صاحب سے سیکھی ہے' کیوں کہ وہ شادی سے پہلے پانچ سال یورپ میں رہے تو کوکنگ میں کافی ماہر ہو چکے تھے' تو انہوں نے ہی مجھے کافی چیزیں سکھائیں.... اب میں بہت شوق سے اور دل کے ساتھ کھانا پکاتی ہوں...."

"فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟"

"سچ پوچھیں تو فارغ وقت بہت کم ملتا ہے اور جب ملتا ہے تو میں اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ میاں کے ساتھ کبھی "مری" یا ایبٹ آباد نکل جاتی ہوں۔ یا پھر امی کے پاس صادق آباد چلی جاتی ہوں' پہلے بہت زیادہ سوشل تھی۔ اب دانستہ خود کو محدود کرلیا ہے۔"

"صائمہ! آپ قارئین کی پسندیدہ رائٹر ہیں....
کوشش تو کی کہ سب باتیں ہو جائیں.... تاکہ قارئین مطمئن ہوں.... اب دیکھیں کہ ان کا کیا رسپانس آتا ہے۔"

"شاہین آپ کے سوال بہت اچھے تھے اور مجھے بھی مزہ آیا جواب دے کر۔"

عمیرہ احمد

آبِ حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سرا مل جاتا ہے۔

J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پارہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال

کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک صرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرادی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کررہی ہے۔ مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی، اس نے اس بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہورہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہوکر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

۲۰
بیسویں قسط

”تم پاکستان نہیں جانا چاہتے حمین؟“ اس رات سالار نے حمین کو بٹھا کر پوچھا تھا۔ امامہ نے اسے رات کے کھانے سے کچھ دیر پہلے اس کے انکار کے بارے میں بتایا تھا۔

”نہیں۔“ حمین نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور کوئی بھی نہیں جانا چاہتا۔“ اس نے مزید بتایا۔

”میں کسی اور کی نہیں، صرف تمہاری بات کر رہا ہوں۔“ سالار نے اسے ٹوک دیا۔

حمین سر جھکائے چند لمحے خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے سر اٹھا کر باپ کو دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

”وجہ؟“ سالار نے اسی انداز میں کہا۔

”بہت ساری ہیں۔“ اس نے بے حد مستحکم انداز میں باپ کو جواب دیا۔

”کسی بھی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی صرف ایک وجہ ہوتی ہے، باقی سب بہانے ہوتے ہیں۔ اس لیے تم صرف وجہ بتاؤ، بہانے نہیں۔“ سالار نے اپنے گیارہ سالہ بیٹے کے ذخیرۂ الفاظ کی ہوا نکالتے ہوئے کہا۔

حمین اس ملاقات کے لیے پہلے سے تیار تھا اور وجوہات کو جمع کرنے پر بھی اچھا خاصا وقت صرف کر چکا تھا۔ باپ نے جیسے انگلی سے پکڑ کر دوبارہ زیرو پر کھڑا کر دیا تھا۔

”میں پاکستان میں ایڈجسٹ نہیں ہو سکتا۔“ حمین نے بالآخر ایک وجہ تلاش کر کے پیش کی۔

”اگر تم کانگو میں ایڈجسٹ ہو سکتے ہو تو پاکستان میں بھی ہو جاؤ گے۔۔۔ افریقہ سے زیادہ بُرا نہیں۔“ سالار نے اسی انداز میں کہا۔

”تب میں چھوٹا تھا۔“ حمین نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

”تم اب بھی چھوٹے ہی ہو۔“ سالار نے بات کاٹی۔

”لیکن میں بڑا ہو رہا ہوں۔“ حمین نے جیسے اعتراض کیا۔

”اس میں کافی ٹائم لگے گا۔۔۔ تمہارے لیے کم از کم پچیس سال۔“ سالار نے بے حد سنجیدگی سے اسے چھیڑا۔ وہ باپ کو دیکھ کر رہ گیا۔

”آئی ایم سیریس بابا!“ اس نے سالار کی بات سے محظوظ ہوئے بغیر کہا۔ ”میں پاکستان نہیں جانا چاہتا۔ اور یہ ممی کے لیے بھی اچھی بات نہیں ہے۔“ وہ کسی بڑے کی طرح باپ کے فیصلے پر تبصرہ کر رہا تھا۔

سالار خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔

”مجھے یہاں تعلیم حاصل کرنی ہے۔ میں وہاں چھٹیوں پر جا سکتا ہوں ہمیشہ کے لیے نہیں۔“ وہ بالکل امریکی انداز میں بے حد صاف گوئی سے باپ کو بتا رہا تھا کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں۔

”چند سالوں کی بات ہے حمین! اس کے بعد تم بھی اس قابل ہو جاؤ گے کہ امریکا واپس آکر کہیں بھی پڑھ سکو۔“ سالار نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ وہ گیارہ سال کا بچہ، باپ کو بے حد مدلل انداز میں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”چند سال سے بہت فرق پڑتا ہے۔ ایک سال سے بھی بہت فرق پڑتا ہے۔“ اس نے سالار کی بات کے جواب میں کہا۔

”تو تم یہ قربانی نہیں دو گے؟“ سالار نے اس بار بات بدلی۔

”جبریل بھی تو دے سکتا ہے قربانی۔۔۔ آپ بھی تو دے سکتے ہیں۔۔۔ میں ہی کیوں؟“ اس نے جواباً ”اسی انداز

میں کہا۔

دنیا کے بڑے بڑے اداروں کے برابر آکے ان کے سامنے بیٹھ کران سے کاروباری امور طے کرنا اور بات تھی... ان کے سوالات اور اعتراضات کے انبار کو سمیٹنا آسان کام تھا... اپنے گیارہ سال کے بیٹے کو اس بات پر قائل کرنا زیادہ مشکل تھا کہ وہ وہ قربانی کیوں دے' جو اس کا بھائی نہیں دے رہا تھا... اس کا باپ بھی نہیں دے رہا تھا... پھر وہ کیوں؟ اور اس کیوں کا جواب فارمولوں اور کلیوں میں نہیں ملتا تھا' صرف ان اخلاقی اقدار میں ملتا تھا جن پر اس نے اپنی اولاد کی تربیت کی تھی' لیکن اس کے باوجود اس کی اولاد اس سے یہ سوال کر رہی تھی۔

"تم جانتے ہو' تمہارے دادا کو الزائمر ہے۔ وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور انہیں ضرورت ہے کہ کوئی ان کے پاس ہو... تم سے انہیں زیادہ محبت ہے۔ اس لیے میں چاہتا تھا تم ان کے پاس رہو۔" سالار نے جیسے وہ جواب ڈھونڈنا شروع کیے جن سے وہ اسے سمجھا سکتا۔

"ویسے بھی جب تمہاری ممی' عنایہ اور رئیسہ کے ساتھ یہاں سے چلی جائیں گی تو تم یہاں کس کے پاس رہو گے؟ گھر میں تمہاری دیکھ بھال کے لیے کوئی نہیں ہو گا۔" سالار نے کہنا شروع کیا۔

"میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں۔" حمین نے باپ کی بات ختم ہونے پر کہا۔ "میں اتنا چھوٹا نہیں ہوں بابا... میں اکیلا رہ سکتا ہوں۔ آپ مجھے بورڈنگ میں بھی رکھ سکتے ہیں یا پھر میں کسی رشتہ دار کے پاس بھی رہ سکتا ہوں۔" اس نے سالار کے سامنے ایک کے بعد ایک حل رکھنا شروع کیا۔

"ان میں سے ایک بھی آپشن میرے لیے قابل قبول نہیں ہے' تمہیں سب کے ساتھ پاکستان جانا ہے۔" سالار نے دوٹوک انداز میں اس سے کہا۔

"آپ مجھ میں اور جبریل میں فرق کیوں کرتے ہیں بابا؟" اس کے اگلے جملے نے سالار کا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنے گیارہ سالہ بیٹے کا چہرہ دیکھا جس نے زندگی میں پہلی بار اس سے ایسا سوال یا ایسی شکایت کی تھی۔

"فرق... ؟ تم اس فرق کی وضاحت کر سکتے ہو؟" سالار پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ لگیں گے' اسے سمجھانے میں اور اب جیسے ایک پینڈورا باکس ہی کھلنے لگا تھا۔

"آپ جبریل کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔" اگلا تبصرہ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ دیکھتے رہے' پھر کچھ دیر بعد سالار نے اس سے کہا۔

"اور میں اسے کیوں بہتر سمجھتا ہوں؟" وہ جیسے اس کے اس الزام کی بھی وضاحت چاہتا تھا۔

"کیوں کہ وہ حافظ قرآن ہے... میں نہیں ہوں۔" بے حد روانی سے کہے گئے اس جملے نے سالار کو سُن کر دیا تھا... وہ واقعی پینڈورا باکس ہی کھول بیٹھا تھا' لیکن بہت غلط حوالے سے۔

وہ باغی نہیں تھا... نہ ہی بدتمیز' نہ ہی بدلحاظ' لیکن وہ جو سوچتا اور محسوس کرتا تھا' وہ کہہ دیتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار سالار کو لگا' وہ سکندر عثمان تھا اور اپنے سامنے آن بیٹھا تھا... لاجواب... بے بس... تاریخ یقیناً" اپنے آپ کو دہراتی ہے' لیکن اپنی مرضی کے وقت پر۔

"تمہیں جبریل برا لگتا ہے؟" سالار نے بے حد مدھم آواز میں اس سے پوچھا۔

"وہ میرا ایک ہی بھائی ہے... مجھے وہ کیسے برا لگ سکتا ہے' لیکن مجھے آپ لوگوں کا یہ رویّہ اچھا نہیں لگتا..."

حمین کو یہ شکایت کب سے ہونی شروع ہوئی تھی' اس کا اندازہ سالار کو نہیں ہوا' لیکن وہ اس وقت وہاں عجیب سی کیفیت میں بیٹھا ہوا تھا۔

"ایسا نہیں ہے حمین۔" اس نے حمین سے کہا وہ اپنے شب خوابی کے پاجامے کو گھٹنے سے رگڑ رہا تھا جیسے اس میں سوراخ ہی کر دینا چاہتا ہو۔

"بابا... میں آجاؤں؟" وہ جبریل تھا جو دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوا تھا...

گفتگو کے عجیب مرحلے پر وہ اندر آیا تھا۔ سالار اور حمین دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر کچھ جز بز ہوئے تھے۔

"ہاں آجاؤ۔" سالار نے اس سے کہا۔

وہ اندر آکر حمین کے برابر میں صوفے پر بیٹھ گیا پھر اس نے ایک نظر حمین کو دیکھا' جو اس سے نظریں نہیں ملا رہا تھا پھر اس نے باپ سے کہا۔

"دادا کے پاس میں پاکستان چلا جاتا ہوں... میں زیادہ اچھے طریقے سے ان کی دیکھ بھال کر سکوں گا۔" کمرے میں عجیب خاموشی چھائی تھی نہ سالار کچھ کہہ سکا' نہ حمین کچھ بول سکا تھا۔ ان دونوں کی آواز زیادہ اونچی نہیں تھی' لیکن جبریل پھر بھی یقیناً"یہ گفتگو سن کر ہی آیا تھا۔

"ممی اور حمین یہیں رہیں آپ کے پاس... میں اکیلا بھی ان کو سنبھال سکتا ہوں۔" وہ ہمیشہ کی طرح مدھم اور مستحکم آواز میں کہہ رہا تھا۔

"پاکستان میں ویسے بھی میڈیسن کی تعلیم کے لیے کم وقت لگتا ہے۔ یونیورسٹی کا سال ضائع ہونے سے بھی فرق نہیں پڑے گا۔" وہ اتنے آرام سے کہہ رہا تھا جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا... جبریل ایسا ہی تھا' کسی تردد کے بغیر مسئلے کا حل نکالنے والا۔

"میں تم سے بعد میں بات کروں گا جبریل۔" سالار نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

"میں گھر میں سب سے بڑا ہوں بابا... میری ذمہ داری سب سے زیادہ ہے... حمین کو آپ یہیں رہنے دیں اور مجھے جانے دیں... اور میں یہ سب بہت خوشی سے کہہ رہا ہوں' مجھے کوئی خفگی نہیں ہے۔" جبریل نے سالار کے ٹوکنے کے باوجود اس سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے کمرے سے جانے کے بعد بھی سالار اور حمین خاموش ہی بیٹھے رہے۔ وہ بے حد تک آمیز صورت حال تھی جس کا سامنا ان دونوں نے چند لمحے پہلے کیا تھا۔

"میرے اور امامہ کے لیے تم میں اور جبریل میں کوئی فرق نہیں... اسے قرآن پاک حفظ کرنے کی وجہ سے عزت دیتے ہیں' لیکن تم تینوں پر اسے فوقیت نہیں دیتے' اس لیے یہ کبھی مت سمجھنا کہ ہم دونوں تم چاروں میں کوئی تفریق کریں گے۔" سالار نے بہت لمبی خاموشی کے بعد اس سے کہنا شروع کیا تھا۔

"تمہارے دادا میری ذمہ داری ہیں اور میرا خیال تھا' میں اپنی ذمہ داری جبریل اور تمہارے ساتھ بانٹ سکتا ہوں... اس لیے یہ کوشش کی... لیکن تم پر زبردستی نہیں کروں گا میں... تم نہیں جانا چاہتے' مت جاؤ۔"

سالار اس سے کہتا ہوا اٹھ کر چلا گیا' حمین وہیں بیٹھا رہا... سر جھکائے... خاموش... سوچتے ہوئے۔

☼ ☼ ☼

"مجھے امید ہے کہ تم مجھ سے خفا نہیں ہو گے؟"

جبریل اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھا پڑھ رہا تھا جب اس نے کمرے کا دروازہ کھلتے اور حمین کو اندر آتے دیکھا۔ دونوں کے درمیان خاموش نظروں کا تبادلہ ہوا پھر جبریل دوبارہ اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ حمین بستر پر جا کر لیٹ گیا اور اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بالآخر اسے مخاطب کیا تھا۔

"خفا؟" جبریل نے پلٹ کر اسے کچھ حیرانی سے دیکھا تھا۔ "کیوں؟"

حمین اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بڑے محتاط انداز میں اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"تم نے ہماری باتیں سنی تھیں؟" وہ کچھ بھی کہنے سے پہلے جیسے تصدیق چاہتا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ایک لمحہ کے لیے جبریل اسے دیکھتا رہا' پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں!"

حمین کے تاثرات بدلے۔ تھوڑی شرمندگی نے اسے جیسے کچھ اور دفاعی پوزیشن پر کھڑا کیا تھا۔

"اسی لیے پوچھ رہا تھا تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو نا؟" حمین نے اب اپنے جملے کو ذرا سا بدلا۔

"نہیں۔" جبریل نے اسی انداز میں کہا۔ حمین اپنے بستر سے اٹھ کر اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"لیکن مجھے مایوسی ضرور ہوئی۔" جبریل نے اس کے قریب آنے پر جیسے اپنے جملے کو مکمل کیا۔ حمین اب اسٹڈی ٹیبل سے پشت ٹکائے کھڑا تھا۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا.... تم میرے بھائی ہو اور میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں.... یقین کرو میں تمہارے خلاف نہیں ہوں...." حمین نے جیسے اسے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"مجھے پتا ہے۔" جبریل نے نرمی سے اسے ٹوکا اور اس کا بازو ہلکے سے تھپتھپایا۔ "لیکن تمہیں بابا سے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی.... انہیں بہت دھچکا لگا ہے.... " جبریل اب اسے سمجھا رہا تھا۔ "تم واقعی سمجھتے ہو کہ وہ مجھے تم سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں.... فرق کرتے ہیں؟" ——————— "جبکہ مجھے لگتا تھا وہ تمہیں زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔" جبریل نے جوابا" اس سے کہا تھا.... "کافی سال ایسے ہی لگتا رہا.... " جبریل نے جیسے بات ادھوری چھوڑ دی۔

حمین نے کچھ تجسس سے کریدا "پھر؟"

"پھر میں بڑا ہو گیا۔" وہ مسکرایا تھا۔ "اور میں نے سمجھا کہ ایسا نہیں ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "کچھ کوالٹیز کو وہ مجھ میں زیادہ پسند کرتے ہیں' کچھ تم میں' لیکن انہوں نے ہم دونوں میں کبھی فرق نہیں کیا' اگر کیا بھی ہو گا تو اس کی کوئی وجہ ہو گی۔" وہ اس کا بڑا بھائی تھا اور بڑے بھائی کی طرح ہی اسے سمجھا رہا تھا۔ حمین خاموشی سے بات سن رہا تھا۔ جب اس نے بات ختم کی تو حمین نے اس سے کہا۔

"میں یہ نہیں چاہتا کہ تم اپنی یونیورسٹی چھوڑ کر پاکستان جاؤ.... میں اتنا خود غرض نہیں ہوں.... " وہ جیسے اسے صفائی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بس میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔" اس نے جبریل سے کہا تھا۔

"تمہیں کوئی خود غرض سمجھ بھی نہیں رہا حمین.... تمہاری چوائس کی بات ہے اور بابا اس لیے تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کیوں کہ تم چھوٹے ہو اور یہاں تم اکیلے نہیں رہ سکتے.... بابا بہت بزی ہیں' کئی بار کئی کئی دن گھر نہیں آتے.... تم اکیلے کیسے رہو گے ان کے ساتھ.... صرف اس لیے تمہیں پاکستان بھیجنا چاہتے تھے وہ...."

اس نے جبریل کی بات کاٹ دی اور بے حد ہلکی' لیکن مستحکم آواز میں اس سے کہا۔

"میں نہیں چاہتا کہ تم پاکستان جاؤ.... تمہاری اسٹڈیز متاثر ہوں.... میں چلا جاؤں گا.... حالانکہ میں خوش نہیں ہوں' لیکن مجھے لگتا ہے میں سب کو ناراض کر کے یہاں رہ نہیں سکتا۔" وہ کہتے ہوئے اپنے بستر کی طرف چلا گیا۔ جبریل کو لگا وہ کچھ الجھا ہوا ہے.... جبریل اسے لیٹتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس نے حمین سے کہا۔

"چند سالوں کی بات ہے حمین.... پھر بابا تمہیں بھی واپس امریکا بلا لیں گے.... پھر تم اپنے خوابوں کی تکمیل کر سکتے ہو۔" جبریل نے جیسے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"میں خواب نہیں دیکھتا.... " اس نے جوابا" چادر اپنے اوپر کھینچتے ہوئے کہا تھا.... جبریل اسے دیکھ کر رہ گیا۔

حمین کے دماغ میں کیا تھا اسے بوجھنا بڑا مشکل تھا' صرف دوسروں کے لیے ہی نہیں' شاید اس کے اپنے لیے بھی۔

جبریل ایک بار پھر اپنی اسٹڈی ٹیبل پر پڑھنے بیٹھ گیا تھا۔ وہ اس ویک اینڈ پر گھر آیا ہوا تھا۔ اب اسے کل پھر واپس جانا تھا' اس کا اگلا سمسٹر شروع ہونے والا تھا۔

"بابا کے ساتھ کون رہے گا؟" کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے اس کا ہاتھ رک گیا۔۔۔ جبریل نے پلٹ کر ایک بار پھر بستر پر لیٹے ہوئے حمین کو دیکھا' اس نے تقریباً "دس منٹ بعد اسے مخاطب کیا تھا' جب وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ سو چکا ہے۔ اور اس کے سوال نے کسی کرنٹ کی طرح اسے جیسے حمین کی سوچ تک رسائی دی تھی۔

وہ واقعی بے حد گہرا تھا۔۔۔ یہ MIT نہیں تھی۔۔۔ امریکا نہیں تھا۔۔۔ جو حمین کو واپس جانے سے روک رہا تھا۔۔۔ یہ سالار سکندر کی بیماری تھی جس نے حمین کو اسے اکیلا چھوڑ دینے پر متوحش کیا تھا۔

وہ یہاں باپ کے پاس رکنا چاہتا تھا۔۔۔ بغیر اسے یہ جتائے کہ وہ اس کی وجہ سے وہاں رہنا چاہتا تھا۔۔۔ یوں ہے کہ وہ اس کے بارے میں فکر مند ہے۔۔۔ بالکل اسی طرح جیسے سالار سکندر اپنے باپ کے بارے میں فکر مند تھا' لیکن اسے یہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔۔۔

"تم بابا کی وجہ سے رکنا چاہتے ہو؟" جبریل نے جیسے اس کا راز افشا کر دیا تھا۔ حمین کے چادر سے ڈھکے وجود میں حرکت ہوئی۔۔۔ شاید اپنے دل کا بھید یوں فاش ہو جانے کی توقع نہیں تھی اسے۔۔۔ لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔۔۔ اس نے چادر بھی اپنے چہرے سے نہیں ہٹائی۔۔۔ جبریل پھر بھی اسے دیکھتا رہا۔

حمین سکندر ایک خرگوش کی طرح سرنگیں بنانے میں ماہر تھا۔۔۔ پلک جھپکنے میں کیا کیا کھود کر کہاں سے کہاں پہنچنے کا شوقین۔۔۔ وہ پلک جھپکتے میں دل سے نکلتا تھا اور وہ لمحہ بھر میں دل میں واپس آنکلتا تھا۔ جبریل سکندر اپنے اس چھوٹے بھائی کو دیکھتا رہا جسے وہ کبھی سمجھ نہیں پاتا تھا اور جب سمجھتا تھا تو اسے اپنی سمجھ بوجھ پر شک ہونے لگتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم سب لوگ جا رہے ہو؟" بار بار پوچھنے اور اس کا جواب عنایہ سے ہاں میں ملنے کے باوجود ایرک کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ ممکن تھا اور کبھی ہو بھی سکتا تھا۔

"لیکن کیوں؟" اگلا سوال کرنے کا خیال اسے بڑی دیر بعد آیا تھا حالانکہ عنایہ اس سوال سے پہلے اس کا بھی جواب دے چکی تھی۔

"بابا چاہتے ہیں' ہم کچھ سال دادا دادی کے پاس رہیں۔۔۔ وہ اکیلے ہیں پاکستان میں۔" عنایہ نے ہمیشہ کی طرح بڑے تحمل سے اس کے اس سوال کا جواب ایک بار پھر دہرایا۔

"چند سال؟ کتنے سال؟" ایرک بے حد پریشان تھا۔

"پتا نہیں۔۔۔" عنایہ نے جواب دیا اور اسے واقعی اس سوال کا جواب نہیں پتا تھا۔

"لیکن یہ گھر کیوں چھوڑ رہے ہو تم لوگ؟ تمہارے فادر اور جبریل تو نہیں جا رہے؟" ایرک نے اسی انداز میں کہا تھا۔

"بابا نیویارک شفٹ ہو رہے ہیں' جبریل ویسے ہی یونیورسٹی میں ہے۔۔۔ اتنا بڑا گھر ہماری ضرورت نہیں رہا اب۔" عنایہ نے دہرایا۔

"لیکن تم پریشان مت ہو۔۔۔ ہم لوگ امریکا تو آتے جاتے رہیں گے۔۔۔ اور تم پاکستان آسکتے ہو۔۔۔ جب بھی تمہارا دل چاہے۔" عنایہ کو اندازہ تھا اس کی' اپنی فیملی کے ساتھ جذباتی وابستگی کا۔۔۔ وہ ان کے بغیر اکیلا رہ جانے والا تھا۔

وہ دونوں اس وقت اسکول کے گراؤنڈ کے ایک بینچ پر بریک کے دوران بیٹھے ہوئے تھے۔۔۔ ارک نے اس کی باتوں کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ بس خاموش بیٹھا رہا تھا یوں جیسے اس صدمے کو سہنے کی کوشش کر رہا ہو جو عنایہ کے انکشاف نے اسے دیا تھا۔

"کیا میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جا سکتا؟" ایک لمبی خاموشی کے بعد ارک نے بالآخر اس سے پوچھا۔ اس سوال نے عنایہ کو مشکل میں ڈال دیا۔ جواب وہ جانتی تھی لیکن دے نہیں سکتی تھی۔

"تمہاری ممی اور فیملی کو تمہاری ضرورت ہے' تم انہیں چھوڑ کر ہمارے ساتھ کیسے جا سکتے ہو؟" عنایہ نے اپنے انکار کو بے حد مناسب الفاظ میں اس تک پہنچایا تھا۔

"ممی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔۔۔ میں ان سے اجازت لے سکتا ہوں۔۔۔ کیا آپ لوگ مجھے اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں؟" ایک اور سوال آیا۔۔۔ عنایہ ایک بار پھر وہیں کھڑی ہو گئی۔

"ارک! میں نہیں جانتی۔۔۔ میں ممی اور بابا سے پوچھ سکتی ہوں' لیکن اپنی فیملی کو اس طرح چھوڑ کر ایک دوسری فیملی کے ساتھ جانا ٹھیک نہیں ہے۔" عنایہ نے کہا تھا۔ وہ تیرہ سال کی تھی اسے بڑوں کی طرح نہیں سمجھا سکتی تھی پھر بھی اس نے کوشش کی تھی۔

ارک اس کی بات پر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

"چند سالوں تک میں ویسے ہی یونیورسٹی چلا جاؤں گا۔۔۔ گھر سے تو ویسے بھی جانا ہی ہوگا مجھے۔" اس نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

"پھر تو اور بھی ضروری ہے کہ یہ وقت تم اپنی فیملی کے ساتھ گزارو۔" عنایہ نے اسی نرم لہجے میں کہا۔

"میں اپنے آپ کو تمہاری فیملی کا حصہ سمجھتا ہوں' کیا تم لوگ ایسا نہیں سمجھتے؟" ارک نے جواباً" اس سے کہا اور جیسے پھر سے اسے مشکل میں ڈالا۔

"میں ممی سے بات کروں گی ارک۔" عنایہ نے اس سوال سے نکلنے کے لیے جیسے ایک حل تلاش کیا۔

"اگر آپ لوگ چلے گئے تو میرا گھر ایک بار پھر سے ٹوٹ جائے گا۔" ارک نے اس سے کہا "میرے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں رہے گی جہاں میں جا سکوں۔" اس نے جیسے منت والے انداز میں کہا تھا۔ یوں جیسے یہ سب عنایہ کے ہاتھ میں تھا' وہ چاہتی تو سب رک جاتے۔

عنایہ کا دل بری طرح پسیجا تھا۔

"ایسے مت کہو ارک۔۔۔ دور جانے سے یہ تھوڑی ہوتا ہے کہ تمہارے ساتھ ہمارا تعلق بھی ختم ہو جائے گا' ہم لوگ ملتے رہیں گے۔۔۔ بات بھی کریں گے۔۔۔ ای میلز بھی۔۔۔ چھٹیوں میں تم ہمارے پاس پاکستان آسکتے ہو۔۔۔ اور ہم یہاں امریکا۔۔۔ کچھ بھی ختم ہونے نہیں جا رہا۔" عنایہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی' یہ جانتے ہوئے بھی کہ ارک ٹھیک کہہ رہا تھا۔۔۔ فاصلہ دیو ہوتا ہے' سارے تعلق کھا جاتا ہے۔۔۔ پیار کا' دل کا' دوستی کا' رشتوں کا۔

"اگر وہ سب نہیں رک سکتے تو تم رک جاؤ۔" ارک نے یک دم اس سے کہا' وہ بری طرح گڑبڑائی۔

"میں کیسے رک سکتی ہوں۔۔۔ پہلے ہی حمین ضد کر رہا ہے۔۔۔ اور اس کی بات کوئی نہیں مان رہا اور مجھے تو کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔۔۔ میں ممی کی ہیلپ کرنا چاہتی ہوں' دادا دادی کا خیال رکھنے میں۔" اس نے ارک سے کہا تھا' وہ بے اختیار اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا' لیکن رک گیا۔ اتنے سال عنایہ کے ساتھ پڑھنے' اس کے ساتھ دوستی اور تقریباً" ہر روز اس کے گھر جانے کے باوجود ان کے درمیان ایسی بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ اسے کچھ بھی کہہ دیتا یا کہہ سکتا۔ عنایہ سکندر کا یہ رکھ رکھاؤ ماں باپ کی طرف سے جینز میں آیا تھا یا خاندانی تربیت تھی' لیکن یہ جس

وجہ سے بھی تھا اس نے عنایہ سکندر کو ہمیشہ اپنی کلاس کے لڑکوں کے لیے معمہ بنا رکھا تھا اور ایرک کے لیے تخیل ..... وہ جس معاشرے میں پل بڑھ رہے تھے وہاں آئی لو یو.... ہیلو ہائے جیسی چیز بن کر رہ گئی تھی.... کوئی بھی 'کسی سے بھی' کبھی بھی کہہ سکتا تھا اور سننے کے لیے تیار رہتا تھا۔ نہ یہ بری چیز سمجھی جاتی تھی نہ برا بنا دینے والی چیز.... اس کے باوجود ایرک کو جھجک محسوس ہو رہی تھی اسے لگتا تھا وہ اگر کبھی عنایہ سے اپنی محبت کا اظہار اس طرح کرے گا تو وہ ناراض ہو جائے گی اور پھر شاید اس گھر میں اس کا داخلہ ہی بند ہو جائے گا۔ اور پھر اس نے امامہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایسی کوئی بات عنایہ سے نہیں کہے گا جب تک وہ بڑا نہیں ہو جاتا' زندگی میں کچھ بن نہیں جاتا.... اور ایرک اب اچانک اپنے آپ کو ایک مخمصے میں پا رہا تھا.... وہ اب جا رہی تھی.... شاید ہمیشہ کے لیے.... اور پتا نہیں وہ لوگ دوبارہ کبھی مل بھی پاتے یا نہیں تو کیا اسے اس سے کہنا چاہیے تھا وہ سب جو وہ عنایہ کے لیے دل میں محسوس کرتا تھا.... یا ایسے ہی خاموش رہنا چاہیے تھا۔

اس دن پہلی بار عنایہ کے حوالے سے ایرک بری طرح پریشان ہوا.... اسے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ جا رہی ہے' اسے لگ رہا تھا وہ اسے کھونے والا ہے.... اور اس مسئلے کا کوئی حل فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور جو حل وہاں بیٹھے بیٹھے ایرک کی بالآخر سمجھ میں آیا تھا.... وہ کس قدر بے وقوفانہ تھا۔ اس کا اسے اندازہ بھی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

''میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ اس دو صفحوں پر مشتمل خط کی ہیڈ لائن تھی جو سالار کو ایرک کی طرف سے ملا تھا اور سالار نے بے حد سنجیدگی سے اس خط کو پڑھا تھا۔ وہ متحیر تھا اس لیے نہیں کہ وہ ایرک کی طرف سے ایسے کسی خط کی توقع نہیں کر رہا تھا بلکہ اس لیے کیوں کہ اس نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ عنایہ اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ کوئی اس کے حوالے سے اس سے ایسی بات بھی کر سکتا ہے' وہ اس معاملے میں روایتی باپ ہی تھا جسے ابھی بھی اپنی بیٹی' بہت چھوٹی لگ رہی تھی۔

امامہ اسے چائے دینے بیڈ روم میں آئی تھی جب اس نے ڈاک چیک کرتے سالار کو ایک کاغذ ہاتھ میں لیے سوچوں میں گم دیکھا۔ وہ چائے کا کپ رکھ کر جانے لگی تھی جب سالار نے اسے روک لیا اور وہ خط اسے تھما دیا۔

امامہ نے کچھ الجھے انداز میں اس خط کو پکڑا تھا' لیکن پہلی سطر پر نظر ڈالتے ہی اس کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا.... دوسری سطر پر نظر ڈالے بغیر بھی وہ جانتی تھی وہ کون ہو سکتا ہے' غصے کی ایک لہر اس کے اندر اتر آئی تھی اور سرخ چہرے کے ساتھ اس نے سالار سے کہا ''ایرک؟''

سالار نے سر ہلاتے ہوئے چائے کا گھونٹ لیا اور اس سے کہا۔ ''سارا لیٹر پڑھو۔''

امامہ نے خط پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا ''اسے پڑھے بغیر بھی میں جانتی ہوں اس نے کیا لکھا ہو گا۔'' وہ پھر بھی خط پڑھ رہی تھی۔

سالار چونکا تھا۔ ''تم سے بات کی ہے اس نے پہلے؟''

''نہیں' میں پھر بھی جانتی ہوں۔'' امامہ نے خط ختم کرتے ہوئے اسے تہ کر کے سالار کی طرف بڑھایا۔ وہ بہت خفا لگ رہی تھی۔

خط میں ایرک نے حتی المقدور بے حد مناسب انداز میں سالار سکندر سے عنایہ کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا.... وہ اس سے کس قدر محبت کرتا تھا اور کیوں اس کے لیے عنایہ کا ساتھ ضروری تھا۔ پھر اس نے سالار کو بتایا تھا کہ وہ اس کے لیے کیا کیا کر سکتا تھا اور عنایہ کو وہ کتنا خوش رکھے گا۔

وہ خط اس کی اپنی بیٹی کے حوالے سے نہ لکھا گیا ہوتا تو سالار اس خط کو پڑھ کر محظوظ ہوتا' ہنستا اور شاید ایرک

سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتا لیکن وہ اس کی اپنی بیٹی کے حوالے سے تھا۔۔۔ بچکانہ ہوتے ہوئے بھی یہ مسئلہ بچکانہ نہیں رہا تھا۔

''عنایہ پسند کرتی ہے ایرک کو؟'' جو پہلا خیال سالار کے ذہن میں آیا تھا وہ اب یہ آیا تھا۔

''تم کیسی باتیں کرتے ہو سالار۔۔۔ عنایہ بے چاری کو پتا تک نہیں ہے کہ یہ کیا خیالی پلاؤ پکا رہا ہے۔۔۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھ سے کہتی۔۔۔ ایرک ایک فیملی فرینڈ ہے' بوائے فرینڈ نہیں ہے۔'' امامہ نے بے حد ناگواری سے اس کے سوال کو بالکل رد کرتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ ضروری نہیں ہے امامہ! کہ ہمیں اپنی اولاد کے دل کی ہر بات پتا ہو۔''

امامہ نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا ''مجھے ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔

''میں دن رات ان کے ساتھ رہتی ہوں سالار۔۔۔ تم نہیں رہتے۔۔۔ تم باپ ہو اولاد کو اور طرح جانتے ہو' میں ماں ہوں ان کو اور طرح دیکھتی ہوں۔'' اس نے سالار کے ہنسنے پر جیسے وضاحت کی تھی۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو' اس کے باوجود یہ ضروری نہیں ہے کہ چوبیس گھنٹے بھی اگر اولاد کو نظروں کے سامنے رکھا جائے تو ان کے دلوں کو بھی جانا جاسکے۔ میں خوش فہمیاں اور غلط فہمیاں دونوں ہی نہیں پالتا' امامہ۔۔۔ باپ ہوں اس لیے حقیقت پسند ہو کر سوچ رہا ہوں۔۔۔ ماں کی طرح جذباتی ہو کر نہیں۔''

امامہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں کئی سالوں سے اکٹھے تھے اسے یہ خوش گمانی نہیں ہونی چاہیے تھی کہ عنایہ کو ایرک کی پسندیدگی کے بارے میں بالکل ہی اندازہ نہیں ہو گا۔ اس کا دل چاہا نہ تھا نہ ہو۔۔۔ لیکن سالار دماغ کی بات کہہ رہا تھا۔

''میں عنایہ سے پوچھ لوں گی۔'' اس نے یک دم کہا۔

''کیا؟'' سالار چائے پیتے پیتے رکا۔

''ایرک کے حوالے سے۔۔۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیسے اس سے۔۔۔'' وہ عجیب طرح سے الجھ کر رکی ''وہ ابھی بچی ہے۔''

سالار اس کی بات پر ہنسا۔ ''ہاں' یہ خط پڑھتے ہوئے میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ کوئی میری بیٹی کے بارے میں اس طرح سوچ بھی کیسے سکتا ہے۔۔۔ وہ ابھی بچی ہے۔۔۔ لیکن یہ زندگی ہے اور ہم امریکا میں رہ رہے ہیں' جہاں آٹھ نو سال کے بچے بچیاں بھی بوائے فرینڈز اور گرل فرینڈز کے کانسپٹ سے واقف ہیں۔ اس لیے ہمیں بھی کچھ زیادہ حقیقت پسندی سے اس صورت حال کو دیکھنا پڑے گا۔۔۔ تم ابھی عنایہ سے بات مت کرو۔۔۔ مجھے ایرک سے بات کرنے دو۔'' سالار نے جیسے اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک حل نکالا۔

''اور اس سے مل کر تم کیا کرو گے؟'' امامہ کو جیسے یہ حل پسند نہیں آیا تھا۔

''اسی حوالے سے گفتگو کروں گا۔۔۔ اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ یہ سب بچکانہ ہے اور کیوں ممکن نہیں ہے۔'' سالار نے جواباً کہا۔

''دو تین سال پہلے بھی ایرک نے ایسی ہی بات کی تھی عنایہ کے بارے میں۔۔۔ تب بھی میں نے اسے سمجھایا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا' وہ مسلمان نہیں ہے اور بے حد چھوٹا ہے لیکن میں زیادہ سختی سے منع اس لیے نہیں کر سکتی تھی اسے کیوں کہ اس وقت وہ اپنے باپ کی موت کی وجہ سے بہت اپ سیٹ تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی وہ اور اپ سیٹ ہو۔'' امامہ نے سالار کو پہلی بار ایرک کے ساتھ ہونے والی وہ گفتگو بتائی تھی۔

سالار اس کی بات پر حیران ہوا ''تم نے کیا کہا تھا تب اس سے؟''

''میں نے اس سے کہا کہ وہ ابھی صرف اپنی تعلیم پر توجہ دے اور مجھ سے وعدہ کرے کہ وہ عنایہ سے اس بارے

میں بات نہیں کرے گا' جب تک وہ اپنی تعلیم مکمل نہیں کرلیتا۔" امامہ نے اسے بتایا۔
"اور وہ مان گیا؟" سالار نے جواباً" اس سے پوچھا۔ امامہ نے سرہلا دیا۔
"اس نے عنایہ سے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی ورنہ وہ مجھے ضرور بتاتی۔" امامہ نے کہا۔
"اسی لیے اس نے خط میں ریفرنس دیا ہوا ہے کہ وعدے کے مطابق میں عنایہ کے بجائے آپ سے اپنی خواہش کا اظہار کررہا ہوں.... اور میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کس وعدے کا ریفرنس دے رہا ہے۔" سالار پہلی بار متاثر نظر آیا تھا۔ امامہ کے چہرے پر اب بھی سنجیدگی تھی۔
"میرا خیال ہے اب مجھے اس سے ضرور ملنا چاہیے' یہ ساری صورت حال بے حد دلچسپ ہے۔" سالار نے کہا اور امامہ نے برا منایا۔
"کیا دلچسپی ہے اس صورت حال میں؟ تمہیں زندگی میں ہمیشہ عجیب و غریب لوگ اور انوکھے حالات ہی اچھے لگے ہیں۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔
"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم.... تم سے میری شادی اس کا ثبوت ہے.... اور دیکھو یہ کتنی اچھی رہی ہے ہم دونوں کے لیے۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا.... وہ جس مزاج جو اس کی شخصیت کا حصہ تھی۔ زندگی کے اتنے سال ساتھ گزانے کے باوجود آج بھی اسے لاجواب کردینے کی صلاحیت رکھتا تھا اور وقتاً" فوقتاً" اس کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔
"تم ایرک سے مل کر کیا کرنا چاہتے ہو؟" امامہ نے اس کے تبصرے کو مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔
"بات چیت کرنا چاہتا ہوں' اس کی سچائی دیکھنا چاہتا ہوں اس پرپوزل کے حوالے سے۔"
وہ ہول کر رہ گئی تھی۔ "کیا مطلب ہے تمہارا سالار؟ تم ایک تیرہ سال کے بچے کے پرپوزل کی بات کررہے ہو.... ایک غیر مسلم کی.... اور تم اپنی بیٹی کے لیے اسے کنسیڈر کرنے کی بات کررہے ہو؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟ یہ مذاق نہیں ہے....." امامہ نے بے حد خفا ہو کر اس سے کہا تھا۔
"ہاں میں جانتا ہوں' یہ مذاق نہیں ہے۔ وہ تیرہ سال کا بچہ ہے' یہ میں بھی جانتا ہوں.... غیر مسلم ہے' یہ بھی میں جانتا ہوں.... لیکن وہ تیرہ سال کا بچہ اگر دس گیارہ سال کی عمر میں بھی یہ پرپوزل دیتا ہے اور اپنی وعدے کی پاسداری کررہا ہے تو پھر اسے غیر سنجیدگی سے نہیں لے سکتا۔" سالار اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔ امامہ بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔
"تم عنایہ کے لیے اسے کنسیڈر نہیں کرسکتے.... ڈونٹ ٹیل می کہ تم ایسا کررہے ہو؟"
"میں صرف اس ایک آپشن کو دیکھ رہا ہوں جو زندگی میں پہلی بار میری بیٹی کے حوالے سے آیا ہے۔" سالار نے جواباً" کہا تھا۔
"سالار میں کسی غیر مسلم کا آپشن اپنی بیٹی کے لیے کنسیڈر نہیں کروں گی۔" امامہ نے دو ٹوک انداز میں اس سے کہا۔ "مذاق میں بھی نہیں۔" سالار نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
"کسی غیر مسلم کا آپشن میں بھی کنسیڈر نہیں کروں گا لیکن کسی ایسے غیر مسلم ایسا ضرور کروں گا جو مسلمان ہونے کی خواہش اور ارادہ رکھتا ہو۔" اس نے بھی اسی انداز میں کہا۔
"میں اس آپشن کو بھی کنسیڈر نہیں کروں گی.... میں نہ آئیڈیلسٹ ہوں نہ ہی فینٹسی پر یقین رکھتی ہوں۔ میں اپنی بیٹی کو کسی مشکل صورت حال میں نہیں ڈالوں گی' ایسے کسی ممکنہ رشتے کے ذریعہ۔" امامہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔
"ہم رسک دوسروں کے لیے لے سکتے ہیں' دوسروں کو نصیحتیں بھی کرسکتے ہیں اور دوسروں کو ایسے بڑے

کاموں پر اکسا بھی سکتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کر سکتے ہیں لیکن یہ سب چیزیں اپنے بچوں کے لیے ہم نہیں چاہ سکتے۔" وہ کہتی گئی۔

"میں نے تم سے شادی کر کے ایک رسک لیا تھا امامہ..... مجھے بھی بہت روکا گیا تھا..... بہت سارے وہم میرے دل میں بھی ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی..... دنیا میں لوگ ایسے رسک لیتے ہیں' لینے پڑتے ہیں....." سالار نے جواباً "اس سے جو کہا' اس نے امامہ کی زبان سے سارے لفظ چھین کر اسے جیسے گونگا کر دیا تھا..... وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن اسے اریک کے ساتھ اپنا موازنہ اور اس انداز میں اچھا نہیں لگا تھا۔

"اریک اور مجھ میں بہت فرق ہے..... مذہب میں فرق ہوگا لیکن کلچر میں نہیں..... ہم ہمسائے تھے' ایک جیسے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے..... بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔"

وہ اپنے دفاع میں پر جوش دلائل دیتے دیتے ایک دم اپنا جوش کھوتی چلی گئی' اسے یک دم احساس ہوا تھا کہ اپنی دفاع میں دیا جانے والا اس کا ہر جواز اس کے اور اریک کے درمیان موجود مماثلت کو مزید ثابت کر رہا تھا۔

"میں اریک کے آپشن پر غور نہیں کر رہا..... عبداللہ کے آپشن پر کر رہا ہوں..... تیرہ سال کی عمر میں اپنی بیٹی کی کسی سے شادی نہیں کروں گا لیکن اگر تیرہ سال کی عمر میں بھی میری بیٹی کی وجہ سے کوئی میرے دین کی طرف راغب ہو رہا ہے تو میں صرف اس لیے اسے رد نہیں کروں گا کہ یہ میری غیرت اور معاشرتی روایات پر ضرب کے برابر ہے..... مجھے معاشرے کو نہیں' اللہ کو منہ دکھانا ہے۔"

سالار نے جیسے ختم کرنے والے انداز میں بات کی تھی۔ امامہ قائل ہوئی یا نہیں' لیکن خاموش ہو گئی تھی۔ اس کی بات غلط نہیں تھی لیکن سالار کی بھی درست تھی' وہ دونوں اپنے تناظر میں..... سوچ رہے تھے اور دوسرے کے نظریے کو بھی سمجھ رہے تھے۔

وہ پہلا موقع تھا جب امامہ نے شکر ادا کیا تھا کہ وہ پاکستان جا رہے ہیں۔ عنایہ اور اریک ایک دوسرے سے دور ہو جاتے تو اس کے خیال میں اریک کے سر سے عنایہ کا بھوت بھی اتر جاتا۔ سالار کے برعکس وہ اب بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ اریک کی اسلام اور عنایہ میں دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اسے یقین تھا تیرہ سال کا وہ بچہ' چوبیس پچیس سال کا ہوتے ہوئے زندگی کے بہت سارے نشیب و فراز سے گزرتا اور زندگی کی رنگینیوں سے بھی متعارف ہوتا پھر سالار سکندر کا خاندان اور اس خاندان کی ایک لڑکی عنایہ سکندر' اریک عبداللہ کو کہاں یاد رہتی اور اتنی یاد کہ وہ اس کے لیے اپنا مذہب چھوڑ کر اس کے پیچھے آتا.....؟ امامہ اس بات پر بھی اللہ تعالیٰ کی شکر گزار تھی کہ وہ سب کچھ یک طرفہ تھا اگر عنایہ اس کا حصہ ہوتی تو اس کی پریشانی اس سے سوا ہوتی۔

☆ ☆ ☆

"ممی! اریک ہمارے ساتھ پاکستان جانا چاہتا ہے۔"

کچن میں کام کرتی امامہ ٹھٹک گئی۔ عنایہ اس کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹا رہی تھی' جب اس کے ساتھ کام کرتے کرتے اس نے اچانک امامہ سے کہا۔ امامہ نے گردن موڑ کر اس کا چہرہ بغور دیکھا تھا۔ عنایہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی' وہ ڈش واشر میں برتن رکھ رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے' اریک نے تمہارے پاپا کو خط لکھا ہے۔" امامہ نے کریدنے والے انداز میں یک دم عنایہ سے کہا۔ وہ کچھ گلاس رکھتے ہوئے چونکی اور ماں کو دیکھنے لگی' پھر اس نے کہا۔

"اس نے پاپا سے بھی یہی بات کی ہوگی..... وہ بہت اپ سیٹ ہے۔ چند دنوں سے..... ہر روز مجھ سے ریکویسٹ کر رہا ہے کہ یا تو اس کو بھی ساتھ لے جاؤں یا پھر خود بھی نہیں رہ جاؤں۔" اس کی بیٹی نے بے حد سادگی سے اس

سے کہا تھا۔ وہ اب دوبارہ برتن رکھنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

امامہ اپنے جس خدشے کی تصدیق کرنا چاہ رہی تھی' اس کی تصدیق نہ ہونے پر اس نے جیسے شکر کیا تھا... وہ خط کے مندرجات سے واقف نہیں تھی۔

"مجھے ایرک پر ترس آتا ہے۔" عنایہ نے ڈش واشر بند کرتے ہوئے اس سے کہا۔ امامہ نے کچن کیبنٹ بند کرتے ہوئے ایک بار پھر اسے دیکھا' عنایہ کے چہرے پر ہمدردی تھی اور ہمدردی کے علاوہ اور کوئی تاثر نہیں تھا اور اس وقت امامہ کو اس ہمدردی سے بھی ڈر لگا تھا۔

"کیوں ترس آتا ہے؟" امامہ نے کہا۔

"کیوں کہ وہ بہت اکیلا ہے۔" عنایہ نے جواباً" کہا۔

"خیر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کی فیملی ہے... ممی' بہن بھائی' دوست... پھر اکیلا کہاں ہے۔"

"لیکن ممی وہ ان سب سے اس طرح کلوز تو نہیں ہے' جس طرح ہم سے ہے۔" عنایہ نے اس کا دفاع کیا۔

"تو یہ اس کا قصور ہے' وہ گھر میں سب سے بڑا ہے' اسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کا خود خیال رکھنا چاہیے۔" امامہ نے جیسے ایرک کو قصوروار ٹھہرانے کی کوشش کی۔

"اگر جبریل اپنی فیملی کے بجائے کسی دوسرے کی فیملی کے ساتھ اس طرح اٹیچ ہو کر یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ اکیلا ہے تو تمہیں کیسا لگے گا؟" امامہ نے جیسے اسے ایک بے حد مشکل سوال حل کرنے کے لیے دے دیا تھا۔

عنایہ کچھ دیر کے لیے واقعی ہی بول نہیں پائی' پھر اس نے بے حد مدھم آواز میں کہا۔

"ممی! ہر ایک جبریل کی طرح خوش قسمت نہیں ہوتا۔" امامہ کو اس کا جملہ عجیب طرح سے چبھا۔ اس کی بیٹی نے شاید زندگی میں پہلی بار کسی دوسرے شخص کے بارے میں اپنی ماں کی رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے جیسے اس کا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش نے امامہ کو پریشان کیا تھا۔

"ایرک چھوٹا بچہ نہیں ہے عنایہ!" امامہ نے کچھ تیز آواز میں اس سے کہا۔ "وہ تیرہ سال کا ہے..." اس نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

عنایہ نے حیران ہو کر ماں کا چہرہ دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس جملے کا مطلب کیا ہے۔ واحد چیز جو عنایہ اخذ کر پائی تھی وہ یہ تھی کہ اس کی ماں کو اس وقت ایرک کا تذکرہ اور اس کی زبان سے ___ اچھا نہیں لگا تھا لیکن یہ بھی حیران کن بات تھی کیوں کہ ایرک کا ذکر ان کے گھر میں اکثر ہوتا تھا۔

"ممی کیا میں ایرک کا خط پڑھ سکتی ہوں؟" غیر متوقع طور پر عنایہ نے فرمائش کی تھی' جبکہ امامہ سمجھ رہی تھی وہ اب گفتگو کا موضوع بدل دے گی۔

"نہیں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔" امامہ نے حتمی انداز میں کہا' وہ اب اس موضوع کو شروع کرنے پر پچھتا رہی تھی۔

"حمین نے پڑھا ہو گا وہ خط۔ ایرک اسے ایک خط پڑھا رہا تھا... میرا خیال ہے یہ وہی خط ہو گا۔"

عنایہ نے کچن سے نکلتے ہوئے اس کے اوپر جیسے بجلی گرائی تھی...

"حمین نے؟" امامہ کو یقین نہیں آیا۔

"ہاں... میں نے ایرک اور اسے ساتھ بیٹھے' کوئی کاغذ پڑھتے دیکھا تھا... میرا خیال ہے یہ خط ہی ہو گا کیوں کہ ایرک ہر کام اس سے پوچھ کر کر رہا ہے آج کل... بٹ آئی ایم ناٹ شیور۔" عنایہ نے اپنے ہی اندازے کے بارے میں خود ہی بے یقینی کا اظہار کیا۔

"ہر شیطانی کام کے پیچھے حمین ہی کیوں نکلتا ہے آخر؟" امامہ نے دانت پیستے ہوئے سوچا تھا' وہ اس وقت یہ

بھی بھول گئی تھی کہ اسے کچن میں کیا کام کرنا تھا۔۔۔۔ اسے اب یقین تھا کہ ایرک کو اس خط کا مشورہ دینے والا حمین ہی ہو سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور امامہ کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ خط ایرک نے لکھا تھا اور حمین نے اسے ایڈٹ کیا تھا۔ اس نے اس خط کے ڈرافٹ میں کچھ جذباتی جملوں کا اضافہ کیا تھا اور کچھ حد سے زیادہ جذباتی جملوں کو حذف کیا تھا۔
ایرک اس کے پاس ایک خط کا ڈرافٹ لایا تھا۔۔۔ یہ بتائے بغیر کہ وہ خط وہ سالار سکندر کے نام لکھنا چاہتا تھا' اس نے حمین سے مدد کی درخواست کی تھی کہ وہ ایک مسلم گرل فرینڈ کو پرپوز کرنا چاہتا تھا اور اس کے باپ کو خط لکھنا چاہتا تھا۔ حمین نے جواباً "اسے مبارک باد دی تھی۔ ایرک نے اس سے کہا تھا کہ کیوں کہ وہ مسلم کلچر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا' اس لیے اسے اس کی مدد درکار تھی' اور حمین نے وہ مدد فراہم کی تھی۔
محمد حمین سکندر نے مسلمانوں کی نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے خط کو دوبارہ لکھا تھا اور ایرک نے نہ صرف اس کا شکریہ ادا کیا تھا بلکہ جب سالار سکندر نے اسے ملاقات کی دعوت دی تو اس نے حمین کو اس بارے میں بھی مطلع کیا تھا۔ حمین کی ایکسائٹمنٹ کی کوئی حد نہیں تھی۔۔۔۔ اسکا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ ایرک کا یہ راز سب سے کہہ دے لیکن اس نے ایرک سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس راز کو کسی سے نہیں کہے گا۔ عنایہ نے ایک آدھ دن اس گٹھ جوڑ کے بارے میں اسے کریدنے کی کوشش کی تو بھی اس نے صرف یہ کہا تھا کہ وہ ایک ضروری خط لکھنے میں ایرک کی مدد کر رہا تھا' لیکن خط کس کے نام تھا اور اس میں کیا لکھا جا رہا تھا' عنایہ کے کریدنے پر بھی حمین نے یہ راز نہیں اگلا تھا۔
"مجھے پتا ہے ایرک نے وہ خط کس کے لیے لکھوایا تھا۔" عنایہ' امامہ کے پاس سے ہو کر سیدھا حمین کے پاس پہنچی تھی۔
وہ اس وقت اپنے کمرے میں کمپیوٹر پر کوئی گیم کھیلنے میں مصروف تھا اور عنایہ کے اس تبصرے پر اس نے بے اختیار دانت پیستے ہوئے کہا۔
"مجھے پہلے ہی پتا تھا وہ کوئی راز نہیں رکھ سکتا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ کسی کو نہ بتاؤں خاص طور پر تمہیں۔۔۔۔ اور اب تمہیں بتا دیا اس نے۔" حمین خفا تھا' اس کا اندازہ یہی تھا کہ یہ راز ایرک نے خود ہی فاش کیا ہو گا۔
"ایرک نے مجھے نہیں بتایا۔۔۔۔ مجھے تو ممی نے بتایا ہے۔" اس بار حمین گیم کھیلنا بھول گیا تھا۔ اس کے ہیرو نے اس کے سامنے اونچی چٹان سے چھلانگ لگائی اور وہ اسے سمندر میں گرنے سے نہیں بچا پایا۔۔۔۔ کچھ ویسا ہی حال اس نے اپنا بھی اس وقت محسوس کیا تھا۔۔۔۔ ایک دن پہلے ہی اس کے اور ممی کے تعلقات میں پاکستان جانے کے فیصلے نے پھر سے گرم جوشی پیدا کی تھی اور اب یہ انکشاف۔
"ممی نے کیا بتایا ہے؟" حمین کے منہ سے ایسے آواز نکلی جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھا ہو۔
"ممی نے بتایا کہ ایرک نے پاپا کو کوئی خط لکھا ہے اور مجھے فوراً" خیال آیا کہ جو خط تم پڑھ رہے تھے' وہ وہی ہو سکتا ہے۔"
عنایہ روانی میں بتا رہی تھی اور حمین کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔۔۔۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہونا کی مثال اس وقت اس پر صادق آ رہی تھی۔ ایسی کون سی مسلم گرل فرینڈ بن گئی یک دم ایرک کی جس کے باپ کو خط لکھوانے کے لیے اس کی ضرورت پڑی جبکہ چوبیس گھنٹے وہ اگر کسی کے گھر بھی آتا تھا تو وہ خود ان ہی کا گھر تھا پھر اس کی عقل میں یہ بات کیوں نہیں آئی یا جوش میں اتنا ہی اندھا ہو گیا تھا کہ اس نے یہ سوچ لیا کہ ایرک بھی عنایہ کے حوالے

سے ایسا کچھ نہیں سوچ سکتا..... حمین اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا..... اور ملامت بڑا چھوٹا لفظ تھا ان الفاظ کے لیے جو وہ اس وقت اپنے اور ایرک کے لیے استعمال کر رہا تھا۔

''تم بول کیوں نہیں رہے؟'' عنایہ کو اس کی خاموشی کھٹکی تھی۔

''میں نے سوچا ہے، میں اب کم بولوں اور زیادہ سوچوں۔ حمین نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے اس وقت وہ خبر پہنچائی جس پر اسے یقین نہیں آیا۔

''خواب دیکھتے رہو۔'' اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو چڑانے والے انداز میں کہا۔

''ممی نے تمہیں بتایا اس خط میں کیا ہے؟'' حمین اس وقت گلے گلے تک اس دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔

''نہیں، لیکن میں نے انہیں بتایا کہ یہ خط حمین کی مدد سے لکھا گیا ہوگا' میں اس سے پوچھ لوں گی..... اس خط میں کیا لکھا تھا ایرک نے پاپا کو؟''

عنایہ اب اس سے پوچھ رہی تھی۔ حمین بے اختیار کراہا تھا..... وہ مصیبت کو دعوت نہیں دیتا تھا..... مصیبت خود آکر اس کے گلے کا ہار بن جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایرک کو سالار نے خود دروازے پر ریسیو کیا تھا وہ ویک اینڈ تھا اور اس وقت ان کے بچے سائیکلنگ کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ گھر پر صرف امامہ اور سالار تھے۔

''یہ آپ کے لیے!'' ایرک نے اپنے ایک ہاتھ میں پکڑے چند پھول جو گلدستے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے اس کی طرف بڑھا دیے۔

سالار نے ایک نظر ان پھولوں پر ڈالی' اسے یقین تھا اس میں سے کچھ پھول۔ اسی کے لان سے لیے گئے تھے لیکن اس نے اسے نظر انداز کیا تھا۔

''اس کی ضرورت نہیں تھی۔'' اس نے اسے اندر لاتے ہوئے شکریہ کے بعد کہا۔ ایرک فارمل میٹنگ کے لیے آیا تھا اور آج پہلی بار سالار نے اسے فارمل انداز میں دیکھا تھا۔

''بیٹھو!'' سالار نے اسے وہیں لاؤنج میں ہی بیٹھنے کے لیے کہا۔ ایرک بیٹھ گیا۔ سالار اس کے بالمقابل بیٹھا اور اس کے بعد اس نے ٹیبل پر پڑا ایک لفافہ کھولا۔ ایرک نے پہلی بار غور کیا' وہ اسی کا خط تھا اور سالار اب اس خط کو دوبارہ کھول کے دیکھ رہا تھا۔ ایرک بے اختیار نروس ہوا تھا۔ خط لکھ بھیجنا اور بات تھی اور اسی خط کو' اس بندے کے ہاتھ میں دیکھنا جس کے نام وہ لکھا گیا تھا' دوسری۔

سالار نے ایک ڈیڑھ منٹ لیا پھر اس خط کو ختم کرتے ہوئے ایرک کو دیکھا۔ ایرک نے نظریں ہٹالیں۔

''کیا عنایہ کو پتا ہے تمہاری اس خواہش کے بارے میں؟'' سالار نے بے حد براہ راست سوال کیا تھا۔

''میں نے مسز سالار سے وعدہ کیا تھا کہ میں عنایہ سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کروں گا' اس لیے میں نے آپ کو خط لکھا۔'' ایرک نے جواباً کہا' سالار نے سر ہلایا اور پھر کہا۔

''اور یہ واحد وجہ ہے جس کی وجہ سے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ تمہارا خط پھاڑ کر نہیں پھینکا..... تم وعدہ کر کے نبھا سکتے ہو' یہ بہت اچھی کوالٹی ہے۔''

سالار سنجیدہ تھا اور اس نے بے دھڑک انداز میں ایرک کی تعریف کی تھی' لیکن اس کے لہجے اور چہرے کی سنجیدگی نے ایرک کو خائف کیا تھا۔

''تو تم عنایہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' سالار نے اس خط کو اب واپس میز پر رکھ دیا تھا اور اس کی نظریں ایرک پر

جمی ہوئی تھیں۔ ایرک نے سر ہلایا۔
"تم نے یہ بھی لکھا ہے کہ تم مذہب بدلنے پر تیار ہو کیوں کہ تم جانتے ہو کہ کسی غیر مسلم لڑکے سے کسی مسلم لڑکی کی شادی نہیں ہو سکتی۔" سالار نے مزید کہا۔ ایرک نے پھر سر ہلایا۔
"پہلی بات یہ ہے ایرک کہ صرف شادی کی نیت۔ سے مذہب بدل لینا بہت چھوٹی بات ہے.... ہمارا دین اس کی اجازت دیتا ہے' اسے بہت پسند نہیں کرتا۔" سالار نے کہا۔
"تمہارے پاس مسلمان ہونے کے لیے میری بیٹی سے شادی کے علاوہ کوئی اور وجہ ہے؟" سالار نے اسی انداز میں اس سے اگلا سوال کیا تھا۔ ایرک خاموش بیٹھا اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔
"مذہب کی تبدیلی ایک بہت بڑا فیصلہ ہے اور یہ نفس کی کسی خواہش کی وجہ سے نہیں ہونا چاہیے' عقل کا فیصلہ ہونا چاہیے.... کیا تمہاری عقل تم سے یہ کہتی ہے کہ تمہیں مسلمان بن کر اپنی زندگی اللہ کے احکامات کے مطابق گزارنی چاہیے؟" اس نے ایرک سے پوچھا' وہ گڑبڑا گیا۔
"میں نے اس پر سوچا نہیں۔"
"میرا بھی یہی اندازہ ہے کہ تم نے اس پر سوچا نہیں.... اس لیے بہتر ہے' پہلے تم اس پر اچھی طرح سوچو۔" سالار نے جواباً" اس سے کہا۔
"میں کل پھر آؤں؟" ایرک نے اس سے کہا۔
"نہیں' تم ابھی کچھ سال اس پر سوچو.... کہ تمہیں مسلمان کیوں بننا ہے' اور اس کی وجہ عنایہ نہیں ہونی چاہیے۔" سالار نے اس سے کہا۔
"میں ویسے بھی عنایہ کی شادی "صرف مسلمان" سے نہیں کروں گا۔ مسلمان ہونے کے ساتھ اسے ایک اچھا انسان بھی ہونا چاہیے۔" اس نے کہا۔
ایرک کے چہرے پر یک دم مایوسی ابھری۔
"یعنی آپ میرا پروپوزل قبول نہیں کر رہے؟" اس نے سالار سے کہا۔
"فوری طور پر نہیں' لیکن تقریباً" دس سال بعد جب مجھے عنایہ کی شادی کے حوالے سے کوئی فیصلہ کرنا ہو گا تو میں تمہیں ضرور کنسیڈر کروں گا.... لیکن اس کے لیے ضروری ہے ان دس سالوں میں تم ایک اچھے مسلمان کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بن کر بھی رہو۔" سالار نے دو ٹوک انداز میں کہا۔
"کیا آپ میری اس سلسلے میں رہنمائی کر سکتے ہیں؟" ایرک نے یک دم کہا۔ سالار چند لمحے خاموش رہا' وہ اسی ایک چیز سے بچنا چاہتا تھا' اسی ایک چیز کو نظر انداز کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب ایرک نے اس سے بالکل صفائی سے مدد مانگ لی تھی۔
"ہاں ہم سب تمہاری مدد کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے رشتہ جوڑنا ضروری نہیں ہے ایرک! ہم انسانیت کے رشتے کی بنیاد پر بھی تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔" سالار نے بالآخر جواباً" کہا۔
"تیرہ سال کی عمر میں اسکول میں پڑھتے ہوئے تم شادی کرنا چاہتے ہو اور تمہیں یہ اندازہ نہیں ہے کہ شادی ذمہ داریوں کا دوسرا نام ہے۔ تم اپنی فیملی کی ذمہ داریوں سے بھاگتے ہوئے ایک اور فیملی بنانے کی کوشش کر رہے ہو.... تم اس فیملی کی ذمہ داری کیسے اٹھاؤ گے؟ مذہب بدل کر ایک دوسرے مذہب میں داخل ہونا اس سے بھی بڑا کام ہے۔ کیا تمہارے پاس اتنا وقت اور تحمل ہے کہ تم اپنے اس نئے مذہب کو سمجھو' پڑھو اور اس پر عمل کرو؟ کیا تم ان پابندیوں سے واقف ہو جو یہ نیا مذہب تم پر لگائے گا؟" سالار اب اس پر جرح کر رہا تھا۔
"میں قرآن پاک کو ترجمے سے پڑھ چکا ہوں' میں پہلے ہی سب چیزیں جانتا ہوں اور میں عمل کر سکتا ہوں۔"

ایرک بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر ایسا کرتے ہیں دس سال کا ایک معاہدہ کرتے ہیں۔۔۔ اگر تیئس سال کی عمر میں تمہیں لگا کہ تمہیں عنایہ سے ہی شادی کرنی ہے تو پھر میں عنایہ سے تمہاری شادی کردوں گا۔۔۔ شرط یہ ہے کہ ان دس سالوں میں تم ایک اچھے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان کے طور پر بھی نظر آؤ۔" سالار نے ایک اور بالکل سادہ کاغذ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت لمبی مدت ہے۔" ایرک نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن یہ وہ مدت ہے جس میں۔۔۔ تمہارے فیصلے تمہاری سچائی کو ظاہر کریں گے تمہارے بچکانہ پن کو نہیں۔۔۔" سالار نے جواباً اس سے کہا۔ وہ سالار کو دیکھتا رہا۔ بے حد خاموشی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔۔۔ پھر اس نے کہا۔

"مسٹر سالار سکندر! آپ مجھ پر دراصل اعتبار نہیں کر رہے۔" اس نے بے حد صاف گوئی سے کہا۔ "اگر کر رہے ہوتے تو مجھ سے دس سال کے انتظار کا نہ کہتے لیکن ٹھیک ہے آپ اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔" اس نے کہا اور میز پر پڑا ایک قلم اٹھایا وہاں پڑے سادہ کاغذ کے بالکل نیچے اپنا نام لکھا اپنے دستخط کیے اور تاریخ ڈالی پھر قلم بند کرکے واپس میز پر اس کاغذ کے اوپر رکھ دیا۔

"میں عنایہ سے متاثر نہیں ہوا میں آپ اور آپ کے گھر سے متاثر ہوا۔۔۔ آپ کی بیوی کی نرم مزاجی اور آپ کی اصول پسندی سے۔۔۔ ان ویلیوز سے جو آپ نے اپنے بچوں کو دی ہیں۔۔۔ اور اس ماحول سے جہاں میں آکر ہمیشہ اپنا آپ بھول جاتا تھا۔۔۔ وہ مذہب یقیناً اچھا مذہب ہے جس کے پیروکار آپ لوگوں جیسے ہوں۔۔۔ میں عنایہ کے ساتھ ایک ایسا ہی گھر بنانا چاہتا تھا کیونکہ میں بھی اپنی اور اپنے بچوں کے لیے ایسی زندگی چاہتا ہوں۔۔۔ میں جانتا ہوں آپ لوگوں کے خاندان کا حصہ بننا اتنا آسان نہیں ہوگا۔۔۔ لیکن میں کوشش کرتا رہوں گا۔۔۔ کیونکہ کوشش تو آپ کا مذہب ہی کرنے کو کہتا ہے جواب میرا مذہب بھی ہوگا۔"

وہ کسی تیرہ سال کے بچے کے الفاظ نہیں تھے اور وہ اتنی جذباتیت سے بھرپور بھی نہیں تھے جیسا اس کا خط تھا لیکن اس کے باوجود اس کے ان جملوں نے صرف سالار کو نہیں امامہ کو بھی بری طرح متاثر کیا تھا۔ وہ چند لمحے پہلے لاؤنج میں داخل ہوئی تھی اور اس نے صرف ایرک کے جملے سنے تھے۔

ایرک اب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔۔۔ اس نے امامہ کو بھی دیکھا اور اسے ہمیشہ کی طرح سلام کیا پھر خدا حافظ کہہ کر وہاں سے نکل گیا۔ لاؤنج میں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیرونی دروازے کے بند ہونے کی آواز پر امامہ آگے بڑھ آئی اس نے لاؤنج کی سینٹرل ٹیبل پر پڑا وہ کاغذ اٹھا کر دیکھا جس پر ایرک دستخط کرکے گیا تھا اس کاغذ پر صرف ایک نام تھا۔۔۔ عبداللہ۔۔۔ اور اس کے نیچے دستخط اور تاریخ۔۔۔

امامہ نے سالار کو دیکھا اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ کاغذ امامہ کے ہاتھ سے لیا اسے تہہ کرکے اسی لفافے میں ڈالا جس میں ایرک کا خط تھا اور پھر اسے امامہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ دوبارہ آئے گا اور اگر میں نہ بھی ہوا اور یہ اپنے وعدے پر پورا اترا تو تم بھی اس وعدے پر پوری اترنا جو میں نے اس سے کیا ہے۔" امامہ نے کپکپاتی انگلیوں سے کچھ بھی کہے بغیر وہ لفافہ پکڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

عائشہ عابدین کو زندگی میں پہلی بار اگر کسی لڑکے سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا تھا تو وہ جبریل سکندر تھا۔ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی اس نے اپنی بڑی بہن نساء عابدین سے جبریل کے بارے میں اتنا کچھ سن رکھا تھا کہ وہ ایک

فہرست بنا سکتی تھی۔ نساء جبریل کی کلاس فیلو تھی اور اس سے "شدید" متاثر اور مرعوب... اس کے باوجود کہ وہ خود ایک شاندار تعلیمی کیریئر رکھنے والی طالبہ تھی۔

عائشہ فیس بک پر اپنی بہن کی وال پر اکثر جبریل کے کمنٹس پڑھتی تھی جو وہ اس کی بہن کے اسٹیٹس اپ ڈیٹس پر دیتا رہتا تھا... عائشہ بھی کئی بار ان اپ ڈیٹس پر تبصرہ کرنے والوں میں سے ہوتی تھی، لیکن جبریل سکندر کی حس مزاح کا مقابلہ وہاں کوئی بھی نہیں کرپاتا تھا، اس کے کمنٹس نساء عابدین کی وال پر بالکل الگ چمکتے نظر آتے تھے اور جب وہ کسی وجہ سے وہاں تبصرہ نہیں کرپاتا تو کئی بار اس کے کلاس فیلوز کے تبصروں کی لمبی قطار کے بیچ میں جبریل کی خاموشی اور غیر حاضری کو بری طرح محسوس کیا جاتا اور ان محسوس کرنے والوں میں سرفہرست عائشہ عابدین تھی جسے خود بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ جبریل کے کمنٹس پڑھتے پڑھتے اس کی عادی ہوگئی تھی۔

نساء کے ساتھ جبریل کی مختلف فنکشنز اور سرگرمیوں میں اکثر بہت ساری گروپ فوٹوز نظر آتی تھیں، لیکن عائشہ کو ہمیشہ جبریل کی فیملی کے بارے میں تجسس رہا تھا۔ وہ سالار سکندر سے واقف تھی۔ کیونکہ اس کا تعارف نساء نے ہی کروایا تھا، لیکن اس کی فیملی کے باقی افراد کو دیکھنے کا اسے بے حد اشتیاق تھا اور یہ ہی اشتیاق اسے بار بار جبریل کی فرینڈز لسٹ میں نہ ہونے کے باوجود اس کی تصویروں کو کھوجنے کے لیے مجبور کرتا تھا، جہاں اسے رسائی حاصل تھی... کچھ تصویریں وہ دیکھ سکتی تھی... کچھ وہ نہیں دیکھ سکتی تھی... لیکن ان تصویروں میں جن تک اسے رسائی حاصل تھی ان میں جبریل کی فیملی کی تصاویر نہیں تھیں۔

جبریل بھی غائبانہ طور پر عائشہ سے واقف تھا اور اس تعارف کی وجہ فیس بک پر نساء کے اسٹیٹس پر ہونے والے تبصروں میں ان کا حصہ لیتا تھا اور نساء نے اپنی وال پر جبریل کو اپنی بہن سے متعارف کروایا تھا۔ وہ غائبانہ تعارف بس اتنا ہی رہا تھا، کیونکہ جبریل نے کبھی اس کی آئی ڈی کھوجنے کی کوشش نہیں کی اور عائشہ کی اپنی وال پر تصویریں بہت کم تھیں، اس سے بھی زیادہ کم وہ لوگ تھے جنہیں اس نے اپنی کانٹیکٹ لسٹ میں ایڈ کیا ہوا تھا۔ نساء کے برعکس اس کا حلقہ احباب بے حد محدود تھا اور اس کی کوشش بھی یہ ہی رہتی تھی کہ وہ اسے اتنا ہی محدود رکھے۔

عائشہ کو جبریل کے بارے میں ہمیشہ یہ غلط فہمی رہی کہ وہ نساء میں انٹرسٹڈ ہے اور اس تاثر کی بنیادی وجہ خود نساء تھی جو اس بات کو تسلیم کرنے میں کبھی تامل نہیں کرتی تھی کہ عمر میں اس سے چھوٹا ہونے کے باوجود وہ جبریل کو پسند کرتی تھی... ایک دوست کے طور پر جبریل کی اس سے بے تکلفی اور دوستی تھی۔ ایسی ہی بے تکلفی جیسی اس کی اپنے دوسرے ہم جماعتوں سے بھی تھی۔ اور نساء نے کبھی اس بے تکلفی کو غلط معنوں میں نہیں لیا تھا۔ کیونکہ جبریل لڑکیوں کے ساتھ بے تکلفی اور دوستی میں بھی بہت ساری حدود وقیود رکھتا تھا اور بے حد محتاط تھا۔

نساء عمر میں اس سے چار سال بڑی تھی۔ وہ اپنے قد کاٹھ اور پختگی دونوں سے پندرہ سولہ سال کا نہیں لگتا تھا اور نساء یہ بھی جانتی تھی۔ یونی ورسٹی میں اتنا وقت گزار لینے کے باوجود جبریل ابھی تک گرل فرینڈ نامی کسی بھی چیز کے بغیر تھا، تو ایسے حالات میں سالار سکندر کی اس لائق اولاد پر قسمت آزمائی کرنے کے لیے کوئی بھی تیار ہوسکتا تھا... صرف نساء ہی نہیں۔

عائشہ عابدین ان سب چیزوں سے واقف تھی... نساء کی جبریل میں دلچسپی ان کے گھر میں ایک کھلا راز تھا، لیکن ان دونوں کے مستقبل کے حوالے سے نہ تو ان کو کوئی مغالطہ تھا نہ ہی کسی اور کو... نساء ذہانت اور قابلیت سے متاثر ہونے والوں میں سے تھی اور جبریل سکندر وہ پہلا شخص نہیں تھا جس نے اسے متاثر کیا تھا، مگر فی الحال یہ جبریل ہی تھا جس کا ذکر وہ کرتی رہتی تھی۔

عائشہ عابدین ایک غیر جانب دار مبصر کی طرح یہ سب کچھ دیکھتی آرہی تھی اور جب وہ جبریل سے ملی، وہ اس سے

پہلے ہی بہت متاثر تھی۔

یونی ورسٹی کے ایک فنکشن میں وہ پہلی بار جبریل سے بالآخر ملنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ نساء کو اندازہ نہیں تھا کہ عائشہ صرف جبریل سے ملنے کے لیے اس کے ساتھ یونی ورسٹی آنے پر تیار ہوئی ہے ورنہ وہ جب بھی امریکہ آتی ان سب کی کوششوں کے باوجود اپنی مرضی کی جگہوں کے علاوہ کہیں نہیں جاتی تھی۔۔۔ یونی ورسٹی میں ہونے والی کوئی تقریب تو وہ شاید وہ آخری چیز تھی، جس کے لیے عائشہ یونی ورسٹی آتی اور نساء نے یہ بات، جبریل سے اسے متعارف کراتے ہوئے کہہ بھی دی تھی۔

جبریل سکندر وہ پہلا لڑکا تھا جسے دیکھنے کا عائشہ عابدین کو اشتیاق ہوا تھا اور جبریل سکندر ہی وہ پہلا لڑکا تھا جسے عائشہ عابدین اپنے ذہن سے نکالنے میں اگلے کئی سال تک کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ تصویریں بھی کبھار کسی شخص کی شخصیت اور وجاہت کو کیمو بدل کردیتی ہیں۔۔۔ اور بہت اچھا کرتی ہیں۔ محمد جبریل سکندر سحر انگیز کرشماتی شخصیت کا مالک تھا۔ خطرناک حد تک متاثر اور مرعوب کردینے والی شخصیت، سولہ سال کی عمر میں بھی وہ تقریباً" چھ فٹ قد کے ساتھ سالار سکندر کی گہری سیاہ آنکھیں اور اپنی ماں کے تیکھے نین نقوش اور بے حد بھاری آواز کے ساتھ ایک عجیب ٹھہراؤ کا منبع دکھتا تھا۔ ایک بے حد معمولی ڈارک بلو جینز اور دھاری دار بلیک اینڈ وائٹ ٹی شرٹ میں ملبوس جبریل سکندر مسکراتا ہوا پہلی بار عائشہ عابدین سے مخاطب ہوا تھا اور وہ بری طرح نروس ہوئی تھی۔ وہ نروس ہونا نہیں چاہتی تھی، لیکن جبریل سے وہاں کھڑے صرف مخاطب ہونا بھی اسے اس کے قدموں پر کھڑے رہنا دشوار کررہا تھا۔ وہ صرف نساء ہی نہیں کسی بھی عمر کی کسی بھی لڑکی کو پاگل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ عائشہ عابدین نے دل ہی دل میں اعتراف کیا تھا۔

"کیوں؟ آپ کو اچھا نہیں لگتا امریکہ آکر گھومنا پھرنا؟" اس نے نساء کے کسی تبصرے پر عائشہ سے پوچھا تھا۔

"نہیں، مجھے اچھا لگتا ہے، لیکن بہت زیادہ نہیں۔" وہ گڑبڑائی۔ اس نے خود کو سنبھالا، پھر جبریل کے سوال کا جواب دیا، جس کی آنکھیں اسی پر ٹکی ہوئی تھیں۔

وہ اب سینے پر بازو لپیٹے ہوئے تھا۔ وہ اس کے جواب پر مسکرایا تھا، پھر اس نے نساء کو فنکشن کے بعد عائشہ کے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں کافی کی دعوت دی تھی جو نساء نے قبول کرلی تھی، وہ دونوں اپنے کچھ دوستوں کا انتظار کرتے ہوئے گپ شپ میں مصروف ہوگئے تھے۔

عائشہ ایک بار پھر غیر جانب دار مبصر بن گئی تھی۔ نساء حاکم مزاج لڑکی تھی اور گھر میں وہ ہر کام اپنی مرضی اور اپنے طریقے سے کرنے کی عادی تھی، لیکن عائشہ نے محسوس کیا تھا، نساء جبریل کے ساتھ اس طرح نہیں کررہی تھی۔ وہ اس کی پوری بات سن کر کچھ کہتی اور اس کی بہت سی باتوں سے اتفاق کررہی تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے، عائشہ عابدین کو وہ بے حد اچھے لگ رہے تھے۔۔۔ ایک پرفیکٹ کپل۔۔۔ جس پر اسے رشک آرہا تھا اور جبریل سے اس طرح متاثر ہونے کے باوجود وہ اسے نساء کی زندگی کے ساتھی کے طور پر ہی دیکھ رہی تھی۔۔۔ نساء کا ذوق اور انتخاب ہر چیز میں اچھا اور منفرد تھا اور جبریل اس کا ایک اور ثبوت تھا۔

فنکشن کے بعد وہ نساء اور جبریل کے کچھ دوستوں کے ساتھ ایک کیفے میں کافی پینے گئی تھی۔ یہ ایک اتفاق تھا یا خوش قسمتی کہ چھ افراد کے اس گروپ میں جبریل اور عائشہ کی نشستیں ایک دوسرے کے ساتھ تھیں۔ نساء جبریل کے بالمقابل میز کے دوسری جانب تھی اور عائشہ کے دوسری طرف نساء کی ایک اور دوست سوزین۔۔۔

عائشہ عابدین کی گھبراہٹ اب اپنی انتہا پر تھی۔ وہ اس کے اتنے قریب تھی کہ اس کے پرفیوم کی خوشبو محسوس کررہی تھی۔ ٹیبل پر دھرے اس کے ہاتھ کی کلائی میں بندھی گھڑی سے ڈائل پر ٹک ٹک کرتی سوئی دیکھ سکتی تھی، لیکن اگر وہ کچھ نہیں کرسکتی تھی تو وہ گردن موڑ کر اسے اتنے قریب سے دیکھنا تھا۔۔۔ وہ غلط جگہ بیٹھ گئی تھی،

عائشہ عابدین کو مینیو دیکھتے ہوئے احساس ہوا تھا۔

جبریل میزبان تھا اور وہ سب ہی سے پوچھ رہا تھا' اس نے عائشہ سے بھی پوچھا تھا۔ عائشہ کو مینیو کارڈ پر اس وقت کچھ بھی لکھا ہوا نظر نہیں آرہا تھا۔ جو دکھ رہا تھا وہ اس احساس سے غائب ہو گیا تھا کہ وہ گردن موڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"جو سب لیں گے' میں بھی لے لوں گی۔" عائشہ نے جیسے سب سے محفوظ حل تلاش کیا تھا' جبریل مسکرایا اور اس نے اپنا اور اس کا آرڈر ایک ہی جیسا نوٹ کروایا۔ وہ ایک ویجی ٹیبل پیزا تھا جسے اس نے ڈرنکس کے ساتھ آرڈر کیا تھا اور بعد میں کافی کے ساتھ چاکلیٹ موز... نساء اپنا آرڈر پہلے دے چکی تھی اور باقی سب لوگ بھی اپنے آرڈر نوٹ کروا رہے تھے... ہیم برگر... شرمپس... اسٹفڈ ٹرکی... یہ امریکن دوستوں کے آرڈر تھے... نساء نے ایک سالمن سینڈوچ منگایا تھا۔

"میں اس سال میڈیکل میں چلی جاؤں گی۔ میرا ایڈمیشن ہو گیا ہے۔" دوران گفتگو جبریل کے سوال پر یک دم اس نے بتایا۔

"فنٹاسٹک۔" اس نے جواباً" مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ خود بھی میڈیسن میں ہی جا رہا تھا۔

وہ سب لوگ گفتگو میں مصروف تھے اور اس گفتگو میں اس کی خاموشی کو جبریل ہی وقتاً" فوقتاً" ایک سوال سے توڑتا... وہ جیسے اسے بوریت سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر شامل کرنے کی... اور عائشہ نے یہ چیز محسوس کی تھی۔ وہ جن ٹین ایجرز کو جانتی تھی وہ اور طرح کے تھے... یہ اور طرح کا تھا۔

کھانا آنے پر وہ اسی طرح گفتگو میں مصروف' خود کھانے کے ساتھ ساتھ عائشہ کو بھی سرو کرتا رہا۔ یوں جیسے وہ روٹین میں یہ سب کرنے کا عادی رہا ہو۔

محمد جبریل سکندر سے ہونے والی وہ پہلی ملاقات اور اس میں ہونے والی ایک ایک چیز عائشہ عابدین کے ذہن اور دل دونوں پر نقش ہو گئی تھی۔

"جس بھی لڑکی کا یہ نصیب ہو گا' وہ بے حد خوش قسمت ہو گی۔" اس نے بے حد دل سے خواہش اور دعا کی تھی۔

اس عمر میں بھی اس نے اپنی زندگی کے حوالے سے کچھ بھی سوچنا شروع نہیں کیا تھا۔ اگر کرتی تو جبریل وہ پہلا لڑکا ہوتا کہ اس جیسے شخص کی خواہش وہ اپنے لیے کرتی۔ جبریل نے اس کے لاشعور کو اس پہلی ملاقات میں اس طرح متاثر کیا تھا۔

"میں تمہارے لیے بہت دعا کر رہی ہوں نساء... کہ تمہاری شادی جبریل سے ہو جائے... جب بھی ہو... وہ بہت اچھا ہے۔" اس کیفے سے اس شام گھر واپس آنے کے بعد عائشہ نے نساء سے کہا تھا۔ وہ جواباً" ہنسی۔

"خیر ابھی شادی وغیرہ کا تو کوئی سین نہیں ہو سکتا ہم دونوں کے لیے... وہ بہت ینگ ہے اور مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے' لیکن مجھے وہ بہت پسند ہے... اور اگر کبھی بھی اس نے مجھ سے کچھ کہا تو میں انکار نہیں کروں گی... کون انکار کر سکتا ہے جبریل کو...؟" اپنے بیڈ روم میں' کپڑے تبدیل کرنے کے لیے نکالتے ہوئے' نساء نے اس سے کہا۔

"اس کے ماں' باپ نے بہت اچھی تربیت کی ہے اس کی... تم نے دیکھا' وہ کس طرح تمہیں توجہ دے رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں میں کبھی اپنے ساتھ کوئی گیسٹ لے کر گئی ہوں اور جبریل نے اسے اس طرح توجہ نہ دی ہو۔" عائشہ کا دل عجیب انداز میں بجھا... تو وہ توجہ سب ہی کے لیے ہوتی تھی اور عادت تھی مہربانی نہیں۔ اس نے کچھ مایوسی سے سوچا۔

"تمہیں پتا ہے' مجھے کیوں اچھا لگتا ہے وہ...؟" نساء اس سے کہہ رہی تھی۔ "وہ حافظ قرآن ہے... بہت باعمل

ہے۔ کبھی تم اس کی تلاوت سنو۔۔۔ لیکن اتنا مذہبی ہونے کے باوجود وہ بہت لبرل ہے۔۔۔ تنگ نظر نہیں ہے' جیسے بہت سارے مسلم ہو جاتے ہیں۔ نہ ہی اس کو میں نے کبھی دوسروں کے حوالے سے شدت پسند پایا ہے۔۔۔ مجھے نہیں یاد کبھی اس نے میرے یا کسی اور فی میل کلاس فیلو کے لباس کے حوالے سے کچھ کہا ہو۔۔۔ یا ویسے کسی کے بارے میں کمنٹ کیا ہو۔۔۔ کبھی نہیں۔"

نساء کہتی جا رہی تھی۔ وہ لباس کے معاملے میں خاصی ماڈرن تھی اور اسے یہ قابل قبول نہیں تھا کہ کوئی اس پر اس حوالے سے کوئی قدغن لگائے اور جبریل میں اسے یہ خوبی بھی نظر آگئی تھی۔ عائشہ بالکل کسی سحر زدہ معمول کی طرح یہ سب سن رہی تھی۔ نساء کے انکشافات نے جیسے عائشہ کے لیے اس کی زندگی کے آئیڈیل لائف پارٹنر کی چیک لسٹ میں موجود خوبیوں کی تعداد بڑھا دی تھی۔

وہ فجر کے وقت نماز کے لیے اٹھی تھی اور اس وقت نماز پڑھنے کے بعد اس نے ایک بار پھر فیس بک چیک کیا تھا اور خوشی کی ایک عجیب لہر اس کے اندر سے گزری تھی' وہ ایڈ ہو چکی تھی اور جو پہلا کلام عائشہ نے کیا تھا' وہ اس کی تصویروں میں اس کی فیملی کی تصویروں کی تلاش تھی اور اسے ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے اکاؤنٹ میں اس کی فیملی کی بہت ساری تصاویر تھیں۔۔۔ سالار سکندر کی۔۔۔ حجاب میں ملبوس امامہ کی۔۔۔ اس کی نوعمر بہن عنایہ کی۔۔۔ حمین کی۔۔۔ اور رئیسہ کی۔۔۔ جبریل کے انکلز اور کزنز کی جوان کی فیملی کے برعکس بے حد ماڈرن نظر آرہے تھے' لیکن ان سب میں عجیب ہم آہنگی نظر آرہی تھی۔

وہ جبریل سکندر سے دوستی کرنا چاہتی تھی' لیکن وہ ہمت نہیں کر پائی تھی۔ لیکن وہ اور اس کی فیملی یک دم جیسے اس کے لیے ایک آئیڈیل فیملی کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ ایسی فیملی جس کا وہ حصہ بننا چاہتی تھی۔۔۔ وہ اس فیملی کا حصہ نہیں بن سکی تھی' لیکن عائشہ عابدین کو احسن سعد اور اس کی فیملی سے پہلی بار متعارف ہو کر بھی ایسا ہی لگا تھا کہ وہ جبریل سکندر جیسا خاندان تھا۔۔۔ اور احسن سعد' جبریل سکندر جیسا مرد۔۔۔ قابل' باعمل مسلمان' حافظ

قرآن...

عائشہ عابدین نے جبریل سکندر کے دھوکے میں احسن سعد کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کتاب کا پہلا باب اگلے نو ابواب سے مختلف تھا۔ اسے پڑھنے والا کوئی بھی شخص یہ فرق محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ پہلا باب بدل دیا تھا۔ نم آنکھوں کے ساتھ اس نے پرنٹ کی دبائی۔ پرنٹر برق رفتاری سے وہ پچاس صفحے نکالنے لگا جو اس کتاب کا ترمیم شدہ پہلا باب تھے۔

اس نے ٹیبل پر پڑی ڈسک اٹھائی اور بے حد تھکے ہوئے انداز میں اس پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اس نے اسے دو ٹکڑوں میں توڑ ڈالا... پھر چند اور ٹکڑے... اپنی ہتھیلی پر پڑے ان ٹکڑوں کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے انہیں ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

ڈسک کا کور اٹھا کر اس نے زیر لب اس پر لکھے چند لفظوں کو پڑھا' پھر چند لمحے پہلے لیپ ٹاپ سے نکالی ہوئی ڈسک اس نے اس کور میں ڈال دی۔

پرنٹر تب تک اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اس نے ٹرے میں سے ان صفحات کو نکال دیا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ اس نے انہیں ایک فائل کور میں رکھ کر انہیں دوسری فائل کورز کے ساتھ رکھ دیا جن میں اس کتاب کے باقی نو ابواب تھے۔

ایک گہرا سانس لیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑے ہو کر اس نے ایک آخری نظر اس لیپ ٹاپ کی مدھم پڑتی اسکرین پر ڈالی۔

اسکرین تاریک ہونے سے پہلے اس پر ایک تحریر ابھری تھی۔ "ول بی ویٹنگ"

اس کی آنکھوں میں ٹھہری نمی یک دم چھلک پڑی تھی۔ وہ مسکرا دی' اسکرین اب تاریک ہونے لگی۔ اس نے پلٹ کر ایک نظر کمرے کو دیکھا' پھر بیڈ کی طرف چلی آئی۔ ایک عجیب سی تھکن اس کے وجود پر چھانے لگی تھی۔ اس کے وجود پر یا ہر چیز پر... بیڈ پر بیٹھ کر چند لمحے اس نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر پڑی چیزوں پر نظر دوڑائی۔

وہ پتا نہیں کب وہاں اپنی رسٹ واچ چھوڑ گیا تھا۔ شاید رات کو جب وہ وہاں تھا' وہ وضو کرنے گیا تھا۔ پھر شاید اسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ وہ رسٹ واچ اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ سیکنڈز کی سوئی کبھی نہیں رکتی' صرف منٹ اور گھنٹے ہیں جو رکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سفر ختم ہوتا ہے... سفر شروع ہو جاتا ہے۔

بہت دیر تک اس گھڑی پر انگلیاں پھیرتی وہ جیسے اس کے لمس کو کھوجتی رہی۔ وہ لمس وہاں نہیں تھا۔ وہ اس کے گھر کی واحد گھڑی تھی جس کا ٹائم بالکل ٹھیک ہوتا تھا۔ صرف منٹ نہیں... سیکنڈز تک... کاملیت اس گھڑی میں نہیں تھی' اس شخص کے وجود میں تھی جس کے ہاتھ پر وہ ہوتی تھی۔

اس نے آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے اس گھڑی کو دوبارہ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ کمبل اپنے اوپر کھینچتے ہوئے وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے لائٹ بند نہیں کی تھی۔ اس نے دروازہ بھی مقفل نہیں کیا تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بعض دفعہ انتظار بہت "لمبا" ہوتا ہے... بعض دفعہ انتظار بہت مختصر ہوتا ہے۔

اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ وہ اسے نیند سمجھ رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے وہ اسے چاروں طرف پھونک رہی تھی۔ جب اسے وہ یاد آیا۔ وہ اس وقت وہاں ہوتا تو اس سے آیت الکرسی اپنے اوپر پھونکنے کی فرمائش کرتا۔

بیڈ سائڈ ٹیبل پر پڑے ایک فوٹو فریم کو اٹھا کر اس نے بڑی نرمی کے ساتھ اس پر پھونک ماری۔ پھر فریم کے شیشے

پر نظر نہ آنے والی گرد کو اپنی انگلیوں سے صاف کیا' چند لمحے تک وہ فریم میں اس ایک چہرے کو دیکھتی رہی' پھر اس نے اس کو دوبارہ بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ سب کچھ جیسے ایک بار پھر سے یاد آنے لگا تھا۔ اس کا وجود ایک بار پھر سے ریت بننے لگا تھا۔ آنکھوں میں ایک بار پھر سے نمی آنے لگی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ "اسے" بہت دیر ہو گئی تھی۔

امامہ نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولی تھیں۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ سالار اس کے برابر میں سو رہا تھا۔ اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی' رات کا آخری پہر تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ عجیب خواب تھا... وہ کس کا انتظار کر رہی تھی' اسے خواب میں بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ کتاب کے وہ دس ابواب سالار کے تھے... وہ کتاب سالار ہی لکھ رہا تھا اور ابھی تک اس کے نو ابواب لکھے جا چکے تھے... دسواں نہیں... وہ گھڑی بھی سالار کی تھی اور سالار نے حمین کی پچھلی برتھ ڈے پر اس کی ضد اور اصرار پر اسے دی تھی اور اب وہ گھڑی حمین باندھتا تھا... اور اس نے خواب میں اپنے آپ کو بوڑھا دیکھا تھا۔ وہ اس کا مستقبل تھا۔ وہ کسی کو یاد کر رہی تھی' کسی کے لیے اداس تھی۔ مگر کس کے لیے... اور وہ کسی کا انتظار کر رہی تھی اور کوئی نہیں آ رہا تھا... مگر کون... اور پھر وہ تحریر ول بی ویٹنگ خواب کی ایک ایک تفصیل کو دہرا رہی تھی۔ ایک ایک جزئیات کو دہرا سکتی تھی۔

وہ بستر سے اٹھ گئی' بے حد بے چینی کے عالم میں... ان کی پیکنگ مکمل ہو چکی تھی۔ وہ اس گھر میں ان کی آخری رات تھی' اس کے بعد وہ ان سب کے ساتھ پاکستان جانے والی تھی اور سالار اور جبریل کو وہیں رہ جانا تھا۔

ایک بار پھر سے اس کا گھر ختم ہو جانا تھا۔ یہ جیسے اس کی زندگی کا ایک انداز ہی بن گیا تھا... گھر بننا... گھر ختم ہونا... پھر بننا... پھر ختم ہونا... ایک عجیب ہجرت تھی جو ختم ہی نہیں ہوتی تھی اور اس ہجرت میں اپنے گھر کی وہ خواہش اور خواب پتا نہیں کیا چلا گیا تھا۔ وہ اس رات اس طرح خواب سے جاگنے کے بعد بھی بہت اداس تھی۔

پہلے وہ سالار کی بے انتہا مصروفیت کی وجہ سے اس کے بغیر اپنے آپ کو رہنے کی عادی کر پائی تھی اور اب پاکستان چلے جانے کے بعد اسے جبریل کے بغیر بھی رہنا تھا۔ وہ چلتی ہوئی کمرے میں موجود صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے ایک بار پھر اس خواب کا خیال آنے لگا تھا۔ اس خواب کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ بری طرح ٹھٹکی... کتاب کے دس ابواب... اس کی اداسی... اس کا بڑھاپا... کسی کو یاد کرنا۔

اسے یاد آیا تھا اس کتاب کا ہر باب سالار کی زندگی کے پانچ سالوں پر مشتمل تھا... ڈاکٹرز نے سالار کو سات سے دس سال کی زندگی کی مہلت دی تھی اور کتاب کا دسواں باب پچاس سال کے بعد ختم ہو رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ۔ ان شاءاللہ)

کرن لقمان

"فیروز بابا اور کتنی دیر لگے گی؟" گرجتی، چمکتی کالی طوفانی رات، اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان گھری اس کچی سڑک پر وہ پچھلے دو گھنٹے سے جیپ صحیح ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

"بس بیٹا! اب زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" فیروز بابا نے اس ٹوٹے ہوئے وائر کو جوڑ لیا تھا جس کے ٹوٹنے سے جیپ کا انجن بند ہوا تھا اور پھر چند منٹ بعد ہی گھرر گھرر کی آوازوں کے ساتھ جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔ راحیل صدرالدین کے سینے سے ایک پُرسکون سانس آزاد ہوئی اور وہ جیپ میں سوار ہو کر مانسہرہ سے چند کلومیٹر دور اپنے گاؤں مانجھیا کی طرف روانہ ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

امیرالدین بڑی پریشانی میں پچھلے ایک گھنٹے سے حویلی کے بڑے برآمدے میں مسلسل ٹہل رہے تھے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ناولٹ

ان کی آنکھیں حویلی کے بڑے پھاٹک پر تھیں' رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا اور موسم کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ رات دس بجے تک وہ پہنچ جائیں گے پر اب اتنی دیر ہو جانے پر ان کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اچانک پھاٹک کے پار انہیں جیپ کی ہیڈ لائٹس جگمگاتی نظر آئیں۔ انہوں نے چوکیدار کے کواٹر سے باہر آنے کا بھی انتظار نہیں کیا اور خود ہی دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔

☼ ☼ ☼

"یا اللہ' یہ بابا کو کیا ہو گیا ہے' کیوں اتنے پریشان ہیں ڈنر پر تو بہت خوش تھے پر اب اتنی دیر سے کس پریشانی میں مسلسل برآمدے میں چکرائے جا رہے ہیں۔" اس نے تیسری بار کھڑکی کی طرف آتے ہوئے سوچا۔

جی تو چاہ رہا تھا کہ باہر بابا کے پاس چلی جائے پر ایک تو لائٹ چلی گئی تھی' پوری حویلی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی' سب سو رہے تھے اس لیے شاید کسی کو جنریٹر چلانے کا خیال بھی نہیں آیا تھا اور پھر آسمان پر کڑکتی' چمکتی بجلیوں کو دیکھ کر ویسے ہی اس کے اوسان خطا ہو جاتے تھے' اس لیے بس وہ بار بار کھڑکی میں سے ہی بابا کو دیکھ رہی تھی اور پھر جب وہ چوتھی بار کھڑکی میں آئی تو اس نے دیکھا۔ برآمدے کے سامنے ایک جیپ آکر آئی کی ہے۔

"اتنی رات کو کون آیا ہے؟" تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے شیشے کی کھڑکی کا پٹ کھول دیا جیسے ہی وہ آگے ہو کر نیچے کو جھکی' کڑک دار گرج کے ساتھ کئی بجلیاں ایک ساتھ چمکیں۔ اسی لمحے آنے والے نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو ایک چاند چہرہ اپنی چمک اس کی آنکھوں میں چھوڑ کر کھڑکی کے پیچھے چھپ گیا۔

"اف توبہ! کتنی خوفناک بارش ہے۔" اس نے ایک دم پیچھے ہو کر کھڑکی بند کر کے پردہ برابر کیا پھر بھاگ کر اپنے بستر میں گھس گئی اور تیز آواز میں آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔

☼ ☼ ☼

اس حویلی سے ان کا رشتہ چونتیس سال پہلے ان کی پیدائش کے ساتھ ہی جڑ گیا تھا۔ عمر کے بائیس سال انہوں نے اس کی آغوش میں محبتیں سمیٹیں اور جب ناراض ہو کر یہاں سے نکلے تو بارہ سال میں ایک بار بھی کبھی پلٹ کر حویلی کی طرف نہ دیکھا۔ اس وقت وہ حویلی کی دوسری منزل کی بالکنی میں ماضی کی تلخ و شیریں یادوں میں گھرے کھڑے تھے' ان کے پیچھے بڑا ہال کمرہ تھا۔ حویلی کے بہت سے کمروں کے دروازے اس ہال کمرے میں کھلتے تھے' انہیں میں سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا بڑے سے سفید دوپٹے میں لپٹا بھاری وجود نماز تہجد ادا کرنے کے لیے کمرے سے باہر آیا۔ وہ اس وجود کے پیچھے آئے۔

"اماں جان!" حاجرہ بی بی کے قدم جہاں تھے وہیں تھم گئے۔

سماعت کو دھوکا ہوا۔ دل کی دھڑکن ڈوب کر ابھری' وہ آہستہ سے پلٹیں نگاہوں کا واہمہ نہیں تھا۔ وہ سچ مچ ان کے سامنے تھے۔ بارہ سال سے پل پل منتظر آنکھیں حیرت اور بے یقینی سے پھیل گئیں۔ راحیل نے آگے بڑھ کر ماں کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں بھرا اور اپنے ہونٹ ان کے ماتھے پر ثبت کر دیے۔

"راحیل' میرے بچے' یہ تو ہی ہے نا!" حاجرہ بی بی کے ہونٹ دیوانہ وار بیٹے کو چوم رہے تھے' ان کی برسوں سے خشک آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔

"میں ہی ہوں اماں جان۔ آپ کا راحیل' آپ کا بیٹا!" انہوں نے ایک چھوٹے بچے کی طرح اپنا وجود ماں کی آغوش میں دے دیا۔

☼ ☼ ☼

"شرمین' شرمین۔ ارے بھئی اٹھو نا۔ ایک زبردست بریکنگ نیوز ہے۔" شدید ایکسائٹمنٹ میں نرمین ـــــ نے اسے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔

"توبہ استغفار' نرمین! کیا ہو گیا ہے۔" اس ناگہانی آفت پر شرمین کو مجبوراً" منہ رضائی سے باہر نکالنا ہی پڑا۔

"جانتی ہو' حویلی میں کون آیا ہے۔" نرمین کی بات پر شرمین کے کان کھڑے ہوئے۔

رات کھڑکی کے پار کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا جب اس نے جیپ سے کسی کو اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ اترنے والے کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی' پر یہ ضرور جان گئی تھی کہ آنے والا کوئی خاص ہے۔ کیونکہ جس والہانہ انداز میں اس کے بابا نے آنے والے کو گلے سے لگا کر پیار کیا تھا۔ وہ کوئی عام بندہ نہیں ہو سکتا تھا پر اس وقت وہ نرمین کی ایکسائٹمنٹ کا گلا گھونٹتے ہوئے بولی۔

"ہاں پتا ہے۔"

"ہیں.... سچی تمہیں پتا ہے۔" نرمین کو حیرت کے ساتھ ساتھ اپنی بریکنگ نیوز کے بریک ہونے کا دکھ بھی ہوا۔ "اچھا بتاؤ' کون آیا ہے۔"

"یہ تو پتا نہیں۔ پر یہ پتا ہے' کوئی آیا ضرور ہے رات میں نے کھڑکی سے دیکھا تھا۔" شرمین بالوں کا جوڑا لپیٹتے ہوئے بولی۔

"لو جی پتا تو کچھ ہے نہیں' خواہ مخواہ ساری ایکسائٹمنٹ کا مزا کرکرا کر دیا۔"

"اوہو.... نرمین! اب بتا بھی دو کون آیا ہے۔"

"گیس کرو....."

"مجھ سے نہیں ہوتا گیس ویس' بتانا ہے تو بتاؤ' ورنہ چلتی بنو۔ میں خود پتا لگا لوں گی۔" شرمین نے پاؤں میں چپل ڈالی اور باتھ روم کی طرف بڑھی۔

"اچھا بابا سنو تو۔" نرمین نے باتھ روم میں گھسنے سے پہلے اس کا بازو پکڑا اور منہ اس کے کان کے قریب لا کر بولی۔ "بارہ سال بعد راحیل لالہ حویلی واپس آئے ہیں۔" شرمین نے جھٹکے سے نرمین کو دیکھا' اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

"تمہارا مطلب.... راحیل صدر الدین.... آغا جان کے بیٹے۔"

"ہاں.... ہاں.... وہی...."

"پر یہ کیسے ہو سکتا ہے حویلی کے دروازے تو ان پہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے تھے اور پھر جس طرح بابا نے رات ان کا استقبال کیا۔ اوہ مائی گاڈ! کہیں راحیل لالہ کے پیچھے بابا جان اور آغا جان میں پھر کوئی کلیش نہ ہو جائے" یہ سوچ کر وہ پریشان ہو گئی' کیونکہ وہ جانتی تھی۔ بارہ سال پہلے بھی اس کے بابا امیر الدین اپنے بھتیجے راحیل صدر الدین کی حمایت میں اپنے بڑے بھائی آغا صدر الدین کی ناراضی مول لے چکے تھے۔

ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے لیے انواع و اقسام کے لوازمات چنے ہوئے تھے۔ تمام ینگ پارٹی موجود تھی' پر کسی کی مجال نہیں تھی جو کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا سکتا بزرگوں کی آمد سے پہلے۔ صرف سویرا اپنے دو سالہ بیٹے شہیر کو سیریلک کھلا رہی تھی۔ تمام بڑے اس وقت آغا صدر الدین کے کمرے میں موجود تھے۔ وجہ راحیل کی اچانک آمد تھی۔

"کب ختم ہو گا یہ ہنگامی اجلاس' میرا تو بھوک کے مارے دم نکل جائے گا۔" نرمین کی آنتیں بھوک کے مارے قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں۔

"سب کا یہی حال ہے۔" سویرا نے شہیر کا منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر انجانی مسرت تھی۔

"آپ کو کیا لگتا ہے آپی کیا ہو گا۔" فردین کی نظریں بار بار آغا جان کے دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ وہ ابھی تک اپنے بڑے بھائی راحیل سے نہیں ملا تھا۔ بارہ سال تک آنکھوں کے سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا بڑا بھائی اس کا آئیڈیل تھا۔ اس نے آج تک ہر کسی سے راحیل کی تعریف ہی سنی تھی، سوائے آغا جان اور گل بی بی کے۔ راحیل کا نصابی اور غیر نصابی ریکارڈ شاندار تھا۔ بقول چچا جان کے ان کی شخصیت بھی ساحرانہ اور دل موہ لینے والی تھی۔

"میں نہیں جانتی فردین کہ کیا ہو گا، پر میں چاہتی ہوں جو ہو وہ اچھا ہو۔" سویرا دور کہیں دیکھتے ہوئے بولیں۔ وہ گل بی بی کی بیٹی تھیں اور گل بی بی یعنی شاہینہ گل آغا صدر الدین اور امیر الدین کی اکلوتی بہن تھیں، جو بیس سال پہلے بیوہ ہو کر حویلی آئی تھیں اور آج تک یہیں تھیں۔

"پر مجھے نہیں لگتا، آغا جان انہیں قبول کریں گے۔ آتو گئے ہیں، پر واپس جانا پڑے گا۔" نرمین کی اس بات پر کوئی کچھ نہ بولا، سوائے فردین کے۔

"تمہارے منہ میں خاک۔"

"کیا... فردین... مرو گے تم میرے ہاتھ سے...."

نرمین کا بس چلتا تو وہ فردین کو کچا چبا جاتی۔

☼ ☼ ☼

آغا صدر الدین شدید غصے میں اپنے کمرے کے وسط میں ٹہل رہے تھے۔ حاجرہ بی بی اور شاہینہ گل بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ امیر الدین صوفے پر سر جھکائے بیٹھے تھے اور راحیل وادی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کی نگاہیں مسلسل باپ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ بارہ سال پہلے پیش آنے والے واقعے کی معافی طلب کر چکے تھے، پر ابھی تک آغا صدر الدین کا جواب نہیں آیا تھا۔

"امیر الدین! اس سے کہہ دو، میرے لیے اب اسے حویلی میں برداشت کرنا ممکن نہیں ہے، جہاں سے آیا ہے، بہتر ہے وہیں چلا جائے، باپ کا سر جھکانے والی ناخلف اولاد کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔" آغا صدر الدین چلتے چلتے امیر الدین کے سامنے رکے تھے۔

"خدا کا واسطہ ہے آپ کو۔ اتنا دل سخت نہ کریں۔ یہ بیٹا ہے ہمارا۔" شوہر کی بات پر حاجرہ بی بی تڑپ اٹھیں۔

"آپ کچھ نہیں بولیں گی حاجرہ بیگم! بارہ سال پہلے آپ کی آہوں اور فریادوں کا اس کے پتھر دل پر کوئی اثر نہیں ہوا، تو اب آپ کا دل بھی اس کے لیے موم نہیں ہونا چاہیے۔" حاجرہ بی بی کا سر جھک گیا اور راحیل کی نگاہیں کھڑکی کے پار وادی میں کچھ ڈھونڈنے لگیں۔

"بھائی جان! میں مانتا ہوں، بارہ سال راحیل نے حویلی سے دور رہ کر ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا، پر اگر بارہ سال پہلے یہ غلط ہوتا تو میں کبھی بھی حویلی کا دروازہ اس کے لیے نہ کھولتا۔ بچوں سے غلطیاں ہوتی ہیں، پر بڑے سنبھال لیتے ہیں، میں نے پہلے بھی آپ سے یہ ہی درخواست کی تھی اور اب بھی کہتا ہوں اسے معاف کر دیں۔" امیر الدین عاجزانہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"معاف کر دوں؟ کہنا آسان ہے پر سالوں کی اذیت کو لمحوں میں فراموش کر دینا بہت مشکل ہے۔" آغا صدر الدین اپنے بھاری وجود کو لیے صوفے پر ڈھے سے گئے۔ "تم نے صحیح کہا، بڑے بچوں کی غلطیوں کو سنبھال لیتے ہیں، میں بھی سنبھال لیتا۔ غصے میں کہہ دیا کہ حویلی چھوڑ دے تو یہ چھوڑ ہی گیا اور گیا تھا، تو واپس آجاتا۔ اس طرح بارہ سال تک سزا نہ دیتا۔ اس وقت شاید میں معاف کر دیتا، پر اب اگر بارہ سال اس کے بغیر گزار لیے ہیں تو باقی کی عمر بھی گزار لوں گا۔" راحیل تڑپ کر آگے بڑھے اور باپ کے قدموں میں بیٹھ کر سر ان کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

"آغا جان! مجھے ایک لمحے کو بھی اس بات کا یقین

ہوتا کہ آپ مجھے معاف کردیں گے تو میں بہت پہلے آجاتا۔"

"جب باپ کا یقین ہی نہیں تھا تو اب کیوں آئے ہو یہاں؟"

"میں ٹوٹ گیا ہوں بابا جان۔۔۔ آپ سب سے دور رہ کر میں بھی کبھی خوش نہیں رہا' ادھوری زندگی جیتا رہا ہوں۔ اب مزید آپ سے اور اماں جان سے دور نہیں رہ سکتا۔ پلیز بابا جان! مجھے معاف کردیں' اب کبھی آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔" راحیل نے امید بھری آنکھیں باپ کے چہرے پر گاڑ دی۔

حاجرہ بی بی شوہر کے قریب آئیں اور اپنا ہاتھ ان کے کاندھے پر رکھ دیا' آغا صدر الدین لمحوں میں شریک حیات کی دلی کیفیت سمجھ گئے۔ نیک اور صالح بیوی نے زندگی کے ہر کٹھن وقت میں خوش اسلوبی سے ساتھ نبھایا تھا۔ بارہ سال اولاد کی جدائی میں انہیں گھلتے دیکھا تھا' پر کبھی لبوں سے شکوہ نہیں سنا کہ جوان اولاد کو حویلی چھوڑنے پر مجبور کیوں کیا۔ وہ باپ تھے۔ سہ سکتے تھے پر جانتے تھے ماں کا دل ایک بار پھر اولاد سے دوری برداشت نہیں کرپائے گا۔ آغا صدر الدین کا ہاتھ آہستہ سے اٹھا اور راحیل کے سر پر ٹک گیا۔

☼ ☼ ☼

لمبے انتظار کے بعد بالآخر دروازہ کھلا اور ایک ایک کرکے حویلی کے سب بڑے باہر آنے لگے۔ فردین تیزی سے ان سب کی طرف لپکا۔ راحیل پر نظر پڑتے ہی وہ اپنی جگہ رک سا گیا۔ وہ اس کے ذہن میں بنائے ہوئے آئیڈیل سے زیادہ شان دار تھے۔ بھائی پر نظر پڑتے ہی راحیل نے مسکرا کر بازو پھیلا دیے۔ جواباً فردین بھاگ کر ان بازوؤں میں سما گیا۔ برسوں کے بچھڑے بھائی چند لمحے دنیا سے بے خبر ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے رہے۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ بھئی ادھر ہم بھی ہیں۔" سویرا شہیر کو گود میں اٹھائے مسکراتے ہوئے آگے بڑھیں۔ فردین سائیڈ میں ہوا تو راحیل بھی سویرا کی طرف بڑھے۔

"کیسی ہو تم۔۔۔؟" راحیل نے گول مٹول سے شہیر کے گال کو پیار سے چھوتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک اور آپ۔۔۔" راحیل کا سر اثبات میں ہل گیا۔

"اوہوں۔۔۔ اوہوں۔۔۔" نرمین نے کھنکار کر سب کی توجہ اپنی طرف کی۔ راحیل نے پہلے نرمین کو' پھر سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا تو انہوں نے راحیل کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر تعارف کروانے لگیں۔

"امیر الدین کی چھوٹی بیٹی ہے نرمین اور فردین کی منگیتر بھی۔۔۔"

"آہاں۔۔۔ گڈ۔۔۔" راحیل نے آگے بڑھ کر نرمین کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ساتھ ہی ان کی نظر کچھ فاصلے پر کھڑی شرمین پر پڑی تو بجلی کے جھماکے کی طرح ایک چہرہ ان کی نظروں میں چمکا۔ وہ چند لمحے اس پر سے نظریں ہٹانا بھول گئے۔

"یہ شرمین ہے۔ نرمین کی بڑی بہن۔" اماں جان نے بتایا تو وہ آہستہ سے "اوہ۔۔۔" کہتے نظر پھیر گئے۔ شرمین کا خیال تھا وہ اس کے سر پر بھی ہاتھ رکھیں گے' پر اس سے صرف نظر کرنے پر وہ تھوڑی بدمزا ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

"یہ تو نے اچھا نہیں کیا راحیل۔۔۔ سمیرا کو اس فرنگن کے حوالے کرکے۔ کسی نہ کسی طرح لے ہی آتا' اب تو وہ اسے اپنے جیسا ہی کرلے گی۔" حاجرہ بی بی کے دروازے پر دستک دینے کے لیے اٹھتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ کسی انجانی سمیرا کے بارے میں جاننے کے لیے اس کا ازلی تجسس بے دار ہوگیا اور اس نے کان تقریباً" دروازے کے ساتھ چپکا ہی دیا۔

"آپ نہیں جانتیں اماں جان' میں خود بھی کس کرب سے گزرا ہوں۔ وہاں کے قوانین بہت سخت ہیں اور اپنے لوگوں کو وہ بہت زیادہ پروٹیکٹ کرتے ہیں

میں نے پچھلے ایک سال میں ہر کوشش کرکے دیکھ لی پر اس کی ماں کسی بھی طرح اسے میرے ساتھ بھیجنے پر رضامند نہیں ہوئی۔ اور میں زبردستی نہیں کر سکتا۔"

سیڑھیوں پر کھٹکے کی آواز سنتے ہی اس نے مزید کچھ نہ سننا بہتر سمجھا اور دروازے پر دستک دینے لگی۔

"کون ہے... آجاؤ...." حاجرہ بی بی کی آواز سنتے ہی وہ اندر آ گئی۔

حاجرہ بی بی جانماز پر بیٹھی تھیں اور راحیل ان کی گود میں سر رکھے لیٹے تھے۔ سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا تو پھر واپس سر گھمانا بھول گئے۔

"بی بی جان! چائے تیار ہے۔ سب آپ کا اور راحیل لالہ کا انتظار کررہے ہیں۔ آپ آجائیں تو پھر چائے پی لیں۔"

"ارے شام کی چائے کا ٹائم ہو گیا۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا' جیتی رہ میری بچی! بس میں ابھی عصر کی نماز پڑھ کر آتی ہوں۔ راحیل! تو شرمین کے ساتھ چلا جا بیٹا!" حاجرہ بی بی گود سے راحیل کا سر اٹھاتے ہوئے بولیں۔

"جی امی جان!" شرمین ان کے مسلسل گھورنے کی وجہ سے نروس ہو رہی تھی۔ راحیل کا انتظار کیے بغیر باہر نکل آئی۔ سیڑھیاں اترنے سے پہلے اس نے اپنے پیچھے آہٹ سنی۔ مڑکر دیکھا تو راحیل لائٹر جلا کر سگریٹ سلگا رہے تھے۔ وہ حیرت سے چند لمحے دیکھتی رہی۔ وہ اس کے قریب آ گئے۔

"آپ سگریٹ پیتے ہیں؟"

"ہاں کیوں؟"

"ایسے ہی' یہاں کوئی نہیں پیتا نا' اس لیے" وہ کندھے اچکا کر کہتی سیڑھیاں اتر گئی' اور وہ دور تک اس کی کمر پر جھولتی چوٹی کو دیکھتے رہ گئے۔ انہیں حویلی میں آئے دو دن ہو گئے تھے اور ان دو دنوں میں انہوں نے جب بھی شرمین کو دیکھا' طوفانی رات میں کڑکتی بجلیوں کی روشنیوں میں چمکتا اس کا چہرہ انہیں ضرور یاد آتا تھا۔

☼ ☼ ☼

میری روح' اے میری روح!

تو آرزوؤں سے لدا جہاز ہے۔ جو ریت میں گر گیا ہے۔

تیرے بادبانوں کو جنبش میں لانے کے لیے ہوا کہاں سے آئے گی۔

کون سا چڑھاؤ تیرے پتوار کو آزاد کرے گا۔

تیرا لنگر نیچے گر پڑا ہے۔ تیرے بادبان کھلنے کے لیے تیار ہیں۔

لیکن تیرے سر پر آسمان خاموش ہے۔

سمندر کا ٹھہرا ہوا پانی تیرے جمود پر خندہ زن ہے۔

اب تیرے اور میرے لیے کون سی امید باقی ہے؟

"اوہ.... شٹ.... اس لائٹ کو بھی ابھی جانا تھا۔"

راحیل خلیل جبران کے ناول "ارضی دیوتا" میں منہمک تھے۔ پر برا ہوا لائٹ کا جس نے ان کا سارا انہماک توڑ دیا۔ وہ موبائل کی ٹارچ جلا کر کچن کی طرف آئے۔

"یا اللہ.... اب اتنی رات کو کہاں ڈھونڈوں' ایک تو یہ شمسہ بوا بھی۔ نا جانے چیزیں کون کون سے خانوں میں رکھ دیتی ہیں۔" شرمین کچن کی درازوں میں گھسی کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

"تم یہاں کیا کررہی ہو؟" راحیل کے اچانک پوچھنے پر وہ ایک دم ڈر کر اچھلی اور پچھلی کیبنٹ سے جا ٹکرائی۔

"وہ... وہ میں موم بتی ڈھونڈ رہی تھی۔" یہ کہتے کہتے ایک دم سے خیال آگیا کہ اس نے دوپٹا نہیں لیا ہوا۔ وہ شرما کر اور کچھ گھبرا کر پیچھے کو ہٹی اور منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا خیال تھا اتنی رات کو تو سب سو رہے ہوں گے۔ راحیل نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

"مل جائیں تو ایک مجھے بھی دے دینا۔" یہ کہتے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

ان کے جاتے ہی شرمین کی جان میں جان آئی۔ دو منٹ بعد اسے ایک کیبنٹ سے موم بتیوں کا پیکٹ مل گیا۔ دو موم بتیاں جلا کر وہ پہلے اپنے کمرے میں آئی' اچھی طرح اپنے وجود کے گرد دوپٹا لپیٹا' پھر ایک موم بتی لے کر راحیل کے بیڈ روم تک آئی۔ دروازہ کھلا ہوا

تھا۔ وہ کمرے میں نہیں تھے۔ باتھ روم میں تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر سائیڈ ٹیبل کے شیشے پر موم بتی جمائی۔ پھر وہ پلٹنے ہی لگی تھی کہ ریشم کے دھاگوں والا دوپٹے کا پلو سائیڈ ٹیبل کی دراز کے ہینڈل میں پھنس گیا۔ جلدی جلدی نکالنے کے چکر میں وہ اور الجھائے گئی۔ اسے ڈر تھا کہ کسی بھی وقت راحیل باتھ روم سے نکل آئیں گے'اس نے جھٹکا مار کر پلو نکالنا چاہا۔

"آرام سے.... دوپٹا پھٹ جائے گا۔" ان کی آواز پر وہ پھر ڈر کر دو قدم پیچھے ہوئی۔ راحیل نے آگے بڑھ کر نرمی سے اس کا پلو ہینڈل سے نکالا اور شرمین کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے پلو پکڑتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تو گہری آنکھیں اس پر ٹکی تھیں۔ وہ گھبرا کر بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔ پیچھے راحیل کتنی دیر دروازے کو دیکھتے رہے۔

☼ ☼ ☼

"بنو رانی! تمہیں سیانی ہونا ہی تھا' ہونا ہی تھا۔"

جیسے ہی شرمین ہال کمرے میں آئی' نرمین نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر گول گول گھومنا شروع کر دیا۔

"ارے.... ارے نرمین! کیا ہو گیا۔ ہوش میں تو ہو....."

"جناب! میں تو ہوش میں ہوں پر شام تک آپ کے ہوش اڑنے والے ہیں۔"

"کیوں.... کوئی بلا آرہی ہے شام کو....." اس نے سویرا کے قریب بیٹھ کر شہیر کو گود میں لیا اور پیار کرنے لگی۔

"بلا نہیں بلّا آرہا ہے۔" سویرا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"فار گاڈ سیک.... نرمین! ایسے تو نہ کہو۔" وہ ہنستے ہنستے بولی۔

"کیا ایسے تو نہ کہو' ارے بھئی بلّی آنکھوں والے کو بلّا ہی کہیں گے۔"

شربتی آنکھوں پر شرمین کا دل دھڑک اٹھا۔ "کس کی بات ہو رہی ہے۔" اس نے سویرا سے پوچھا۔

"فہیم اور تمہاری ساجدہ خالہ شام کو آرہے ہیں۔"

شرمین کی نظریں جھک گئیں۔

فہیم اس کا خالہ زاد اور منگیتر تھا۔ دس سال پہلے جب اس کی امی کا ایکسیڈنٹ ہوا اور ان کے بچنے کی امید نہ رہی تو انہوں نے اور ساجدہ خالہ نے فہیم اور شرمین کا رشتہ طے کر دیا تھا' جو کہ مرنے والی کی آخری خواہش جان کر حویلی والوں نے بھرپور طریقے سے نبھایا۔

"ہائے ہائے کیسی شرم آرہی ہے نا۔" نرمین نے اس کی حالت سے حظ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھ رہی ہیں آپی! یہ کیسے مجھے تنگ کر رہی ہے۔" شرمین نے غصے سے کہا۔

"تنگ تو میں کروں گی تمہیں' تم بھی تو ہر وقت مجھے چھیڑتی ہو' فردین کے حوالے سے....." اس نے تنک کر جواب دیا۔

"کس کی مجال ہے' جو میرے علاوہ میری منگیتر کو چھیڑتا رہتا ہے۔" فردین کی اچانک آمد پر وہ تینوں چونک گئیں۔ فردین نے سویرا کے پہلو میں بیٹھ کر اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

"اچھا تو اس کا مطلب تو میری بہن کو چھیڑتا رہتا ہے۔" سویرا نے فردین سے مصنوعی غصے سے پوچھا۔

"جناب! آپ کی بہن کو چھیڑنے کے تمام جملہ حقوق اپنے نام کروا چکا ہوں' منگنی کی صورت میں....."

"چل..... چل..... مار کھائے گا مجھ سے' اگر کوئی فضول حرکت کی تو اور یہ بتا کہ یہ راحیل کہاں ہیں۔"

"راحیل لالہ تو امیر چچا کے ساتھ زمینوں پر گئے ہیں۔" راحیل کے ذکر پر شرمین کی آنکھوں میں رات کے مناظر گھوم گئے۔

☼ ☼ ☼

"ممانی جان! شمسہ بوا رات کے لیے مینو پوچھ رہی ہیں۔ آپ بتا دیں کیا کیا بنانا ہے' تو میں شمسہ بوا کو بتا آؤں۔" سویرا حاجرہ بی بی سے رات کے کھانے کا پوچھنے آئی تھی' اپنی دھن میں بولتے ہوئے اسے اچانک غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔

"ممانی جان.... آپ ٹھیک تو ہیں۔" حاجرہ بی بی کا سر سجدے میں تھا اور وہ ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ سویرا نے ان کی کمر پر ہاتھ رکھا تو آہستہ آہستہ انہوں نے سر اٹھایا تو ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"خیریت تو ہے ممانی جان' آپ اس طرح سے رو کیوں رہی ہیں۔" سویرا ان کے قریب ہی بیٹھ گئی اور اپنے دوپٹے کے پلو سے ان کے آنسو صاف کرنے لگی۔ "کیا ہوا مجھے' بتائیں' کیا پریشانی ہے۔" جواب میں جو کچھ حاجرہ بی بی نے بتایا' وہ اس کا بھی دل دکھا گیا۔

☼ ☼ ☼

"واؤ.... خالہ جانی! آپ کی چوائس تو زبردست ہے' کیا لش پش ہے' یہ گرین والا سوٹ.... اور یہ میرون والا تو بہت ہی کمال ہے میرے لیے بھی لے آتیں نا میرون.... "شرمین کے لیے آنے والے ایک ایک سوٹ پر نرمین کی رال ٹپک رہی تھی۔

"نہیں بھئی' یہ میرون والا تو خاص فہیم کی پسند ہے شرمین کے لیے۔ تمہارے لیے میں پنک سوٹ لائی ہوں بیٹا۔" ساجدہ خالہ نے نرمین کے لیے لایا ہوا پنک سوٹ اس کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اوں ہوں.... پر یہ پنک کلر مجھے کچھ خاص پسند نہیں ہے نا...." نرمین نے طوعاً و کرہاً وہ سوٹ لے ہی لیا۔

"بہت ناشکری ہو نرمین' اتنے خوب صورت سوٹ پر بھی ناک بھوں چڑھا رہی ہو۔" گل بی بی کو نرمین کی حرکت پر غصہ آگیا۔

"نا بھئی نا' میری بٹی کو کوئی کچھ نہ کہے' اگلی بار آؤں گی تو اپنی گڑیا کے لیے میرون سوٹ لے آؤں گی۔" ساجدہ خالہ نے پیار سے نرمین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ انہیں حقیقتاً" اپنی بہن کی ان دو نشانیوں سے بے حد محبت تھی۔

"اوہ خالہ جانی! یو آر سو کیوٹ...." نرمین نے خالہ کو بانہوں میں بھر کر ان کے گال پر پیار کر لیا۔

"ویسے آنٹی! اس بار آپ کچھ زیادہ جلدی عیدی نہیں لے آئیں شرمین کے لیے.... ابھی تو رمضان شروع ہونے میں بھی پانچ چھ دن باقی ہیں۔" سویرا نے جیولری دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے بیٹا! ایک تو رمضان میں شاپنگ کرنا آسان نہیں' دوسرے اتنی گرمی میں روزہ رکھ کر ہنڈی سے مانجھیا تک آنا بہت ہی مشکل لگتا ہے' اس لیے اس بار میں پہلے آگئی' اب عید والے دن عید ملنے آؤں گی اور شادی کی تاریخ طے کرنے...." ساجدہ خالہ نے صوفے کے پاس قالین پر بیٹھی شرمین کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔

"سو بسم اللہ۔ جم جم آئیں' آپ کا اپنا گھر ہے اور پھر اللہ جتنی جلد بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش کروا دے اتنا ہی اچھا ہے۔" حاجرہ بی بی سر پر دوپٹا کھینچ کرتے ہوئے بولیں۔

"نرمین کے لیے آپ لوگوں نے کیا سوچا ہے' دونوں بہنوں کی ساتھ ہی کریں گے نا۔" ساجدہ خالہ کی بات پر شرمین نے شرارت سے نرمین کے پاؤں پر چٹکی بھری۔

"اوئی...." نرمین نے غصے سے شرمین کو دیکھتے ہوئے پاؤں مسلا' پر دل میں لڈو پھوٹنے لگے تھے۔

"ان شاء اللہ جیسا سوچا تھا ویسا ہی کریں گے' بلکہ اب تو میرا راحیل بھی سامنے ہے' مجھے اس کے لیے بھی کچھ سوچنا ہے۔" حاجرہ بی بی کا لہجہ راحیل کے لیے پُر تفکر تھا۔

"اچھا.... میرا تو خیال تھا' بارہ سالوں میں وہ وہاں باہر ہی شادی کر چکا ہوگا۔" ساجدہ خالہ کو حاجرہ بی بی کی بات سن کر حیرت ہوئی تھی۔

"کی تھی.... پر نبھی نہیں...."

"اور.... بچے...."

"ایک بیٹی ہے' پانچ سال کی' وہاں ماں کے پاس ہی ہے۔"

"اوہ...." ساجدہ خالہ کو سن کر افسوس ہوا۔

"مکافات عمل ہے جو اپنوں کا گھر نہ بسائے' اس کا گھر بھی نہیں بستا۔" گل بی بی کا لہجہ زہر خند تھا۔

"کیسی باتیں کررہی ہیں امی آپ۔۔۔ کوئی ایسی بات کرتے ہیں کیا۔" سویرا کی آواز میں خفگی اور شرمندگی دونوں شامل تھیں۔

"ممانی جان! فردین اور فہیم آجائیں تو میں کھانا لگوا دیتی ہوں آغا جان اور امیر ماموں بھی آچکے ہیں۔" یہ کہتی سویرا وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

"شرمین' نرمین بیٹا! تم بھی یہ سامان سمیٹو اور کچن میں سویرا کا ہاتھ بٹاؤ۔" حاجرہ بی بی ماحول کی تلخی کم کرنے کے لیے گویا ہوئیں۔

دونوں بہنوں نے اثبات میں سر ہلائے اور چیزیں سمیٹنا شروع ہوگئیں' جہاں راحیل کی شادی اور بچی دونوں کے لیے بریکنگ نیوز تھی' وہیں گل بی بی اور سویرا کے متضاد رویے حیرت انگیز تھے۔

☼ ☼ ☼

ہال میں قدم رکھتے ہی راحیل کو معمول سے زیادہ گہما گہمی کا احساس ہوا' سب گھر والوں کے درمیان اسے دو نئی صورتیں نظر آئیں' وہ دروازے سے تھوڑا آگے آکر رک گئے۔

"ارے راحیل لالہ۔۔۔ آئیں ناں رک کیوں گئے۔" سب سے پہلے فردین کی نظر ان پر پڑی تھی' وہ سب کو سلام کرکے آگے آگئے۔

"راحیل کیسے ہو بیٹا! ماشاء اللہ بارہ سالوں میں تو اور بھی زیادہ سوبر اور پیارے ہوگئے ہو تم۔۔۔" ساجدہ خالہ نے راحیل کے سر پر ہاتھ پھیرا' راحیل' ساجدہ خالہ کو پہچان گئے تھے' ساتھ ہی ان کے ساتھ کھڑے ہوئے ڈیسنٹ سے لڑکے نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"اور ان سے ملیے یہ ہیں ساجدہ خالہ کے ہونہار فرزند ارجمند جناب فہیم بھائی صاحب اور جلد ہی ہمارے مستقبل میں ہونے والے بہنوئی صاحب۔۔۔" فردین نے شرارت سے مسکراتے ہوئے فہیم کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے۔ بہنوئی والی بات پر راحیل نے الجھ کر فردین کو دیکھا تو وہ بولا۔

"ارے لالہ! یہ شرمین کے منگیتر ہیں۔"

فہیم کے ہاتھ پر راحیل کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی' ان کے چہرے کے تاثرات میں سنجیدگی بڑھ گئی۔ وہ ساجدہ خالہ کی طرف گھوم کر ان کی خیریت دریافت کرنے لگے۔ فہیم کو ان کا رویہ کچھ مبہم لگا۔

راحیل بے خیالی میں شرمین کے ساتھ ہی ٹو سیٹر صوفے پر بیٹھ گئے۔ کسی کے لیے یہ کوئی اہم بات نہ تھی۔ دونوں ایک ہی گھر کے فرد تھے۔ پر فہیم کی آنکھوں میں کوئی کانٹا چبھا تھا۔ اس پر مستزاد راحیل نے شرمین کو چائے بنانے کا کہا تو وہ جھٹ اس کے لیے چائے بنانے لگی۔ یہ مناظر فہیم کے لیے ناگوار تھے۔ پُر تکلف ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ فہیم رات کو ہی واپس جانا چاہتا تھا۔ پر خراب موسم ہونے کی وجہ سے آغا صدر الدین نے زور دے کر اسے رات کو سفر کرنے سے منع کردیا۔

☼ ☼ ☼

وہ دوسری منزل کی بالکنی میں گرل پر کہنیاں ٹکائے کھڑے تھے گہری کالی رات میں ان کی آنکھیں نہ جانے وادی میں کیا دیکھ رہی تھیں۔ آہٹ پر انہوں نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ سویرا دونوں ہاتھوں میں چائے کے کپ لیے کھڑی تھی۔

"تھینک یو۔۔۔" انہوں نے مسکرا کر ایک کپ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"اتنی رات تک جاگ رہی ہو' سوئیں کیوں نہیں۔"

"آپ بھی تو جاگ رہے ہیں۔"

"میں تو جاگتا ہی رہتا ہوں۔ بہت کم نیند کی دیوی مہربان ہوتی ہے مجھ پر۔۔۔" ایک ہاتھ میں کپ لیے دوسرا ہاتھ جینز کی جیب میں ڈال کر وہ پھر وادی کی طرف گھوم گئے۔

"کیوں چھوڑ دیا آپ نے اسے؟" انہوں نے چونک کر سویرا کو دیکھا' پھر واپس اپنی پوزیشن میں آگئے۔ وہ بھی دو قدم آگے بڑھ کر ان کے ساتھ آکھڑی

ہوئی تھی۔ چہرہ ان کی طرف موڑ کر وہ ان کے تاثرات جانچ رہی تھی۔

"میں نے اسے نہیں، اس نے مجھے چھوڑ دیا۔" وہ آہستہ آہستہ گھونٹ بھر رہے تھے۔

"کیوں......" سویرا نے پوچھا۔

"کیونکہ......" انہوں نے رخ اس کی طرف موڑ لیا۔ "سور کا گوشت کھانے والوں میں وفا نہیں ہوتی۔"

"لو میرج تھی......" سویرا نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"باہر کی آزاد فضاؤں میں ہم جیسے اپنوں کے ٹھکرائے لوگ لو میرج ہی کرتے ہیں۔" سویرا کی نظریں اپنے کپ پر جھک گئیں۔

"چھوڑو...... تم یہ بتاؤ، تم خوش ہو۔"

"ہوں......" اس نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

"سچ......" ان کی تسلی نہیں ہوئی۔

اس نے سر اٹھا کر ان کی آنکھوں میں دیکھا اور مسکرا دی۔ "بالکل سچ!"

"گڈ......" وہ بھی مسکرا دیے...... "مجھے خوشی ہے، میرا یہاں سے جانا رائیگاں نہیں گیا۔"

"پر راحیل! میں گلٹی فیل کرتی ہوں، مجھے لگتا ہے کہیں نہ کہیں آپ کے اور آپ سے متعلق سب کے دکھوں کی ذمہ دار میں ہوں۔" اس نے اپنی بے چین نظریں راحیل کے چہرے پر جما دیں۔

"پاگل......" انہوں نے سویرا کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"ایسے نہیں سوچتے۔ جس انسان کی زندگی میں جو دکھ ہے، وہ اسے ہر حال میں مل کر رہتا ہے، یہ دکھوں اور سکھوں کے سلسلے ہمیں ابد سے ملتے ہیں اور لحد تک ساتھ جاتے ہیں۔ میں یہاں رہتا تو ہم دونوں ہی دکھی رہتے، اچھا ہے۔ اب ہم میں سے کوئی ایک خوش بھی تو ہے۔" ان کی بات پر سویرا کچھ کہنا چاہتی تھی، پر پیچھے ابھرنے والی چاپ پر دونوں ہی گھوم گئے۔

"وہ...... آپی! شہیر جاگ گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں آتی ہوں۔" سویرا تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

سوتے سے جاگنے پر شہیر کا یا جا بند کروانا مشکل کام تھا۔ شرمین نے اس کے پیچھے قدم بڑھائے۔

"سنو......" راحیل کی آواز پر اسے رکنا پڑا۔ "یہ کپ لیتی جاؤ۔" خود کو ان کی نظروں کے حصار میں محسوس کرکے اس کے قدم من من بھر کے ہو جاتے تھے۔ اس نے جلدی سے کپ لیا اور تقریباً" بھاگتی ہوئی کچن کی طرف آ گئی۔

☼ ☼ ☼

سویرا شہیر کے ساتھ بیڈ پر لیٹی اسے تھپک تھپک کر تقریباً" سلا چکی تھی۔ تب ہی شرمین، شہیر کے دوسری طرف آ کر لیٹ گئی۔ سویرا نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ وہ بھی مسکرا دی۔

"آپی...... ایک بات پوچھوں آپ سے......" شرمین نے آہستہ سے پوچھا۔

"پوچھو......" اس کے ہاتھ مسلسل شہیر کو تھپک رہے تھے۔

"بارہ سال پہلے راحیل لالہ نے آپ سے شادی سے انکار کیوں کیا تھا؟" سویرا نے اس کی طرف دیکھا پھر اس کے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوئی۔

"انکار انہوں نے نہیں، میں نے کیا تھا۔"

"واٹ؟" وہ جھٹکا کھا کر اٹھی، پر اس خیال سے کہ کہیں شہیر جاگ نہ جائے۔ جلدی سے واپس لیٹ گئی۔

"پر ہم سب تو یہ ہی جانتے ہیں کہ آغا جان کے سامنے راحیل لالہ نے آپ سے شادی سے انکار کیا تھا تو سزا کے طور پر آغا جان نے انہیں حویلی چھوڑ دینے کا حکم دے دیا تھا۔"

"ہاں! کوئی بھی نہیں جانتا، سوائے ہم دونوں اور امیر ماموں کے۔ جب راحیل حویلی سے چلا گیا تو امیر ماموں اسے منا کر واپس لینے گئے تھے۔ تب راحیل نے انہیں ساری حقیقت بتا دی تھی۔ انہوں نے آغا جان

کو سمجھانے کی بہت کوشش کی' پر آغا جان اولاد کے ہاتھوں پسپا ہونے کو تیار نہ تھے۔ پھر انہیں امی کی بیوگی کا دکھ تھا۔ وہ ان کا دکھ بانٹنے کے لیے نہ جانے کب سے میرے اور راحیل کے رشتے کا سوچے بیٹھے تھے۔"

"آپ کے انکار کی وجہ شہریار بھائی تھے۔"

"ہاں! شہریار مجھے چاہتے تھے۔ میں جب بھی اپنے تایا کے گھر جاتی' شہریار کی آنکھیں میرے اردگرد محبت کا جال بُننے لگتیں اور مجھے پتا بھی نہ چلا' میں کب' کیسے اس جال میں الجھتی چلی گئی' جب مجھے پتا چلا کہ آغا جان نے میرے اور راحیل کے رشتے کے سلسلے میں امی سے بات کی ہے تو مجھے اور تو کچھ سمجھ نہیں آیا' سوائے اس کے میں راحیل سے بات کروں' کیونکہ امی تو الف سے ے تک کسی اور کو راحیل پر ترجیح دینے کے لیے تیار نہ تھیں۔ اس لیے میں نے راحیل سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں شہریار کے سوا کسی سے شادی کر کے خوش نہیں رہ سکتی اور انہوں نے ساری برائی اپنے سر لے لی' ناکردہ گناہ کی سزا بارہ سال کاٹی۔" یہ کہتے کہتے سویرا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

شرمین کا دل بھی راحیل کے لیے دکھ سے بھر گیا' ورنہ وہ تو ہمیشہ اس سارے معاملے میں راحیل کو غلط سمجھتی رہی تھی۔ بارہ سال اس نے حاجرہ بی بی کو راحیل کی یاد میں آنسو بہاتے دیکھا تھا۔ اسے بہت غصہ آتا تھا اس بیٹے پر جو ماں کو جدائی کی آگ میں جلنے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔

"گل بی بی' راحیل لالہ کو غلط سمجھتی ہیں' آپ نے انہیں کیوں نہیں بتایا کہ وہ غلط نہیں تھے۔"

"امی تو کیا' میں سب کو بتا دیتی' پر راحیل نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ حالات کچھ بھی ہوں' میں کچھ نہیں بولوں گی۔ شرمین ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کا اظہار محبت سخت ناپسند کیا جاتا ہے' لڑکی کے منہ سے نکلی بات خاندان کے لیے گالی بنتی ہے اور خود اس کے لیے ساری عمر کے طعنے۔ پر محبت کرنے والوں کی عقل پر پردے پڑے ہوئے ہیں' وہ یہ سب نہیں سمجھتے۔ وہ مجھ سے زیادہ سمجھ دار تھا' یہاں رہتا تو آغا جان کے فیصلے کے آگے اسے پسپا ہونا ہی پڑتا' سو اس نے یہاں سے چلے جانے کا ہی فیصلہ کر لیا۔" سویرا کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں' اس لیے وہ مزید کوئی بات کیے واپس اپنے کمرے میں آگئی۔

رات گئے تک وہ سویرا اور راحیل کے بارے میں سوچتی رہی اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ فہیم کی حویلی میں موجودگی کے باوجود اس کی سوچوں کا محور کچھ اور تھا۔

☆ ☆ ☆

"شمسہ بوا! آپ نے میرا گولڈن فریم والا چشمہ دیکھا ہے کہیں۔" وہ سوٹ بوٹ میں باہر جانے کے لیے تیار تھے۔ پر ان کا گولڈن فریم والا نظر کا چشمہ نہیں مل رہا تھا۔

"بیٹے' میں تو سارے گھر کی صفائی اپنی نگرانی میں کروا چکی ہوں' پر میں نے تو نہیں دیکھا کہیں' گھر سے باہر تو نہیں' لے کر گئے تھے۔" شمسہ بوا کچن میں کھڑی آملیٹ کے لیے پیاز کتر رہی تھیں۔

"گھر سے باہر....." انہوں نے دماغ پر زور ڈالنا شروع کیا۔ "ہاں صبح باغ میں نیوز پیپر پڑھا تھا میں نے' تب وہ میرے پاس ہی تھا' شاید میں باغ میں ہی بھول آیا ہوں۔" جلد ہی انہیں یاد آگیا اور وہ تیزی سے باغ کی طرف آئے۔ بڑا ہی خوب صورت نظارہ تھا' کھلتے ہوئے سرخ رنگ کے سوٹ میں وہ بھی باغ میں کھلا کوئی گلاب ہی لگ رہی تھی۔

"بھمرو' بھمرو شام رنگ بھمرو' آئے ہو کس بگھیا سے ہو اوا' ہو اوا' ھم ھم....." دیوار کے ساتھ بنی کیاریوں میں لگے پودوں کو وہ موٹے پائپ سے پانی دے رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ لہرا لہرا کر گنگنا بھی رہی تھی۔ وہ بنا چاپ کیے اس کے پیچھے آئے۔ ارادہ تھا شرمین سے ہی چشمے کے بارے میں پوچھ لیں گے۔

"سنو تم نے میرا چشمہ تو نہیں دیکھا۔"

وہ جو اپنے خیال میں مست گا رہی تھی' اچانک راحیل کی آواز پر گھبرا کر پلٹی' تو پائپ سے نکلنے والی موٹی دھار نک سک سے تیار راحیل کو سر سے پیر تک بھگو

گئی۔ "اوہ..." پائپ شرمین کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ دبالیا۔ ادھر راحیل کو 440 والٹ کا شاک لگا۔ انہوں نے شدید حیرت سے پہلے اپنا حلیہ اور پھر شرمین کو دیکھا۔ راحیل کی غصے سے بھری نگاہ دیکھتے ہی شرمین ان کی سائڈ سے نکل کر بھاگی' پر راحیل نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑلی۔

"آ... آ... آئم سوری! پلیز... پلیز... چھوڑ دیں۔" راحیل کا بس چلتا تو اسے بے نقط سناتے' پر اس کے چہرے پر چھائی خجالت اور بے بسی دیکھ کر ان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتے رہے اور وہ اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرتی رہی۔ اچانک راحیل نے اسے چھوڑ دیا۔ شرمین نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ وہ اسے ڈانٹتے' غصہ کرتے تو شاید اسے حیرت نہ ہوتی' پر بغیر کسی ری ایکشن کے چھوڑ دینے پر اسے عجیب لگا۔ ان کی گہری نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ بھاگ کر اندر آگئی اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی نگاہوں کو اس کے تعاقب میں جانے سے نہ روک سکے۔ یہ جانے بغیر کہ کسی اور کی نگاہیں بھی یہ سارا منظر دیکھ رہی ہیں۔

کل شام چائے پر دونوں کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر فہیم کی آنکھوں میں کانٹا چبھا تھا۔ پر آج باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے دونوں کو اتنا قریب اور راحیل کے ہاتھ میں شرمین کی کلائی دیکھ کر اس کے دل میں خنجر اتر گیا۔ حویلی میں اس کا ایک ایک پل قیامت کی طرح بھاری ہوگیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنی ماں کو لیے راولپنڈی کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔ شرمین کو پتا چلا تو وہ تاسف اور دکھ میں جیسے ڈوب سی گئی' آج سے پہلے تو فہیم کبھی اس سے ملے بغیر نہیں گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"وہ رہا..." فردین نے نرمین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ تینوں حویلی کی چھت پر رمضان کا چاند دیکھنے کے لیے موجود تھے۔

"کہاں مجھے تو نظر نہیں آرہا۔" نرمین چھت کی آدھی دیوار سے اچک اچک کر دیکھنے کی کوشش کررہی تھی۔

"اتنی دور سے کہاں نظر آئے گا' تھوڑا قریب آکر دیکھو۔" فردین کے بلانے پر وہ تھوڑا قریب چلی گئی۔

"کہاں' یہاں سے بھی نظر نہیں آرہا۔"

"تو تھوڑا اور قریب آؤ نا' بالکل میرے پاس' پھر نظر آئے گا۔" دوربین آنکھوں سے لگائے وہ آسمان پر کم نرمین کو زیادہ دیکھ رہا تھا۔

"ہوں... اچھا... شرمین... شرمین... ذرا ادھر آنا۔" نرمین' فردین کی چالاکی سمجھ گئی تھی۔

"اوہو... شرمین کو کیوں بلا رہی ہو' اسے دہیں دیکھنے دو نا چاند۔"

"تم نا... میں سب سمجھتی ہوں تمہاری چالاکی۔" نرمین پیر پٹختی ہوئی خود ہی شرمین کے پاس چلی گئی۔

"اے کاش تم اتنی سمجھ دار نہ ہوتیں۔" فردین ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

"وہ دیکھو' وہ رہا۔" شرمین کو چاند نظر آگیا تھا' تینوں نے چاند دیکھ کر دعا مانگی اور نیچے سب کو بتانے آگئے۔

☼ ☼ ☼

حویلی کے ڈائننگ ہال میں رونق لگی ہوئی تھی' پہلی سحری کی افراتفری تھی۔ شمسہ بوا دیگر ملازمین کے ساتھ مل کر ٹیبل پر سحری کے لوازمات سجا رہی تھیں۔ تقریباً" سب ہی آچکے تھے۔ اچانک شرمین کو کچھ یاد آیا۔

"کہاں جارہی ہو شرمین! اب کھانا شروع کرو' پھر ٹائم کم رہ جائے گا۔" گل بی بی کے روکنے پر وہ پلٹی۔

"جی بس ابھی آتی ہوں' کمرے سے اپنی شال لے آؤں۔"

"شرمین بیٹا! راحیل کو بھی دیکھ لینا' وہ ابھی تک نہیں آیا۔" حاجرہ بی بی کی آواز سن کر وہ رکی پر بات سن کر عجیب کشمکش میں پڑگئی۔

راحیل سے وہ کچھ خوف زدہ سی رہتی تھی۔ ان کا

انداز سب کے ساتھ لیا دیا سا ہی ہوتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے سے شال اٹھائی۔ راحیل کے کمرے میں آئی۔ وہ کمرے میں نہیں تھے۔ "اب کہاں ڈھونڈوں" ایک دو کمروں میں دیکھنے کے بعد وہ لائبریری کی طرف آئی تو اندر لائٹ جل رہی تھی، وہ اندر آئی تو لائبریری کے **نسبتاً** اندھیرے حصے میں راحیل ایزی چیئر پر آنکھیں موندے نیم دراز تھے۔ ان کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا جو اب اختتام کے قریب تھا۔ وہ دو منٹ کھڑی سوچتی رہی انہیں کیسے اٹھاؤں۔ ان کی جگہ فردین ہوتا تو وہ اس کا بازو جھنجوڑ کر تھپڑ لگا کر بال نوچ کر بھی اٹھا دیتی پر راحیل کو چھونے کے خیال سے ہی اسے ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔

"راحیل لالہ..." اس نے سوچا آواز دے کر اٹھا دیتی ہوں، پر دو تین دفعہ پکارنے پر بھی انہوں نے آنکھ نہیں کھولی۔

"شاید بہت گہری نیند میں ہیں۔ اللہ... یہ سگریٹ تو ان کا ہاتھ جلا دے گی، پہلے اسی کو نکالتی ہوں۔" وہ خود کلامی کرتی ان کے ہاتھ کی طرف بڑھی، پھر بہت نرمی سے ان کی انگلیوں سے سگریٹ نکال کر ایش ٹرے میں دبا دیا۔

"توبہ! یہ تو اب بھی نہیں اٹھے کیا کروں۔" اس نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا۔

"کیا بات ہے۔"

"ہائے اللہ۔" راحیل کے اچانک آنکھیں کھول کر بولنے پر وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹی اور ایک ہاتھ سینے پر اور دوسرے سے ٹیبل کا کونا پکڑ لیا۔

"کیا راحیل لالہ، آپ بھی ناں ڈرا ڈرا کر مار ہی دیں گے مجھے۔"

"اچھا، واقعی... میں تو سمجھتا تھا خواتین مرتی ہیں مجھ پر۔ پر آج پتا چلا ڈر کر مر بھی جاتی ہیں۔" ان کے دھیمے لہجے میں ہلکی سی شوخی تھی۔

"جی۔" اسے امید نہیں تھی کہ وہ اس سے اس طرح کی بات کریں گے "وہ، بی بی جان نے بلایا ہے آپ کو سحری کے لیے۔" یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تیزی سے باہر آ گئی۔

راحیل کے حوالے سے اس کا ذہن الجھتا جا رہا تھا بظاہر انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی، پر کچھ تھا ضرور ایسا جو اسے چونکا رہا تھا۔ پہلے بھی کئی بار ان کی گھورتی آنکھیں اسے پریشان کر چکی تھیں۔

اور دوسری طرف راحیل ایزی چیئر پر جھولتے یہ بات سوچ رہے تھے کیوں یہ لڑکی میرے حواسوں پر سوار ہوتی جا رہی ہے۔ اس گھر میں کسی کی امانت ہے وہ۔ مجھے اس کے لیے اس انداز سے نہیں سوچنا چاہیے پر یہ میرا دل اس کے معاملے میں اتنا بے بس کیوں ہوتا جا رہا ہے یا اللہ اب اور کون سا امتحان میرے سامنے ہے۔

☼ ☼ ☼

فہیم اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا آج کتنے دن ہو چکے تھے پر وہ ایک منظر اس کی نگاہوں کے سامنے سے ہٹتا ہی نہیں تھا "راحیل کے ہاتھ میں شرمین کی کلائی" سوچ سوچ کر جلتا کڑھتا رہتا۔

"فہیم بیٹے! جب سے ہم بی بی جان کی طرف سے ہو کر آئے ہیں تم پریشان ہو، شادی کی کوئی بات کر رہی ہوں تو بھی تم بیزار ہو رہے ہو آخر بتاتے کیوں نہیں، کیا مسئلہ ہے۔ آج بتا ہی دو۔" ساجدہ کتنے دنوں سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ کچھ بتا ہی نہیں رہا تھا، حویلی سے بھی وہ کچھ غصے میں جلدی جلدی کر کے انہیں لے کر آیا تھا، پر آج وہ مصمم ارادہ کر کے اس کے کمرے میں آئی تھیں کہ پوچھ کر ہی رہیں گی۔

"کیا بتاؤں امی! میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"جب خود کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو تو کسی دوسرے کی سمجھ سے چل لینا چاہیے بیٹا۔" اور پھر اس نے جو دیکھا جو سمجھا وہ سب اپنی ماں کو بتا دیا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا فہیم! یہ سب تمہارا وہم ہے وہ تو ہمارے وہاں جانے پر بہت خوش تھی۔ کبھی کبھی

آنکھوں دیکھا بھی غلط ہو جاتا ہے بیٹے۔"

"ہو سکتا ہے امی! آپ صحیح کہہ رہی ہوں پر میرا دل نہیں مان رہا۔ میں ایک بار اسے چیک ضرور کروں گا اگر واقعی اس کے جذبوں میں ملاوٹ نکلی تو پھر آپ بھول جائیے گا کہ شرمین نام کی کوئی آپ کی بھانجی بھی تھی۔"

ساجدہ کو اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا کیونکہ جانتی تھیں کہ اگر ایک بار مرد کے دل میں شک کا بال آجائے تو پھر کوئی طاقت اسے نکال نہیں سکتی۔

☼ ☼ ☼

"کچھ کر رہی تھیں بیٹا۔" حاجرہ بی بی شرمین کے کمرے میں آئیں تو وہ اپنے کپڑے چیک کر رہی تھی۔

"جی بی بی جان! ساجدہ خالہ جو کپڑے لائی تھیں وہ سل کر آگئے ہیں وہی دیکھ رہی تھی۔" اس نے کپڑے سائیڈ میں کر کے ان کے لیے بیڈ پر جگہ بنائی۔

"اچھا اچھا' اللہ پہننا نصیب کرے۔ بیٹا میں یہ کہنے آئی تھی کہ تمہاری عیدی تو تمہاری خالہ لے آئی تھیں پر نرمین کے لیے ابھی تک کچھ نہیں آیا۔ سوچا تھا سویرا آئے گی تو ایبٹ آباد جا کر لے آؤں گی پر وہ اپنی سسرال میں خاصی مصروف ہے آج کل' آ نہیں پا رہی۔ تم ایسا کرو دونوں بہنیں راحیل کے ساتھ اسلام آباد چلی جاؤ' وہاں سے نرمین کے کپڑے' جوتیاں اور جیولری لے آؤ اور اپنے لیے بھی میری طرف سے جو چاہو لے لینا۔"

وہ مسکرا دی "میرے پاس تو ضرورت سے بہت زیادہ ہے بی بی جان! نرمین کے لیے شاپنگ کر لوں گی۔ کب تک جائیں گے راحیل لالہ۔"

"بس وہ تھوڑی دیر تک نکلنے ہی والا ہے اور ہاں تمہاری ساجدہ خالہ کا فون آیا تھا آج ان کی طرف افطار کی دعوت ہے وہاں بھی چلی جانا۔" یہ سنتے ہی شرمین کے چہرے پر حیا کے رنگ بکھر گئے۔

☼ ☼ ☼

"تم یہاں کیا کر رہے ہو۔" نرمین اپنے چہرے کے گرد شال لپیٹتی باہر آئی تو دیکھا بلیو جینز اور بلیک ٹی شرٹ میں ملبوس فردین سلور گرے کرولا سے ٹیک لگائے انگلی میں کی چین گھماتے ہوئے سیٹی پر بڑی پیاری دھن بجا رہا تھا۔

"بادشاہ سلامت! ملکہ عالیہ کا انتظار فرما رہے ہیں۔" وہ بڑی ادا سے بولا۔

"اوہو' بادشاہ سلامت ذرا ملکہ عالیہ کے لیے شاہی سواری کا دروازہ تو کھولیے" وہ بھی ناز سے اٹھلائی۔

"اجی ملکہ عالیہ! ہم تو دل و جان کے دروازے کھولے کھڑے ہیں آپ آئیں تو سہی" یہ کہتے ہوئے اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا وہ بھی آج موڈ میں تھی۔ ملکاؤں والی شان سے چلتی آئی اور لباس فاخرہ سنبھالتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ فردین دروازہ بند کر کے پلٹا تو بلبلا اٹھا۔ شرمین نے اس کا کان کھینچا ہوا تھا۔ نرمین کے پیچھے وہ سارا منظر دیکھتی آرہی تھی۔

"بنتے ہو بادشاہ سلامت اور حرکتیں کرتے ہو دربانوں والی۔ کسی بادشاہ نے اپنی ملکہ کے لیے دروازہ کھولا ہے' کبھی۔" نرمین کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اسے ہنستا دیکھ کر فردین لال پیلا ہو گیا۔

"یہ سب تمہاری بہن کی چالاکی ہے پر کوئی بات نہیں' دیکھ لوں گا میں بھی۔" اس وقت راحیل بلیک ڈریس پینٹ اور گرے شرٹ میں ملبوس آنکھوں پر ڈارک سن گلاسز لگائے مونچھوں تلے ہلکی سی مسکراہٹ لیے باہر آئے۔

"ہاں بھئی' تیار ہو سب' چلیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ہلکی پھلکی باتوں میں راستہ کٹا۔ فردین انہیں اسلام آباد کے التقوی شاپنگ مال میں لے آیا تھا۔

"اچھا بھئی اب سن لیں سب' یہ عیدی میرے نام کی ہے اس لیے میں خود نرمین کو اپنی پسند سے ساری شاپنگ کرواؤں گا۔ بزرگ اعتراض نہیں کریں گے۔"

"یہ بزرگ کسے کہا ہے تم نے۔ ہاں دو سال چھوٹی ہوں تم سے۔" شرمین نے پھر اس کا کان کھینچا۔

"ارے ارے دل پر کیوں لے رہی ہو۔ میں تو راحیل لالہ کو کہہ رہا تھا تم دو سال چھوٹی ہو پر وہ تو دس سال بڑے ہیں مجھ سے۔" اس کی بات پر راحیل مسکرا دیے۔

فردین نرمین کو لے کر کپڑوں والی دکانوں کی طرف چلا گیا۔ شرمین راحیل کے پیچھے پیچھے آگئی اسے اپنا یہاں آنا بالکل بے مقصد لگ رہا تھا وہ بیزاری کے عالم میں راحیل کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی وہ کبھی رسٹ واچز دیکھتے' کبھی موبائلز اور کبھی ڈیجیٹل کیمرے دیکھنے لگتے۔

"تم اپنے لیے کچھ نہیں لوگی۔" کچھ دیر بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"نہیں' میرے پاس سب کچھ ہے۔"

"بی بی جان نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کی طرف سے تمہارے لیے ایک اچھا سا سوٹ لے آؤں' آؤ اس شاپ میں دیکھتے ہیں۔" پھر انہوں نے اس کے لیے کھلتے ہوئے سرخ رنگ کا فل ایمبرائیڈڈ سوٹ پسند کیا۔

"یہ کلر تم پر بہت سوٹ کرتا ہے شرمین اس روز بھی تم نے یہی کلر پہنا ہوا تھا۔" انہوں نے سوٹ سیلز گرل کو پیک کرنے کے لیے دیتے ہوئے کہا۔

"کس دن۔" وہ یاد کرنے لگی کہ کس دن اس نے یہ کلر پہنا تھا۔

"جس دن تم نے پودوں کے ساتھ ساتھ مجھ پر بھی چھڑکاؤ کر دیا تھا۔"

شرمین وہ منظر یاد کر کے ہنس دی اور راحیل کو اس کی ہنسی کی جھلملاہٹ میں اپنا دل سینے سے جاتا محسوس ہوا۔

"محبت کرتی ہو فہیم سے؟" بڑا ہی اچانک اور بے ربط سوال آیا تھا ان کی طرف سے۔ وہ حیران رہ گئی چند لمحے سمجھ میں نہیں آیا کیا جواب دے۔

"منگیتر ہے وہ میرا۔"

"کیا یہ ضروری ہے کہ منگیتر ہو تو محبت بھی ضرور ہو۔"

"جی یہ ضروری نہیں۔ پر دس سال سے جڑے رشتے میں دل بھی جڑ ہی جاتا ہے۔"

"اوہ۔" انہیں اپنے سینے میں دل سکڑتا محسوس ہوا۔ وہ مزید کوئی بات کیے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے۔

☼ ☼ ☼

فردین نے نرمین کو چار اسٹائلش سوٹ ہمراہ میچنگ شوز اور جیولری دلوائے' پھر راحیل وہیں سے اپنے دوست کی طرف چلے گئے اور یہ تینوں ساجدہ خالہ کی طرف آگئے' انہوں نے بہت محبت سے تینوں کا استقبال کیا افطار کا وقت قریب تھا۔ فہیم بھی آفس سے آچکا تھا۔ شرمین دل ہی دل میں بہت خوش تھی پر فہیم کے سامنے وہ مسلسل مصنوعی ناراضی کا اظہار کر رہی تھی' جس کا فہیم کے نزدیک کچھ اور ہی مطلب بن رہا تھا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر فہیم اور فردین واپس آئے تو ساجدہ خالہ نے شرمین کو چائے بنانے کچن میں بھیج دیا فہیم بھی کسی بہانے وہاں سے اٹھ کر کچن میں آگیا۔ فہیم کو کچن میں دیکھ کر شرمین نے رخ پھیر لیا۔

"کیا بات ہے۔ بہت برا لگ رہا ہوں کیا؟" اس کی گہری نظریں مسلسل شرمین کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"جی' بہت برے لگ رہے ہیں۔" اس نے روٹھے انداز سے جواب دیا۔

"کیوں' کوئی اور اچھا لگنے لگ گیا ہے کیا؟" اس کے لہجے میں طنز کی گہری کاٹ تھی۔

شرمین نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا کھولتے پانی کا ساس پین جھلک گیا کچھ پانی اس کے ہاتھ پر بھی آیا پر۔ اسے اتنی تکلیف نہ ہوئی جتنی اذیت فہیم کی بات سے محسوس ہوئی۔

"فہیم! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ میرے لیے ایسا سوچیں گے۔"

"کیوں نہ سوچوں' جب سے آئی ہو۔ دیکھ رہا ہوں تمہارا منہ پھولا ہوا ہے۔"

"اوہ' میرا پھولا ہوا منہ تو نظر آگیا اور جو آپ مجھ

سے مل کر نہیں آئے تھے' وہ کچھ نہیں۔" بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس نے چائے دم کی اور دودھ الگ سے گرم کرنے کے لیے رکھ دیا۔

فہیم نے قریب آکر شرمین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"میرا تم سے نہ مل کر آنا تمہارے لیے پریشانی کا باعث ہے۔"

"بالکل اسی طرح جیسے آپ کے لیے میری ناراضی پریشانی کی وجہ ہے۔"

جلتے سلگتے دل پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑے اور سانسیں پُرسکون ہوگئیں' شرمین نے اس کی طرف سے رخ پھیرلیا۔ فہیم نے کندھوں سے گھما کر اسے سامنے کیا۔

"اچھا بابا سوری۔ آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔"

شرمین نے ناراض نظروں سے اسے دیکھا۔

"سوری کہہ تو دیا پھر کیوں ناراض ہو رہی ہو چلو اب جلدی سے ہنس کر دکھاؤ۔" فہیم کے اصرار پر ہلکی سی مسکراہٹ شرمین کے لبوں پر آگئی' پر ایک درد سا دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر گیا۔

وہ اس کی ناراضی کا شکوہ کرتا پر ایسی گری ہوئی بات نہ کرتا۔ باقی سارا وقت وہ نارمل ری ایکٹ کرتی رہی پر حویلی واپس آکر بھی فہیم کی یہ بات اسے کافی دنوں تک بے چین کیے رہی۔۔۔۔

✲ ✲ ✲

عید کا دن ہے گلے ہم کو لگا کر ملیے
رسم دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے

عید کے دن فردین کی جیسے ہی نرمین پر نظر پڑی اس نے مہدی حسن کا گایا ہوا یہ گیت گنگنانا شروع کردیا۔ اتفاق سے وہ دونوں اس وقت سیڑھیوں کے قریب کھڑے تھے آس پاس کوئی نہیں تھا۔

"کیوں پھر کیا خیال ہے۔" فردین نے سارے زمانے کی محبت آنکھوں میں سمو کر پوچھا۔

"خیال یہ ہے کہ اب میں بھی تمہیں کچھ سناؤں۔" نرمین کی شرارتی رگ پھڑک اٹھی۔

"ویٹس گڈ ارشاد" فردین کو مزا آگیا۔

"ہوں سنو"

عید آئی ہے زمانے میں
فردین گر گیا غسل خانے میں

"واٹ"

"ایک اور بھی ہے۔"

ڈبے میں ڈبہ ڈبے میں کیک !!!
فردین صدر الدین لاکھوں میں ایک

کیوں ہیں نا اچھے شعر؟"

"کیا یار بچوں والے شعر سنا رہی ہو۔ کوئی جوانوں والے شعر سناؤ نا پھڑکتے ہوئے مچلتے ہوئے۔" یہ کہتے کہتے وہ کچھ اس کے قریب آنے لگا تو وہ ایک دم بولی۔

"اچھا' پھڑکتے ہوئے مچلتے ہوئے۔ دیکھ رہے ہیں آغا جان یہ کیسی باتیں کررہا ہے مجھ سے۔" فردین کرنٹ کھا کر پلٹا مگر پیچھے دور سے آتے فیروز بابا کو دیکھ کر وہ نرمین کی چالاکی سمجھ گیا۔ واپس مڑا تو وہ سیڑھیاں چڑھ کر ہنستی ہوئی ۔۔۔ بھاگ رہی تھی۔

"اتنی سمجھ دار کیوں ہو تم آخر؟" فردین نے دانت پیستے ہوئے ہتھیلی پر مکا مارا۔

✲ ✲ ✲

"لیں بی بی جان! گلاب جامن کھائیں میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں۔" تازہ تازہ گرم گرم گلاب جامن پلیٹ میں سجا کر شرمین سب سے پہلے بی بی جان کے پاس لائی۔

"ماشاء اللہ' اللہ نظر بد سے بچائے میری بچی کو۔ یہ تو بہت ہی مزے دار ہیں۔" انہوں نے ایک گلاب جامن اٹھا کر چکھی۔

"بیٹا سسرال والے کپڑے کیوں نہیں پہنے۔ آج وہ پہن لیتیں ویسے تو ان کپڑوں میں بھی بہت پیاری لگ رہی ہو۔"

"بی بی جان! جب سسرال جاؤں گی تو ان کے کپڑے

پہن لوں گی۔ ابھی تو آپ کے پاس ہوں اس لیے جو کپڑے راحیل لالہ نے آپ کی طرف سے دلوائے وہ پہن لیے۔" اس نے محبت سے کہا تو بی بی جان نے آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

"یہ گلاب جامن تو میرے راحیل کو سب سے زیادہ پسند ہیں۔ جاؤ جلدی سے اسے کھلا اور اپنی عیدی بھی لے لینا۔ فردین اور نرمین تو دونوں لڑ کر اس سے عیدی نکلوا چکے ہیں۔"

"جی اچھا' پر یہ راحیل لالہ ہیں کہاں۔ مجھے تو ابھی تک نظر نہیں آئے۔"

"وہ ابھی ابھی اپنے کسی دوست کی طرف جانے کے لیے نکلا ہے۔ دیکھو ابھی برآمدے میں ہی ہو گا۔" وہ پلیٹ سنبھالتی مڑ کر برآمدے کی طرف بھاگی۔

"راحیل لالہ۔" اس کی آواز پر وہ رک گئے۔ وہ بھاگتی ہوئی ان کے سامنے آئی۔ اس وقت حویلی کے بڑے سے صحن میں پہلے سے کھڑی چار گاڑیوں کے پیچھے ایک گاڑی آکر رکی تھی پر دونوں کی توجہ اس طرف نہ گئی۔

"عید مبارک راحیل لالہ۔ لیں گلاب جامن کھائیں۔ ابھی ابھی مجھے بی بی جان نے بتایا ہے کہ آپ کو بہت پسند ہیں۔ یہ میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں۔" بھاگ کر آنے کی وجہ سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔

"واقعی' زبردست..." انہوں نے ایک گلاب جامن اٹھا کر اپنے منہ میں رکھا۔ "ہوں... بھئی یہ تو بہت ہی لذیذ ہیں' ایک اور لے لوں۔"

وہ ہنس دی... "جتنے دل چاہے لے لیں اور مجھے میری عیدی دیں۔"

"ہاں بھئی۔ تمہاری عیدی... لو یہ باقی گلاب جامن تم کھاؤ۔" انہوں نے آدھی گلاب جامن کھا کر باقی آدھی اس کے منہ میں ڈال دی۔

"ہم اپنا والٹ نکالتے ہیں۔" والٹ میں سے پانچ پانچ ہزار کے دو نوٹ نکال کر انہوں نے اس کی طرف بڑھا دیے۔

"ارے نہیں... نہیں... یہ تو بہت زیادہ ہیں۔" وہ اتنے پیسے لیتے ہوئے ہچکچائی۔

"اتنی مزے دار گلاب جامن اور اتنی پیاری مسکان کے لیے تو لاکھوں بھی کم ہیں۔"

"جی... " وہ کچھ کہہ بھی نہیں۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولے۔

"ارے بھئی۔ فردین اور نرمین کو بھی اتنے ہی دیے ہیں۔ لے لو' شاباش..." یہ سن کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور پیسے لے لیے' پھر رکے بغیر مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی اور راحیل ٹھنڈی سانس بھر کے گیٹ کی طرف بڑھ گئے...

یہ سارا منظر اس گاڑی میں بیٹھے دو افراد کے دلوں میں ہلچل مچا گیا جو ابھی ابھی چار گاڑیوں کے پیچھے آکر رکی تھی۔ فہیم نے تیزی سے گاڑی ریورس کی اور گیٹ سے باہر نکال لے گیا۔

"فہیم بیٹے! رکو تو سہی' مجھے اس سے بات تو کرنے دو' ہو سکتا ہے..."

"بس امی اب یہ مت کہئے گا کہ آنکھوں دیکھا بھی غلط ہو سکتا ہے۔" غصے سے فہیم کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

"اچھا گاڑی احتیاط سے چلاؤ۔ کہیں غصے میں کوئی ایکسیڈنٹ نہ کر بیٹھنا۔ پہاڑی علاقہ ہے۔" ساجدہ کو فہیم کی اور اپنی جان کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"رات ہو گئی' ساجدہ اور فہیم ابھی تک نہیں آئے' اللہ خیر کرے۔" حاجرہ بی بی کو فکر ہو رہی تھی۔

"آپ نے فون کیا وہاں..." آغا صدر الدین کے لہجے میں بھی پریشانی تھی۔

"جی شام سے کتنے ہی فون کروا چکی ہوں' نہ فہیم موبائل اٹھا رہا ہے اور نہ ہی پی ٹی سی ایل کوئی اٹھاتا ہے۔"

"ہوں... چلیں' دیکھتے ہیں' صبح تک کوئی خیر خبر نہ آئی تو کسی کو بھیج کر پتا کرواتے ہیں' آپ فکر نہ کریں'

سب ٹھیک ہوگا۔" آغا صدر الدین نے حاجرہ بی بی کو تسلی دی' پر شرمین کے دل کو چین نہیں آرہا تھا۔
فکر تو سب ہی کو تھی' پر جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ شرمین کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ صبح چار بجے تک اسے نیند نہیں آئی' تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے وہ کمرے سے نکل کر نیچے آئی' ابھی اس کے قدم آخری سیڑھی پر ہی تھے کہ آغا صدر الدین کے کمرے کا دروازہ کھلا اور پینٹ کوٹ میں ملبوس راحیل کہیں جانے کے لیے تیار ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ اٹھائے باہر آئے۔ یہ اس وقت کہاں جارہے ہیں۔
"راحیل لالہ...." برآمدے کی طرف اٹھتے راحیل کے قدم رک گئے۔ وہ تیزی سے چلتی ان کے قریب آئی۔
"آپ کہیں جارہے ہیں۔"
"ہاں...."
"کہاں...."
"لندن...."
"اس وقت اچانک؟ سب خیریت تو ہے نا۔"
"وہاں ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں سمیرا کی ماں کی ڈیتھ ہوگئی ہے' مجھے سمیرا کو اپنی کسٹڈی میں لینا ہے' اس لیے ایمرجنسی میں جارہا ہوں۔"
"اوہ.... کب تک واپس آئیں گے سمیرا کو لے کر۔"
"بہت جلد آجاؤں گا ان شاء اللہ...."
"اچھا.... اپنا اور سمیرا کا خیال رکھیے گا۔" وہ ان کے دل کے قریب تھی۔ پر اس وقت بہت ہی اپنی لگی۔ انہوں نے نرمی سے اس کے گال کو چھوا۔
"تم بھی اپنا خیال رکھنا۔" یہ کہہ کر وہ بیگ اٹھا کر باہر چلے گئے اور وہ کافی دیر وہیں کھڑی اپنے گال پر ان کے پوروں کا لمس محسوس کرتی رہی۔
کبھی کبھی ایک لمحہ انسان پر بہت کچھ واضح کر جاتا ہے۔ شاید وہ بھی ایک ایسا ہی لمحہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ ساجدہ' یقیناً" تمہیں اور فہیم کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے اور غلط فہمیوں کی بنیاد پر برسوں کے رشتے نہیں توڑے جاتے۔" صبح نہ جانے کب اس کی آنکھ لگی تھی اور اب آنکھ کھلنے پر اسے سب سے پہلا خیال فہیم اور ساجدہ خالہ کا آیا تھا۔ وہ ان کی بابت جاننے کے لیے نیچے لاؤنج میں آئی تو اس کے کانوں میں بی بی جان کی آواز پڑی' وہ دروازے میں ہی رک گئی' کسی کو اس کے آنے کا نہیں پتا چلا' سب کا دھیان بی بی جان اور ساجدہ خالہ کی ہونے والی گفتگو پر تھا۔
"شرمین تمہاری بھانجی ضرور ہے ساجدہ! پر اس کی تربیت میرے ہاتھوں ہوئی ہے اور مجھے اپنی تربیت پر پورا بھروسا ہے' وہ کوئی ایسا کام نہیں کرسکتی جس پر ہمارے سر شرم سے جھک جائیں۔"
یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے' ایسا کیا کہا ہے ساجدہ خالہ نے میرے متعلق' بی بی ان کو۔ کیا کیا ہے میں نے آخر....
"تمہارا دماغ چل گیا ہے راحیل اس گھر کی بچیوں کے لیے اپنی زندگی برباد ضرور کرسکتا ہے' پر ان کی خوشیاں تباہ نہیں کرسکتا' تم یہ رشتہ نہیں کرنا چاہتیں تو نہ کرو' پر میرے بچوں کی کردار کشی مت کرو۔"
شرمین کے حواسوں پر بم پھٹا تھا' ساجدہ خالہ نے مجھ پر الزام لگایا ہے۔ راحیل لالہ کے حوالے سے....
"کیوں.... کوئی اور اچھا لگنے لگا ہے کیا؟" فہیم کی آواز اسے اپنے آس پاس گونجتی محسوس ہوئی۔
شرمین کا سر چکرانے لگا۔ اسے اپنے آس پاس ہر چیز گھومتی محسوس ہوئی وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی۔ دھڑام کی آواز پر سب کی نظریں ایک ساتھ دروازے کی طرف اٹھیں جہاں شرمین بے ہوش ہو کر گری تھی۔

☼ ☼ ☼

آج پورے بائیس دن بعد وہ کھلی ہوا میں سانس لینے باغ میں آئی تھی۔ کسی نے اس سے فہیم اور ساجدہ خالہ کے متعلق بات نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود اسے اپنے لیے ہر کسی کی نگاہ ترحم آمیز لگتی۔ اس

کا دل ہر وقت غم میں ڈوبا رہتا' دس سال پر محیط یہ رشتہ کیا اتنا کچا تھا کہ ایک جھٹکے میں توڑ دیا جاتا' لایعنی سوچیں آنسو بن کر اس کے چہرے پر بہہ رہی تھیں' اسے پتا بھی نہ چلا' کوئی کتنی دیر سے اسے دیکھ رہا ہے۔

"ہیلو...." بہت پیاری اور میٹھی سی آواز اس کے کانوں نے سنی' چہرہ موڑ کر دیکھا تو پنک فراک' پنک شوز پہنے کاندھوں تک آتے بالوں کی اونچی سی پونی بنائے ایک انگریز بچی اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی' اس نے جواباً" حیرت سے کہا۔

"ہیلو...." بچی اس کے قریب آئی اور اپنی فراک کی جیب سے ایک چھوٹا سا رومال نکال کر اس کے آنسو صاف کرنے لگی' شرمین کو بچی کی اس حرکت پر بے طرح پیار آیا۔ اس نے بچی کو گود میں لے کر اس کے پھولے پھولے گالوں پر پیار کیا۔

"آپ کون ہو اور رو کیوں رہی ہو۔" شرمین کو پھر حیرت ہوئی' کیونکہ بچی بالکل صاف اردو بول رہی تھی۔

"پہلے آپ بتاؤ' آپ کون ہو؟"

"میں سمیرا راحیل ہوں۔"

"سمیرا راحیل...."

"اوہ تو اس کا مطلب راحیل لالہ آگئے' اب جب انہیں اس ساری بات کا پتا چلے گا تو.... اوہ تو۔ یا اللہ میں کیسے ان سے نظریں ملا پاؤں گی۔ یہ کیا کردیا فہیم تم نے' مجھے میرے ہی اپنوں سے نظر ملانے کے قابل نہیں چھوڑا۔" اس کی آنکھیں ایک بار پھر نم ہو گئیں۔

"آپ کیوں رو رہی ہو۔ اچھے بچے نہیں روتے۔" سمیرا کی بات پر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"میں بچی تو نہیں ہوں۔"

"بڑے تو بالکل بھی نہیں روتے۔"

"ہوں.... صحیح...."

"مجھے تو آپ بہت اچھی لگی ہیں۔" سمیرا نے معصومیت سے کہا۔

"مجھ سے دوستی کریں گی۔" شرمین نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

"ضرور کیوں نہیں۔" سمیرا نے اس کی فرینڈ شپ قبول کرلی۔ اس کی معصوم باتوں میں شرمین اپنا دکھ بھول گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کھانے پر سب ہی موجود تھے۔ سوائے شرمین کے' اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر کھانا کمرے میں ہی منگوا لیا تھا' پر درحقیقت وہ راحیل کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ ابھی تک کسی نے راحیل کو شرمین کا رشتہ ٹوٹنے کی خبر نہیں دی تھی۔

"سمیرا کہاں ہے؟" راحیل نے کھانا شروع کرنے سے پہلے نرمین سے پوچھا۔

"وہ شرمین کے ساتھ کمرے میں ہے' کھانا کھا کر سو چکی ہے۔"

"ارے ہاں.... یہ شرمین کہاں ہے' صبح سے نظر ہی نہیں آئی۔" انہوں نے اپنی پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے پوچھا۔

"نظر ملانے کے قابل چھوڑا ہوتا تو نظر آتی نا...."

"گل بی بی...." آغا صدر الدین کی گرجتی ہوئی تنبیہی آواز پر ہر سو سناٹا چھا گیا' اس ساری صورت حال پر راحیل شدید حیرت سے ہر ایک کا چہرہ تک رہے تھے۔ آغا صدر الدین کی غصے سے بھری آنکھیں چند سیکنڈ گل بی بی پر جمی رہیں' پھر وہ بولے۔

"کھانا شروع کریں سب...."

جیسے تیسے کھانا ختم کر کے راحیل آغا صدر الدین کے پیچھے ان کے کمرے میں آگئے۔

"یہ سب کیا تھا آغا جان.... میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔" جیسے ہی آغا صدر الدین دیوان پر بیٹھے' راحیل نے سوال کردیا۔

"ساجدہ اور فہیم نے رشتہ ختم کردیا ہے۔" وہ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"واٹ؟ پر کیوں....؟" راحیل کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

"وجہ تم ہو۔" ان کی گہری نگاہیں پل پل بیٹے کا چہرہ

پڑھ رہی تھیں۔

"میں۔۔۔ پر میں نے ایسا کیا کیا ہے آغا جان! جس کی وجہ سے انہوں نے رشتہ ختم کردیا۔" حیرت ان کے چہرے پر جم سی گئی تھی۔

"یہ تو اب تم ہی بتاؤ گے بیٹے۔ شرمین تو بچی ہے میں اس سے نہیں پوچھ سکا۔ فہیم کا کہنا ہے اس نے تمہیں اور شرمین کو بہت قریب دیکھا ہے۔"

راحیل چند سیکنڈ باپ کا چہرہ دیکھتے رہے، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس بات کا کیا جواب دیں، پھر وہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھے اور باپ کے قدموں میں بیٹھ کر ان کے گھٹنے پکڑ لیے۔

"آپ کو کیا لگتا ہے آغا جان! آپ کا بیٹا ایسی کوئی حرکت کرسکتا ہے، جس سے اس گھر کی بیٹی کی عزت پر کوئی حرف آئے۔"

آغا صدر الدین نے آگے جھک کر بیٹے کے چہرے کو ہاتھوں میں لیا۔ "مجھے یقین ہے اپنے بیٹے پر۔ پر رائی کا دانا تو ہوتا ہے، جس کا پہاڑ بنتا ہے میرے بچے۔" راحیل کی نظریں جھک گئیں اور پھر نظریں جھکائے جھکائے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ٹھیک ہے آغا جان! اگر اس سب کی وجہ میں بنا ہوں تو اسے دوبارہ فکس بھی میں ہی کروں گا، مجھے اس کی خوشیاں عزیز ہیں اور میں انہیں ہر قیمت پر واپس لاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ آغا جان کے کمرے سے باہر آگئے۔ پر ان کے لہجے میں آغا صدر الدین کو وہ رائی کا دانا مل گیا تھا، جس کا پہاڑ بنا تھا۔

☆ ☆ ☆

آج آفس میں کام بہت زیادہ تھا، اس کی نظریں مسلسل اسکرین پر اور ہاتھ کی بورڈ پر تھے۔ شیشے کی ٹیبل پر کی چین سے دی جانے والی دستک پر اس نے سر گھما کر دیکھا تو پھر اسکرین پر نظر ڈالنا بھول گیا۔ بلیک پینٹ کوٹ میں ملبوس دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے راحیل صدر الدین اس کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ ان کی بھرپور مردانہ وجاہت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ انہوں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے بددلی سے تھام لیا۔

"پلیز۔۔۔" اس نے چیئر کی طرف اشارہ کرکے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔

ان کے بیٹھتے ہی اس نے پوچھا۔ "چائے یا کولڈ ڈرنک۔۔۔"

"کچھ نہیں۔۔۔ میں یہاں یہ پوچھنے نہیں آیا کہ تم نے یہ سب کیوں کیا، میں صرف یہ جاننے آیا ہوں کہ آخر تم نے ایسا کیا دیکھا، جس نے تمہیں برسوں کا تعلق توڑنے پر مجبور کردیا، میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کتنے سچے ہو ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم خود کسی میں انوالو ہو اور الزام اس معصوم لڑکی پر لگا رہے ہو۔"

"میں کسی میں انوالو نہیں ہوں، پر وہ یقیناً" آپ میں انوالو ہے، میں نے خود اسے عید والے روز آپ کے ہاتھوں سے مٹھائی کھاتے اور ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا ہے، اس کا اور کیا مطلب بنتا ہے۔"

"تت۔۔۔ تت۔۔۔" ان کی زبان نے تاسف کا اظہار کیا۔ "اگر اس کا دل تم سے نہ جڑا ہوتا تو آج مجھے ایک بے وقوف اور شکی مزاج آدمی کے ساتھ اس کا رشتہ ختم ہونے کی خوشی محسوس ہوتی۔ تمہیں کیا لگا فہیم کہ بارہ سال حویلی سے دور رہ کر، میں کوئی اجنبی ہوگیا ہوں، میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں رہا، پاکستانی معاشرے میں زیادہ تر جوائنٹ فیملی سسٹم پروان چڑھتا ہے، ان فیملیز میں رہنے والی چچا، تایا کی اولادیں آپس میں بے تکلفی سے ہنستی بولتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے درمیان کوئی غلط رشتہ ہے۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو اب جہاں رشتہ کرو تو پہلے اچھی طرح چھان بین کرلینا، شاید ہی تمہیں کوئی اپنے معیار کے مطابق ملے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"فہیم! مجھے لگتا ہے اب اس بات کا کوئی فائدہ نہیں ہے، پر شاید تمہیں اپنی زیادتی کا احساس ہوجائے، اس لیے بتا رہا ہوں میری اہمیت اس کی نظر میں فردین جیسی ہی ہے، پر بڑا ہونے کی وجہ سے عزت اس سے بھی

زیادہ... مجھے پاکستان آئے دو ڈھائی ماہ ہوئے ہیں اور اس عرصے میں' میں اچھی طرح جان گیا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ باوفا ہے' پر حیرت ہے دس سال کے دلی تعلق کے باوجود تمہیں یہ پتا نہیں چل سکا کہ وہ تمہارے ساتھ بے وفا نہیں ہو سکتی۔" ان کی اس بات پر فہیم کا سر کچھ شرمندگی سے جھک سا گیا۔

☆ ☆ ☆

راولپنڈی سے مانجھیا واپس آتے آتے رات گیارہ بج گئے۔ ٹی وی لاؤنج میں سمیرا اور شرمین کارٹون کے ساتھ ساتھ پاپ کارن کا شغل بھی کر رہی تھیں۔ باپ پر نظر پڑتے ہی سمیرا بھاگ کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر آہستہ آہستہ چلتے شرمین کے پاس آگئے۔ انہیں قریب آتا دیکھ کر اس کی نگاہیں جھک گئیں۔

"کیسی ہو۔"

"ٹھیک ہوں' آپ ٹھیک ہیں۔"

"ہوں..."

"پاپا فرینڈ بہت مزے کا پاستا بناتی ہیں اور انہوں نے مجھے مزے مزے کی اسٹوریز بھی سنائی ہیں۔"

"فرینڈ نے..."

"جی... یہ ہی تو ہیں میری نیو فرینڈ..." سمیرا نے شرمین کی طرف اشارہ کیا تو وہ ہولے سے مسکرا دی۔

"تنگ تو نہیں کرتی تمہیں یہ..." انہوں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں' سمیرا بہت کیوٹ بے بی ہے۔"

"شرمین! میں تم سے..." نہایت سنجیدہ لہجے میں وہ اس سے کچھ کہنا چاہ رہے تھے' پر بات پوری ہونے سے پہلے ہی ایک طرف سے آتی گل بی بی کو دیکھ کر چپ ہو گئے۔

دونوں کو دزدیدہ نظروں سے دیکھتی گل بی بی کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ شرمین کے لیے وہاں مزید رکنا دوبھر ہو گیا۔ نرمین کی زبانی اسے کل ڈنر میں ہونے والی ساری بات کا علم ہو چکا تھا۔ وہ تیز قدموں سے اپنے

کمرے کی طرف چلی گئی۔ راحیل سمیرا کو گود میں اٹھائے اسے جاتا دیکھتے رہے۔

٭ ٭ ٭

دو دن بعد ان کے پاس ساجدہ خالہ کا فون آیا۔
"راحیل بیٹے میری فہیم سے تفصیلی بات ہوئی ہے، شرمین کے سلسلے میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا ہے، پر بیٹے مرد کی انا آڑے آجاتی ہے اور ویسے بھی تم جانتے ہو، تھوک کر چاٹنا آسان نہیں ہوتا، سیٹل منٹ کسی نہ کسی قیمت پر ہوتا ہے۔"
راحیل کو ان کی باتوں سے دکھ ہوا، پھر بھی انہوں نے پوچھ لیا۔ "آپ بتائیں کیا چاہتی ہیں۔"
"جب تک تم حویلی میں ہو۔ وہ تعلقات استوار نہیں کر سکے گا۔"
ایک تلخ سی مسکراہٹ راحیل کے لبوں کو چھو گئی۔
"ٹھیک ہے، آپ آغا جان سے بات کریں، میں لندن واپس چلا جاؤں گا۔"
یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا اور سگریٹ جلا کر کڑوا کسیلا دھواں اگلنے لگے۔

٭ ٭ ٭

"یہ دیکھو، میں اپنی گڑیا کے لیے کیا بنا کر لائی ہوں۔" اس نے سارے جہان کی ایکسائٹمنٹ لہجے میں بھر کر کہا۔ "چاکلیٹ شیک... سمیرا کو پسند ہے نا، لو پیو۔" سمیرا اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر آہستہ آہستہ چاکلیٹ شیک پینے لگی۔
"مزے کا ہے نا۔"
"ہوں مزے کا ہے، پر آپ نے تو کہا تھا آپ میرے لیے مینگو شیک بناؤ گی۔"
"ہاں وہ بھی بناؤں گی، پر کل..."
"کل تو ہم چلے جائیں گے۔" شرمین نے حیرت سے سمیرا کو دیکھا۔
"چلے جائیں گے؟ کہاں چلے جائیں گے۔"
"لندن..."
"لندن... اتنی جلدی، پر کیوں..."
"آئی ڈونٹ نو... پاپا نے تو مجھے یہ ہی بتایا کہ ہم کل لندن واپس جا رہے ہیں۔"
سمیرا کی بات سن کر شرمین سوچ میں پڑ گئی۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو راحیل لالہ واپس آئے ہیں، پھر اتنی جلدی کیوں واپس جا رہے ہیں، اگر کسی کام کے سلسلے میں جا رہے ہیں، تو پھر سمیرا کو کیوں لے جا رہے ہیں، اپنے ساتھ۔"
چند دن میں ہی سمیرا اس کے ساتھ کتنی اٹیچ ہو گئی تھی۔ حویلی میں اور بھی لوگ تھے۔ پر وہ شرمین کے ساتھ ہی زیادہ رہنا پسند کرتی تھی، اس کے ساتھ کھیلتی، اس کے ہاتھ سے کھاتی اور اس کے ساتھ سوتی تھی۔ شرمین کا دل سمیرا کی جدائی کا سوچ کر دکھ سے بھر گیا۔

٭ ٭ ٭

"نہیں راحیل! ایک بار پھر میں تمہیں وہی غلطی نہیں دہرانے دوں گا۔" وہ اپنے بابا امیر الدین کے لیے روز کی طرح آج بھی چائے لے کر آئی تھی۔ پر اندر سے آنے والی آوازوں نے اس کے قدم روک لیے۔
"میں نے بارہ برس بھابھی کو آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ بھائی جان نے کبھی اظہار نہیں کیا۔ پر میں جانتا ہوں، ہر نماز کے بعد لمبی لمبی دعاؤں میں وہ صرف تمہیں مانگتے رہے اور شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جو فردین نے مجھ سے یہ نہ پوچھا ہو کہ راحیل لالہ کب واپس آئیں گے۔ میں اپنی بیٹی کی خوشیوں کے لیے اتنے لوگوں کی خوشیاں قربان نہیں کرنے دوں گا تمہیں۔"
چائے کا کپ شرمین کے ہاتھ میں لرز گیا۔
"اب کچھ نہیں ہو سکتا چچا جان! میں آغا جان سے وعدہ کر چکا ہوں کہ ہر قیمت پر اس سارے معاملے کو دوبارہ فکس کروں گا۔ اماں جان، آغا جان اور فردین میری جدائی کے عادی ہو چکے تھے۔ پھر ہو جائیں گے، مگر شرمین کے سامنے ساری عمر پڑی ہے، جس لڑکی پر ایک دفعہ الزام لگ جائے اسے کوئی اچھی طرح اپناتا نہیں۔ اس معاشرے میں اور پھر دس سال کی نسبت ٹوٹ جانا کوئی معمولی بات تو نہیں، چند دن بعد اس کی

شادی ہونے والی تھی۔ کیا گزرتی ہوگی اس پر سوچ سوچ کر' کاش میں اس کی شادی سے پہلے یہاں نہ آیا ہوتا۔"

شرمین کے لیے مزید کھڑا رہنا مشکل ہوگیا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آگئی اور دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

☆ ☆ ☆

نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ایش ٹرے میں سگریٹوں کا ڈھیر بڑھتا ہی جارہا تھا' ان کی آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی تھیں۔ دستک کی آواز پر وہ چونک گئے۔

"دیس.... کم ان...." دروازہ کھول کر شرمین اندر آگئی۔

"تم... اس وقت...." راحیل بیڈ پر نیم دراز تھے۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

شرمین نے کمرے کا جائزہ لیا۔ صوفے پر ان کا سوٹ کیس کھلا ہوا تھا۔ کچھ کپڑے اندر' کچھ باہر تھے۔ سینٹر ٹیبل پر ان کا پاسپورٹ' ٹکٹ اور کچھ فائلز بکھری ہوئی تھیں۔

"آپ کہیں جارہے ہیں۔"

"ہاں.... پر تمہیں یہاں اس وقت نہیں آنا چاہیے تھا۔" ان کے لہجے میں ایک انجانا سا خوف بول رہا تھا۔

"اس حویلی کی لڑکیوں کے لیے قربانی دینے کا ٹھیکہ صرف آپ نے اٹھایا ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا' پھر دھیرے سے مسکرادیے۔

"مجھے اس حویلی کی لڑکیوں کی خوشیاں بہت عزیز ہیں۔"

"اوہ آپ تو دیوتا ہوگئے اور ہم کتنی خود غرض.... پر افسوس' جس کی خوشی کے لیے آپ نے قربانی دی' وہ تو خوشی پھر بھی نہیں پاسکی۔"

"کیا مطلب....؟" انہوں نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"مطلب یہ کہ آپ کے جانے کے دو سال بعد سویرا آپی کی شادی ہوئی۔ تین سال تک اولاد نہ ہونے کی وجہ سے سسرال والوں نے زندگی اجیرن کیے رکھی' پھر شہریار بھائی کی دوسری شادی کرکے انہیں دبئی بھیج دیا۔ سال چھ مہینے کے بعد وہ دس پندرہ دن کے لیے آپی کے پاس آتے تھے۔ آٹھ سال بعد خدا نے انہیں شہیر سے نوازا' پر دوسری طرف ان کے تین بچے ہوچکے تھے۔ اسی لیے ان پر زیادہ حق دوسری بیوی اور اس کی اولاد کا ٹھہرا' ان کے ساس' سسر ان کا میکے آنا جانا زیادہ پسند نہیں کرتے' وہ صرف ان دنوں میں یہاں آتی ہیں جب ان کے ساس' سسر دبئی دوسری بہو اور اس کے بچوں سے ملنے جاتے ہیں۔ گل بی بی آپ سے ناراض رہتی ہیں' کیونکہ وہ آپ کو اپنی بیٹی کی خوشیوں کا قاتل سمجھتی ہیں' اس وقت اگر آپ سویرا آپی سے شادی کرلیتے تو انہیں آج صرف محبت نہ ملنے کا دکھ ہوتا' پر اپنوں کے ساتھ ہونے کا سکھ تو ہوتا' ایسی اذیت ناک زندگی تو نہ ہوتی' جو وہ اب گزار رہی ہیں۔" یہ کہتے کہتے شرمین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"پر اس نے تو مجھے بتایا تھا کہ...." انہیں اپنی ہی

آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"کہ وہ بہت خوش ہیں یہ ہی نا۔۔۔ محبت کی شادی کی تھی' اپنا بھرم تو رکھنا ہی تھا انہیں اور پھر اب وہ اپنی ناکام محبت کا رونا رو کر کریں بھی کیا۔" راحیل کو اپنی ٹانگیں بے جان ہوتی محسوس ہوئیں' وہ بیڈ پر گر سے گئے۔

"میں اتنی رات کو آپ سے یہ کہنے آئی ہوں کہ اب میرے لیے آپ کو کوئی قربانی دینے کی ضرورت نہیں' ایک شکی اور بیمار ذہنیت کا مرد بھی کسی کو خوشی نہیں دے سکتا' میں سمیرا کی ماں بن کر تو ساری عمر خوش رہ سکتی ہوں پر فہیم سے شادی کر کے خوش نہیں رہ سکتی۔"

راحیل نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا' پر وہ اپنی بات کہہ کر رکی نہیں' تیزی سے دروازے سے نکلتی چلی گئی' وہ حیرت سے سوچتے رہ گئے۔ یہ کیا کہہ گئی تھی۔۔۔

☆ ☆ ☆
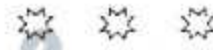
صبح ناشتے کے بعد انہوں نے اپنی تیاری پر آخری نظر ڈالی۔ اور اپنے کچھ دوستوں سے ملنے باہر چلے گئے۔ شرمین کی بات کو انہوں نے اس کی جذباتیت پر محمول کیا تھا۔ پر سمیرا کے لیے ان کا دل واقعی دکھی تھا۔ واپسی پر انہوں نے حویلی کے گیٹ سے ساجدہ خالہ کی گاڑی کو نکلتے دیکھا۔

"اوہ۔۔۔ تو اس کا مطلب معاملہ فکس ہو گیا۔" درد کی لہر ان کے سینے میں اٹھی۔ وہ حویلی کے اندر آئے تو فیروز بابا نے انہیں حاجرہ بی بی کا پیغام دیا۔ وہ ان کے کمرے میں آئے تو حاجرہ بی بی نماز کے بعد دعا مانگنے میں مشغول تھیں۔

"آپ نے بلایا اماں جان۔۔۔"

"ہاں بیٹا۔۔۔ بہت دیر سے نظر نہیں آئے۔" انہوں نے جا نماز تہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی کچھ دوستوں سے ملنے چلا گیا تھا۔ ساجدہ خالہ آئی تھیں۔ اتنی جلدی چلی گئیں۔"

"رک کر کیا کرنا تھا انہوں نے۔۔۔"

"کیوں؟ وہ تو فہیم کا رشتہ لے کر آئی تھیں نا دوبارہ۔۔۔"

"ہاں پر امیر الدین نے انکار کر دیا۔"

"چچا جان نے انکار کر دیا۔۔۔ پر کیوں۔۔۔؟" ان پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔

"کیونکہ اسے شرمین کے لیے فہیم سے زیادہ اچھا رشتہ مل گیا ہے۔"

"پر۔۔۔ شرمین کسی اور رشتے پر کیسے مانے گی اماں جان۔۔۔" راحیل کی بات سن کر وہ مسکرا دیں۔

"وہ مان گئی ہے۔" انہوں نے بے یقینی سے ماں کی طرف دیکھا۔

"کس کا رشتہ آیا ہے شرمین کے لیے۔۔۔"

"راحیل صدر الدین کا۔۔۔" انہیں اپنی سماعت پر شبہ ہوا' پر جب اماں جان نے ان کے ماتھے پر بوسا دیا تو انہیں یقین آ گیا کہ انہونی ہو گئی ہے۔

انہوں نے ماں کو بازوؤں کے حلقے میں لے کر ان کا سر سینے سے لگا لیا اور جواباً" اپنی خوشی کے اظہار کے طور پر ان کا سر چوم لیا۔

☆ ☆ ☆

راحیل' سمیرا کو ڈھونڈتے ہوئے باغ کی طرف آئے تو سامنے کا منظر دیکھ کر ان کے قدم رک گئے۔ سمیرا تتلی کی طرح باغ میں بھاگتی پھر رہی تھی اور شرمین آنکھوں پر پٹی باندھ کر سمیرا کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی' وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باغ میں آئے تو سمیرا کو پکڑنے کی کوشش میں شرمین ان سے ٹکرا گئی۔ آنکھوں سے پٹی ہٹا کر دیکھا تو راحیل کو خود سے بہت قریب پایا۔

"پکڑ لیا۔۔۔ پکڑ لیا' فرینڈ نے بابا کو پکڑ لیا۔" سمیرا اچھل اچھل کر تالیاں بجا رہی تھی۔ انہوں نے سمیرا کو گود میں اٹھایا۔

"جی بیٹا! فرینڈ نے آپ کے بابا کو پکڑ لیا۔ پر چھوڑیں گے اب ہم بھی نہیں۔"

انہوں نے ذو معنی لہجے میں شرمین کی طرف جھکتے ہوئے کہا تو وہ شرما کر اندر بھاگ گئی اور ان کی آنکھوں میں چمکتے چاند چہرے کا عکس جھلملا اٹھا۔

☆

لوگوں کا انداز بالکل اپنے اردگرد کے ماحول سے میل کھاتا ہے۔ جواد جیسے ہی ___ اسپتال کے دروازے سے داخل ہوا تو اس کے امپورٹڈ بوٹ سنگ مرمر کے چمک دار فرش جیسے تھے۔ دونوں میں ہی اپنا عکس دیکھا جاسکتا تھا۔ عملے کی کلف زدہ وردی کی طرح اس کا مہنگا سوٹ بھی بے داغ تھا۔ لیکن اسپتال آنے والے مریض اور تیمار دار پل پل مرض سے ڈولتی زندگی کی کشتی کو موت کے دہانے پر دیکھتے ہیں جس سے ان کا وجود انکساری کا پیکر لگتا تھا، مگر جواد کی اکڑی ہوئی گردن میں کوئی لچک پیدا نہیں ہوئی۔ وہ رعب سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔

"دیکھو یقیناً" "یہ وہی ہے۔" کاؤنٹر پر کھڑی عورت نے ساتھ والی سے وثوق سے کہا گویا جواد کے چہرے کی اکتاہٹ اور ماتھے کے بلوں میں اس کا نام پرویا ہوا تھا۔

"ثمینہ بی بی! کون سے کمرے میں ہیں۔" اس نے مریضہ کا اصلی نام لیا تھا۔

کاؤنٹر پر کھڑی عورت سوچ میں پڑ گئی تو جواد نے مریضہ کے مشہور زمانہ نام کا سہارا لیا۔

"مہتاب بیگم کون سے کمرے میں ہیں۔" عورت نے سمجھ کر فوراً" سمت واضح کی تو جواد بے زاری سے بڑھ گیا۔

"تین دن سے ماں ناساز حالت میں یہی کہتی جا رہی ہے کہ میرے بیٹے کو بلا دو اور یہ اتنے فون کرنے کے بعد آیا بھی ہے تو یوں جیسے کسی پر احسان کر رہا ہو۔ ہونہہ اس دن کے لیے اولاد پیدا کی جاتی ہے' سچ ہے کچھ لوگوں کے لیے پیسہ ہی ہر رشتہ ہوتا ہے۔" عورت نے دبے لفظوں میں ساتھی سے کہا پھر بھی اس کی سرگوشی جواد تک پہنچ گئی۔

"وہ تو وہاں آنا ہی نہیں چاہتا تھا اور اس لمحے اس کا شدت سے دل چاہا کہ وہاں سے پلٹ جائے جیسے سالوں پہلے ثمینہ اس کے روتے بلکتے وجود سے نگاہ پھیر کر پلٹ گئی تھی۔

وہ بستر پر آنکھیں موندے لیٹا ظاہر کر رہا تھا کہ گہری نیند میں ہے۔ کئی دن سے اس کے ماں باپ کے درمیان ہونے والی چپقلش اس وقت آخری معرکے کی طرح عروج پر تھی۔

"قسمت گھر چل کر دروازے تک آئی ہے تو اس کو ٹھوکر کیسے مار دوں؟ ہماری زندگی سنور جائے گی۔" ثمینہ شادی کے اتنے سالوں بعد بھی اس قدر جاذب نظر تھی کہ ایک فلم پروڈیوسر نے دیکھتے ہی اس کو بڑے پردے پر آنے کی پیشکش کر دی تھی۔

"تمہاری مصروفیت بڑھنے پر گھر' بچہ' میں سب ہی نظر انداز ہوں گے۔ میں تمہیں ایسی راہ چلنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔"

اس کا شوہر بھی گھٹنے ٹیکنے پر آمادہ نہ تھا۔ پھر بحث طویل ہو کر پہلے لڑائی پھر جنگ میں بدل گئی جس میں کوئی بھی فریق ہارنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ثمینہ نے شوہر کے خلاف جا کر فلم میں کام شروع کر دیا۔ پیسے کی آمد' رتبہ' ستائش یہ سب در کھلے تو اس کو ہر طرف اپنی جیت نظر آنے لگی۔ اس کو یقین تھا جلد اس کا شوہر بھی اس کی کامیابی سے مرعوب ہو کر ہتھیار ڈال دے گا۔

مگر ایسا نہ ہوا اور بے شمار ملنے والے ایوارڈز میں طلاق کا تمغہ بھی شامل ہو گیا۔ گھر سے بغیر اجازت قدم باہر نکالنے والی عورت کو ٹھوکر مار کر اس کے شوہر نے بھی جیت پر اپنی مہر ثبت کر لی۔ بس جو شکست خوردہ ہوا تھا وہ جواد کا ننھا وجود تھا جو اس قدر زخمی ہوا تھا کہ سنبھل نہ پایا۔

کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر وہ پھر شش و پنج کا شکار ہوا' پھر اس نے خود کو باور کروایا کہ وہ وہاں صرف اپنی ماں کی خاطر آیا ہے۔ اس لیے حوصلہ کر کے اندر داخل ہو گیا۔

بستر پر لاغر سی ثمینہ بے سدھ پڑی تھی۔ اس نے ثمینہ سے مہتاب بن کر بے پناہ عروج دیکھا تھا مگر اس کا انجام بھی ہر ایک کی طرح زمین کے چھ فٹ نیچے ہی ہونا تھا۔

جواد نے قریب کھڑی نرس سے ثمینہ کی طبیعت دریافت کی پھر صوفے پر بیٹھ کر ایک بار پھر ماضی میں کھو گیا۔

سب اسے مبارک باد دے رہے تھے کہ اس کی ماما آگئی ہیں تو اس نے بھی خوشی سے سجی سنوری دلہن کو دیکھا جو اس کی نئی ماما تھیں مگر یہ خوشی جلد ہی ماند پڑ گئی۔ سائرہ اس کے تمام کام کرتی تھی مگر اس کے وجود میں ممتا کی گرمائش نہیں تھی۔ جواد کو وقت پر کھانا ملتا' اس کا یونیفارم ہمیشہ استری ہوتا' مگر سائرہ میں اس کے دن بھر کے قصے اور بے ربط سوالات سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ سائرہ ایک فرماں بردار بیوی تھی جو شوہر کی وفا میں جواد کا ہر کام فرض کی طرح کرتی تھی۔ مگر اس کا وجود جواد کے لیے اپنائیت سے خالی تھا۔ نتیجتاً" جواد ذہنی دباؤ کے باعث نیند کا کچا ہو گیا اور اکثر ہی ڈر کر رات کو باپ کے بستر میں آلیٹتا۔ بس یہاں سائرہ کا بھی ضبط جواب دے گیا۔ شوہر میں شراکت برداشت نہ ہوئی تو

اس نے رات کو کمرے کے دروازے کے باہر ایک تپائی بطور رکاوٹ رکھنا شروع کردی جس کے باعث جواد نہ تو دروازہ کھول پاتا اور نہ ہی دستک دے کر کھولنے کی فریاد کرسکتا تھا اس لیے وہ پلٹ جاتا اور سہم کر اکیلے ہی رات گزار دیتا۔ دن گزرنے کے ساتھ جواد کی زندگی کے رنگ پھیکے پڑنے لگے اور سائرہ کے کمرے میں زرق برق ننھے کپڑوں کی آمد ہونے لگی۔ سب نے ایک بار پھر مبارک باد دینا شروع کردی کہ جواد کی بہن آنے والی ہے پر اس بار جواد نے کسی کا یقین نہ کیا خوش خبریوں سے اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔

ایک رات شدت پیاس سے سائرہ کی آنکھ کھلی تو چکراتے سر کو سنبھالتے ہوئے اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور بے خیالی میں اپنی ہی رکھی تپائی سے ٹکرا کر اوندھے منہ جاگری۔ تین دن سائرہ اسپتال رہی اور گھر میں اس کی گود سونی ہوجانے کا ماتم چھایا رہا۔ جواد بھی تین رات نہ سوسکا پھر چوتھی رات سویا تو گرمائش کے باعث مہینوں بعد ایسے سکون سے سویا کہ صبح ہی بیدار ہوا۔ بیدار ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ سائرہ اس کے ساتھ اسے لپٹائے ہوئے لیٹی ہے۔ پہلی ٹھوکر سے ہی سائرہ کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے جواد میں اپنی حقیقی اولاد دیکھنا شروع کردی۔ پھر اس نے کبھی اپنے دروازے کے آگے تپائی نہیں رکھی اور اس کی محبت اور توجہ سے جواد اتنا پرسکون ہوگیا کہ اس نے جلد ہی راتوں کو ڈرنا چھوڑ دیا۔ یہ احساس کہ کبھی بھی اس کے قدم ڈگمگائیں تو اس کی ماں اسے سنبھال لے گی' جواد کو بلا کا پراعتماد کرگیا۔

سالوں بعد جب جواد کی شادی کے موقع پر ثمینہ نے بیٹے اور بہو سے ملنے کی خواہش کی تو یہ حقیقت کہ اسے جنم دینے والی کوئی اور ہے' ایک انکشاف کی طرح اسے یاد آئی۔ ثمینہ کے دوبارہ زندگی میں آنے سے کئی کڑوے ابواب کھل گئے تھے' اس لیے جواد نے ملنے سے انکار کردیا۔ مگر ثمینہ بیش بہا قیمتی تحائف لیے خود ہی گھر چلی آئی۔ ثمینہ نے سالوں کی بے اعتنائی کے فاصلے دولت کی بیساکھیوں کے زور پر طے کرنے چاہے مگر ناکام رہی۔ جواد کے باپ کی موت کے بعد وہ مسلسل رابطے میں رہنے لگی۔ مگر بچوں کی پیدائش' ان کی سالگرہ اور دوسرے موقعوں پر لگائے جانے والے اس کے تحفوں کے انبار بھی جواد کے دل سے بچپن کی ان تاریک سرد راتوں کے داغ نہ دھوسکے جو اس نے سہم کر ماں کو پکارتے کاٹی تھیں۔

ثمینہ عمر بڑھنے کے ساتھ بڑے پردے سے چھوٹی اسکرین پر آنے لگی پھر عمر نے مزید اپنا سفر جاری رکھا تو اس کو کام پر آرام کو فوقیت دینی ہی پڑی۔ تب اسے احساس ہوا کہ اس نے جو بویا تھا وہی کاٹنا نصیب ہوگا۔ وہ پذیرائی کی چاہ میں گھر سے نکلی تھی۔ اب تمام دنیا کی پذیرائی بھی گنوا کر وہ صرف اپنے بیٹے کے منہ سے ستائش کی خواہاں تھی۔ بڑھتی ہوئی دولت میں وہ خوشی کہاں تھی جو اپنے سامنے اپنے پوتے پوتیوں کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر حاصل کرسکتی تھی۔

اس نے جواد اور اپنی بہو کو سمجھایا کہ وہ اس کے ساتھ رہیں اور سائرہ کی عفو و درگزر کی تربیت جواد کے فیصلے میں شامل ہو بھی جاتی اگر ثمینہ یہ نہ کہتی کہ سائرہ کو اپنے حقیقی بیٹے کے سپرد کردے۔ اس تجویز پر جواد بھڑک اٹھا اور دوٹوک کہہ دیا کہ سائرہ ہی اس کی ماں ہے۔ ثمینہ کو اس کے متعلق بات کرنے کا حق نہیں۔

ثمینہ نے ایک بار پھر فرار کا راستہ اختیار کیا اور عہد کیا کہ مرجائے گی مگر سوتن کے گھر میں رہ کر اپنی اولاد کے منہ سے اس کو ماں سن کر دن نہیں کاٹے گی۔ اس لیے رابطہ منقطع کرکے اپنے ہی ٹھکانے پر مقیم رہی' پر اب جب وہ سانسوں کی بھی محتاج ہوگئی تھی تو قسم توڑ کر بیٹے کو بلوایا۔

پر اب جواد کے لیے ثمینہ کا وجود بے سایہ شجر بن چکا تھا۔ وہ اس کی زندگی کو چھو کر اس میں شمولیت کے لیے دستک دیتی اور جب جواد بچپن کی تلخ یادوں کی کڑواہٹ بھلا کر اس کے لیے در کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا تو معلوم ہوتا وہ کب کی جاچکی ہے۔ ثمینہ کی اس آنکھ مچولی نے سمجھ دار جواد کے اندر اب بھی وہ آٹھ سالہ بچہ زندہ رکھا ہوا تھا۔ وہ ثمینہ سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اسپتال سے آنے والے فون سن کر ٹال دیتا' اسپتال کے رستے پر گاڑی ڈالتا اور آدھے رستے سے ہی

واپس موڑ لیتا۔ اب بھی وہ وہاں نہ آتا اگر سائرہ کو اس کی بیٹی سے صورت حال معلوم نہ ہوئی ہوتی۔ سائرہ نے آفس سے آتے ہی جواد کو کمرے میں بلوالیا تھا۔

”تمہیں یاد ہے جب تم چھوٹے تھے‘ میں اپنے دروازے کے آگے تپائی رکھ دیتی تھی؟“

سائرہ کی بات پر جواد نے آنکھیں چرالیں۔ یہ واحد بات تھی جو جواد کو سائرہ کا سوتیلا ہونا یاد کراتی تھی۔ اس لیے اس نے سالوں سے اس پر قفل ڈالے ہوئے تھے اور سائرہ نے بھی کبھی یہ موضوع نہ چھیڑا تھا۔ اب جواد کے ماضی کی ایک گرہ کھلنے والی تھی۔

”ہم سب کے اندر ایک فرعون ہوتا ہے‘ جو کہتا ہے کہ ہم اپنی قسمت لکھنے پر قادر ہیں۔ جو ہمارے گناہوں پر ہمارے دل کو تسلی دیتا ہے کہ وہ ضرورت ہیں۔ میں نے بھی ضمیر کی ملامت کو نظرانداز کرکے تپائی رکھنا شروع کی تو بے خبر تھی کہ میں ماں کی ممتا اور محبت کو اپنے در سے داخل ہونے سے روک رہی ہوں۔ لیکن میں جلد سنبھل گئی۔ ثمینہ بدقسمت تھی جس نے اپنے فرعون کی پرستش شروع کردی۔ اس نے بھی گھر چھوڑتے ہوئے اپنے اور تمہارے بیچ ایک غائبانہ تپائی رکھی تھی تاکہ تم اس کے پاؤں کی زنجیر نہ بنو۔ بس اس نے تپائی ہٹانے میں بہت دیر کردی کیونکہ تپائی ہٹانے کے لیے جھکنا پڑتا ہے۔ ہم سب مسلمان ہیں‘ جھکے بغیر ہماری نماز ادا نہیں ہوتی مگر انکساری اس کے عمل سے روکنے کے لیے ہماری انا ــــ کس کس طرح ہمارے بیچ آجاتی ہے۔ ثمینہ کو بھی جب تمہارے اور اس کے بیچ رکھی تپائی ہٹانے کا موقع نہ ملا تو اسے تمہاری محبت میں میری شراکت برداشت نہ ہوئی۔ اور وہ پلٹ گئی۔ جانتے ہو‘ کہیں نہ کہیں ہم سب فاصلے بڑھانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ پہلی تپائی ثمینہ نے رکھی تھی دوسری شاید تمہارے باپ نے‘ تیسری نہ جانے کس نے ــ دیکھتے ہی دیکھتے تپائیوں کا ڈھیر لگ گیا جس کو کسی نے ہٹانے کی کوشش نہ کی۔

اب وہ ڈھیر لوہے کی سل بن گیا ہے۔ ہمیں اللہ نے ایک بڑے مقصد کے لیے چنا ہے۔ تمہیں اپنے اور ثمینہ کے بیچ کی تپائی ہٹانی ہے۔ تم سزا دو گے تو یہ لوہے کی سل آہستہ آہستہ تمہیں چاروں طرف سے قید کرلے گی۔ وقت گزر گیا تو تم چاہ کر بھی تبدیلی نہ کرسکو گے۔ تمام عمر ناخنوں سے لوہے کی سل نوچتے رہنے سے بہتر ہے کہ انہیں ــــ معاف کردو۔“

سائرہ تحمل سے سمجھا رہی تھی اور جواد سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”اسپتال جاؤ اس کی بات سنو‘ جو سالوں کا بوجھ تم دل میں لیے پھرتے ہو کیا خبر اس کی تلافی اسی میں ہو۔“

اور اب وہ ثمینہ سے دو فٹ دور بیٹھا تھا۔ ثمینہ کے جسم میں حرکت شروع ہوئی تو جواد اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ثمینہ کی آنکھیں اپنے بیٹے کو سامنے دیکھ کر نم ہوگئیں۔ اس نے ٹوٹے فقروں میں ماضی کی غلطیوں کی معافی مانگی تو جواد نے معاف کرکے خود کو بھی ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

”میرا مرض لاعلاج ہے مگر میری بے سکونی کا علاج تمہارے پاس ہے‘ ایک بار مجھے بچپن کی طرح امی کہہ کر بلاؤ۔“ ثمینہ چالیس سالہ جواد میں چار سال کا بچہ دیکھ رہی تھی۔

جواد جانتا تھا کہ اس کا ایک لفظ ان کے بیچ کی تپائی کو نیست و نابود کردے گا مگر ایسا کرنا اس کے نزدیک سائرہ سے بے وفائی تھی۔ حقیقت جو بھی تھی لیکن وہ سائرہ میں ہی اپنی حقیقی ماں دیکھتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ یہ سائرہ کی بھی خواہش تھی نہ جانے جواد نے پیدا کرنے والی کی آرزو کا احترام کیا یا پالنے والی کا مان رکھا مگر حقیقت میں اس نے دل کی گہرائی سے ثمینہ کو امی کہا تو اس نحیف وجود میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

وہ جواد کا ہاتھ تھامے مسکراتے چہرے کے ساتھ پرسکون ہو کر موت کی آغوش میں گئی اور جواد نے اس کے جنازے کو سہارا دے کر اپنی محرومیاں اور نفرتیں بھی اس کے ساتھ ہی دفنادیں۔

کئی سال کے بعد اس رات جگنوں کے مارے آٹھ سالہ بچے کے وجود کی باقیات آزاد ہو کر سرد پڑ گئیں اور وہ ایسے سکون قلب سے آشنا ہوا جس کی کمی کا اسے احساس نہ تھا۔

"بھئی واہ مزا آگیا۔ بہت لاجواب قیمہ بھرے کریلے بنائے ہیں تم نے فارینہ بیٹے۔ یہ لو تمہارا انعام۔"

تایا جان نے کھانے کے بعد نہ صرف کھانے کی بے ساختہ تعریف کی بلکہ سو سو کے دو نوٹ بھی فارینہ کی جانب بڑھا دیے۔

"تھینک یو تایا جان۔" خوشی سے اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔

"واہ پاپا یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ گرم ترین دوپہر میں قصائی کے سر پر کھڑے ہو کر قیمہ نکلوایا میں نے۔ سبزی کل خالہ جان خرید کر لائیں۔ کریلے چھیلے امی نے ان محترمہ نے تو صرف ہانڈی میں ڈوئی چلائی ہے

محض بڑبڑا کر رہ گیا تھا لیکن ماں کی بات سے ببانگ دہل اختلاف کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ اس گھر میں فارینہ کا ووٹ بینک بہت مضبوط تھا۔ سب اس کے حمایتی تھے اور وہ سب کی چہیتی تھی۔

خیر کم پیاری تو وہ غازی کو بھی نہ تھی بلکہ وہ اس کا پہلا اور آخری پیار تھی۔ غیر اعلانیہ منگیتر اور اکلوتی چچا زاد پلس خالا زاد کزن۔ ان تمام حوالوں سے ہی وہ اسے بہت عزیز تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اسے چڑائے بنا اور چھیڑ چھاڑ کیے بغیر غازی کا کھانا ہی ہضم نہ ہوتا تھا۔ فارینہ کون سا اس سے دبتی تھی 'غازی کی ہر بات کا دوبدو جواب دینا اس نے خود پر فرض کر رکھا تھا

راشدہ رفعت

اور انعام کی حق دار بھی یہ ہی قرار پائیں۔" غازی نے نقطۂ اعتراض بلند کیا دستر خوان کے گرد بیٹھے سب نفوس مسکرا دیے۔

فارینہ اور غازی کی نوک جھونک اس گھر کی معمول کی کارروائی تھی 'لیکن خلاف توقع آج فارینہ کے بجائے خالا جان کی طرف سے جواب آیا تھا۔

"آج تو بچی نے پکا لیا اور سب نے کھا لیا 'لیکن اب ایک مہینے تک کوئی قیمہ بھرے کریلے کا نام بھی مت لے۔ رمضان المبارک میں اتنی محنت طلب چیزیں نہیں بنائی جائیں گی۔ فرمائشیں کرتے وقت یہ بات سب کے ذہن میں رہے۔" انہوں نے دو ٹوک انداز میں سب کو باور کروایا تھا۔

"یہ بھی خوب رہی۔" غازی ماں کی بات سن کر

۔ بڑوں کے سامنے۔ بس ذرا لحاظ کر جاتی تھی اور گھر کے سب بڑے دونوں کی نوک جھونک سے خوب لطف اٹھاتے اور زیر لب مسکرائے جاتے۔

جہانگیر منزل میں دو کنبے آباد تھے۔ عابد جہانگیر 'جو مرحوم جہانگیر حسن کے بڑے صاحبزادے تھے اور خالد جہانگیر جو جہانگیر صاحب کے چھوٹے بیٹے تھے۔ دونوں بیٹوں کے خاندانوں میں مثالی ہم آہنگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نصرت بیگم اور ندرت بیگم سگی بہنیں تھیں۔ نصرت بیگم اور عابد صاحب کو خدا نے تین بیٹوں سے نوازا تھا۔ ولید 'غازی اور سب سے چھوٹا اسامہ 'جبکہ ندرت اور خالد کے دو ہی بچے تھے فارینہ اور مبشر۔ یوں فارینہ کو دونوں گھروں کی اکلوتی لڑکی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ وہ ماں 'باپ کی تو لاڈلی تھی

ہی۔ تایا، تائی بھی اس پر جان چھڑکتے تھے۔

ولید بڑے بھائیوں کی طرح اس کے خوب لاڈ اٹھاتا تو مبشر اور اسامہ کا فارینہ آپی کے بنا ہر کھیل ادھورا رہتا۔ غازی کے خیال میں اگر وہ بھی سب کی طرح فارینہ کے آگے پیچھے پھرنے لگتا تو فارینہ کا دماغ ساتویں آسمان پر ہی جا پہنچتا۔ بس اسی لیے وہ فارینہ کو تنگ کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔

☼ ☼ ☼

"فری، یار میری شرٹ تو پریس کر دو۔" وہ اپنا فیورٹ ڈرامہ دیکھنے کے لیے لاؤنج میں آکر بیٹھی ہی تھی کہ بوتل کے جن کی طرح غازی صاحب نمودار ہو گئے۔

"غازی پلیز ابھی کچن سے نکلی ہوں، تھوڑی دیر پسینہ تو سکھانے دو۔" ندرت بیگم پاس بیٹھی تھیں اس لیے فارینہ منہ پھاڑ کر انکار نہ کر سکی۔

"اچھا ٹھیک ہے کوئی مسئلہ نہیں، میں خود کر لیتا ہوں۔" بے حد نرمی سے اسے مخاطب کر کے وہ شرٹ لیے واپس پلٹ گیا تھا۔ استری اسٹینڈ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ حسب توقع دانت کچکچاتی ہوئی فارینہ بھی آ گئی۔

"تم اتنے گھنے، میسنے کیوں ہو غازی؟ جب دیکھ لیتے ہو نا کہ امی میرے پاس بیٹھی ہیں جب ہی کوئی کام کہتے ہو اور کہنے کا انداز بھی اتنا معصومانہ اور شریفانہ ہوتا ہے کہ آگے سے کوئی انکار کر ہی نہ سکے۔" اس نے غازی کے ہاتھ سے شرٹ چھینی تھی۔

"ہاں، لیکن تم نے تو انکار کر دیا تھا نا۔" اسی معصومانہ سے انداز میں فارینہ کو یاد دلایا۔

"انکار کے بعد امی کا گھورنا اسٹارٹ ہو گیا تھا اور امی کے گھورنے پر بھی میں ٹس سے مس نہ ہوتی تو پھر وہ لمبا چوڑا لیکچر ملنا تھا نا تا مجھے کہ ڈرامہ ختم ہو جاتا امی کا لیکچر ختم نہ ہوتا۔" وہ خفگی سے کہتے ہوئے شرٹ پریس کرنے لگی۔ غازی کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بہت بدحرام ہو تم غازی۔ ذرا سا کام بھی نہیں ہوتا تم سے، کپڑے پریس کرنا کوئی ایسا مشکل آرٹ بھی نہیں جو تم سیکھ ہی نہ سکو۔ بس مجھے تنگ کرنے کے بہانے ہیں۔" فارینہ کی بڑبڑاہٹ ہنوز جاری تھی۔

"سیکھ لوں گا یار۔ پرامس شادی کے بعد خود کپڑے پریس کیا کروں گا۔" غازی مسکراہٹ دباتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے مخاطب ہوا تھا۔

"ہاں، ہونے والی بیوی کا ابھی سے اتنا خیال، اسے آرام پہنچاؤ گے تو میرا کیا قصور ہے۔" حسب توقع فارینہ چراغ پا ہو گئی تھی۔ اپنے بڑوں کی جس "کمٹمنٹ" سے غازی برسوں سے آگاہ تھا فارینہ اس سے قطعی لاعلم تھی۔ غازی کی اکثر ذومعنی باتیں اس کے سر پر سے گزر جاتی تھیں اور وہ ان باتوں کے ایسے مزے دار جواب دیتی تھی کہ غازی دیر تک سر دھنتا تھا۔

"فارینہ، کیا کر رہی ہو گڑیا۔" اتنے میں ولید بھائی اسے ڈھونڈتے ہوئے آنکلے تھے۔

"غازی کی شرٹ پریس کر رہی ہوں ولید بھائی بلکہ یہ تو پریس ہو ہی گئی آپ نے بھی کچھ پریس کروانا ہے تو دے دیجیے۔" اس نے غازی کو شرٹ تھما کر بہت تمیز سے ولید بھائی کو مخاطب کیا۔

"بس میرے کام کرتے ہوئے ہی تمہیں نخرے سوجھتے ہیں۔" غازی نے اسے گھورا تھا۔

"تو تم باتیں بھی تو ایسی کرتے ہو۔ پتا ہے ولید بھائی، آپ کے آنے سے چند سیکنڈ قبل یہ موصوف فرما رہے تھے کہ شادی کے بعد خود کپڑے پریس کیا کروں گا۔ میرا دماغ تو گھومنا ہی تھا نا۔ جو بیوی ابھی آئی نہیں اس کا اتنا خیال اور مجھے ہر وقت اپنے کاموں میں....." اس کے شکوے دوبارہ اسٹارٹ ہو چکے تھے۔ غازی بری طرح گڑبڑایا تھا اور ولید بھائی نے بہت مشکل سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی تھی۔

"دیکھ لیجیے گا ولید بھائی یہ جو آپ کا بھائی ہے نا پکا

زن مرید ثابت ہو گا۔" فارینہ نے بہت وثوق سے پیش گوئی بھی کرڈالی تھی۔

"غلط فہمی ہے تمہاری۔" غازی اسے کھاجانے والی نگاہوں سے گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔ فارینہ سے کیا بعید تھا وہ ولید بھائی کے سامنے مزید کیا گوہر افشانیاں کرڈالے۔

"اچھا چھوڑو گڑیا یہ بتاؤ پھوپھو کی طرف جانا ہے کیا۔ ابھی کچھ دن پہلے تم کہہ رہی تھیں ناکہ عفرہ سے کوئی کام ہے تمہیں۔ میں اپنے ایک دوست سے ملنے اسی سائیڈ پر جارہا ہوں تم کہتی ہو تو تمہیں عاکفہ پھوپھو کی طرف چھوڑدوں گا اور واپسی پر پک کرلوں گا۔" ولید نے اس کا پروگرام پوچھا تھا۔

"جی 'جی بالکل ولید بھائی پھوپھو کی طرف تو مجھے جانا ہی ہے۔ ایک تو ان سے ملے اتنے دن ہو گئے ہیں پھر عفرہ آپی سے اکنامکس کا ایک ٹاپک بھی سمجھنا تھا۔ میں امی سے پوچھ لوں پھر تیار ہونے میں تو مجھے پانچ منٹ ہی لگیں گے آپ بس تھوڑا سا ویٹ کرلیں۔" فارینہ کے کہنے پر ولید اثبات میں سرہلاتا ہوا واپس پلٹ گیا۔ وہ فٹ امی سے اجازت لینے بھاگی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے پھوپھو کے گھر جانے کی ہر ہفتہ' دس دن بعد وہاں جانے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑلیتی ہو جانے وہاں جاکر تمہیں ایسا کیا مزا آتا ہے۔ سکون سے گھر میں بیٹھو۔" ندرت بیگم نے اسے ڈپٹ ہی تو دیا تھا اور وہ پہلے بھی عاکفہ پھوپھو کے ہاں جانے کی اجازت اتنی آسانی سے کب دیتی تھیں۔ فارینہ کو خاصی منت سماجت سے کام لینا پڑتا تھا اور وہ اب بھی وہی حربہ آزمارہی تھی۔

"پیاری امی پلیز جانے دیں بالکل جھوٹ نہیں بول رہی۔ واقعی اکنامکس کا ایک ٹاپک سمجھنا ہے۔ ہمارا بہت امپورٹنٹ ٹیسٹ ہے کالج میں۔ عفرا آپی بہت اچھا سمجھاتی ہیں۔"

"شہر کے بہترین کالج میں داخلہ دلوایا ہے تمہیں۔ ایک سے ایک قابل ٹیچر ہے وہاں۔ عفرہ میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ تمہیں صرف اسی کا سمجھایا ہوا سمجھ میں آتا ہے۔" ندرت بیگم تنک کر بولی تھیں۔

"میں نے عفرہ آپی سے چکن مکھنی ہانڈی کی ترکیب بھی پوچھنی ہے پچھلی بار پھوپھو کے ہاں گئی تھی تو عفرہ آپی نے ایسی مزے کی ہانڈی بنائی تھی کہ سب انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ اس دن میں ریسپی پوچھنا ہی بھول گئی۔ آج پوچھ کر آؤں گی اور پھر آپ لوگوں کو بنا کر کھلاؤں گی۔"

"آج چکن ہانڈی کی ترکیب پوچھ کر آؤ گی اور جو چیز آج کھاکر آؤ گی اس کی ترکیب پوچھنے چار دن بعد پھر جاؤ گی۔ ہے نا۔ صحیح کہہ رہی ہوں نامیں۔" ندرت نے طنز کیا فارینہ نے خفگی سے منہ پھلالیا تھا۔

"ریسپی تو میں فون پر بھی پوچھ سکتی ہوں۔ لیکن ٹاپک فون پر نہیں سمجھا جاسکتا۔ چار دن بعد ویسے ہی روزے شروع ہو رہے ہیں پھر گھر سے کہاں نکلنا ہو گا لیکن ٹھیک ہے اگر آپ اجازت نہیں دے رہیں تو میں نہیں جاتی.... ولید بھائی کو کہہ دیتی ہوں میرا انتظار مت کریں۔ چلیں جائیں اپنے دوست کے ہاں۔" وہ خفگی سے کہتی ماں کے پاس سے اٹھ گئی تھی نتیجہ حسب توقع تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے چلی جاؤ لیکن زیادہ دیر مت لگانا۔" ندرت نے بادل ناخواستہ اجازت دے ہی دی۔

"تھینک یو امی۔" فارینہ نے خوش ہو کر چٹاچٹ ماں کے گال چومے پھر اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ دس منٹ بعد وہ جانے کے لیے تیار تھی۔ شکر ہے خالا جان سے سامنا نہ ہوا ورنہ ان کی عدالت میں بھی پیشی بھگتنا پڑتی۔

☆ ☆ ☆

عاکفہ پھوپھو' تایا اور ابو کی اکلوتی بہن تھیں لیکن عاکفہ پھوپھو اور ان کی فیملی کو جہانگیر منزل میں کبھی خوش دلی سے ویلکم نہ کیا جاتا تھا۔ ندرت بیگم اور نصرت بیگم کی عاکفہ سے رنجش کی جڑیں دور ماضی تک پھیلی

ہوئی تھیں۔

عاکفہ دو بھائیوں کی لاڈلی بہن اور ماں ' باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ زندگی کے بائیس برسوں تک وہ ماں باپ اور بھائیوں کے پیار کو حق سمجھ کر وصول کرتی رہیں' پھر جہانگیر صاحب نے اپنے بڑے بیٹے عابد کی شادی اپنے دوست کی بیٹی سے کر دی۔ نصرت بیاہ کر جہانگیر ہاؤس آئیں تو عاکفہ نے شروع شروع میں بھابھی کے خوب چاؤ چونچلے اٹھائے' لیکن پھر آہستہ آہستہ ان کے دل میں عجیب سی رقابت نے جنم لینا شروع کر دیا۔ وہ نئی نویلی دلہن کے لیے بھائی کا پیار اور التفات دیکھ کر خوب کڑھنے لگیں۔

شوہر اور سسرال والوں کی نظروں میں نصرت کی اہمیت گھٹانے کے لیے عاکفہ نے ہر حربہ استعمال کر ڈالا۔ سب سے پہلے اس نے اپنی ماں کے دل میں بہو کے خلاف زہر بھرا۔ وہ ماں کے کانوں میں جھوٹی باتیں ڈالتی ناہید بیگم غصے میں آکر بہو پر چڑھ دوڑتیں۔ نصرت کبھی اپنی صفائی میں دو لفظ بھی کہہ ڈالتی تو' عاکفہ اس کا الگ سے فسانہ تیار کر کے بھائی کو سناتی۔ عابد جیسے نرم خو اور محبت کرنے والے شوہر ماں ' بہن کی باتوں میں آکر بیوی سے متنفر ہوتے گئے۔ حالات سے دل برداشتہ ہو کر نصرت میکے جا بیٹھیں۔ ولید کی پری میچور ڈلیوری ان کے میکے میں ہی ہوئی۔ سسر کے علاوہ کوئی بچے کو دیکھنے تک نہ آیا۔

جہانگیر صاحب بہت شریف النفس شخص تھے وہ اپنی بیوی اور بیٹی کی زیادتیوں سے واقف تھے۔ نصرت کے والد یعنی اپنے دوست کے سامنے شرمندگی کا اظہار بھی کرتے لیکن اپنے بیوی بچوں پر ان کا زور نہ چلتا تھا۔ عابد ' نصرت کو گھر واپس لانے پر تیار نہ تھا اس کا کہنا تھا کہ نصرت خود ناراض ہو کر میکے گئی ہے اور اسے خود ہی واپس آنا ہو گا۔ نصرت کے گھر والے بیٹی کو سسرال واپس بھیج بھی دیتے اگر حالات سدھرنے کا کوئی امکان ہوتا۔ وہ وقت نصرت کے خاندان کے لیے بہت آزمائش کا وقت تھا۔ نصرت کی والدہ جو پہلے ہی مختلف بیماریوں میں گھری ہوئی تھیں۔ یہ ذہنی ٹینشن برداشت نہ کر پائیں اور دل کے دورے میں جان کی بازی ہار بیٹھیں۔ ساس کے انتقال پر شرمندہ ' شرمندہ سے عابد سسرال آئے تھے نصرت کے والد کی ہدایت پر گھر والوں نے اپنے دلی جذبات دل میں ہی چھپائے رکھے اور سب عابد سے اچھے طریقے سے پیش آئے۔

ولید جو اب پانچ ماہ کا ہو چکا تھا جسمانی طور پر کمزور مگر بہت پیارا بچہ تھا۔ بیٹے کو دیکھ کر عابد جہانگیر کی پدرانہ محبت جاگ گئی۔ کہاں ضد اور انا میں آکر اتنے عرصے سے پہلوٹھی کے بیٹے کو دیکھنے تک نہ آئے تھے اور اب بیٹے کو گود سے اتارنے کا جی ہی نہ چاہ رہا تھا۔ ولید کے لیے باپ نامانوس اجنبی تھا وہ ان کی گود میں بے چین ہو کر روئے جا رہا تھا۔ نانا' ماموں کی شکلیں دیکھ کر وہ ہمک ہمک کر ان کے پاس لپکتا۔ عابد صاحب کے پچھتاووں کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ سوئم کے بعد انہوں نے اپنے سسر سے نصرت کو واپس گھر لے جانے کی بات کی۔ نصرت اس کڑے وقت میں اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر سسرال جانے پر تیار نہ تھیں۔ ماں کی اچانک موت سے چھوٹے بہن بھائی نفسیاتی طور پر بہت ڈسٹرب تھے وہ ان کی دلجوئی کے لیے ابھی مزید ان کے پاس رکنا چاہتی تھیں لیکن باپ نے سمجھا بجھا کر انہیں سسر اور شوہر کے ہمراہ واپس سسرال بھیج دیا۔

سسرال میں حالات اب بھی زیادہ مختلف نہ تھے۔ عاکفہ کے مزاج کی تندی برقرار تھی اس نے بھاوج کا استقبال طنزیہ جملوں سے ہی کیا تھا لیکن اب عابد کا رویّہ بدل گیا تھا۔ انہیں بہن کی زیادتیاں بھی نظر آنے لگی تھیں اور بیوی کی مظلومیت کا بھی احساس ہو گیا تھا۔ انہوں نے تنہائی میں نصرت سے اپنے سابقہ رویوں کی دل کھول کر معافی مانگی تھی۔

"مجھے بہت افسوس ہے نصرت کہ میں بھی عام مردوں کی طرح کانوں کا کچا نکلا اور ماں ' بہن کی باتوں میں آکر تمہاری اور اپنی زندگی میں دوری کا زہر گھول دیا۔ جس وقت تمہیں میری سب سے زیادہ ضرورت

تھی۔ میں نے تمہارا ساتھ نہ دیا۔ تمہارا اعتبار نہ کیا۔ اپنی زندگی کے اتنے خوب صورت دن اپنی ضد اور انا کی بھینٹ چڑھا دیے۔ کتنا بدنصیب باپ ہوں میں کہ اپنے بچے کی زندگی کے پہلے چار ماہ کا کوئی نقش، کوئی یاد میرے حافظے میں محفوظ نہیں۔ اللہ نے مجھے اتنی بڑی نعمت سے سرفراز کیا اور میں مسلسل کفران نعمت کا مرتکب ہوتا رہا۔ حالانکہ اباجی نے مجھے بہت سمجھایا کہ میں ضد چھوڑ دوں۔" عابد شرمسار لہجے میں صفائیاں دے رہے تھے۔ نصرت کے لبوں پر تھکی تھکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے عابد کہ آپ آئندہ عاکفہ اور اماں کی باتوں میں نہ آئیں گے۔ میرے ساتھ تو ان کا رویہ اب بھی ویسا ہی ہے۔" نصرت کے استفسار پر عابد مزید شرمندہ ہوئے تھے۔

"میں لاعلم نہیں ہوں نصرت میں جانتا ہوں اماں اور عاکفہ اب بھی تمہارے ساتھ نامناسب رویہ اپنائے ہوئے ہیں لیکن کچھ دن مزید برداشت سے کام لے لو۔ اباجی نے عاکفہ کا رشتہ فائنل کر دیا ہے کچھ مہینوں تک اس کی شادی ہو جائے گی۔ اماں کو تم سے بدظن کرنے میں بھی عاکفہ کا ہی ہاتھ ہے۔ تم دیکھ لینا اس کی شادی کے بعد اماں کا رویہ خود بخود تبدیل ہو جائے گا۔" عابد نے اسے تسلی دی تھی۔

دو ماہ بعد عاکفہ پیا دیس سدھار گئی تھی۔ اب نصرت کو عابد کے کہے کے مطابق ساس کے رویے کے بدلنے کا انتظار تھا، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس کی ساس اپنے بہنوئی کے انتقال پر حیدر آباد گئی تھیں واپسی پر بس کے ایکسیڈنٹ میں ساس، سسر دونوں جاں بحق ہو گئے۔ اس ناگہانی حادثے کی خبر سن کر نصرت کا اپنا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ اپنے شفیق سے سسر سے تو انہیں بہت محبت تھی ہی، پر ساس کے بھی یوں اچانک چلے جانے سے انہیں بہت دھچکا لگا تھا۔

عابد اور ان سے چھوٹے خالد، دونوں بھائیوں کا غم کی شدت سے برا حال تھا۔ نصرت نے دونوں کی دل جوئی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ شوہر کے ساتھ دیور کو بھی بھرپور تسلی دلاسا دیتیں۔ غم کی شدت سے تو عاکفہ کا بھی برا حال تھا لیکن اب عاکفہ کو "جہانگیر منزل" آنا آسان نہ لگتا۔ غم سے نڈھال بھائیوں کو تو اپنا ہی ہوش نہ تھا اور بھابھی سے تعلقات کی نوعیت ایسی نہ تھی کہ وہ اس کے کندھے سے سر ٹکا کر آنسو بہا سکے، پھر عاکفہ کی شادی کو ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔ اس کڑے وقت میں سسرال والے بڑھ چڑھ کر دل جوئی کر رہے تھے اور وہ ہی عاکفہ کو سب سے بڑھ کر اپنے لگتے۔ عملی زندگی کی تلخ حقیقتیں آشکار ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔

جہانگیر منزل میں پھیلی اداسیوں کو ولید کی قلقاریوں نے ختم کرنا شروع کر دیا۔ وہ ماں، باپ اور چاچو کی آنکھوں کا تارا تھا۔ کچھ ہی عرصے میں نصرت پھر امید سے ہو گئیں۔ اس بار بھی خدا نے بیٹے کی نعمت سے سرفراز کیا۔ گل گوتھنا سا غازی، ولید سے بڑھ کر شرارتی تھا۔ عاکفہ کے ہاں پہلوٹھی کی بیٹی ہوئی تھی۔ عفرہ، غازی سے چھ ماہ بڑی تھی۔

عابد جہانگیر نے بھانجی کی پیدائش پر حسب دستور دینا دلانا تو کیا، لیکن بہن سے تعلقات کی نوعیت بالکل رسمی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ نصرت، عاکفہ کی زیادتیوں کو فراموش نہیں کر پائی ہیں اور عابد کو اب اپنے گھر کی خوشیاں زیادہ عزیز تھیں۔

عاکفہ کے سسرال میں پہلوٹھی کی بیٹی ہونے پر خوشی کا ذرا سا بھی اظہار نہ کیا گیا۔ وہ لوگ بیٹے کے خواہش مند تھے اور خواہش پوری نہ ہونے پر عاکفہ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ یہ انتہا درجے کی جہالت تھی مگر حقیقت یہی تھی کہ عاکفہ کے سسرال والے اس لحاظ سے حد درجہ جاہل ثابت ہوئے۔ عفرہ کے بعد عاکفہ کے ہاں جڑواں بچیوں نے جنم لیا۔ طبی پیچیدگی کے باعث بچیاں جانبر نہ ہو سکیں لیکن اس بات پر بھی ——— شکر ہی منایا گیا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ سسرال والوں کی زیادتیاں بڑھتی چلی گئیں۔ شوہر مٹی کا مادھو تھا، جو عاکفہ کے حق میں آواز تک بلند

نہ کر سکتا تھا۔ عاکفہ جان گئی تھیں کہ ان کے کیے کی فصل ہے، جو انہیں بہت جلد کاٹنی پڑ رہی ہے۔ مگر صبر شکر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"جہانگیر منزل۔" میں اب خالد کی شادی کا تذکرہ تھا، تعلیم مکمل کر کے خالد برسر روزگار ہو گیا تھا۔ نصرت اس کے لیے لڑکی ڈھونڈنے لگی تھیں جب خالد نے دبی زبان سے بھابھی سے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی وہ نصرت کی چھوٹی بہن ندرت میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ نصرت دیور کی خواہش جان کر خاموش سی ہو گئیں۔

"میری زندگی آپ کے سامنے کھلی کتاب کی مانند ہے بھابھی مجھ سا شریف، خوب صورت اور کماؤ لڑکا کوئی اور کہاں ملے گا آپ کو، آپ کی شہزادیوں جیسی بہن کا صحیح جوڑ مجھ سا خوبرو شخص ہی ہو سکتا ہے۔" خالد قدرے شوخ ہوتے ہوئے بولا۔ نصرت کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

ندرت بھی بیاہ کر جہانگیر منزل آ گئی تھیں۔ عاکفہ جو اس کوشش میں تھی کہ خالد کی دلہن اپنی پسند سے لا کر جہانگیر منزل سے اپنا ٹوٹا تعلق بحال کر لے اس شادی سے اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ بہت بجھے دل سے اس نے بھائی کی شادی میں شرکت کی۔

نئی نویلی دلہن کو بھی اکلوتی نند کے بگڑے موڈ کا اندازہ ہو گیا تھا، لیکن اسے اس بگڑے موڈ کی رتی برابر پروا نہ تھی۔ عاکفہ نے نصرت کو جتنا ستانا تھا ستا لیا تھا اب اس کا وقت بیت چکا تھا اور مقابل دھیمے مزاج والی نصرت نہیں بلکہ ندرت تھیں، جو عاکفہ سے شدید خار کھاتی تھیں۔ جان چھڑکنے والے شوہر کا بخشا مان ہی تھا کہ ندرت نے خود ہی عاکفہ کو منہ لگانے کی زحمت نہ کی، نہ ہی اس سے کسی قسم کے تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی، حالانکہ گزرتے وقت کے ساتھ عاکفہ کا مزاج بہت بدل گیا تھا۔

اب اس میں پہلے والا طنطنہ اور غرور نہ تھا اب اسے میکے کی قدر و قیمت کا بھی احساس ہونے لگا تھا۔ لاڈ اٹھانے والے ماں باپ تو منوں مٹی کی چادر اوڑھ کر سو چلے تھے اس کا میکا اب بھائیوں کے دم سے ہی آباد تھا اور بھائیوں کو بہن سے زیادہ اپنی بیویوں کے جذبات کا خیال رہتا تھا۔ اب عاکفہ کو نصرت سے روا رکھے جانے والی زیادتیوں کا احساس پچھتاوے میں مبتلا کر رہا تھا۔ کاش وہ حسد کے جذبے سے مغلوب ہو کر بھابھی کی زندگی اجیرن نہ کرتی تو، آج میکے میں اس کا خوش دلی سے استقبال کیا جاتا۔ اب وہاں اس کی حیثیت بن بلائے مہمان سے زیادہ کی نہ تھی۔

حالانکہ اب اسے بھتیجا، بھتیجی بہت پیارے لگتے۔ یہ خونی رشتوں کے درمیان پائی جانے والی فطری محبت تھی لیکن جب وہ بھتیجا، بھتیجی کو پیار کر رہی ہوتی تو اسے اندازہ ہو جاتا کہ بھابھیوں کو محبت کا یہ مظاہرہ نرا ڈھکوسلا لگتا ہے لیکن ولید، فارینہ اور غازی اکلوتی پھوپھو کی محبت کا جواب محبت سے ہی دیتے تھے۔ عفرہ سے بھی سب کی خوب دوستی تھی اور عاکفہ محسوس کرتی تھیں کہ اپنے ددھیالی کزنز کی نسبت عفرہ ماموؤں کے بچوں سے زیادہ اٹیچڈ ہے۔ عفرہ کے بعد عاکفہ کے ہاں ہونے والی جڑواں بچیاں جانبر نہ ہو سکی تھیں اور پھر قدرت نے انہیں دوبارہ ماں بننے کا موقعہ نہ دیا۔ اب ان کی زندگی کا محور و مرکز ان کی عفرہ ہی تھی۔

☆ ☆ ☆

عاکفہ نے عفرہ کی پرورش اور تربیت مثالی انداز میں کرنے کی کوشش کی تھی۔ ماں باپ کے لاڈ پیار کی وجہ سے جو کمزوریاں ان کی اپنی شخصیت میں پیدا ہو گئی تھیں، عاکفہ کی خواہش تھی کہ عفرہ کی شخصیت ان خامیوں سے مبرا ہو اور عاکفہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئی تھیں۔

عفرہ بہت سلجھی ہوئی عادتوں اور دھیمے مزاج والی لڑکی تھی۔ اپنے تیز طرار ددھیالی کزنز کی نسبت اپنے ماموں کے بچوں سے اس کی زیادہ ذہنی ہم آہنگی تھی لیکن شعور سنبھالنے کے بعد اس نے خود ہی ماموؤں کے ہاں جانا کم کر دیا تھا۔ عفرہ نے بہت حساس طبیعت

پائی تھی بچپن سے لڑکپن کی سرحد پر قدم رکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ممانیاں اس کی ماں کی آمد پر بہت سرد مہری والا برتاؤ اختیار کرتی ہیں۔ یہ لیا دیا انداز عفرہ کو بہت دکھی کر دیتا تھا اور بچپن کے برعکس وہ یاں سے ماموؤں کے ہاں جانے کی ضد کرنا چھوڑ چکی تھی لیکن ماموں کے بچے اب بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتے تھے۔ ولید باقاعدگی سے اکلوتی پھوپھو کے ہاں چکر لگاتا تھا۔ اور فارینہ بھی کبھی ولید تو کبھی غازی کے ہمراہ اس سے ملنے پہنچی ہوتی۔ وہ عفرہ کو بہت آئیڈیلائز کرتی تھی اور زندگی کے ہر معاملے میں اسے عفرہ آپی کی رائے اور مشورہ درکار ہوتا اور جب سے فارینہ نے کالج میں اکنامکس کا مضمون منتخب کیا تھا اسے عفرہ سے ملنے کا مستقل بہانہ مل گیا تھا۔ عفرہ نے اکنامکس میں ماسٹرز کر رکھا تھا اور اب وہ ایک ہائیر سیکنڈری اسکول میں کانٹریکٹ بنیادوں پر اکنامکس کا مضمون پڑھا رہی تھی۔ شام کو اس کے پاس ٹیوشن والے بچے بھی پڑھنے آتے تھے اسی لیے فارینہ شام ڈھلنے کے بعد پھوپھو کے ہاں جاتی جب عفرہ کو فراغت ہوتی تھی۔ ٹاپک سمجھنے کا تو بہانہ ہوتا تھا اصل میں تو پھوپھو اور عفرہ سے ملاقات اور پھر مزے دار سا ڈنر کرنا مقصود ہوتا تھا۔ عفرہ کے ہاتھ میں بلا کا ذائقہ تھا اور فارینہ اس کی بتائی گئی ریسپیز ٹرائی کر کے خود بھی خاصی ماہر کک بن گئی تھی' آج بھی وہ ولید بھائی کے ہمراہ عاکفہ پھوپھو کے ہاں پہنچی تو کچن سے مٹر پلاؤ کی اشتہا انگیز خوشبو آ رہی تھی۔

"دیکھا ولید بھائی کتنے صحیح وقت پر پہنچے ہیں ہم۔" پھوپھو سے پیار لینے کے بعد فارینہ چہکی تھی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے میں اور امی تمہیں ہی یاد کر رہے تھے۔" کچن سے عفرہ مسکراتے ہوئے باہر نکلی۔

"یعنی اصل میں بن بلایا مہمان میں ہوں۔" ولید نے مسکراتے ہوئے شکوہ کیا۔

"ولید بھائی آپ بن بلائے تو ضرور ہو سکتے ہیں مگر مہمان ہر گز نہیں کیونکہ پھوپھو کا گھر 'اپنا گھر۔" فارینہ نے لاڈ سے عاکفہ کے شانے سے سر ٹکایا۔

"بالکل میرا بچہ پھوپھو بھی تمہاری۔ پھوپھو کا گھر بھی تمہارا بلکہ پھوپھو کا سب کچھ تمہارا۔" عاکفہ نے بے ساختہ فارینہ کی پیشانی چوم لی تھی۔ بھتیجی' بھتیجوں کی محبت کبھی کبھار انہیں آبدیدہ بھی کر دیتی تھی۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتیں کہ بھابیوں کی لاتعلقی اور گریز بھرا رویہ ان کی اولاد کو منتقل نہیں ہوا۔ عاکفہ اپنے ماضی پر بہت نادم تھیں برسوں پہلے انہوں نے نصرت بھابھی کی زندگی میں زہر گھولنے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کی تھی وہ تو نصرت کی قسمت اچھی تھی ورنہ نوبت علیحدگی تک آن پہنچی تھی۔ عاکفہ' نصرت اور ندرت کو 'بیگانگی بھرا رویہ اپنانے میں حق بجانب سمجھتی تھیں۔ ان کے نزدیک بھابھیوں کا یہ ہی احسان کم نہ تھا کہ وہ اپنے بچوں کو ان کے ہاں آنے سے منع نہیں کرتی تھیں۔ عاکفہ بے چاری کو کیا علم تھا کہ ہر بار یہاں آنے سے پہلے فارینہ کو اپنی ماں سے کیسا بحث مباحثہ کرنا پڑتا ہے۔

"پھوپھا جان نظر نہیں آ رہے۔ کہیں گئے ہوئے

ہیں کیا؟" سوچوں میں گم عاکفہ، ولید کے سوال پر چونکی تھیں۔

"انہوں نے کہاں جانا بیٹا۔ اپنے بھائی کے ہاں ہی گئے ہوئے ہیں۔" عاکفہ کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"میرا تو خیال ہے سبحان پھوپھا صرف سونے کے لیے گھر آتے ہوں گے۔ دن کا بیشتر وقت تو وہ اپنے بھائی کے ہاں ہی گزارتے ہیں۔" فارینہ کہے بغیر نہ رہ پائی۔

"فری' بری بات۔" ولید نے اسے تنبیہی انداز میں ٹوکا تھا۔

"سوری پھوپھو۔" اس نے جھٹ سوری بھی کہہ دیا۔

سچ یہی تھا کہ سبحان احمد کی اپنے گھر اور گھر والوں سے دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ عاکفہ احمد نے ان کے وارث کو جنم نہ دیا تھا یہ قصور ان کے گھر والوں کے لیے ناقابل معافی تھا اور سبحان پر اپنے گھر والوں کا مکمل کنٹرول تھا۔ ماں' باپ مر گئے تو بڑے بھائیوں نے ان کی جگہ سنبھال لی وہ سبحان کو اپنے اشاروں پر چلاتے۔ سبحان احمد کی آمدنی کم نہ تھی لیکن آمدنی کا بڑا حصہ بھائی ،بھتیجوں کی نذر کر دیتے۔ ان کے اپنی گھر کا خرچا کیسے چلے گا انہیں مطلق پروا نہ ہوتی۔ عفرہ نے بہت چھوٹی عمر سے ہی ٹیوشنز کر کے اپنی تعلیم کا خرچا اٹھانا شروع کر دیا تھا اب تو خیر ٹیچنگ اور ٹیوشن سنٹر سے معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ زندگی پہلے سے کہیں زیادہ سہل ہو گئی تھی اور دونوں ماں بیٹی خدا کی اس عنایت پر شکر ادا کرتے نہ تھکتیں۔

"عفرہ بیٹا فریزر سے کباب نکال کر تل لینا اور میٹھے میں سویاں بھی بنا لو۔" عاکفہ بھتیجے اور بھتیجی کی بھرپور خاطر کرنا چاہ رہی تھیں۔

"کچھ بھی نہیں عفرہ آپی صرف پلاؤ' رائتہ اور سلاد' عفرہ آپی کے ہاتھ کے بنے پلاؤ کے بعد کسی اور چیز کی گنجائش ہی کب بچے گی۔" فارینہ نے عفرہ کو دوبارہ کچن میں جانے سے منع کر دیا۔ ولید نے بھی اس کی تائید کی تھی۔

اور ایک بھرپور ڈنر کے بعد جب فارینہ اور ولید گھر واپس لوٹ رہے تھے تو دوران سفر ولید کو کچھ خیال آیا تھا۔

"تم نے تو عفرہ سے کوئی ٹاپک بھی سمجھنا تھا کوئی اہم ٹیسٹ تھا تمہارا۔"

"ٹیسٹ تو پرسوں ہو گیا ہمارا' پوری کلاس میں چوتھے نمبر پر میرے ہی مارکس تھے۔" فارینہ نے بہت اترا کر بتایا۔

"یعنی خالہ سے جھوٹ بولا تم نے۔" ولید کو فارینہ کے انداز پر ہنسی آ گئی تھی۔

"جھوٹ تو آپ نے بھی بولا۔ آپ گھر سے یہ کہہ کر نکلے تھے کہ آپ نے کسی دوست کے ہاں جانا ہے۔" فارینہ نے بہت مزے سے ولید کو یاد دلایا۔ ولید سے کوئی جواب نہ بن پڑا وہ ہنس پڑا تھا۔ فارینہ بھی مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

"غازی بھائی' یہ فارینہ آپی نے بھیجا ہے پڑھ کر سائن کر دیں۔" غازی اپنے بیڈ روم میں لیپ ٹاپ پر مصروف تھا جب اسامہ کاغذ کا ایک صفحہ لہراتا اس کے کمرے میں آیا۔

"کیا ہے یہ۔" غازی نے لیپ ٹاپ ایک طرف رکھ کر اسامہ کے ہاتھ سے کاغذ لیا۔ صفحے پر موٹے مارکر سے دستور عمل برائے رمضان المبارک تحریر تھا اور نیچے ترتیب وار شقیں درج تھیں۔

سحری کے لیے گھر کا ہر فرد خود الارم لگا کر سوئے گا اور کسی کو دروازے بجا کر نہیں اٹھایا جائے گا۔ افطاری کا مینو سحری کے وقت ہی ڈسکس کر لیا جائے گا۔ آفس سے واپسی پر کسی نے کوئی فرمائش بتائی تو وہ ہرگز پوری نہ کی جائے گی۔ گھر کا ہر فرد اپنے کپڑے خود پریس کرے گا۔ (امی' خالا' پاپا' تایا جان' ولید بھائی اور دونوں چھوٹو اس شق پر عمل کرنے سے مستثنیٰ ہیں۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔

غازی نے تیزی سے "دستور عمل" پر نگاہیں

دوڑائی تھیں پھر بھنا ہوا فارینہ کی تلاش میں نکلا وہ رمضان کی آمد سے پہلے کچن کیبنٹس کی تفصیلی صفائی میں مصروف تھی۔

"کیا ہے یہ؟" اس نے "شہزادہ مقرن" کے اسٹائل میں دستاویز لہرائی۔

"کر دیے سائن۔" فارینہ نے ہاتھ جھاڑ کر کاغذ غازی کے ہاتھ سے لیا۔

"گھر کے ہر شخص نے بنا چوں چراں کیے دستخط کر دیے ہیں تمہیں پتا نہیں کیا مسئلہ ہے۔" فارینہ نے کاغذ پر نگاہیں دوڑا کر برا سامنہ بنایا۔

"گھر کے ہر فرد کو ہر شق میں خصوصی استثنا حاصل ہے تم نے سیدھی طرح یہ ہی کیوں نہ لکھ دیا کہ غازی کو صبح سحری کے لیے خود اٹھنا پڑے گا۔ وہ افطاری کے لیے کوئی فرمائش کرنے کا اہل نہیں ہو گا اور کپڑے پریس کرنے سمیت ہر چھوٹا موٹا کام غازی کو خود کرنا پڑے گا۔" وہ چبا چبا کر بول رہا تھا۔

"ہاں تو اس میں غلط ہی کیا ہے۔ اتنی سخت گرمی کے روزے ہیں تم تو سارا دن آفس میں اے سی والے کمرے میں بیٹھتے ہو۔ گھر واپس آکر بھی کمرے سے قدم باہر نہیں نکالتے اور تمہارے چھوٹے موٹے کام کرنے میں میں ہلکان ہوتی رہوں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔" وہ چمک کر بولی تھی۔

"گھر کے باقی لوگوں کے کام بھی تو ہنسی خوشی کرتی ہو۔ صرف مجھ سے کیا پرخاش ہے تمہیں۔" غازی اس بار بے بسی سے استفسار کر رہا تھا۔

"گھر کے باقی لوگ میرا خیال رکھتے ہیں ان کے کام میں خود اپنی مرضی اور خوشی سے کرتی ہوں اور تم مجھ سے دھونس اور زبردستی سے کام کرواتے ہو۔" فارینہ نے فوراً" وجہ بھی بتادی تھی۔

"ایک تمہارا ہی تو خیال رہتا ہے مجھے اور تم کہتی ہو کہ میں تمہارا خیال نہیں رکھتا۔" غازی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا تھا۔ فارینہ نے اس جملے پر اسے ناسمجھی سے تکا تھا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا۔" کبھی کبھی وہ غازی کی کسی ذو معنی بات پر مشکوک ہو جاتی تھی اور اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

"میری باتوں کے مطلب نکالنے مت بیٹھ جایا کرو۔ دکھاؤ اپنی تاریخی دستاویز جب سب نے سائن کر دیے ہیں تو مجھے کیا اعتراض۔ میں بھی کر دیتا ہوں۔" غازی نے جیب سے بال پوائنٹ نکال کر سائن کر دیے تھے اور مسکرا کر کاغذ دوبارہ فارینہ کو تھمایا۔

"یہ غازی اتنا اچھا کب سے ہو گیا۔" وہ کچن سے چلا بھی گیا لیکن فارینہ دیر تک مشکوک انداز میں اسی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

رمضان کا چاند نظر آگیا تھا۔ پہلی شب سے ہی گھر میں روایتی ہلچل اور مذہبی جوش و خروش کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ گھر کے تمام مرد حضرات نے باجماعت مسجد کا رخ کیا تھا تو خواتین نے گھر میں نماز تراویح کا اہتمام کیا تھا۔ فارینہ نے نماز سے فارغ ہو کر سحری کے لیے آٹا گوندھا پھر فریج میں جھانک کر موجود لوازمات کا جائزہ لیا آخر سب کاموں سے فارغ ہو کر سونے کے لیے اپنے بیڈروم کا رخ کیا۔

پچھلے دو سالوں سے سحری کی ذمہ داری اس نے اپنے سر لے رکھی تھی اور وہ یہ ذمہ داری باخوشی نباہتی تھی۔ گھر کے سب افراد کو من پسند سحری کروانے کا لطف ہی الگ تھا۔ نہ صرف سحری بلکہ افطار پر بھی وہ بھرپور اہتمام کرتی تھی، مگر شرط صرف ایک تھی کہ سب اپنی فرمائشوں سے ذرا وقت پر آگاہ کر دیا کریں۔ گھر کے باقی افراد اس معاملے میں بھرپور تعاون کرتے تھے، صرف غازی تھا جو افطار سے آدھا گھنٹہ پہلے بھی کسی مشکل سی چیز کی فرمائش بہت آسانی سے کر سکتا تھا۔ خیر اسی لیے تو اس نے غازی سمیت سب سے خصوصی چارٹر پر سائن کروالیے تھے۔ اپنی اس پیش بندی سے وہ پوری طرح مطمئن تھی۔ سحری کے لیے الارم لگا کر وہ روزمرہ کی دعائیں اور وظائف پڑھتی کب گہری نیند میں کھو گئی پتا بھی نہ چلا۔

سحری کے وقت آنکھ کھلی تو وہ الارم بجنے کی آواز نہ تھی بلکہ کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔

"سحری کا وقت ختم ہونے میں بیس 'پچیس منٹ رہتے ہیں فری۔ جلدی سے اٹھ جاؤ ورنہ پہلا روزہ ہی بغیر سحری کے رکھنا پڑ جائے گا۔" یہ زوردار آواز غازی کی تھی فارینہ کو بستر چھوڑنے میں دو سیکنڈ بھی نہ لگے تھے جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر وہ کمرے سے باہر آئی تو لاؤنج میں دسترخوان سج چکا تھا اور سب بہت مگن ہو کر سحری کرنے میں مصروف تھے۔

"آؤ بیٹا جلدی سے آجاؤ سحری کا وقت ختم ہونے میں تھوڑا وقت ہی بچا ہے۔" تایا جان نے اپنے برابر اس کی جگہ بنائی تھی۔

"پتا نہیں کیوں میری آنکھ نہیں کھلی یا پھر میرے موبائل پر الارم ہی نہیں بجا۔" وہ شرمندہ ہو رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں فری ایسا ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ تم جلدی سے سحری شروع کرو۔ میں نے تمہارے لیے ملک شیک بھی بنایا ہے۔" غازی نے جگ اس کے سامنے رکھا۔

"بھائی آج تو غازی نے سب کو ہی بہت بھرپور سحری کروائی ہے مجھے تو پتا ہی نہ تھا کہ میرا یہ بھتیجا اتنا سگھڑ ہے۔" خالد صاحب مسکرا کر بولے تھے۔

"ہاں یار آملیٹ بھی تم نے زبردست بنایا ہے۔" ولید نے بھی کھلے دل سے غازی کی کارکردگی سراہی۔

"اگر تمہاری آنکھ وقت پر کھل گئی تھی تو تم مجھے پہلے نہیں جگا سکتے تھے' غازی خود اتنی ایفی شینسی جھاڑنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔" وہ غازی پر خفا ہوئے بنا نہ رہ پائی۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ پہلے تو میں تمہیں جگانے ہی جا رہا تھا لیکن پھر تمہارے چارٹر پر کیے میرے دستخط آڑے آگئے۔ پہلی شق یہ ہی تھی نا کہ ہر شخص اپنا الارم لگا کر سوئے گا اور دروازے بجا کر کسی کو نہیں اٹھایا جائے گا۔ پانچ دس منٹ تک تو میں نے تمہارے جاگنے کا انتظار کیا پھر خود ہی سحری کی تیاری شروع کر دی۔ خیر اتنے میں خالہ اور امی بھی آ گئی تھیں۔ ولید بھائی کے لیے آملیٹ تو میں بنا سکتا تھا لیکن پراٹھا بنانا تو میرے بس میں نہیں تھا نا۔" غازی بہت معصومیت بھرے لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔ دسترخوان کے گرد بیٹھے سب ہی نفوس مسکرا دیے تھے۔

"اچھا اب مجھے گھورنا تو بند کرو۔ جلدی جلدی سحری کرلو خالا کے کہنے پر تمہارا دروازہ بجایا ہے۔ خالا نے کہا تھا دفع کرو چارٹر کو وقت نکلا جا رہا ہے فری نے روزہ بھی رکھنا ہے اسے جا کر جگاؤ۔" غازی نے اسے بتانا ضروری سمجھا تھا کہ چارٹر سے روگردانی کرنے میں اس کا قطعاً" کوئی قصور نہ تھا۔

"ہاں تو ایسی بچکانہ باتیں بھی کوئی قابل عمل ہوتی ہیں۔" ندرت نے غازی کی تائید کرتے ہوئے بیٹی کو جلدی جلدی ہاتھ اور منہ چلانے کی تاکید کی تھی۔ سحری کا وقت واقعی نکلا جا رہا تھا۔

اور جب فجر کی نماز پڑھ کر وہ کچن میں برتن دھو رہی تھی تو غازی چلا آیا۔

"چلو پہلی سحری پر ہی ایک بات تو کنفرم ہو گئی کہ تمہارا دستور عمل برائے رمضان المبارک قطعاً" ناقابل عمل ہے یہ ہی کہہ رہی تھیں نا ندرت خالا۔" وہ صاف صاف اسے چڑا رہا تھا لیکن فارینہ آج اسے منہ توڑ جواب دینے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ غلطی اس کی اپنی تھی وہ پہلی شق پر پہلے ہی روز عمل نہ کر سکی تھی لیکن یہ معما اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ موبائل فون پر الارم سیٹ کرنے کے باوجود اس کی آنکھ کیوں نہ کھلی۔ وہ تو بہت چنگھاڑتی ہوئی ٹون سیٹ کرتی تھی۔

"برتن دھو کر میرے کپڑے پریس کر دینا۔ کر دو گی نا۔" وہ بہت دوستانہ لہجے میں استفسار کر رہا تھا۔ فارینہ محض اسے گھور پائی تھی۔

"نظروں کے تیر چلا کر مجھے روزے کی حالت میں شہید مت کر دینا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔

"اور ہاں..." کچن سے باہر نکلتے نکلتے اسے کچھ یاد آیا تو وہ واپس پلٹا تھا۔

"موبائل فون پر الارم سیٹ کرنے کا ایک اصول

ہمیشہ یاد رکھو پہلے ہمیشہ ٹائم چیک کرتے ہیں ہو سکتا ہے صبح کے پونے تین بجے آپ کے موبائل پر رات کے پونے گیارہ بج رہے ہوں ایسے میں الارم تو نہیں بولے گا نا۔" بہت معصومیت سے وہ اسے گُر کی بات بتا کر کچن سے نو دو گیارہ ہوا تھا۔ یہ حقیقت جان کر کہ اس کے موبائل میں ٹائم کی سیٹنگ میں گڑبڑ غازی نے کی ہے فارینہ کا طیش میں آنا لازمی امر تھا۔ غازی نے عافیت اسی میں جانی تھی کہ فوراً" فارینہ کی پہنچ سے دور چلا جائے' اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ جو شیشے کا گلاس وہ دھو رہی تھی اسی سے غازی کے سر کا نشانہ لے لے اور غازی کا روزے کی حالت میں "شہید" ہونے کا واقعی کوئی ارادہ نہ تھا۔

☼ ☼ ☼
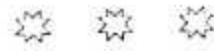
پہلا عشرہ بخیر و خوبی گزر گیا تھا۔ خلاف توقع غازی بھی اب فارینہ کو قطعاً" نہ ستا رہا تھا بلکہ وہ بغیر کہے اس کی کافی مدد کروا دیتا تھا۔ اس شدت کی گرمی میں واقعی کچن میں کھڑے ہونا کب آسان تھا اور فارینہ جیسی دھان پان لڑکی تو روزہ رکھ کر ویسے ہی نڈھال ہو جاتی تھی۔ لیکن اس گھر میں روزہ چھوڑنے کا نہ تو کوئی رواج تھا نہ ہی "فیشن۔" نصرت بیگم اور ندرت نے بچوں کی تربیت عین اسلامی اصولوں کے مطابق کی تھی اور روزہ رکھنے کی خصوصی ہمت تو اللہ کی خاص عطا ہوتی ہے' سو سب پورے ذوق و شوق سے نہ صرف روزے رکھ رہے تھے بلکہ حتی المقدور عبادات بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔

اس روز بھی فارینہ نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھی کہ گھر کے لینڈ لائن نمبر پر عاکفہ کا فون آیا تھا۔ کال ندرت نے ریسیو کی۔ [illegible] بات سے بھی فارینہ کو اندازہ ہو گیا کہ عاکفہ پھوپھو سب کو افطار پر مدعو کر رہی ہیں لیکن ندرت نے گرمی کی شدت کو بنیاد بنا کر آنے سے معذرت کر لی تھی۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی امی گرمی کی شدت کا بہانہ تو میزبانوں کو سجتا ہے جنہوں نے ڈھیروں مہمانوں کے لیے افطار کا اہتمام کرنا ہو۔ ہم نے تو گاڑی میں بیٹھ کر پھوپھو کے گھر جانا تھا اور افطاری میں مزے مزے کی چیزیں کھا کر گھر واپس لوٹنا تھا۔" تلاوت سے فارغ ہو کر فارینہ قرآن پاک رکھ آئی اور پھر ماں کے سر ہو گئی۔ پھوپھو کو کیے جانے والا ماں کا انکار اسے سخت کھلا تھا۔

"اپنی پھوپھو کے گھر جانے کا تو تمہیں بہانہ چاہیے ہوتا ہے اپنے گھر میں تو جیسے تمہیں کوئی مزے کا کھانا کھانا نصیب نہیں ہوتا۔" ندرت بلاوجہ تلملا گئی تھیں۔

"افوہ امی میرا کہنے کا یہ مطلب تھوڑی تھا اچھا چلیں پھوپھو کے گھر نہیں جانا تو نہ جائیں انہیں اپنے ہاں افطار پر مدعو کر لیں۔ روزے داروں کو افطاری کروانا تو ثواب کا کام ہے نا۔" اس نے ماں کو قائل کرنا چاہا۔

"اچھا بس یہ گناہ ثواب کے لیکچر مجھے مت دو اور شام کے لیے میرے کپڑے پریس کر دو۔ زمان صاحب کی بیگم صبح آئی تھیں افطاری کا بلاوا دینے۔ تمہاری خالا اور میں آج شام کو وہاں جائیں گے۔ تم نے بھی چلنا ہو تو چلنا۔"

"جی نہیں اتنی گرمی میں مجھے کسی دوسرے کے گھر جا کر افطار کرنے کا کوئی شوق نہیں۔" وہ قدرے خفگی بھرے انداز میں جتا کر کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

جس دن سے نصرت اور ندرت زمان صاحب (پڑوسی) کے ہاں سے افطاری کر کے لوٹے تھے ان کی زبان پر بیگم زمان کی بھانجی کے حسن کے چرچے تھے۔

"بہت پیاری بچی تھی آپا اور چہرے پر کیسی معصومیت اور بھولپن تھا۔ آج کل کی لڑکیوں والی تیزی طراری نام کو نہ تھی۔ میں تو کہتی ہوں دیر مت کریں۔ شیراز صاحب کی بیوی بھی بہت دلچسپی لے رہی تھیں اس میں' پاس بٹھا کر پورا انٹرویو کیا تھا انہوں

ندرثمن کا۔ مجھے خدشہ ہے کہ وہ اپنے عمیر کے تھا۔
لیے رشتہ نہ مانگ لیں اس کا۔" ندرت بہن سے مخاطب تھیں۔

"اچھا تو گویا جن موصوفہ کے حسن اور معصومیت کے قصیدے ہم پچھلے تین دن سے سن رہے ہیں ان کا نام درثمن ہے۔" غازی جو قریب ہی بیٹھا تھا ماں اور خالا کی گفتگو میں دخل در معقولات کیے بنا نہ رہ پایا۔

"ہاں دیکھ لو۔ کیسا پیارا نام ہے۔" نصرت نے اتنا خوش ہو کر بتایا جیسے نام اتنا پیارا ہونے میں ان کا بھی کوئی کریڈٹ ہو۔

"نام واقعی بہت پیارا ہے اور جیسا کہ آپ کہہ رہی ہیں کہ چہرے پر فارینہ جیسی میرا مطلب ہے آج کل کی لڑکیوں جیسی کوئی تیزی طراری بھی نہیں۔" اس نے قریب بیٹھی سبزی بناتی فارینہ کو چھیڑنا چاہا تھا مگر فارینہ اپنی ہی کسی سوچ میں گم تھی وہ غازی کی بات پر توجہ ہی نہ دے پائی۔

"ڈیئر مام اور ڈیئر خالا تین دن سے آپ اس لڑکی کی امتیازی خصوصیات گنوا رہی ہیں لیکن آپ دونوں کو علم ہے کہ ولید بھائی کی رضامندی کے بغیر آپ کسی خوب صورت سے خوب صورت اور معصوم ترین لڑکی کا رشتہ مانگنے نہیں جا سکتیں۔ پچھلے دو برسوں میں کم از کم دو درجن لڑکیاں آپ کے من کو بھا گئی ہیں، لیکن ولید بھائی نے کسی ایک نام پر بھی رضامندی نہیں دی۔ وہ مستقل مزاجی سے ایک ہی بات پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ فی الحال وہ شادی کے بندھن میں بندھنا ہی نہیں چاہتے۔ آپ دونوں خواتین آخر اس انکار کی تہ میں جھانک کر کیوں نہیں دیکھتیں۔" غازی کچھ لجاجت کچھ بے بسی بھرے انداز میں ماں اور خالہ سے مخاطب ہوا تھا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا؟" نصرت نے تیکھے تیوریوں سے بیٹے کو گھورا۔

"اس سلطان راہی اسٹائل میں گھوریں گی تو مطلب تو اپنی موت آپ مرجائے گا۔ جو ہمت بگ بی میں نہیں ہے وہ میں کہاں سے لاؤں۔" غازی بڑبڑایا

"یہ غازی تو فضول ہانکتا ہے آپا اس کی باتوں پر کیوں دھیان دے رہی ہیں۔" ندرت جو عموماً "غازی کے واری صدقے جاتی رہتی تھیں اس وقت اس اہم گفتگو کے بیچ انہیں غازی کی دخل اندازی قطعاً" نہ بھائی تھی سو بہن کو دوبارہ اپنی طرف متوجہ کیا۔

"میں تو کہتی ہوں کسی طرح درثمن کی تصویر ولید کو دکھا دی جائے پھر دیکھیے گا کیسے اس کا انکار اقرار میں بدلے گا۔" ندرت کچھ زیادہ ہی پرجوش اور پریقین تھیں۔

"جب وہ لڑکی واقعی اتنی اچھی ہے اور ولید بھائی ابھی شادی پر راضی نہیں ہو رہے تو آپ لوگ غازی کا رشتہ کیوں نہیں لے جاتے۔" کافی دیر سے خاموش بیٹھی فارینہ نے اپنی دانست میں ماں اور خالا کو بہت صائب مشورہ دیا تھا لیکن ندرت جانے کیوں آپے سے باہر ہو گئیں۔

"تم لوگوں کے سامنے تو کوئی بات کرنا ہی فضول ہے۔ جب بڑے بات کر رہے ہوں تو بیچ میں بچوں کے بولنے کا کوئی تک ہے بھلا۔ چلو اٹھو جاؤ یہاں سے۔ اس لڑکی کے اندر تو عقل نام کو نہیں ہے۔" آخر میں قدرے بے بسی سے بڑی بہن کو مخاطب کیا اور لڑکی انتہائی خفگی کے عالم میں سبزی کی ٹوکری سمیت واک آؤٹ کر گئی تھی۔

غازی نے بہت مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی تھی۔ پھر وہ بھی وہاں سے اٹھ گیا تھا مبادا خالا فارینہ کی طرح اس کی بھی "عزت افزائی" کر ڈالیں۔

☼ ☼ ☼

"میں آپ کو بتائے دے رہا ہوں بھائی۔ امی اور خالا اب آپ کے انکار کو مزید خاطر میں نہیں لائیں گی وہ آپ کی کہیں نہ کہیں بات پکی کر کے دم لیں گی جو تازہ ترین لڑکی انہوں نے ڈھونڈی ہے اس کی شان میں دونوں خواتین مسلسل قصیدے پڑھے جا رہی ہیں۔ خطرے کی گھنٹی زوردار طریقے سے بجنے لگی ہے

بھائی آپ کو جانے کیوں آواز میں آرہی۔"

غازی ولید سے مخاطب تھا اور فارینہ جو ولید کے دھلے ہوئے کپڑوں کی تہ بنا کر اس کی وارڈ روب میں رکھنے آرہی تھی غازی کی بات سن کر وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔ ولید بھائی آخر شادی سے انکاری کیوں تھے ہو سکتا ہے دونوں بھائیوں کی گفتگو سے یہ گتھی سلجھ جائے۔ فارینہ نے دروازے پر دستک دینے کے بجائے چپکے سے دونوں بھائیوں کی باتیں سننے کا فیصلہ کیا تھا۔

"میری مرضی کے بغیر امی میرا رشتہ کیسے طے کر سکتی ہیں۔ تم بلاوجہ کا وہم مت پالو۔" ولید نے غازی کو رسانیت سے مخاطب کیا۔

"اور میں کہوں گا آپ بلاوجہ کی خوش فہمی مت پالیں۔ امی اور خالہ کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس بار وہ آپ کے انکار کو خاطر میں لانے کے موڈ میں نہیں۔" غازی اپنی بات پر مصر تھا۔

"پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔" ولید نے بے چارگی بھرے لہجے میں غازی سے ہی استفسار کیا۔

"ہمت کریں اور اپنی محبت کا نام والدہ حضور کو بتا دیں نہ صرف بتا میں بلکہ اس نام پر ڈٹ کر کھڑے ہو جائیں۔ صاف کہہ دیں کہ شادی کروں گا تو صرف اسی سے ورنہ ساری زندگی کنوارا بیٹھا رہوں گا۔" غازی بھائی کو جوش دلا رہا تھا اور دروازے سے کان لگا کر کھڑی فارینہ دم بخود تھی۔ ولید بھائی کسی کی محبت میں گرفتار تھے کتنا بڑا انکشاف تھا یہ لیکن آخر وہ موصوفہ تھیں کون۔ تجسس سے فارینہ کا برا حال ہو رہا تھا۔

"امی تو پہلے ہی پھوپھو سے خار کھاتی ہیں۔ میں نے عفرہ کا نام لے لیا تو امی کی طرف سے فوری انکار تو ہو گا ہی لیکن مجھے یہ بھی خدشہ ہے کہ دو چار مہینے بعد پھوپھو اور عفرہ یہاں کا چکر لگا لیتی ہیں پھر یہ سلسلہ بھی موقوف ہو جائے گا ظاہر ہے امی کا نزلہ صرف مجھ پر نہیں گرے گا۔ عاکفہ پھوپھو اور عفرہ بھی لپیٹ میں آئیں گی اور یہ میں ہرگز نہیں چاہتا۔" ولید افسردگی سے گویا ہوا۔

"تو پھر یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے گی؟" غازی پوچھ رہا تھا۔

"ابھی میں امی کو انکار کر کے تھکانا چاہتا ہوں مجھے یقین ہے ایک وقت ایسا آئے گا جب امی تھک ہار کر اقرار کریں گی کہ میں آخر کسی لڑکی کا نام تو لوں وہ وہیں میری شادی کر دیں گی بس جب میں عفرہ کا نام لے لوں گا۔" ولید کے کہنے پر غازی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا کہنے آپ کی لانگ ٹرم پلاننگ کے بگ بی۔ میں تو سمجھتا تھا اس گھر میں فارینہ ہی عقل سے پیدل ہے۔ گستاخی معاف آپ تو فارینہ سے بھی زیادہ بھولے ہیں۔" غازی کے کہنے پر ولید کے چہرے پر تو جانے کیسے تاثرات نمودار ہوئے تھے باہر کھڑی فارینہ کا میٹر گھوم گیا مگر غصے کی یہ کیفیت صرف چند سیکنڈوں پر محیط تھی حقیقت میں تو دل و دماغ اس وقت شدید حیرت سے دوچار تھے۔

ولید بھائی عفرہ آپی کو پسند کرتے تھے کیسا انوکھا انکشاف تھا یہ انوکھا مگر خوشگوار ترین.... وہ دونوں ہی فارینہ کے دل سے بہت قریب تھے اور اگر دو پیارے ایک ہو جاتے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ فارینہ کے لب آپ ہی آپ مسکرانے لگے تھے۔

"عاکفہ پھوپھو آج کل عفرہ آپی کی وجہ سے بہت پریشان ہیں ان کا خیال ہے کہ پھوپھا جان اپنے کسی بھائی کے بیٹے سے ان کا رشتہ طے نہ کر دیں اور آپ تو جانتے ہیں کہ عاکفہ پھوپھو کی پھوپھا جان کے سامنے بالکل نہیں چلتی اگر انہوں نے ایک بار فیصلہ کر لیا تو پھوپھو کو بھی اس فیصلے کے سامنے سرنڈر کرنا پڑے گا۔" غازی ولید کو صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کر رہا تھا۔

"تمہیں کس نے بتایا۔" ولید یہ خبر سن کر تڑپ اٹھا تھا۔

"ظاہر ہے پھوپھو نے ہی بتایا۔ پرسوں میں گیا تھا ان کی طرف۔" غازی ولید کو تفصیل بتانے لگا فارینہ واپس پلٹ گئی۔

اسے ہماری صورت حال کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ اب وہ بی جان سے ولید بھائی کی مدد کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے لیے اسے غازی کا ساتھ ہی درکار تھا۔ شام کو جب وہ افطاری تیار کرنے کچن گئی تو تھوڑی دیر میں غازی بھی اس کی ہیلپ کروانے آ گیا۔ فروٹ چاٹ، سکنجبین اور کسی بھی فروٹ کا شیک بنانے کی ذمہ داری غازی نے ہی اٹھا رکھی تھی۔

"ولید بھائی، عفرہ آپی کو پسند کرتے ہیں اور تم نے یہ بات مجھے آج تک نہیں بتائی۔" اس نے چھوٹتے ہی شکوہ کیا تھا۔ غازی نے اس غیر متوقع بات پر حیرت سے بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"اب یہ مت پوچھنے بیٹھنا کہ تمہیں کیسے پتا چلا۔" فارینہ نے کہا۔

"میں نے تمہاری اور ولید بھائی کی باتیں سن لی ہیں۔ جہاں مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی ولید بھائی، عفرہ آپی کو پسند کرتے ہیں۔ وہیں اس بات کا دکھ بھی ہوا کہ اتنی اہم خبر سے کسی نے مجھے آگاہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔" فارینہ خفگی سے بولی تھی۔

"چلو اب تو تم آگاہ ہو گئی ہو نا، بتاؤ کیا کر لو گی اپنے ولید بھائی اور اپنی عفرہ آپی کے لیے۔ کیا اپنی والدہ محترمہ اور میری والدہ حضور کو عفرہ آپی کا رشتہ لے کر جانے پر راضی کر لو گی۔" غازی نے پوچھا۔ فارینہ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کا منہ لٹک گیا۔

"بس اسی لیے نہیں بتایا تھا تمہیں۔" غازی نے جتایا۔

"کیا پھوپھو کا قصور اتنا بڑا تھا غازی کہ اتنے برس گزرنے کے بعد بھی معاف نہ کیا جا سکے۔" وہ افسردگی سے پوچھ رہی تھی۔

"پھوپھو کی وجہ سے امی، ابو کی علیحدگی ہوتے ہوتے بچی تھی بے شک یہ کوئی معمولی قصور نہیں تھا فری! لیکن پھوپھو کو اپنی غلطی کا احساس بھی تو ہو گیا تھا۔ بعد کے برسوں میں پھوپھو نے کبھی جہانگیر منزل کے کسی فرد کی زندگی میں مداخلت کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ انہوں نے تو اپنے بھائیوں پر بھی حق جتانا چھوڑ دیا۔ دو، چار مہینوں بعد مہمانوں کی طرح آتی ہیں اور ہماری والدہ محترماؤں کے بگڑے موڈ کو خوش دلی سے برداشت کر کے چپ چاپ واپسی کی راہ لیتی ہیں کسی زمانے میں وہ بے شک ظالم رہی ہوں گی لیکن اب تو مجھے ان سے بڑھ کر کوئی دوسرا مظلوم نہیں لگتا۔" غازی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا اور فارینہ کو اس کے تجزیے سے مکمل اتفاق تھا۔

"اور غازی، پھوپھو نے اپنی شادی سے پہلے خالہ جان کو جو ٹف ٹائم دیا اس کی ایک یہ ریزن بھی تو ہے کہ وہ کم عمر تھیں۔ گھر کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھیں انہیں خالہ جان کو ملنے والی اہمیت برداشت نہ ہوئی۔ اب فرض کرو تمہاری اور ولید بھائی کی بیویاں اس گھر میں آتی ہیں تو ہو سکتا ہے میں ان سے جیلس ہونا شروع ہو جاؤں۔ کیونکہ فی الحال تو گھر میں میں ہی آل ان آل ہوں۔ میں اگر آنے والی بہوؤں کو ٹف ٹائم دوں تو کیا امی اور خالہ میرا یہ قصور معاف کر دیں گی یا نہیں۔ غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے غازی اور کوئی اپنی غلطی پر شرمندہ ہو تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔" فارینہ نے بھی رنجیدہ ہو کر پھوپھو کے حق میں پوری تقریر ہی کر ڈالی۔

"تم کوئی بھی بات کرتے ہوئے میری شادی اور میری بیوی کو بیچ میں کیوں لاتی ہو۔" غازی اس تقریر کے جملہ معترضہ پر جزبز ہوا تھا۔

"تم اپنی ہونے والی بیوی کے لیے ابھی سے کتنے پوزیسو ہو غازی میں سچ کہہ رہی ہوں میں اس سے بہت جیلس ہونے لگی ہوں۔" فارینہ کے کہنے پر غازی نے بہت مشکلوں سے مسکراہٹ ضبط کی تھی۔

"پاگل ہو بالکل کوئی خود سے بھی جیلس ہو سکتا ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"کیا مطلب؟" فارینہ ایک بار پھر اس کی بات سن کر چکرا گئی تھی۔

"میرا مطلب ہے کوئی خود با تو دیکھے کسی سے

جیلس ہو سکتا ہے۔" غازی نے گڑبڑا کر وضاحت دی۔

"اچھا اب یہ ادھر ادھر کی ہانکنا بند کرو اور امی وغیرہ کو منانے کی کوئی ترکیب سوچو۔" وہ سنجیدگی سے غازی سے مخاطب ہوئی غازی نے فرماں برداری سے اثبات میں سرہلا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆
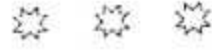
وہ ولید بھائی کے ساتھ ٹیلر کے پاس آئی تھی۔ واپسی پر ولید بھائی نے گاڑی پھوپھو کے گھر کی طرف موڑلی۔ تم پندرہ بیس منٹ تک پھوپھو کے ہاں بیٹھنا مجھے جنید سے کچھ کام ہے۔" ولید بھائی نے اسے مخاطب کیا۔ جنید ان کا گہرا دوست تھا اور وہ پھوپھو والی کالونی میں ہی رہائش پذیر تھا۔ آج ولید بھائی کو جنید سے واقعی ہی کوئی کام تھا۔ پھوپھو کے گیٹ پر اسے اتار کر وہ گاڑی آگے بڑھا کر لے گئے۔

دروازہ کھلا ہی ہوا تھا۔ فارینہ گھر میں داخل ہوئی۔ چہار سو خاموشی کا راج تھا۔ فارینہ نے بلند آواز سے عفرہ کو پکارا تھا۔ اگلے ہی پل پھوپھو کے بیڈ روم سے عفرہ باہر نکلی تھی۔ گلابی آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ۔ فارینہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

"سب خیریت تو ہے نا عفرہ آپی۔" اس نے عفرہ سے گلے ملتے ہوئے پوچھا۔

"امی کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے فارینہ۔" عفرہ اس سے ملتے ہوئے سسک پڑی تھی۔

"کہاں ہیں پھوپھو۔" فارینہ پریشان ہوئی۔

"اندر بیڈ روم میں۔" عفرہ اسے ساتھ لیے عاکفہ پھوپھو کے بیڈ روم میں داخل ہو گئی تھی۔ پھوپھو تکیوں کے سہارے بیڈ پر نیم دراز تھیں۔ نقاہت زدہ چہرہ طبیعت خرابی کا پتا دے رہا تھا۔

"فارینہ' میرا بچہ کیسی ہو۔" پھوپھو نے اسے دیکھ کر باہیں وا کر دیں۔

"میں تو ٹھیک ہوں پھوپھو۔ یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔" وہ ان کی حالت دیکھ کر تڑپی تھی۔

"بس بیٹا ڈاکٹر کی ہدایت کو نظرانداز کرتے ہوئے روزے رکھ لیے تھے۔ بی پی اور شوگر لیول ایسا لو ہوا کہ نارمل ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ میڈیسن لے رہی ہوں۔ ہو جاؤں گی ٹھیک۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

"صبح واش روم جاتے ہوئے چکرا کر گر پڑیں۔ کمر میں بھی چوٹ آئی ہے۔" عفرہ نے روہانسے انداز میں آگاہ کیا۔ کسی اپنے کو سامنے پا کر اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹنے لگے تھے۔

"آپ نے ہم لوگوں کو انفارم تک نہیں کیا۔ پھوپھو کی طبیعت اتنی خراب رہی اور ہمیں پتا ہی نہیں عفرہ آپی۔" فارینہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"میں تو بڑے ماموں کو فون کرنے لگی تھی لیکن امی نے منع کر دیا۔" عفرہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"ارے بیٹا اب اتنی بھی طبیعت خراب نہ تھی کہ بھائی کو پریشان کرتی اور اب تو طبیعت کافی بہتر ہے۔" وہ نقاہت زدہ لہجے میں بولیں۔

"جی نظر آ رہا ہے ہمیں کتنی بہتر ہے آپ کی طبیعت۔" فارینہ ان سے خفا تھی اتنے میں ہی پھوپھو کی پڑوسن چلی آئی تھیں۔ نوشین آنٹی' جن کا پھوپھو کے گھر کافی آنا جانا تھا اور فارینہ بھی ان سے بخوبی واقف تھی۔

"آج تو فارینہ بھی آئی ہوئی ہے۔" انہوں نے فارینہ کے سلام کا جواب دے کر خوشی کا اظہار کیا تھا پھر سوپ کا باؤل عفرہ آپی کو تھمایا۔

"میں عاکفہ آپا کے لیے زبردست سا سوپ بنا کر لائی ہوں عفرہ۔ اب اپنی امی کو زبردستی پلانا تمہارا کام ہے۔" پھوپھو کو کسی بھی قسم کا سوپ پسند نہ تھا اور نوشین آنٹی بھی یہ بات جانتی تھیں جب ہی مسکرا کر عفرہ کو مخاطب کیا۔ عفرہ اثبات میں سرہلاتی سوپ کا پیالا لیے کچن میں چلی گئی۔

"تم نے روزے کی حالت میں ناحق زحمت کی نوشین سوپ بنا کر لانا ضروری تھا کیا۔" پھوپھو دھیرے سے بولی تھیں۔

"روزانہ کوئی کچن میں جانے سے منع کرتا ہے عاکفہ آپا اور پھر مشکل وقت میں پڑوسی ہی پڑوسی کے کام نہ آئیں تو کیا فائدہ ایسے ہمسایوں کا۔ میرے ہر بچے کی پیدائش پر دو ہفتوں تک آپ کے گھر سے کھانا پک کر جاتا تھا۔ میں نے کبھی منع کیا آپ کو بلکہ ہم تو آپ کے خلوص اور محبت کو حق سمجھ کر وصول کرتے رہے اور اب ایسی ہی توقع آپ سے بھی کرتے ہیں۔" ہنس مکھ سی نوشین آنٹی کافی باتونی بھی تھیں۔ فارینہ ان کی بات سن کر مسکرا دی۔

وہ اس وقت کافی شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ سگے رشتے دار اتنے انجان اور بے خبر کہ عاکفہ کی طبیعت خرابی کا علم ہی نہ ہو سکا اور پڑوسن خبر گیری پر کمربستہ۔ قصور پھوپھو کا نہ تھا وہ اگر فون کر کے طبیعت خرابی کا بتا بھی دیتیں تو جہانگیر منزل میں سے کس نے ان کی عیادت کو آنا تھا۔ بھاوجوں نے محض ٹیلی فون پر خبر گیری کر کے رسم نبھالینی تھی اور دونوں بھائیوں میں سے کوئی آ بھی جاتا تو زیادہ سے زیادہ نقد رقم کا ایک لفافہ بہن کو یہ کہہ کر پیش کر دیا جاتا کہ وہ اپنے علاج معالجے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں بے شک عاکفہ پھوپھو کے معاشی حالات قابل رشک نہ تھے لیکن انہیں رقم سے زیادہ جذباتی ڈھارس کی ضرورت ہوتی تھی اور وہ ڈھارس انہیں کبھی اپنے میکے کی جانب سے نہ ملی تھی۔ فارینہ اس وقت عاکفہ کے لیے بہت دکھی ہو رہی تھی۔

"ٹینشن چھوڑیں عاکفہ آپا۔ ہمت سے کام لیں آپ ماں ہیں عفرہ کی ایک بار بیٹی کے لیے ڈٹ کر کھڑی ہو جائیں گی تو بھائی صاحب کو گھٹنے ٹیکنے ہی پڑیں گے۔" نوشین آنٹی عاکفہ سے مخاطب تھیں۔ فارینہ نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا۔

"کیسی ٹینشن پھوپھو مجھے تو بتائیں کیا ہوا ہے۔" اس نے پریشان ہو کر انہیں پکارا۔

"کیا بتاؤں بیٹا۔ عاکفہ کے لبوں پر بے بس سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں بتاتی ہوں۔ بات دراصل یہ ہے فارینہ کہ بھائی جان بھائی عفرہ کا رشتہ اپنے بھتیجے سے کرنے کے چکر میں ہیں۔ ایک نمبر کا نالائق اور لوفر لڑکا ہے نعمان۔ پڑھا لکھا بھی خاص نہیں اور بھائی جان کو اپنی شہزادیوں جیسی بیٹی کے لیے وہی نکھٹو شخص مناسب ترین لگ رہا ہے۔ عاکفہ آپا اسی ٹینشن کی وجہ سے تو بیمار پڑی ہیں یہ شوگر اور بلڈ پریشر گھٹنا تو صرف بہانہ ہے۔ طبیعت خرابی کی اصل وجہ صرف ٹینشن ہے ٹینشن۔" نوشین آنٹی بتا رہی تھیں اور فارینہ یہ سنتے ہی انتہائی مضطرب ہو گئی۔

"آپ ٹینشن مت لیں پھوپھو میں اللہ سے دعا کروں گی عفرہ آپی کو ان شاء اللہ کسی بہت شاندار بندے کا ساتھ نصیب ہو گا۔" اس نے پھوپھو کے ہاتھ تھام کر بہت جذب سے کہا تھا نوشین آنٹی نے جھٹ آمین کہہ ڈالا اور پانچ منٹ مشکل سے گزرے ہوں گے ایک شاندار بندہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"کیا ہوا پھوپھو طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہی تشویش جو عاکفہ پھوپھو کو دیکھ کر فارینہ کے لہجے میں ظاہر ہوئی تھی وہی لہجہ اور انداز ولید کا تھا۔ بے پناہ تشویش دکھ اور رنج فارینہ نے ان کی طبیعت خرابی کی تفصیل بتائی تھی۔

"مجھے تم سے یہ امید نہ تھی عفرہ۔ پھوپھو کی طبیعت اتنی خراب تھی اور تم ہمیں ایک کال کرنے کی روادار بھی نہ ہوئیں۔" عفرہ کمرے میں داخل ہوئی تو ولید اس پر بگڑا تھا۔ وہ منمناتے ہوئے جانے کیا وضاحت دینے لگی فارینہ تو دونوں کو یوں اکٹھے ساتھ کھڑا دیکھ کر کسی اور ہی سوچ میں گم ہو چکی تھی۔ دعا ہونٹوں پر نہ تھی بلکہ دل کے اندر سے نکل رہی تھی۔ دونوں کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ نصیب ہو جائے، لیکن دعا کے ساتھ ساتھ کچھ عملی اقدامات کی بھی ضرورت تھی اور یہ لائحہ عمل اس نے غازی کے ساتھ ہی مل کر طے کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ٹھیک ہے تم کہتی ہو تو ابو سے بات کر کے دیکھ

لیتے ہیں لیکن میرا نہیں خیال اس کا کوئی فائدہ ہو گا۔ امی کی مرضی کے بغیر ابو پانی نہیں پیتے' سب سے بڑے بیٹے کا رشتہ ان کی مرضی کے بغیر کیسے طے کریں گے۔ نا ممکن ہے یار۔" غازی کچھ زیادہ پر امید نہ تھا۔

"کوشش کر کے دیکھنے میں کیا حرج ہے غازی۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن جب ہم دونوں کی والدہ محترماؤں کو پتا چلے گا کہ ہم کس کوشش میں لگے ہوئے ہیں تو سوچ لو وہ ہمارا کیا حشر کر سکتی ہیں۔" غازی نے اسے ڈرانا چاہا۔

"جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" اس جملہ معترضہ پر غازی غش کھانے کو تھا کہ اس بار "ایسی ویسی" بات غازی کے بجائے فارینہ کے لبوں سے ادا ہوئی تھی۔

"ہم عفرہ آپی سے بھی اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا ولید بھائی سے تو ان دو پیاروں کی خاطر امی اور خالا کی ڈانٹ نہیں کھا سکتے ڈفر۔" فارینہ نے اس کی کم عقلی پر تاسف کا اظہار کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن پلیز تم مجھے تمیز سے مخاطب کیا کرو۔ غازی نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی۔

"ٹھیک ہے۔" فارینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

عابد جہانگیر سے بات کرنے کا موقعہ اسی شام مل گیا تھا۔ دونوں خواتین پڑوس میں افطاری پر مدعو تھیں۔ غازی اور فارینہ موقع غنیمت جان کر عابد صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ فارینہ نے نہایت جذباتی انداز میں تایا کے سامنے عاکفہ پھوپھو کی حالت زار کا نقشہ کھینچا۔ ان کی پریشانی کی وجہ سے آگاہ کیا' پریشانی کے خاتمے کے لیے ولید اور عفرہ کا رشتہ طے کرنے کی تجویز بھی پیش کر ڈالی لیکن جب اس تجویز پر عابد صاحب نے خاطر خواہ رد عمل کا اظہار نہ کیا تو غازی نے عفرہ کے لیے ولید کی پسندیدگی کے بارے میں بھی بتا ڈالا۔

"میں آپ کو یہ بات بتانا نہیں چاہ رہا تھا ابو کیونکہ جب آپ کے ذریعے یہ بات امی تک پہنچے گی تو ہماری تو درگت بنے گی سو بنے گی بے چارے ولید بھائی خواہ مخواہ میں زیر عتاب آجائیں گے کیونکہ انہوں نے تو یہ چاہت اپنی دانست میں اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپا رکھی ہے۔" غازی فکر مندی سے بولا تھا۔

"میرے بچو' یہ ہی بات تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں جب تمہیں خود اندازہ ہے کہ نصرت ولید کے لیے عفرہ کا نام تک سننے پر راضی نہیں ہوں گی تو عفرہ کا رشتہ مانگنا تو بہت دور کی بات ہے۔" عابد صاحب نے رسانیت سے دونوں "بچوں" کو سمجھایا تھا۔

"تو تایا جان ہم اسی لیے تو آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ اپنے خصوصی اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے خالا جان اور امی کو مجبور کریں کہ وہ اس رشتے پر راضی ہو جائیں۔" فارینہ نے لجاجت سے انہیں مخاطب کیا۔

"فری بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے ابو۔ یہ ایسا وقت ہے کہ آپ کو ہی اپنے بیٹے کی خاطر اسٹینڈ لینا ہو گا۔ ٹیپو سلطان نے بھی تو کچھ اسی قسم کی بات کہی تھی نا فری۔ بتاؤ ابو کو کہ کیا کہا تھا ٹیپو سلطان نے۔" غازی نے اچانک فارینہ کو مخاطب کیا۔ فارینہ نے بہت سوچا کہ ٹیپو سلطان نے اس قسم کی سچویشن کے بارے میں کیا کہا تھا مگر کچھ یاد آکر نہ دیا۔ لاعلمی کا اظہار غازی سے مذاق اڑوانے کے مترادف تھا۔ اس لیے اس نے کچھ نہ کچھ بولنا ہی ضروری سمجھا۔

"جی تایا جان' ٹیپو سلطان نے بھی یہ ہی کہا تھا کہ اولاد کی شادی کے وقت ان کی پسند' ناپسند کو مد نظر نہ رکھا جائے تو......"

"ڈفر' یہ کب کہا تھا ٹیپو سلطان نے۔" غازی نے اسے گھورا۔

"پھر کیا کہا تھا۔" فارینہ نے بے چارگی سے پوچھا۔

"وہی شیر اور گیدڑ کی زندگی والی کہاوت...... سناؤ نا ابو جی کو۔" وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

"واہ میں کیوں سناؤں تم خود سناؤ نا۔" فارینہ کو اس کی چالاکی پر تاؤ چڑھا تھا۔

"میں جانتا ہوں بیٹا، بی کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہوتی ہے لیکن اگر میں شیر بنتے ہوئے تمہاری امی کو اپنا فیصلہ ماننے پر مجبور بھی کردوں تو تم خود سوچو کہ جبر کے تحت جوڑا گیا عفرہ اور ولید کا بندھن کتنا پائیدار ثابت ہوگا اور شادی کے بعد اس گھر میں عفرہ کی کیا حیثیت ہوگی۔ عفرہ میری سگی بھانجی ہے بیٹا اور مجھے کم پیاری بھی نہیں۔ اس کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ ناپسندیدہ بہو بن کر اس گھر میں نہ آئے۔ باقی میں کوشش کروں گا کہ اس کے لیے کوئی اور مناسب رشتہ ڈھونڈ سکوں تاکہ سبحان اپنے ناکارہ بھتیجے سے اس کی شادی نہ کرے، لیکن ظاہر ہے سبحان عفرہ کا باپ ہے۔ اس کی زندگی کے متعلق حتمی فیصلہ کرنے کا اختیار اسی کے پاس ہے۔" عابد صاحب نے بات ہی نپٹا دی تھی۔

"ابو کی باتیں حقیقت پسندی پر مبنی ہیں فری۔" وہ منہ لٹکا کر تایا جان کے کمرے سے نکلی تو غازی نے اسے سمجھانا چاہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو غازی لیکن میرے نزدیک سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ ولید بھائی عفرہ آپی کو پسند کرتے ہیں اور عفرہ آپی بھی ولید بھائی جیسا شخص ہی ڈیزرو کرتی ہیں۔ ان دونوں کے ملن کے لیے میں اپنی کوششیں جاری رکھوں گی۔" اس نے اعلان کیا۔

"وش یو بیسٹ آف لک فری۔" اس بار غازی نے بھی صدق دل سے اس کی کامیابی کے لیے دعا دی تھی۔

☆ ☆ ☆
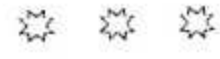
"یہ عابد بھائی کو کیا پٹیاں پڑھا کر آئے ہو تم دونوں؟" حسب توقع بہت جلد پیشی بھگتنا پڑ گئی تھی۔ جرح کرنے والی ندرت تھیں لیکن جرح کا سامنا کرنے کے لیے فی الوقت غازی دستیاب نہ تھا۔ فارینہ نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے خود کو نہ صرف اس جرح کا سامنا کرنے کے لیے تیار کیا بلکہ عفرہ آپی اور ولید بھائی کا مقدمہ لڑنے کا بھی فوری فیصلہ کیا تھا۔

"ہم نے تایا جان کو پٹیاں پڑھانے کی اپنی سی بہت کوشش کی تھی لیکن وہ شیر کی ایک دن کی زندگی جینے کو تیار ہی نہیں۔" فارینہ نے بہت افسوس سے کندھے اچکا کر کہا۔

"تم جانتی ہو نصرت آپا یہ جان کر کتنی ڈسٹرب ہو گئی ہیں کہ ولید، عفرہ کو پسند کرتا ہے۔" ندرت نے بیٹی کو گھورتے ہوئے مخاطب کیا۔

"صرف ڈسٹرب ہونے سے بات نہیں بنے گی امی۔" خالا کو عفرہ آپی کا باقاعدہ رشتہ لے کر جانا ہو گا۔"

"اپنی حد میں رہو فارینہ۔ بدتمیزی کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔" ندرت کو ٹھیک ٹھاک غصہ آگیا تھا۔ فارینہ بے چاری چپ ہو گئی ورنہ جی تو چاہ رہا تھا کہ انہیں بتائے بدتمیزی ہی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

"تمہاری پھوپھو نے برسوں پہلے آپا کے ساتھ کیا کیا تھا۔ کتنی بار یہ قصہ تم لوگوں کو سنا چکی ہیں مگر جانے عاکفہ نے تم لوگوں کو کیا گھول کر پلا دیا ہے کہ تمہیں اس کی کوئی زیادتی، زیادتی ہی نہیں لگتی۔" ندرت عاکفہ کے لیے ان سب کی محبت سے پہلے ہی بے زار رہا کرتی تھیں اور اب تو بگڑنے کا معقول بہانہ بھی ہاتھ لگ چکا تھا۔ انہوں نے فارینہ کو بے بھاؤ کی سنا ڈالی تھیں۔ وہ بھی آخر کب تک ضبط کرتی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو گئیں پھر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔

"آپ نے اپنی روزے دار بیٹی کو رلا دیا۔ یہ کوئی ثواب کا کام نہیں ہے خالا۔" اسی وقت غازی بھی وہاں آنکلا تھا۔ فارینہ کے آنسو دیکھ کر وہ بے چین ہوا تھا اور خالا کو ٹوکے بنا نہ رہ پایا۔

لاڈلی بیٹی کو یوں روتا دیکھ کر ندرت خود پشیمان ہو گئی تھیں۔

"تم ہی سمجھاؤ اسے غازی آخر یہ ایسی باتیں کیوں کرتی ہے۔" وہ بے بسی سے بولیں۔

"فری نے کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں کی خالا آخر آپ لوگ پھوپھو کا ماضی بھلا کیوں نہیں دیتے۔" زندگی میں پہلی بار غازی کھلم کھلا فارینہ کی کسی بات پر حمایت کر رہا تھا۔

"ہماری پھوپھو کے ماضی کے ساتھ ہمارے ماضی کی انتہائی تلخ یادیں جڑی ہیں غازی۔ آپا شادی کے کچھ عرصے بعد ہی میکے واپس آکر بیٹھ گئی تھیں۔ ہم کوشش بھی کرلیں تو ان دنوں کی اذیت ناک یادیں ذہن سے کھرچ کر نہیں مٹا سکتے۔ آپا کی زندگی میں زہر گھولنے والی عاکفہ ہی کی ذات تھی۔ میری ماں جس نے بہت ارمانوں اور چاؤ سے بڑی بیٹی کی شادی کی تھی اس کا گھر اجڑتا نہ دیکھ سکیں۔ یقین کرو بیٹا' آپا کا گھر تقریباً" اجڑنے ہی والا تھا ولید کی پیدائش کے باوجود عابد بھائی بیٹے کو دیکھنے تک نہ آئے۔ لوگوں سے اڑتی اڑتی یہی خبر سننے کو ملتی تھی کہ ماں' بہن کے دباؤ میں آکر عابد بھائی آپا کو طلاق دینے ہی والے ہیں۔ میری اماں یہ ٹینشن نہ سہار پائیں اور آپا کا غم لیے اس دنیا سے ہی رخصت ہوگئیں۔ ہمارے گھر پر قیامت ٹوٹ گئی تھی بیٹا! اور پھر آپا کا گھر دوبارہ بس بھی گیا لیکن اماں تو دوبارہ واپس نہ آئیں نا۔" اتنے برسوں بعد ندرت شفیق ترین ماں کو یاد کرکے سسک پڑی تھیں۔ غازی اور فارینہ بھی افسردہ ہوگئے تھے۔

"اچھا خالا آپ ٹینشن نہ لیں ظاہر ہے امی کی اور آپ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔" غازی نے انہیں کندھے سے لگا کر چپ کروایا۔ فارینہ کچھ بولنے ہی لگی تھی لیکن غازی نے آنکھ کے اشارے سے منع کردیا۔

☆ ☆ ☆

رمضان المبارک کا آخری بابرکت عشرہ شروع ہوچکا تھا۔ گھر کی خواتین کی عبادات' ذکر و اذکار اور وظائف کا سلسلہ بھی زور پڑچکا تھا۔ طاق راتوں میں عبادت کا خاص اہتمام ہوتا۔ مرد حضرات مساجد میں شب بے داری کرتے تو خواتین گھر میں جائے نماز سنبھالتیں۔ اس شب بھی نصرت' ندرت اور فارینہ نماز عشا اور تراویح کی ادائیگی کے بعد شب قدر کے نوافل پڑھ رہی تھیں جب فارینہ نیند بھگانے کے لیے چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔ ندرت اور نصرت کو بھی چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ عبادات کے درمیان چھوٹا سا "ٹی بریک" آگیا تھا۔ جب چائے کا سپ بھرتے ہوئے فارینہ کو یونہی ایک خیال آگیا تھا۔

"ہم انسان کتنے گناہ گار ہوتے ہیں نا خالا اگر اللہ ہماری عبادتیں قبول ہی نہ کرے تو....."

"تو بیٹا جی اسی لیے تو توبہ' استغفار کی بہت اہمیت ہے۔ انسان کو چاہیے ہر وقت اپنے گناہوں پر توبہ کا اظہار کرتا رہے توبہ قبول ہوجائے تو پھر سب عبادتیں بھی قبولیت کا درجہ پاجاتی ہیں۔" نصرت بیگم نے بہت پیار سے بھانجی کو سمجھایا تھا۔

"اللہ تعالیٰ بہت غفور الرحیم ہے خالا لیکن اللہ کے بندے کسی کا قصور یا غلطی آسانی سے معاف کیوں نہیں کرتے۔ برسوں گزر جانے کے باوجود کسی کی غلطی ان کے ذہنوں میں تازہ رہتی ہے اور وہ غلطی معاف کرنے کا سوچتے تک نہیں۔" فارینہ نے عام سے انداز میں یونہی بات برائے بات کی تھی لیکن ندرت اور نصرت دونوں یہ بات سن کر چونک گئیں۔ عام سے انداز میں کی جانے والی بات خاص پس منظر رکھتی تھی۔ دونوں کا چونکنا فطری تھا۔

"یاد ہے نا خالا شب برات پر کالونی میں شیخ صاحب کے گھر عورتوں کا درس منعقد ہوا تھا اور درس دینے والی آنٹی نے بتایا تھا کہ اس رات دل میں کسی کے خلاف کینہ' بغض یا کدورت رکھنے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ رمضان کی طاق راتیں بھی تو افضل ترین راتیں ہیں کیا ان راتوں میں بھی عبادات کی قبولیت کے لیے وہی اصول ہوگا۔" فارینہ سادہ سے انداز میں پوچھ رہی تھی لیکن یہ سوال سن کر ندرت کو جھرجھری سی آگئی تھی۔

وہ بہت عبادات گزار خاتون تھیں۔ بہت خشوع و خضوع سے نماز پڑھتیں۔ باقاعدگی سے صدقہ' خیرات کرتیں۔ رمضان المبارک میں تو عبادات کے ذوق و شوق کا عجب ہی عالم ہوتا۔ خصوصاً" آخری عشرے میں تو شب بے داری کرتے ہوئے عبادات میں مشغول رہتیں۔ لیکن یہ ان کی بیٹی نے ابھی کیا کہہ دیا

تھا۔ وہ محض کوئی خاص لمحہ تھا جب عام سی بات نے دل پر کاری ضرب لگائی تھی۔ وہ بابرکت رات اب صرف عبادت کی رات ہی نہ تھی بلکہ وہ محاسبے کی رات تھی۔ وہ ہمیشہ اللہ کے حضور توبہ استغفار کرتی رہتی تھیں۔ اس گمان کے ساتھ کہ اس غفور الرحیم رب کے ہاں یہ توبہ قبولیت کا درجہ پا جائے گی اور وہ خود کتنی کٹھور دل ثابت ہوئیں کہ اپنے شوہر کی سگی بہن کا قصور اتنے برسوں بعد بھی معاف نہ کرپائیں حالانکہ وہ تو متاثرہ فریق تک نہ تھیں۔

عاکفہ نے جو کچھ کیا نصرت بیگم کے ساتھ کیا۔ پھر نصرت آپا دوبارہ اپنے گھر واپس لوٹ تو آئی تھیں۔ آئندہ زندگی میں انہوں نے اس گھر پر بھی راج کیا اور شوہر کے دل پر بھی اور ندرت کی زندگی بھی بہن سے مختلف نہ تھی۔ خالد ان پر جان چھڑکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بیٹی جیسی رحمت سے نوازا تو اولاد نرینہ بھی عطا کی۔ عاکفہ کی زندگی تو سدا آزمائشوں سے عبارت رہی تھی۔ ندرت کو سدا اپنی ماں کے بچھڑنے کا قلق رہا اور وہ عاکفہ کو ماں کی موت کا ذمہ دار ٹھہراتی رہیں لیکن یہ بھی تو سچ تھا کہ اماں کی جان کے ساتھ سو بیماریاں چمٹی ہوئی تھیں اور موت سے کسے مفر ہے۔

عاکفہ کے ماں باپ تو اکٹھے اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ ندرت نے تو ہمیشہ پیار کرنے والی اور جان نچھاور کرنے والی سگی بہن کے ساتھ زندگی گزاری اور عاکفہ کا تو میکا ہی ختم ہوگیا۔ بیویوں کے تیور دیکھتے ہوئے بھائی خود ہی اکلوتی بہن سے لیے دیے انداز میں ملتے تھے۔ بیتے برسوں میں عاکفہ نے کبھی جہانگیر منزل میں بسنے والے کسی فرد کی زندگی میں مداخلت کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ انہوں نے کبھی زبان سے اظہار نہیں کیا ورنہ ان کا ہر عمل شاہد تھا کہ وہ اپنے ماضی پر نادم ہیں۔

عفرہ کی تربیت انہوں نے مثالی انداز میں کی تھی۔ عفرہ خود بہت پیاری بچی تھی۔ ایسی بچی جو کسی گھر میں جاتی تو اجالا بکھیر دیتی اور جب ندرت کو علم ہوا کہ ولید عفرہ کو چاہتا ہے تو انہوں نے بہن کو دو ٹوک انداز میں باور کروایا کہ وہ عاکفہ کی بیٹی سے ولید کا رشتہ طے کرنے کے بارے میں سوچیں تک نہیں۔ حالانکہ نصرت ولید کی خواہش جان کر کچھ متذبذب تھیں۔ وہ خود عاکفہ کی بیٹی سے رشتہ جوڑنے کے "قطعاً" حق میں نہ تھیں لیکن اپنے فرمانبردار بیٹے کی چاہت سے آگاہ ہونے کے بعد وہ کسی قطعی فیصلے پر پہنچتے ہوئے ہچکچا رہی تھیں یہ ندرت ہی تھیں جنہوں نے بہن کو قطعی فیصلے پر پہنچنے میں مدد دی۔ جذباتی انداز میں نصرت بیگم کو عاکفہ کا ماضی یاد کروایا۔

ولید کے حوالے سے بھی انہیں خوب تسلی دلا سے دیے کہ جوانی میں وقتی پسندیدگی کو انسان محبت کا نام لے لیتا ہے اور ولید کے لیے وہ اتنی اچھی لڑکی ڈھونڈیں گی کہ وہ شادی کے بعد عفرہ کے بارے میں سوچے گا تک نہیں۔ کتنی بڑی زیادتی کرنے والی تھیں وہ ولید کے ساتھ۔ عفرہ، عاکفہ کے ساتھ اور شاید سب سے بڑھ کر اپنے ساتھ۔ ان کی بظاہر بے وقوف نظر آنے والی بیٹی نے آج کتنی بڑی عقل کی بات سکھا دی تھی انہیں۔

دل کو بلاوجہ کے بغض، کینہ اور کدورت سے پاک کرنے کے بعد انہوں نے خالق کائنات کی بارگاہ میں سچے دل سے توبہ کی اور اس توبہ کے بعد ان کا جی اتنا ہلکا پھلکا ہوگیا کہ انہیں خود ہی توبہ کی قبولیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

یہ "جہانگیر منزل" میں اترنے والی خوب صورت ترین چاند رات تھی۔ سب لوگ بہت ارمانوں سے خریدی گئی عاکفہ اور عفرہ کی عیدی لے کر عاکفہ کے ہاں جا رہے تھے۔ فارینہ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ ماں اور خالا کے ساتھ مل کر اس نے عفرہ کے لیے عید کا نہایت خوب صورت جوڑا ڈیزائن کیا تھا۔ انہوں نے آج عفرہ کو عیدی دینی تھی اور اس کا رشتہ لینا تھا۔

"ہو سکتا ہے سبحان پھوپھا انکار ہی۔ کر دیں۔" کبھی کبھی فارینہ کو خدشہ ستاتا تھا۔

"جب تم نے امی اور خالہ کو راضی کر لیا ہے تو سبحان پھوپھا کس کھیت کی گاجر مولی ہیں۔ ایک چھوٹا سا وعظ ان کے سامنے بھی کر دینا۔ تم تو سب کچھ کر سکتی ہو یار۔" غازی آج کل اس کی صلاحیتوں سے خاصا امپریس ہو رہا تھا۔ فارینہ اترا کر مسکرا دیتی۔

پورے گھر میں ولید ایسا فرد تھا جس کو گھر میں ہونے والی تازہ ترین پیش رفت کی بھنک بھی نہ پڑی تھی، بلکہ فارینہ کی خواہش پر اسے یہ بھنک پڑنے ہی نہ دی گئی تھی۔ وہ ولید بھائی کو سرپرائز دینا چاہتی تھی اور غازی سمیت سب نے اس کی خواہش کا احترام کیا تھا۔

آج بھی ولید آخری افطاری پر اپنے بیسٹ فرینڈ جنید کے ہاں انوائیٹڈ تھا۔ پیچھے سے سب لوگ عاکفہ کے ہاں جا پہنچے تھے۔ سب کو یوں اکٹھا اپنے گھر آتا دیکھ کر عاکفہ کو اپنی بصارتوں پر اعتبار ہی نہ آیا۔ سبحان پھوپھا بھی گھر پر ہی تھے۔ اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے بہت تپاک سے انہوں نے سب کو خوش آمدید کہا۔ عاکفہ کے بھائیوں کی مضبوط مالی حیثیت کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہی ان سے بہت مرعوب اور متاثر رہتے تھے لیکن انہیں یہ بھی اندازہ تھا کہ بھائیوں، بھاوجوں کی نگاہ میں عاکفہ کی زیادہ وقعت نہیں ہے اس لیے انہیں بیوی سے ہر قسم کا رویہ روا رکھنے کی کھلی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔ لیکن آج عاکفہ کے بھائی، بھاوج جس محبت اور اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہن اور بھانجی سے مل رہے تھے سبحان صاحب کی حیرت فطری تھی اور پھر نصرت بیگم نے بہت لجاجت سے ولید کے لیے عفرہ کا رشتہ مانگ کر عاکفہ اور سبحان کو گنگ ہی کر دیا۔

"بہت آس لے کر آپ کے پاس آئے ہیں سبحان بھائی۔ مایوس مت کیجیے گا۔" اس بار سبحان صاحب کو مخاطب کرنے والی ندرت تھیں۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ ندرت بھابھی۔ یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے کہ میری بیٹی کے لیے آپ لوگ ولید جیسے قابل بچے کا رشتہ پیش کر رہے ہیں۔ عفرہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔ اللہ نے اسے بھائی جیسے رشتے سے بھی نہیں نوازا۔ میں خود ہائپر ٹینشن کا مریض۔ عاکفہ کی صحت کا بھی آپ کو بخوبی اندازہ ہے۔ سچ بتاؤں تو یہ سوچ کر میری راتوں کی نیند اڑ جاتی تھی کہ اگر مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو میرے بعد عاکفہ اور عفرہ کا کیا بنے گا۔ ان ہی سوچوں کے زیر اثر میں تو اپنے بھائی کے بیٹے سے عفرہ کا رشتہ طے کرنے والا تھا حالانکہ میرا بھتیجا کسی طور عفرہ کے قابل نہ تھا لیکن بیٹیوں کے باپ بعض اوقات بہت مجبوری کے عالم میں ایسے فیصلے کر ڈالتے ہیں۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ ابھی میں نے انہیں زبان نہیں دی تھی۔ عفرہ آج سے آپ کی بیٹی ہے اور میں اس عنایت پر ہمیشہ آپ لوگوں کا ممنون احسان رہوں گا۔" شدت جذبات سے سبحان صاحب کی آواز کپکپا کر رہ گئی تھی۔

"بے چارے سبحان پھوپھا۔ ان کے متعلق میں ہمیشہ کتنا غلط گمان کرتی تھی۔" فارینہ سبحان صاحب کی شکل دیکھ کر سوچ رہی تھی اور نصرت بیگم نے سبحان صاحب کا اقرار سن کر عفرہ کو بے ساختہ اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

"احسان مند تو ہم آپ کے ہیں سبحان بھائی اتنی سلجھی ہوئی اور پیاری بچی کو آپ نے ہماری جھولی میں ڈال دیا۔ ہم لاکھ جوتیاں چٹخاتے ولید کے لیے عفرہ جیسی بچی کبھی نہ ڈھونڈ پاتے۔" نصرت بیگم نے عفرہ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ عاکفہ بے ساختہ رونے لگی تھیں۔ ان سے یہ خوشی برداشت نہ ہو پا رہی تھی۔ ندرت نے پیار سے نند کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"ولید بھائی کو تو فون کر کے بلا لو غازی۔" فارینہ نے غازی کے کان میں سرگوشی کی اور جس وقت ولید عاکفہ کے ہاں پہنچا، نصرت بیگم عفرہ کو انگوٹھی پہنا چکی تھی اور شرمائی لجائی عفرہ دونوں ممانیوں کے درمیان بیٹھی تھی۔

"آپ سب لوگ یہاں کیسے...؟ آنے کا کوئی پروگرام تو نہ تھا۔" ولید حیران ہو کر پوچھ رہا تھا۔

"ہم سب عفرہ آپی کی منگنی میں آئے ہیں۔ ولید بھائی۔" غازی نے سنجیدگی سے بھائی کو آگاہ کیا لیکن اس ادھوری خبر سے ولید کے چہرے پر جیسا تاریک

سایہ لہرایا۔ فارینہ سے مزید ضبط نہ ہو سکا۔
"مبارک ہو ولید بھائی، عفرہ آپی سے آپ کی باقاعدہ منگنی ہو گئی ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ ولید نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر ماں اور خالا کو دیکھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا کر خبر کی تائید کر دی۔

"ڈیئر امی اور پیاری خالا...... عفرہ بھابھی کو انگوٹھی تو آپ لوگ پہنا ہی چکے ہیں۔ پلیز اب ولید بھائی کو بھی ان کے ساتھ بیٹھنے کا موقع عنایت کر دیں۔ میں دو چار تصویریں ہی بنا لوں۔" چونکہ مرد حضرات باہر صحن میں محفل جما کر بیٹھ چکے تھے اس لیے غازی نے شوخی سے ماں اور خالا سے جگہ چھوڑنے کی درخواست کی تھی۔ دونوں ہنستے ہوئے اٹھ گئی تھیں۔ بے یقین سا ولید عفرہ کے برابر جا بیٹھا۔

"خواب نہیں ہے میرے چاند، حقیقت ہے یہ۔" ندرت نے ولید کی بے یقینی دیکھ کر پیار سے اسے مخاطب کیا۔ ولید نے بھی کیا، کیوں اور کیسے کی بحث میں پڑنا غیر ضروری خیال کیا۔ وہ طمانیت سے مسکرا دیا۔ پھر ذرا سا رخ ترچھا کر کے عفرہ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی بہت پیاری شرمیلی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ غازی نے اپنے سیل فون پر اس یادگار لمحے کو فوراً "مقید کر لیا تھا۔

غازی بھی اتفاق سے وہیں موجود تھا۔ آج اس سے واقعی ضبط نہ ہو سکا۔
"امی، پیاری امی، پلیز ایک انگوٹھی میری اس غیر اعلانیہ منگیتر کی انگلی میں بھی ڈال دیں تاکہ اس احمق لڑکی کو اندازہ ہو کہ یہ اپنے منگیتر کے بارے میں کیا کیا اظہار خیال کرتی ہے۔ ہر چوتھے دن تو یہ میرے لیے کوئی رشتہ پیش کر رہی ہوتی ہے۔" غازی بے بسی سے بولا تھا۔ نصرت نے بہت مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی اور فارینہ پہلے تو حیران پریشان ہو کر غازی کی شکل دیکھتی رہی پھر خالہ کے پاس آئی تھی۔
"کیا غازی سچ کہہ رہا ہے خالا" وہ بے یقینی سے استفسار کر رہی تھی۔
"شرم تو اس لڑکی کو چھو کر نہیں گزری۔" غازی بھناتا ہوا کمرے سے ہی چلا گیا۔ اس انکشاف کے بعد وہ فارینہ کے چہرے پر جن رنگوں کو دیکھنے کا متمنی تھا، وہ رنگ نظر نہ آئے تو اس کا جلا جانا فطری تھا۔ البتہ ندرت نے بہت پیار سے بھانجی کی پیشانی چوم لی تھی۔
"اب غازی سے چونچیں لڑانا بند کر دو چندا، ورنہ شادی کے بعد اسے ادب سے مخاطب کرنا، تمہیں بہت مشکل لگے گا۔" اب نصرت اسے چھیڑ رہی تھیں اور اس بار وہ واقعی شرما کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

بیگم زمان اپنی خوب صورت ترین بھانجی کے ساتھ۔ "جہانگیر منزل" کی خواتین سے عید ملنے آئی تھیں۔ مہمانوں کی بھرپور خاطر مدارات تو کی گئی لیکن آج بھانجی صاحبہ کو عام مہمانوں کی طرح ہی ٹریٹ کیا گیا تھا۔
"کتنی پیاری ہے درثمن۔ سچ خالہ میں تو کہتی ہوں آپ درثمن کے لیے غازی کا رشتہ لے جائیں۔ یہ لڑکی ہاتھ سے نکل گئی تو ہم اتنی اچھی لڑکی پھر کہاں سے ڈھونڈیں گے۔" فارینہ نے مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد نصرت کو مفت مشورے سے نوازا تھا۔

"عید کا سارا دن گزر گیا اور تم نے مجھے عیدی تک نہیں دی غازی۔" شام کو اس کا غازی سے سامنا ہوا تو وہ شکوہ کیے بنا نہ رہ پائی۔
"بولو کیا چاہیے۔" کوئی الٹا سیدھا جواب دینے کے بجائے غازی نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ وہ اس مسکراہٹ اور ایسے جواب کے لیے تیار نہ تھی۔ اس لیے فوری طور پر کوئی جواب نہ سوجھا۔ عیدی تو وہ ہر عید پر غازی سے مانگتی ہی تھی اور وہ بحث تکرار کے بعد عیدی سے نوازتا تھا لیکن آج کتنے آرام سے مسکراتے ہوئے اس نے والٹ جیب میں سے نکال لیا تھا۔

"بس رہنے دو میں تو ویسے ہی تمہیں آزما رہی تھی۔" فارینہ نے اسے منع کرنا چاہا۔

"محبت کرنے والوں کو آزماتے نہیں ہیں ڈیر۔" وہ تو آج بالکل بدلا ہوا غازی لگ رہا تھا۔

"دیکھو غازی.... غیر اعلانیہ منگیتر ہی بن کر رہو تو ٹھیک ہے۔ یہ محبت وحبت کی کوئی بات کی نا تو میں خالا کو بتا دوں گی۔" آخر کار غازی نے فارینہ کی بوکھلاہٹ دیکھ ہی لی۔ لیکن اس بوکھلاہٹ میں بھی کس دھمکی سے نوازا تھا اس نے غازی کو لطف ہی آگیا۔

"اچھا سچ سچ بتاؤ۔ اس خبر کے بعد کیا محسوس کر رہی ہو تم۔ دل کی فیلنگز کچھ بدلی بدلی لگ رہی ہیں نا۔" وہ بہت پرشوق لہجے میں استفسار کر رہا تھا۔

"پلیز غازی اب زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے' میرے لیے یہ خبر کوئی شاکنگ نیوز ہے۔ اتنی بدھو نہیں ہوں میں۔ مجھے پہلے سے ہی اس بات کا اندازہ تھا۔" اس نے غازی کی غلط فہمی دور کرنا ضروری سمجھا۔

"واقعی سچ کہہ رہی ہو۔" غازی حیران ہوا۔

"ہاں تو تم کیا سمجھتے ہو تمہاری اوٹنگی بونگی باتیں میرے سر پر سے گزر جاتی تھیں۔ جی نہیں مجھے سب سمجھ آتا تھا لیکن غصہ بھی آتا تھا۔ نہ تو تم نے کبھی کھل کر اس بارے میں بات کی نہ امی اور خالا نے کبھی کچھ بتایا۔ اسی لیے تو میں تمہارے رشتے پیش کرتی تھی کہ کسی بہانے تو سہی' کوئی تو منہ سے پھوٹے کہ میرا تمہارا رشتہ بالکل طے ہے۔" فارینہ نے کتنا بڑا انکشاف کیا تھا۔ غازی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

"تو تم واقعی یہ چاہتی تھیں کہ میرے تمہارے رشتے کی تصدیق ہو جائے۔" غازی نے حیرت کو ایک طرف رکھتے ہوئے خوش ہونا ضروری سمجھا۔

"اور نہیں تو کیا جب بات پکی ہے تو مجھے بھی تو پتا ہونا چاہیے تھا نا۔ اب میں بھی کالج میں اپنی دوستوں کے سامنے خوب شو ماروں گی۔ میرے گروپ میں میرے علاوہ سب کی منگنیاں ہو چکی ہیں۔ مجھے اپنا آپ اتنا بے چارہ بے چارہ سا لگتا تھا۔" وہ کس معصومیت سے اظہار خیال فرما رہی تھی۔

"تو تم صرف اس لیے اپنے میرے رشتے کی تصدیق چاہتی تھیں کہ کالج میں اپنی سہیلیوں کے سامنے شو مار سکو۔" دکھ اور صدمے سے غازی کا برا حال تھا۔

فارینہ نے مزے سے اثبات میں گردن ہلادی۔

"اچھا اب یہ ہی بات تم میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو کہ تم صرف اسی لیے اس خبر کی تصدیق چاہ رہی تھیں۔" کچھ لمحوں کے توقف کے بعد غازی نے اسے مخاطب کیا۔ فارینہ نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ مگر غازی کی پُرشوق جذبے لٹاتی آنکھوں کا سامنا کرنا اب اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

"دیکھو غازی کالج میں شو تو میں بعد میں ماروں گی اگر تم نے لفنگوں کے اسٹائل میں مجھے گھورنا بند نہ کیا تو میں تمہارے سر پر کوئی چیز اٹھا کر دے ماروں گی۔" فارینہ نے اپنا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے غازی کو دھمکایا۔ دھمکی سن کر غازی ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ کچھ لمحوں بعد فارینہ کی ہنسی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی تھی۔

غازی کو یقین تھا کہ اس سادہ سی لڑکی کی سنگت میں زندگی بہت مزے کی گزرنی تھی اور کچھ ایسا ہی یقین غازی کے بارے میں فارینہ کو بھی تھا۔

☆

آمنہ ریاض

دشتِ جنوں

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی.... ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔
معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔
فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ' وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے' آئے کت اور وسامہ' معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے' اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔
کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں تین بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔
صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے' رامین' کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔
شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہجہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں عرف مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔

باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں.... خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں' جس کی وجہ سے وہ تنک مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں بچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور ٹیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

ساتویں قسط

شام کا وقت تھا' خوش نصیب چھت کی منڈیر پر کہنیاں ٹکائے بے زاری سے نیچے جھانک رہی تھی۔ یہاں سے دیکھنے پر فضل منزل کا ایک حصہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ حتیٰ کہ بیرونی دروازہ جو پرانی طرز کا اور بہت بڑا تھا۔ وہ نہ صرف اندر سے دکھائی دیتا تھا بلکہ اس کا بیرونی حصہ اور گلی بھی کسی قدر نظروں میں آجاتی تھی۔ دروازے کے دونوں طرف پیپل کے گھنے اور اونچے درخت کھڑے تھے جن کا سایہ بے حد وسیع تھا۔

خوش نصیب کے پاس منڈیر پر ایک تام چینی کی پلیٹ پڑی تھی جس میں گھر کے بنے ہوئے فرنچ فرائز کا پہاڑ سا بنا ہوا تھا۔ یہ چپس اس نے آدھا گھنٹہ ماہ نور کا سر کھا کر حاصل کیے تھے۔ گو کہ ماہ نور نے اسے سمجھانے کی کافی کوشش کی تھی کہ اتنے زیادہ چپس کھا کر خود اپنے آپ سے دشمنی مول نہ لے' لیکن وہ خوش نصیب ہی کیا جو کسی

کی بات ماننے پر تیار ہو جائے۔ اسے صرف ان آلوؤں کا صفایا کرنا تھا جن کے متعلق تھوڑی دیر پہلے فضیلہ چچی کو کہتے سن چکی تھی کہ وہ ماہ نور سے کباب بنوانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ دل تو چاہ رہا تھا اس ارادے سے پہلے ہی فضیلہ چچی کا قیمہ بنا کر ان کے کباب بنا دے لیکن ایک تو وہ عمر میں بڑی تھیں، دوسرے ایسی باتیں صرف سوچی ہی جا سکتی ہیں۔ تکمیل کے مراحل میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ دن بھر کی کچن مہم کے بعد اب آلو کے کباب بنانے سے ماہ نور اور روشن امی کو صرف اسی صورت بچایا جا سکتا تھا کہ آلو ہی صفحہ ہستی سے غائب کر دیے جائیں، سو اس نے یہی کیا اور چپس بنوا کر اوپر آ گئی۔

اب چپس کی بھری ہوئی پلیٹ تھی اور زندگی کا عمیق فلسفہ۔ جسے سلجھانے کے لیے خوش نصیب بی بی کے پاس بڑا فارغ وقت تھا۔ ایک ایک چپس اٹھا کر کترتی جاتی اور زندگی کی تلخیاں یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتی جاتی۔ ویسے ٹھنڈی آہ بھرنے کے لیے ایک یہ غم بھی بہت تھا کہ چپس کے ساتھ کوک نہیں ملی۔ اگر مل جاتی تو اس اچانک دعوت کا لطف دوبالا ہو جاتا۔

خیر اسی وقت اس نے دیکھا فضیلہ چچی کی معیت میں ایک پورا جلوس مرکزی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہو نہ ہو وہ مہمان جس کی آمد کی خوشی میں ان سے ان کا پورشن چھینا گیا اور جس کے لیے صبح سے اس کی روشن امی اور ماہ نور کچن میں مغز ماری کر رہی تھیں، اب پہنچنے ہی والا تھا۔ خوش نصیب نے حلق کے اندر سے ایک بھرپور "ہوں" کیا اور جی جان سے آنے والے مہمان پر لعنت بھیجی۔ اسے اس مہمان سے دلچسپی تھی نہ مہمان کے میزبانوں سے۔ لیکن اسی اثنا میں فضل منزل کے بڑے دروازے کے پاس آ کر کالے رنگ کی گاڑی رکی۔

نظر پڑتے ہی خوش نصیب چونکی۔ دل زور سے دھڑکا (نہیں نہیں۔ آپ سب غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ یہ وہ دھڑکن نہیں تھی جو کسی کا نام سنتے ہی "مس" ہو جاتی ہے) آنکھیں سکیڑیں۔ ماتھے پر لکیریں نمودار ہوئیں۔ بینائی کا پورا زور لگا کر پہچاننے کی کوشش کی اور لیجیے صاحب! وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اگلا دروازہ کھلا اور اندر سے "انگلش فلموں کا ہیرو" برآمد ہوا۔ خوش نصیب نے حیرانی کے شدید جھٹکے کے زیر اثر ایک زوردار "ہائے" کی آواز نکالی اور ہاتھ ہونٹوں پر رکھا لیکن یہ عمل اس قدر بے ساختہ تھا کہ کہنی منڈیر پر رکھی تام چینی کی پلیٹ سے جا ٹکرائی۔ خوش نصیب نے حواس باختہ ہو کر پلیٹ سنبھالنا چاہی لیکن اس سے پہلے ہی پلیٹ اس کی دسترس سے نکلتی چلی گئی۔

اور یوں فضل منزل کی چوتھی منزل سے پلیٹ گری اور نیچے سے خوشی خوشی گزر کر جاتے شفیق چچا کے سر کو چھوتی ہوئی فرش پر گر کر پاش پاش ہو گئی۔ اور چپس ہوا میں بکھر گئے۔ اور سب کے سر چھت کی طرف اٹھ گئے۔ اگر جو خوش نصیب فوراً" ہی نیچے نہ بیٹھ گئی ہوتی تو یقیناً" اب تک اہل خانہ کی نظروں سے نکلے تیر اسے اس جہان فانی سے کوچ کرنے پر مجبور کر چکے ہوتے۔ ابھی تو وہ منڈیر کے سائے میں دبکی بیٹھی تھی اور نیچے فضل منزل کے صحن میں سب ہی ہکا بکا صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سب سے زیادہ حیران مہمان تھا۔ مہمانوں پر پھول برسائے جاتے ہیں ایسا سنا تھا۔ آلو کے چپس برستے پہلی بار دیکھے۔ عجیب ہی رواج تھا۔ شامیر سوچ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وسامہ جب تک زندہ رہا اس کی ذہنی الجھنیں ایک معمہ بنی رہیں۔ مرنے کے بعد بھی وہ اپنے پیچھے سوالوں کا ایک سلسلہ چھوڑ گیا ایسے سوال جن کے جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھے۔

بہتر گھنٹے وہ لاپتا رہا۔ چھتیس گھنٹے اسے تلاش کیا جاتا رہا اور جب تہ خانے کی اس سال خوردہ الماری سے اسے

مردہ حالت میں نکالا گیا تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتا چلا ابتدائی چوبیس گھنٹوں کے دوران حرکت قلب بند ہونے سے اس کی موت واقع ہو چکی تھی اس کے علاوہ اس کے خون میں خواب آور ادویات کی بھاری مقدار کی آمیزش بھی تھی۔

وسامہ نامور ادیب تھا۔ اس کی موت کا ادبی حلقوں میں بڑا چرچا ہوا لیکن چونکہ وہ کوئی بہت سوشل انسان نہیں تھا نہ ہی ادبی حلقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں سوائے چند ایک کے کوئی اسے بہت قریب سے جانتا تھا سو اس کی ناگہانی موت ایک سوال تو بنی لیکن اس سوال کو بہت اچھالا نہیں گیا۔ وسامہ کی موت کا دکھ اس کے چند انتہائی قریبی لوگوں پر اثر انداز ہوا تھا۔ اس کے ماں باپ، چھوٹی بہن، معاویہ اور آئے کت۔ ماں باپ اسے پسند کی شادی کے جرم میں بے دخل کر چکے تھے۔ یہ اس کا ایسا گناہ تھا جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"ایک لاوارث لڑکی کو لا کر ہمارے سر پر بٹھا رہا ہے وسامہ! کوئی خودرو جھاڑ بھی ہو تو اس کی کوئی نہ کوئی جڑ ہوتی ہے۔ یہ کیسی لڑکی ہے جس کے آگے پیچھے کا ہی کچھ نہیں پتا۔" یہ وسامہ کی ماں کے الفاظ تھے اس وقت، جب وہ آئے کت سے شادی کرنے کے لیے ڈٹا ہوا تھا۔

وسامہ آئے کت کے آگے پیچھے کی ساری معلومات لے آیا۔ وہ ایک یتیم خانے میں رہ کر پلی بڑھی تھی کیونکہ اس کی ترک ماں اسے پاکستانی باپ کے پاس چھوڑ کر واپس چلی گئی تھی۔ دس سال کی عمر تک آئے کت اپنے باپ کے پاس رہی اس دوران اس کی ماں کبھی کبھار اس سے ملنے آجاتی تھی اور کبھی اسے اپنے ساتھ بھی لے جاتی تھی۔ باپ کے انتقال سے ایک سال پہلے ماں نے آنا چھوڑ دیا اور باپ کے گزر جانے کے بعد ان کے ایک دوست نے آئے کت کو یتیم خانے بھجوا دیا۔ بس یہی تھا اس کا ماضی۔ لیکن وسامہ کے قریبی لوگوں میں سوائے معاویہ کے کوئی بھی ان باتوں پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اور اگر اعتبار تھا بھی تو وہ ایسی لڑکی کو ہرگز اپنی بہو بنانے کے لیے تیار نہیں تھے اور اسے رد کرنے کے لیے ان کے پاس سو بہانے موجود تھے۔

وسامہ نے شادی کر لی اور ماں باپ نے ناراضی اختیار کر کے اس کی شکل نہ دیکھنے کا عہد کیا۔ حتیٰ کہ ایک حادثے میں جب وسامہ اپنی ٹانگ سے محروم ہوا اور زندگی اور موت کی کشمکش سے بچ نکلا تب بھی اس کے والد کا دل نرم نہ ہو سکا۔ اور اب یہی والد وسامہ کی ناگہانی موت پر تڑپ تڑپ کر رو دیے تھے۔ انہوں نے خوب سر پٹخا۔ چیخے چلائے کہ کسی طرح گزرا وقت واپس آجائے تو وہ وسامہ کو ہرگز خود سے دور جانے نہ دیں گے۔ لیکن...... گزرا وقت کبھی واپس آیا ہے کیا؟ آئے کت اپنے حواس کھو بیٹھی۔ ماں اور باپ کے بعد اس نے جس شخص سے بے پناہ اور بے انتہا محبت کی بالآخر اسے بھی کھو دیا تھا۔ وسامہ کے بے روح جسم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے باوجود وہ اس کی موت کا یقین کرنے پر تیار نہیں تھی۔

وہ پوری پوری رات اپنے اردگرد وسامہ کے کپڑے اور ضروریات کا دیگر سامان پھیلا کر بیٹھی رہتی اور ان سے ایسے باتیں کرتی جیسے ان چیزوں میں اسے وسامہ نظر آرہا ہو۔ صبح ہوتے ہی وہ وسامہ کی پسند کا لباس پہن کر ٹک سک سے تیار ہوتی اور سارے فلک بوس میں اسے آوازیں دیتی پھرتی۔ پھر ایک روز اس کا سکتہ ٹوٹ گیا اور وہ اس بری طرح سے روئی، اس نے ایسے بین ڈالے کہ فلک بوس کی دیواریں بھی دکھ سے لرزنے لگیں۔

وسامہ کی والدہ نے آئے کت کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور وہ دونوں مل کر اس شخص کے لیے روتی رہیں جس کی زندگی میں وہ ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھنے کا تہیہ کر چکی تھیں لیکن اب ان کا غم ایک تھا اور اس غم نے انہیں زندگی بھر ساتھ ہی رکھنا تھا۔

باقی بچا معاویہ۔ تو وہ بے چارہ کھل کر رو بھی نہ سکا۔ دوستوں جیسے بھائی کی موت کا یقین آتا تو روتا۔ اپنا ہر چھوٹا

بڑا غم ہر پریشانی اس نے ہمیشہ وسامہ سے ہی بانٹی تھی۔ اب وہی نہیں تھا تو کس کو جا کر بتاتا کہ دیکھو کتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے میرا۔

وہ ایک الجھی ہوئی طبیعت کا بچہ تھا۔ جس کے ماں باپ باہمی جھگڑوں سے تنگ آکر علیحدگی اختیار کرنے پر راضی ہو گئے تھے اور اپنے راستے الگ کرتے ہوئے انہوں نے ایک بھی بار معاویہ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ ماں باپ کے جھگڑوں نے اسے ذہنی طور پر بے اعتباری کا شکار کر دیا تھا۔ ایسے میں وسامہ تھا جو آگے بڑھا اور اس نے معاویہ کو ایک بھائی اور دوست بن کر اس ذہنی پراگندگی سے باہر نکالا۔

وسامہ معاویہ کے لیے کیا حیثیت رکھتا تھا وہ کبھی لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا مختصراً" یہ کہ معاویہ کو اپنے بھائی وسامہ طالب سے عشق تھا۔ جو اس کا سگا بھائی نہیں تھا لیکن بھائیوں سے بڑھ کر تھا۔ وہ اس کا دوست نہیں تھا لیکن ساری زندگی اس نے معاویہ کو دوست کی کمی محسوس ہونے نہیں دی تھی۔

وسامہ صلح جو انسان تھا لیکن معاویہ اس کے لیے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا تھا۔ وسامہ اگر دن کو رات کہتا تو معاویہ بھی یہی کہتا تھا۔

وہ دونوں اکٹھے سوتے جاگتے تھے۔ ایک ساتھ انہوں نے کئی خواب دیکھے تھے۔ ایک ساتھ شرارتیں کی تھیں۔ ایک ساتھ ڈانٹیں سنی تھیں۔ کئی بار اسے وسامہ نے سزا ملنے سے بچایا تھا۔ معاویہ کو یہ بھی افسوس تھا کہ وہ وسامہ کے اتنے احسانات کے بدلے میں اسے ایسی بدتر موت سے نہیں بچا سکا اور موت بھی ایسی جس کا کوئی سراغ ہی نہ ملے۔ پولیس آئی۔ لیکن تحقیقات پوری طرح شروع ہونے سے پہلے ہی معمہ حل ہو گیا۔

کسی نے کہا وسامہ نے خودکشی کی ہے۔ ایسی الماری جسے صرف باہر سے کھولا جا سکتا تھا' میں کوئی جا کر کیوں بیٹھے گا جبکہ وہ یہ بات بھی جانتا ہو کہ اندر سے اس الماری کا دروازہ کھلنا ناممکن بات ہے۔ پھر الماری کے دستے پر وسامہ کے فنگر پرنٹس موجود تھے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں اس کے خون میں نشہ آور دوائیوں کا اثر ملا تھا۔ یقیناً" اس نے نیند کی گولیاں کھا کر خود کو الماری میں بند کر لیا ہو گا اور وہیں اس کی موت واقع ہو گئی ہو گی۔ قیاس کے اس دراز ہوتے سلسلے پر پولیس کی حتمی رپورٹ نے فل اسٹاپ لگا دیا تھا۔ اس رپورٹ نے صرف وسامہ طالب کی موت کے کیس کو ہی بند نہیں کیا اس رپورٹ نے بشام کی وادی میں پھیلی ہوئی فلک بوس کی نحوست پر مبنی کہانیوں پر بھی مہر ثبت کر دی تھی۔

معاویہ کو وسامہ کی ایسی اندوہناک موت نے شدید دکھ سے ہمکنار کیا تھا۔ لیکن اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ بیٹھ کر فلک بوس کی نحوست کی کہانیاں سنے اور وہاں بھٹکتے آسیب کے قصوں سے لطف اندوز ہو۔ اس نے اپنی نگرانی میں لیکن بددلی کے ساتھ فلک بوس کی ساری کھڑکیاں دروازے بند کرا دیے۔ کانپتے ہاتھوں اور بوجھل دل کے ساتھ وسامہ کا سارا ساز و سامان سمیٹا۔

اس کی کتابیں ' اس کا کمپیوٹر سسٹم ' اس کی رائٹنگ ٹیبل۔ اور اس کی زیر طبع کتاب کا وہ آخری حصہ جو اب کبھی مکمل نہیں ہو گا۔

طویل کاریڈور میں وہ دیر تک بوجھل اور سست قدموں سے چلتا رہا۔ لان سے سوکھے پتے اڑ اڑ کر اس کے قدموں سے لپٹتے رہے۔ سامنے تالاب پر سفید پری اپنے پنکھ پھیلائے اداس کھڑی تھی۔ معاویہ کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کھڑا بلاوجہ اس مجسمے کو دیکھنے لگا۔ خزاں نے پہاڑوں پر بکھرے سبزے پر اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس جگہ کی خوب صورتی جوں کی توں تھی۔ یہ پرشکوہ عمارت ابھی بھی ایسے طمطراق سے کھڑی تھی کہ کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ لیکن ہر طرف خاموشی تھی اور اتنا اجاڑپن اور اتنی ویرانی تھی ہر طرف 'جو آج

تک اس نے فلک بوس میں نہیں دیکھی تھی۔ ایسا لگتا تھا' وسامہ ساری رونق اپنے ساتھ سمیٹ کر قبر کی تاریکی میں لے گیا ہے۔

وہاں سے دور روش پر ایک پک اپ کھڑی تھی جس پر وسامہ اور آئے کت کا سامان لادا جارہا تھا۔ معاویہ کے حلق میں آنسوؤں کی نمی شامل ہونے لگی۔ سینے میں سسکیاں اودھم مچارہی تھیں اور آنکھیں ایسی ہوگئیں جیسے شدت گریہ سے نڈھال انسان کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ اس نے رخ بدلا۔ آنکھوں کو زور زور سے جھپکا۔ لیکن دل کا غم جب آنکھوں کی حدود سے باہر نکلنے کو بے چین ہونے لگا تو وہ تیز تیز قدموں سے چلتا روش تک آیا اور فلک بوس کی حدود سے نکلتا چلا گیا۔ فلک بوس کے آگے ڈھلوانی سڑک تھی۔ اس سے آگے جنگل۔ وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے چلتا چلا گیا۔ جنگل اداس تھا اور قد آور درختوں کے پتوں سے دھوپ چھن چھن کر آرہی تھی۔ وہ خودرو گھاس اور پتھروں کو روندتا' چلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ جنگل میں بہت دور نکل آیا۔ ایک جگہ ٹھٹک کر رک گیا۔ ایک بڑا گول پتھر جو اپنی وضع کے اعتبار سے ہمیشہ ہی نظروں میں آجاتا تھا۔ معاویہ کے سامنے آگیا۔ معا" منظر بدلا اور بچپن کی ایک یاد مجسم ہو کر اس کی آنکھوں کے سامنے آگئی۔

وہ اور وسامہ...... اس گول پتھر کے گرد بھاگ رہے تھے اور آپس کے کسی مذاق پر ہنس ہنس کر ان کے پیٹ میں درد ہو گیا تھا۔ پھر تھک کر اسی پتھر پر بیٹھ گئے۔ جب سانس بحال ہوئی تو وسامہ کو جانے کیا خیال آیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے اپنا اور معاویہ کا قد ناپنے لگا۔

"تم مجھ سے چھوٹے ہو۔ لیکن قد تمہارا زرافے کی طرح بڑھ رہا ہے۔" اس نے معاویہ کو بتایا۔

"اس کا مطلب...... میں بڑا ہو کر زرافہ بنوں گا؟" چھوٹا سا معاویہ ہونق بن کر پوچھ رہا تھا۔ وسامہ بے ساختہ ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ بشام کا جنگل اس کی ہنسی کی آواز سے جاگ اٹھا تھا۔ معاویہ کی آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں نے یاد کا منظر دھندلا دیا۔ وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھا اور...... خوب چیخ چیخ کر رویا۔ دھاڑیں مار مار کر...... بالکل بچوں کی طرح۔ بشام کے جنگل نے اسے نوحہ کناں دیکھا تو دکھ سے آنکھیں بھینچ لیں۔ درختوں نے دم سادھ لیا اور ہوا اپنی جگہ تھم سی گئی تھی۔ فلک بوس کی کھڑکیاں اس روز تاریکی اوڑھے کھڑی تھیں اور اس کی سکتہ زدہ چمنیاں اس بھرپور جوان کو روتے ہوئے دیکھ رہی تھیں جس کا نقصان اتنا بڑا تھا کہ اس کا ازالہ کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

مہمان کے سامنے نہ جانے کی ایسی کوئی پابندی فی الحال تو نہیں لگائی گئی تھی لیکن اس کی آمد پر جو کچھ ہوا اس کے بعد خوش نصیب نے یہی مناسب سمجھا کہ کمرے میں دبکی بیٹھی رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ پلیٹ والا حادثہ نہ ہوا ہوتا تو کوئی مائی کا لال اسے مہمان کے سامنے جانے اور **فضیلہ** چچی اینڈ فیملی کی ساری پلاننگ برباد کرنے سے روک نہیں سکتا تھا۔

بہرحال شام سے رات ہوگئی جب ماہ نور نے کمرے میں جھانکا۔ اور خوش نصیب کو چوڑے فریم پر جھکا دیکھ کر چونک گئی۔

ماہ نور کی طرح خوش نصیب کے ہاتھ میں بھی بہت صفائی تھی لیکن اس صفائی سے فائدہ اس وقت حاصل ہو سکتا تھا جب خوش نصیب اس کی مدد کرنے پر راضی ہوتی۔ اسے تو بس ہر کام سے جان چھڑا کر دوسروں کے لیے پریشانیاں کھڑی کرنے کا شوق تھا اور اپنا یہ شوق وہ بڑی تن دہی سے پورا کرتی بھی تھی۔

بہرحال ماہ نور نے کمرے میں جھانکا اور خوش نصیب کو مصروف پا کر چونک گئی۔ ”آج سورج مغرب سے نکلا ہے کیا؟“

”اس وقت سورج کہاں سے نکل آیا؟..... “سنجیدگی سے پوچھا گیا۔ ”ذرا بالکنی سے باہر دیکھو۔ پوری رات ہے۔ ہاں شاید کہیں چاند نکلا ہو۔“ بڑے مصروف انداز میں فرمایا گیا اور ایسی ادائے بے نیازی برتی گئی جیسے ماہ نور کا طنز سمجھی ہی نہ ہو۔

”چاند تو نکلا ہو یا نہ نکلا ہو..... ذرا نیچے چل کر دیکھو شفیق چچا کے سر پر ایک آلو بخارہ ضرور نکل آیا ہے۔“

”ہائیں..... کیا مطلب؟..... “نا سمجھی سے آنکھیں پٹپٹا کر پوچھا۔

”اللہ رے معصومیت..... “ماہ نور اسے جانتی نہ ہوتی تو ضرور غش غش کر اٹھتی۔ ”زیادہ بنو مت۔ جیسے تم جانتی ہی نہیں۔“ اس نے ڈپٹ کر کہا۔

”کیا نہیں جانتی؟..... اور تم کیسی عجیب باتیں کر رہی ہو ماہ نور! کسی کے سر پر آلو بخارہ کیسے نکل سکتا ہے؟“

”اتنے سارے سوال اگر تم کرو گی تو شفیق چچا اور فضیلہ چچی کیا کریں گے؟“

”اپنے مہمان کو انٹرٹین کریں گے اور کیا۔“ بے ساختہ کہہ گئی اور ساتھ ہی زبان دانتوں میں دبالی۔ ماہ نور نے البتہ فوراً“ ہی سر پیٹ لیا۔ اب کچھ کہنے سننے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

”شامیر سونے چلا گیا یا اس کے سامنے ہی کلاس ہوگی؟“ خوش نصیب نے رونکھی ہو کر پوچھا۔

”کب کا سونے چلا گیا۔“ ماہ نور نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھی لیکن اگلے ہی پل حیران ہو کر اس کی طرف پلٹی۔

”تم تو مہمان سے ملی بھی نہیں۔ پھر تمہیں کیسے پتا کہ اس کا نام شامیر ہے؟“

”تمہیں پتا نہیں؟..... مجھے سب پتا ہوتا ہے۔“ اس نے معصوم سا منہ بنا کر کہا اور اس کے پیچھے چل پڑی۔

☆ ☆ ☆

بشام میں شام اتر رہی تھی۔ آسمان کا رنگ سیاہی مائل نیلا دکھائی دینے لگا تھا۔

معاویہ دیر تک رونے اور اپنا دل ہلکا کرنے کے بعد وادی کی طرف نکل آیا۔ وادی کی اکلوتی مارکیٹ جاگنا شروع ہو گئی تھی۔ جگہ جگہ عارضی قمقمے جلائے گئے تھے۔ وہ ایک اسٹال نما دکان پر کھڑا ہو کر گرم دستانے دیکھنے لگا۔

اسی وقت بارش کا پہلا قطرہ زمین کی ہتھیلی پر گرا اور آن کی آن میں جذب ہو گیا۔ پھر دوسرا اور تیسرا اور اس کے بعد لاتعداد قطرے برستے چلے گئے۔

مارکیٹ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ شیڈ لگائے جانے لگے۔ اسٹال سمیٹ دیے گئے۔

معاویہ بھی دیگر افراد کی طرح بھاگا اور ایک دکان کے شیڈ میں پناہ لی۔ بارش نے زور پکڑ لیا تھا۔ وہ رک کر انتظار کرنے لگا۔ آج کی رات فلک بوس میں اس کی آخری رات تھی۔ صبح وہ واپس چلا جاتا۔

”فلک بوس تو اجڑ گیا۔“

”فلک بوس اجڑ گیا یا فلک بوس نے اجاڑ دیا؟“

”اجاڑا تو فلک بوس کے آسیب نے ہے۔“

معاویہ نے ان آوازوں پر بے ساختہ گردن موڑ کر دیکھا۔ قریب کھڑے دو مقامی افراد ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ معاویہ نے دانستہ اپنا رخ موڑ کر ان کی طرف پیٹھ کر لی تاکہ وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکیں۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"کسی نے کیا کہنا ہے۔۔۔؟ یہ بات تو سب جانتے ہیں۔" دوسرا بولا۔ "اس آسیب نے آج تک کسی کو نکلنے دیا ہے فلک بوس میں؟ ہو نہ ہو' اس قتل کی ذمہ دار بھی وہ بدروح ہے۔ سنا ہے۔۔۔" وہ آدمی ذرا سا اپنے ساتھی کے قریب ہوا اور اس کوشش میں نادانستگی میں' منہ موڑ کر کھڑے معاویہ کے بالکل ہی قریب ہو گیا۔ اور سرگوشی میں بولا یہ جانے بغیر کہ معاویہ کا پور پور سماعت میں ڈھل چکا ہے۔

"سنا ہے۔۔۔ جس رات دوسامہ کی موت ہوئی' اس رات اس بدروح کو فلک بوس میں بھٹکتے ہوئے کئی لوگوں نے دیکھا تھا۔"

"لیکن میں نے تو سنا ہے اس نے خودکشی کی ہے۔۔۔"

معاویہ کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور اسے وہ سب باتیں یاد آنے لگیں۔ جو دوسامہ کے قتل کی تفتیش کے دوران سامنے آتی رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

شفیق چچا کے ماتھے پر کم و بیش ایک انچ کی خراش آئی تھی اور اس خراش سے ذرا اوپر' پلیٹ ٹکرانے سے ایک بڑے سائز کا آلو بخارہ سا نمودار ہو گیا تھا۔ اور اس حالت میں وہ ایسے مضحکہ خیز لگ رہے تھے کہ ان پر پہلی نظر پڑتے ہی خوش نصیب اپنی بے ساختہ امڈتی ہنسی روک ہی نہیں سکی۔ اگر جو ساتھ ماہ نور نہ ہوتی اور فوراً" ہی اسے ٹہوکا دے کر اپنے دانت اندر کرنے کا اشارہ نہ کیا ہوتا تو یقیناً" اب تک اس پر ایک اور فرد جرم عائد ہو چکی ہوتی۔

ویسے بھی جس وقت مہمان نے گھر میں قدم رکھا تھا' خوش نصیب اس جلوس میں شامل نہیں تھی جو مہمان کے استقبال کے لیے دروازے تک گیا تھا۔ دوسرے چھت کا واحد کمرہ بھی اسی کے زیر استعمال تھا سو خود بخود یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ چپس کی پلیٹ والا خودکش حملہ خوش نصیب کی کارستانی ہے۔

یوں بھی اس طرح کی شرارتوں بلکہ تخریب کاریاں کہنا زیادہ مناسب رہے گا تو اس طرح کی تخریب کاریوں میں خوش نصیب اتنی شہرت حاصل کر چکی تھی کہ جب بھی ایسا کوئی کام ہوتا جس کا مجرم ثابت نہ ہو رہا ہوتا تو قرعہ فال خود بخود ہی خوش نصیب کے نام پر نکل آتا تھا۔ اب تو پھر بھی اس کا جرم کسی حد تک ثابت ہو رہا تھا۔

"ہاں بھئی! یہ کیا تماشا لگایا ہے آج؟" شفیق چچا اپنے نام سے بالکل ہی مختلف تھے۔ اس وقت اپنے زخمی ماتھے پر تیوریاں ڈالے بیٹھے تھے اور ان تیوریوں کو گننے کا فریضہ سرانجام دے رہی تھیں ان کی نصف بہتر یعنی فضیلہ چچی جن کے غالباً" نام کی بدولت انہیں افضل تسلیم کر لیا گیا تھا۔

ساتھ ان کی ساری آل اولاد بھی خوش نصیب کی درگت بنتے دیکھنے کے خیال سے وہیں موجود تھی۔ صیام کی تو کمینی مسکراہٹ ہی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ شاہجہان اپنی ہونق شکل کے ساتھ معتبر تاثرات سجائے بیٹھا تھا تاکہ گھر کا بڑا بیٹا ہونے کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے خوش نصیب کے کان کھینچ سکے۔

ہاں منہا ذرا سہمی بیٹھی تھی اور سب کے عقب میں کھڑے ہو کر اس نے باقاعدہ خوش نصیب کو اشارے بھی کیے تھے کہ وہ ہر چیز سے صاف مکر جائے۔ لیکن وہ خوش نصیب ہی کیا جو کسی کی بات مان لے۔

"تماشا؟ آپ کا مہمان کیا بندر کا تماشا بھی دکھاتا ہے؟" مزے سے بولی۔ وہ دراصل ڈھٹائی کے اس دور میں داخل ہو چکی تھی جہاں کسی کے زبان سے نکلے ہوئے لفظ دل پر چاہے سو چرکے لگائیں۔ کسی کے سامنے دھیما پڑ جانا اس کی شان کے خلاف تھا۔

"ارے لڑکی! زبان کو لگام دو۔" فضیلہ چچی ڈپٹ کر بولیں۔ "خبردار جو شامیر کے بارے میں ایک بھی غلط لفظ بولا۔"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ چچا نے خود ہی...."

"خبردار جو آگے ایک لفظ بھی کہا۔" شفیق چچا جلال میں آگئے۔ "یہ جو حرکت آج تم نے کی ہے.... اس کی کوئی وضاحت ہے تمہارے پاس؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"اچھا....! تو چھت پر کیا آج کل کسی جن بھوت نے بسیرا کرلیا ہے، جو ایسے پلیٹیں کھینچ کھینچ کر مار تا ہو؟" وہ اور غصے سے بولے۔

"ارے توبہ ہے چچا! پلیز اس طرح کی باتیں نہ کریں۔ آپ کو پتا بھی ہے مجھے ایسی باتوں سے کتنا ڈر لگتا ہے۔"

"لو اور سنو...." فضیلہ چچی ٹھٹھا لگا کر بولیں۔ "سارے زمانے کو ڈرانے والی خود ڈرنے لگی۔ اللہ کی قدرت ہے۔"

خوش نصیب نے منہ بنا کر انہیں دیکھا۔ کوئی جواب بھی دینا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے ہی شفیق چچا غصے سے بولے۔

"تمہاری بدتمیزیاں دن بہ دن بڑھتی جارہی ہیں خوش نصیب! اگر یہ سب ایسے ہی چلتا رہا تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔" مذاق ایک طرف لیکن ان کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ کمرے سے باہر تک بھی جاتی۔

ماہ نور.... ازلی بزدل.... اس کا دل تو فوراً ہی کانپنے گا۔

خوش نصیب اونچے لہجوں اور ایسی دھمکیوں کی عادی ہو چکی تھی ' ضرور پلٹ کر کوئی جواب دیتی اگر دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے شامیر کو نہ دیکھ چکی ہوتی۔

وہ نائیٹ سوٹ میں ملبوس تھا اور غالباً کسی کام سے اندر آرہا تھا' شفیق چچا کی دھاڑ سن کر چوکھٹ پر ہی رک گیا۔ لیکن خوش نصیب کی عزت افزائی جس انداز سے ہو رہی تھی' وہ سن چکا تھا۔

خوش نصیب کا تو وہ حال ہوا جیسے بدن میں خون ہی نہ بچا ہو۔ دل کا کڑھنا ایک طرف' لیکن اگر وہ اپنے نام کے برعکس سیاہ بخت تھی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ ہر کوئی فضل منزل میں اس کے رتبے سے آگاہ ہوتا۔

"ارے شامیر بیٹا....!" فضیلہ چچی کی نظر بھی پڑ چکی تھی' سو فوراً لہجہ بدل کر بولیں اور ساتھ ہی چپکے سے میاں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

میاں بھی انہی کے تھے سو فوراً سمجھ گئے۔ "اب جاؤ.... پھر بات کریں گے۔"

شامیر دروازے میں کھڑا تھا اور خوش نصیب کو وہیں سے گزر کر جانا تھا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا ناکامی یہ نہیں ہوتی کہ آپ اس ناکامی کے بوجھ سے اپنے کندھوں کو کتنا جھکا ہوا محسوس کرتے ہیں ناکامی یہ ہوتی ہے کہ ناکامی سے روشناس ہونے کے باوجود آپ کتنا سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

اور اس میں بلند حوصلے کی کمی نہیں تھی۔ دل میں چاہے خود کو جتنا مرضی ناکام تصور کرے 'کوئی اور اسے ناکام سمجھے یہ اسے ہرگز منظور نہیں تھا۔ لہٰذا دل ہی دل میں اس نے ایک گہری سانس لی۔ تصور میں اپنا کندھا تھپتھپایا اور گردن اکڑا کر شامیر کے پاس سے باہر نکلتی چلی گئی۔

راج ہنس جیسی اٹھی ہوئی گردن اور اس پر سے اس کی شان بے نیازی۔

شامیر نے گردن موڑ کر اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھا اور مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

☼ ☼ ☼
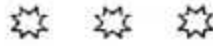
معاویہ فلک بوس واپس آیا اور عجیب اضطراب کی کیفیت میں سارے فلک بوس میں پھرتا رہا۔

عجیب وحشت کے عالم میں اس نے فلک بوس میں آیوشمتی کو تلاش کیا۔ اس آسیب کا پتا لگانے کی کوشش کی جس کا خوف اس کے بھائی کو نگل گیا تھا۔ لیکن فلک بوس خالی تھا۔ وہاں خاموشی 'اداسی اور وحشت کا عنصر ضرور تھا لیکن کسی بدروح کا کوئی وجود نہیں تھا۔

حالانکہ وہ جب تک زندہ رہا معاویہ خود اسے یقین دلاتا رہا کہ آیوشمتی اس کا ذہنی عارضہ ہو سکتی ہے حقیقت نہیں۔ لیکن اب اس کے گزر جانے کے بعد وہ خود ہی مخمصے میں پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کا بے روح جسم دیکھا تھا۔

اس کے چہرے پر اس کے اپنے ہی ناخنوں کی کھرونچیں تھیں۔ جسم سے زندگی نکل جانے کے باوجود اس کے چہرے پر ڈر کی جو تحریر لکھی تھی اس سے نظریں چرانا ناممکن تھا۔

وہ بار بار سوچتا بار بار الجھتا۔ اسے اپنے سوالوں کے جواب چاہیے تھے۔ وسامہ نے اگر خودکشی کی تو کیوں؟ اس کا دل یہ بات ماننے پر راضی نہیں ہو رہا تھا کہ محض کسی آسیب یا بدروح کے خوف نے اسے زندگی کی قید سے آزاد ہونے کی ترغیب دی ہوگی ہے۔ اور اگر اس نے خودکشی نہیں کی تو..... وہ کون تھا جس نے وسامہ کو اس حال تک پہنچا دیا؟

ایک بار پھر وہ تھک کر بیٹھا اور لاچار اور بے بس ہو کر بیٹھا ہی رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"آ گئیں ڈانٹ کھا کے؟ کبھی تو شرارت سے باز آ جایا کرو خوش نصیب!" وہ جوں ہی کمرے میں داخل ہوئی روشن آرا نے حسب معمول ناراضی سے کہا۔ خوش نصیب نے منہ بنا لیا۔

"آپ کو کیسے پتا میں ڈانٹ سن کر آئی ہوں؟"

"آج تک تم نے ایسا کوئی کام کیا ہے کہ اس گھر کے کسی فرد نے تمہیں تعریف کرنے کے لیے بلایا ہو؟"

سوال میں جان تھی لیکن خوش نصیب ایک گہری سانس بھر کر بولی۔

"میں نے کوئی شرارت نہیں کی۔"

"جھوٹ مت بولو۔" وہ اسی کی والدہ تھیں اور اس کی نس نس سے اچھی طرح واقف تھیں۔

خوش نصیب ایک اور گہری سانس بھر کر بولی۔ "اگر ایک آپ مجھ پر بھروسا کرنا شروع کر دیں تو باقی ساری دنیا کو میں اپنی جوتی کی نوک پر رکھوں۔"

"جیسے ابھی تم نے اپنی جوتی کی نوک پر نہیں رکھا ہوا ساری دنیا کو۔" وہ اور طنز اور ناراضی سے بولیں۔

"اور یہ وہ کام ہے، جو آپ ساری زندگی نہیں کر سکیں' دیکھ لیں ابھی تک کتنا ڈر ڈر کے زندگی گزارنا پڑ رہی ہے۔" ترنت بولی۔

"بکومت اور اٹھ کر بستر ٹھیک کرو۔" ڈپٹ کر بولیں۔ خوش نصیب منہ بناتی ہوئی اٹھی اور بستر جھاڑنے لگی۔ روشن آرا نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"یہ کیا حرکت کی تھی آج تم نے؟ کم سے کم مہمان کا تو خیال کیا ہوتا۔"

"جان بوجھ کر نہیں گرائی..... غلطی سے پلیٹ گر گئی تھی۔" وہ چڑ کر بولی۔ "اور مہمان کا خیال میں کیوں کرتی؟ ہمارا مہمان ہے کیا؟"

"جب اکٹھے رہتے ہیں تو ہمارا تمہارا کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ وہ مہمان ہے تو ہم اس کے میزبان۔۔۔۔"

"یہ پرانے سبق آپ مجھے نہ پڑھایا کریں پلیز۔۔۔ بچپن سے یہی ساری باتیں سنتی بڑی ہوئی ہوں میں۔" اس نے چادر جھاڑی، تکیے صحیح جگہ پر رکھے اور پھر ماں کو دیکھ کر بولی۔ "لیکن ایک بات آپ میری کہیں بھی لکھ کر رکھ لیں۔ آج وہ پلیٹ غلطی سے گری تھی۔ اگلی بار ایسا نہیں ہوگا۔" روشن آرا ہکا بکا رہ گئیں۔

"میں جب تک اس مہمان کے بچے کو یہاں سے بھگا نہیں دیتی یا کم سے کم فضیلہ چچی کو مزہ نہیں چکھا دیتی، سکون سے نہیں بیٹھوں گی۔" بہت سنجیدگی اور مستحکم لہجے میں وہ کہتی چلی گئی۔

وہ ہمیشہ سے منہ پھٹ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے بڑے بڑے دعوے کرنے کی عادی تھی لیکن اتنی بدلحاظ کبھی نہیں ہوئی تھی کہ یوں منہ بھر کر اپنے ارادوں کا ذکر ماں کے سامنے کردے۔ روشن آرا اس کے دیے ہوئے صدمے سے نکل کر ایک دم غصے میں آئیں اور انگلی اٹھا کر بولیں۔

"مہمان کو تو جب گھر سے نکالو گی سو نکالو گی۔۔۔ ابھی اپنا بستر اٹھاؤ اور کمرے سے باہر نکل جاؤ۔"

اب شاکڈ ہونے کی باری خوش نصیب کی تھی۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر دریچے کی طرف دیکھا۔ آسمان سے لپٹی ہوئی سیاہ رات دریچے سے اندر آنے کے لیے سر پیر مار رہی تھی۔ خوش نصیب نے تھوک نگل کر خشک ہوتا حلق تر کیا اور بولی۔

"اس وقت کیوں نکال رہی ہیں؟ میں سوؤں گی کہاں؟"

"یہ اپنے ارادے باندھنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔" روشن آرا ناراضی سے بولیں۔

"اتنی بڑی چھت ہے سونے کے لیے۔ کہیں بھی بستر ڈال لینا اور تب تک کمرے میں واپس مت آنا جب تک یہ بدلہ لینے کا خناس تمہارے دماغ سے نکل نہ جائے۔"

"روشن امی!" وہ روہانسی ہو کر بولی تھی، لیکن روشن امی اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھیں۔

☆ ☆ ☆

فلک بوس وہ جگہ تھی جو وسامہ کو اپنے خوابوں کا مسکن لگتی تھی۔ وہ ہمیشہ وہاں مستقل رہنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ بشام کی دلکش وادی 'فلک بوس' کا سکون اس جیسے تخلیقی ذہن رکھنے والے بندے کو بہت متوجہ کرتی تھی۔ شادی کے بعد پہلی بار جب وہ آئے کت کو وہاں لے کر گیا تو آئے کت نے بھی ایسی ہی خواہش کا اظہار کردیا۔ وسامہ کے لیے اس خواہش کو پورا کرنا ناممکن تھا۔ لیکن جب طالب ماموں نے اسے گھر سے نکالا تو معاویہ نے بڑی فیاضی سے اسے فلک بوس جا کر رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ گوکہ معاویہ کے والد اردشیر ازی اس بات کے خلاف تھے، لیکن معاویہ نے ان کی ایک نہیں سنی تھی۔ اسے اپنے بھائی کی خوشی عزیز تھی، سو اس نے یہ خوشی پوری کر کے چھوڑی تھی۔

بشام سے نکل کر وہ ماموں، ممانی کے گھر ایبٹ آباد آگیا۔ اس کا اور ان لوگوں کا غم ایک تھا۔ گوکہ وہ ذہنی اور جذباتی طور پر ان لوگوں سے قریب رہا تھا، لیکن وسامہ کی موت کے بعد وہ ان لوگوں کے اور بھی قریب ہوگیا تھا۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے اسے سکون ملتا تھا۔ دراصل جب غم ایک ہو جاتا ہے تو اس غم کا بوجھ بھی تقسیم ہو جاتا ہے۔ سو معاویہ اپنا غم بانٹنے ایبٹ آباد آگیا تھا۔

لیکن اس کے اس فیصلے سے اردشیر ازی خوش نہیں تھے۔ انہوں نے فون پر اچھی خاصی ناراضی کا اظہار کیا

تھا۔

"تم یہاں رہ کر اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ تمہیں چاہیے جلد از جلد واپس جاؤ اور اپنی پڑھائی پر دھیان دو۔"

"مجھے وسامہ کے قتل کے کیس کی انکوائری کروانے دیں... میں واپس چلا جاؤں گا۔" اس نے تحمل، لیکن دوٹوک لہجے میں کہا۔ اس وقت وہ ارد شیرازی سے ڈرتا تھا' ابھی بہادر نہیں ہوا تھا کہ ہربات کا جواب منہ پر دے سکتا۔ غم نے ویسے ہی لہجے کا انداز بدل دیا تھا۔

"وسامہ نے خودکشی کی ہے معاویہ! اور خودکشی کے کیس کی کیا انکوائری کرواؤ گے؟ اس نے موت کو خود اپنے لیے پسند کیا۔" وہ بے حس لہجے میں بولے۔

معاویہ کو ان کے اس لہجے سے نفرت تھی، لیکن وہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ اس طرح بات مت کریں۔ باپ سے سو شکوے، لیکن ان کے آگے بولنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا وہ۔

"یہ سچ نہیں ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "اسے قتل کیا گیا ہے... وہ الماری باہر سے بند کی گئی تھی۔"

"اگر ایسا ہے تو یہ کام ضرور اس کی بیوی نے ہی کیا ہوگا' مجھے اس کا کردار کبھی قابل بھروسا نہیں لگا۔" ارد شیرازی نے سگار سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کٹ پر الزام تراشی بند کریں۔"

"میں الزام نہیں لگا رہا۔" وہ اطمینان سے بولے۔ "لیکن وہ جس طرح کے کردار اور بیک گراؤنڈ کی مالک ہے' اس سے یہ ہی توقع کی جاسکتی ہے۔ جس کی کوئی پہچان کوئی بنیاد نہیں تھی۔ پہچان اسے وسامہ سے شادی کرکے مل گئی' تھوڑا بہت پیسہ بھی مل گیا ہوگا۔ اب اپاہج شوہر کو رکھ کر اسے کیا کرنا تھا۔"

"آپ کٹ کے بارے میں اس طرح بات مت کریں۔" وہ جھنجلا کر بولا۔ "وسامہ نے اسے پسند کیا تھا تو کچھ سوچ کر ہی کیا ہوگا اور مجھے اس کی پسند پر فخر ہے۔"

"وہ کرپٹ لڑکی ہے معاویہ! تم سمجھتے کیوں نہیں؟"

"آپ مجھے نہ سمجھائیں' صرف اجازت دیں تاکہ میں فلک بوس میں انکوائری شروع کرا سکوں۔"

"تم جانتے ہو میں فلک بوس کو بیچنا چاہتا ہوں اور ایسی باتیں اس کی ساکھ کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔"

"میرا بھائی چلا گیا اور آپ کو اپنی اور فلک بوس کی ساکھ کی پڑی ہوئی ہے۔" اس نے صدمے سے کہا۔

"دیکھو معاویہ!" وہ تحمل سے بولے۔ "جس دور میں ہم جی رہے ہیں' یہاں سگے رشتوں کی اہمیت آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہے' وہاں ان سیکنڈ ریلیشنز کو تم کتنی اہمیت دلوا سکو گے۔"

"یہ بات آپ جیسا خود غرض انسان نہیں کہے گا تو کون کہے گا۔" اس نے تلخی سے دل میں سوچا اور بولا۔ "بابا پلیز..."

"معاویہ! مجھ سے بحث مت کرو۔" وہ اب کڑک کر بولے۔ معاویہ اگلا ایک جملہ نہیں بول سکا۔ وسامہ کے قتل کیس کی انکوائری کروانے کے سلسلے میں اس کی آخری امید بھی دم توڑ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح خوش نصیب کا منہ خوب سوجا ہوا تھا۔ پتا نہیں روشن امی اتنی ظالم کیوں تھیں۔ ہر وہ کام جو خوش نصیب پورے جی جان سے کرنا چاہتی' اسی کے راستے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ کھڑی کر دیتی تھیں۔

ناراض ناراض سی وہ ساری فضل منزل میں گھومتی رہی' یہاں تک کہ اس احاطے میں جا پہنچی جہاں شامیر کی کالی

"اوڈی" پارک کی گئی تھی۔

"ہائے..." ساری ناراضی اڑن چھو ہوگئی۔ نرم پوروں سے اس نے اس کالے مخمل کو چھوا اور شیشے سے اندر جھانک کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ان آرام دہ اور نرم گرم سیٹوں پر بیٹھ کر کیسا لگتا ہوگا۔ تصور کی آنکھ سے اس نے خود کو گاڑی کی سیٹ پر کھلے ہوئے بالوں کے ساتھ سیاہ گاگلز لگائے ایک شان اور اسٹائل سے گردن اکڑا کر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ یہ ایسا سہانا اور دل فریب منظر تھا کہ وہ اس منظر کی خوب صورتی میں غرق ہونے لگی۔

ایک تو تصور ایسا اوپر سے دور کسی اونچے چوبارے کی کھڑکی میں رکھا ریڈیو گیت سنانے لگا۔

آج پھر جینے کی تمنا ہے

آج پھر مرنے کا ارادہ ہے

ایک ہاتھ گاڑی پر رکھے وہ آنکھیں بند کیے جھومنے کا ارادہ کر رہی تھی' اس بات سے بے خبر کہ گاڑی کی دوسری طرف برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا شامیر اسے دیکھ چکا ہے اور صرف یہ ہی نہیں' بلکہ اس کی سمجھ میں نہ آنے والی حرکتوں کو اب بڑی دلچسپی سے دیکھتا چلا جا رہا ہے۔ ایک ہاتھ میں تہ کیا ہوا اخبار پکڑے اور دوسرے ہاتھ کی بند مٹھی مسکراتے ہوئے لبوں پر سجائے وہ بڑے شوق سے اسے دیکھ رہا تھا۔

خوش نصیب آنکھیں بند کیے گاڑی پر ہاتھ پھیرتی پورا چکر لگا کر جب عین اس کے سامنے پہنچی تو غالباً "نظر کے ارتکاز" نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ جوں ہی آنکھ کھلی سامنے شامیر کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔

وہ جو خیالوں ہی خیالوں میں اوڈی کی ٹیسٹ ڈرائیو کے مزے لے رہی تھی' یوں حواس میں آتے ہی بدکی کہ پہلے کچھ کم ہونق لگ رہی تھی جو گڑبڑاہٹ میں ہونق پن کی چوٹیوں کو ہی چھو گئی۔ منظر سے غائب ہو جانے کے خیال سے وہ تیزی سے مڑی تھی' لیکن اس سے بھی پہلے شامیر نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"گڈ مارننگ..."

"ہائے ہائے... کہاں کی گڈ مارننگ... بھاڑ میں جھونکو ایسی گڈ مارننگ کو... یہاں کہاں سے آ گیا... وہ بھی سویرے سویرے..." حواس باختہ ہو کر منہ ہی منہ میں بدبدائی۔

"آپ نے کچھ کہا؟ میں نے ٹھیک سے سنا نہیں۔" لہجے میں اشتیاق تھا۔

"نہیں' نہیں... بالکل نہیں... ہرگز نہیں..." جلدی سے بولی۔ "اور آپ کی تعریف...؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" بنا اس کی طرف دیکھے بولی۔ بڑی زبردست کوشش کر رہی تھی کہ اس کا حواس باختہ پن شامیر دیکھ نہ پائے۔

اس سوال پر شامیر کی پیشانی پر استعجاب سے بل پڑ گئے اور آنکھوں میں حیرانی اور بے یقینی نظر آنے لگی۔

"کیا سچ...؟ لیکن میں تو آپ کو پہلی نظر میں ہی پہچان گیا تھا۔"

"ظاہر ہے... میں ہوں ہی اتنی خوب صورت... کوئی مجھے بھول ہی نہیں سکتا۔" خود اعتمادی اس میں بدتمیزی کی حد تک بھری ہوئی تھی' گردن اکڑا کر بولی۔

شامیر اس کے جملے سے اتنا لطف اندوز ہوا کہ اپنی بے ساختہ امڈتی مسکراہٹ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

"میری تو مسیحا ہیں آپ... راہبر... بھٹک جاتا اگر جو آپ نے رہنمائی نہ کی ہوتی۔ یقین کیجیے آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا میں..." اتنا شکر گزار لہجہ تھا کہ خوش نصیب پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ وہ خلوص سے بول رہا تھا' لیکن خوش نصیب نے پرسوچ انداز میں ماتھے پر تیوریاں ڈال کر اسے دیکھا۔

''اگر فضل منزل ہی آنا تھا تو اتنے دن سے گلیوں میں گھومتے کیوں پھر رہے تھے؟'' بڑا تھانے دارنی والا انداز تھا۔

شامیر محظوظ ہوا اور اخبار سمیت بازو سینے پر باندھتے ہوئے بولا۔ ''ایک ضروری کام سے آتا تھا' لیکن آج پتا چلا... کشش کوئی اور بھی۔''

خوش نصیب کچھ سمجھی' کچھ نہیں۔ ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ وہ لمبا تھا اور بے حد وجیہہ۔ اوپر سے مسکراتا بھی دھیما دھیما تھا۔

ابھی وہ کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچی تھی کہ صیام وہاں آگئی۔ شامیر اور خوش نصیب کو آمنے سامنے کھڑے دیکھ کر منہ بنایا' لیکن امی کی خاص تاکید یاد آگئی۔ یہ ہی کہ شامیر کے سامنے نرم لہجے میں بات کرنی ہے۔ دراصل نرم لہجہ وہ تیر ہوتا ہے' جس سے مرد کا دل سب سے پہلے گھائل ہوتا ہے۔ اور فضیلہ چچی ایسے تمام تیروں سے واقف تھیں جو مرد کے دل پر سیدھا وار کرتے ہیں۔ صیام ان ہی کی تو بیٹی تھی۔ سو اس نے ساری ناگواری کو ڈالا دل کے اس کونے میں' جہاں سے بوقت ضرورت اسے نکالا جا سکتا تھا اور دماغ کی بات کو مانتے ہوئے مسکرا کر شامیر سے بولی۔

''آیئے شامیر! ناشتا تیار ہے۔''

شامیر مسکرا کر آگے بڑھا' پھر رک کر خوش نصیب سے بولا۔

''آپ بھی آیئے...''

''جی نہیں... شکریہ... میں ناشتا کر چکی ہوں۔'' روکھا سا انداز۔

''ٹیبل پر ہمارا ساتھ دیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔'' وہ بھرپور مسکرایا۔ یہ مسکراہٹ بڑی جان لیوا تھا۔

''آپ کو خوش کرنے کے لیے ٹیبل پر اور بہت سے لوگ موجود ہوں گے۔ میری طرف سے معذرت قبول کیجیے۔'' یکایک وہ ایک الگ ہی خوش نصیب بن گئی۔ اس خوش نصیب سے وہ خود واقف تھی یا کیف۔ جو اس وقت یہاں موجود ہوتا تو ضرور چونک جاتا۔

شامیر کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ پرسوچ' نپی تلی مسکراہٹ' لیکن اس نے اپنی نظریں خوش نصیب کے چہرے سے بالکل نہیں ہٹائیں۔ ایسے جیسے کسی کھوج میں ہو۔ پھر وہ بھرپور مسکرایا' سر کو ذرا سا خم کیا اور مسکراہٹ کی اشرفیاں خوش نصیب پر لٹاتا' صیام کے ساتھ چلا گیا۔

سچ تو یہ ہے لڑکیوں کے لیے ایسے لڑکے بڑے جان لیوا ثابت ہوتے ہیں' جو جیتے دھیمے مسکرا کر دیکھیں۔ جنہیں ذو معنی جملے بولنے میں ملکہ حاصل ہو۔ آنکھوں سے سب کچھ کہہ جائیں اور لبوں سے ایک جملہ تک کہنے کے روادار نہ ہوں... لیکن... لیکن ابھی خوش نصیب اس ادراک سے کوسوں دور تھی۔ اور گمان کے کسی اور ہی دیس میں تھی۔

☼ ☼ ☼

کیف واپس اسلام آباد جا رہا تھا۔ اوپر آیا تاکہ نانی خالہ کو خدا حافظ کہہ سکے۔

پرانی طرز کا تنگ سا زینہ چڑھ کر جوں ہی چھت کا دروازہ عبور کیا تیز چمکتی دھوپ نے آنکھیں چندھیا دیں۔ اس نے بے ساختہ آنکھوں کے آگے ہتھیلی کا چھجا سا بنا لیا۔ زینے سے آگے بھی کوئی تیس قدم دور کمرہ تھا۔ وہاں تک جاتے وہ پسینے میں نہا گیا تو اور بھی دل میں شرمندہ ہوا۔ سارا خاندان ان ہی ان لوگوں کے بارے میں بے حس بن چکا تھا۔ اپنے اپنے کمروں میں اسپلٹ اے سی کی کولنگ میں بیٹھے اس سال پڑنے والی گرمی پر سیر حاصل تبصرہ فرماتے

ہوئے کسی کو بھی رتی بھر بھی احساس نہیں ہوا ہو گا کہ کتنے لوگ اوپر اس تندور میں سلگ رہے ہیں۔ اس کا دل اور شرمندگی سے بھر گیا۔ غصہ آیا سو الگ۔ بندہ بے حس خاندان میں پیدا ہو تو سینے میں احساس مند دل لے کر ہرگز پیدا نہ ہو۔ زندگی مشکل ہو جاتی ہے یار۔

اس نے سوچا اور ماتھے سے بہتے پسینے کے ساتھ وہ ملال بھی پونچھ ڈالا جو اس وقت اسے بڑی شدت سے محسوس ہو رہا تھا۔

دستک دے کر اندر آیا۔

خوش نصیب نانی کے پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی اور گردن موڑ کر دروازے پر دستک دینے والے کو دیکھ رہی تھی۔ ماتھے پر ذرا سی جھلاہٹ کی شکنیں۔ کیف کو دیکھ کر بولی۔

"تم اس وقت؟ خیریت....."

"میں جا رہا ہوں.... خدا حافظ نانی خالہ!"

وہ آگے بڑھا اور نانی کا بوڑھا ہاتھ نرمی سے اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

ضعیف نانی خالہ دعائیں دینے لگیں۔ ان کی زبان تو اب صاف نہ رہی تھی، لیکن جذبہ جوں کا توں تھا۔ کانوں سے کم سنائی دیتا تھا، لیکن جس عمر میں وہ تھیں وہاں لفظوں سے زیادہ احساس کی زبان سمجھی جاتی ہے۔

خوش نصیب نے دیکھا، کیف کا انداز سادہ تھا، مگر جملے کی بنت اور لہجے کا اتار چڑھاؤ بتاتا تھا اس کا دل بوجھل ہے۔ کیف کان لگا کر نانی کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"لو.... ایسا ہو سکتا تھا بھلا؟ ایسا پہلے کبھی ہوا ہے کہ آپ سے ملے بغیر چلا جاؤں؟" وہ مسکرا رہا تھا اور نانی کو بچوں کی طرح بہلا رہا تھا۔ ایسے مسکراتا ہوا وہ ہمیشہ ہی اچھا لگتا تھا۔

"نانی خالہ! آپ نے میرے لیے بہت سی دعائیں کرنی ہیں اور ہاں کھانا بھی ضرور کھانا ہے۔ میں فون کر کے پوچھوں گا۔"

وہ واقعی ان سے بچوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔ خوش نصیب پتا نہیں کیوں، لیکن ٹھوڑی کے نیچے بند مٹھی جما کر اسے دیکھتی گئی اور جب وہ نانی کو الوداع کہہ کر پلٹا تو ترنت بولی۔

"محاذ پر جا رہے ہو کیا؟ اور منہ تو ایسے لٹکا رکھا ہے جیسے کبھی واپس ہی نہیں آؤ گے.... دعا کرنا میرے لیے۔" اس کی نقل اتار کر سر جھٹکا۔

کیف مسکرایا، ایسے ہی جیسے وہ ہمیشہ مسکراتا تھا۔ یعنی شرارت سے، ذومعنی انداز میں اور خوش نصیب کو ایسے ہی دیکھا جیسے ہمیشہ دیکھتا تھا۔

یعنی محبت سے، چاہ سے، لگن سے۔

"یہ دل والوں کی باتیں ہیں۔ تم نہیں سمجھو گی۔" اس نے چڑانے والے انداز میں کہا۔

"ہمیں ایسا دل چاہیے بھی نہیں.... جو ذرا ذرا سی باتوں پر منہ لٹکانے پر مجبور کر دے۔" سر جھکا کر نانی کے لیے اگلا لقمہ بناتے ہوئے اس نے بے نیازی سے کہا تھا۔

"میری ایک بات لکھ کر رکھ لو نصیبن! اپنی ان ساری بڑی بڑی باتوں پر تم ایک دن ضرور پچھتاؤ گی۔" اس نے چڑ کر کہا تھا۔ اور خوش نصیب ہمیشہ ہی اس نام پر چڑ جاتی تھی، ابھی بھی دانت کچکچا کر بولی۔

"پچھتائیں میرے دشمن۔"

"جن کی تعداد ایک ہزار کے قریب تو ضرور ہو گی اور اتفاق سے ان ایک ہزار میں سے تین چوتھائی تو اسی گھر میں

موجود ہیں۔" وہ دوبدو بول رہا تھا۔ "وہ شاید قیامت کا دن ہی ہوگا جب تمہیں یقین آجائے گا کہ اس گھر میں کوئی بھی تمہارا دشمن نہیں ہے۔"

"کم سے کم اب تو یہ بات مت کہو۔" خوش نصیب نے سنجیدگی سے کہا۔ "جبکہ خود دیکھ بھی چکے ہو ایک معمولی کمرے کے لیے کیسے ہماری حیثیت کو رد کیا گیا ہے۔" صاف طنز تھا۔ کیف چپ سا رہ گیا' پھر بولا۔

"وہ بے حسی ہو سکتی ہے' دشمنی ہرگز نہیں۔"

"مجھے لفظوں کے ہیر پھیر میں مت الجھایا کرو کیف! تمہیں پتا ہے میں سادہ سی انسان ہوں۔ گھماؤ پھراؤ والی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" یہ ایسی عاجزی کا اظہار تھا کہ کیف اپنا بے ساختہ قہقہہ روک ہی نہیں سکا۔ خوش نصیب کی پیشانی پر بل پڑ گئے' اس نے کھا جانے والی نظروں سے کیف کو گھورا اور انگلی اٹھا کر بولی۔

"نکلو یہاں سے۔۔۔"

"جا رہا ہوں' جا رہا ہوں۔" وہ ہنس ہنس کر آنکھوں میں آیا پانی' پونچھتے ہوئے بولا۔

"کہنے صرف یہ آیا تھا کہ اب جا رہا ہوں تو جلدی واپس نہیں آؤں گا۔ زیادہ یاد نہ کرنا مجھے۔" آنکھوں میں شرارت اور لبوں پر دل جلانے والی مسکراہٹ سجا کر بولا۔ خوش نصیب کھول اٹھی۔

"ایسے بھی برے دن نہیں آئے میرے۔۔۔ کہ تمہیں یاد کروں۔"

"ظاہر ہے۔۔۔ جس کا خیال ہر وقت دل و دماغ میں رہتا ہو اسے یاد کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"اچھا سنو۔۔۔" پھر جاتے جاتے پلٹا۔ لیکن بات کرتے کرتے مخمصے میں پڑ گیا کہ کہے یا نہیں۔

خوش نصیب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "اب بول بھی چکو۔"

"وہ جو۔۔۔ فضیلہ چچی کا مہمان ہے۔"

"ارے ہاں۔۔۔ تم نے دیکھا کیف!" اسے ایک دم سے یاد آیا۔ "یہ تو وہی ہے۔۔۔ مخمل کی گاڑی والا۔۔۔ جسے راستہ بتایا تھا۔"

"یاد ہے مجھے۔" ناک چڑھا کر بولا۔ "یار! بات یہ ہے کہ۔۔۔" وہ جو سوچ رہا تھا کہہ نہیں پا رہا تھا۔

"کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو' اب بول بھی دو۔"

"نہیں کچھ نہیں۔۔۔" اس نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ خاموش رہنا ہی مناسب رہے گا۔ "تم اپنا خیال رکھنا' چلتا ہوں۔" باہر نکل گیا۔

"لو اور سنو۔۔۔ اپنا خیال رکھنا تو ایسے کہہ کر گیا ہے جیسے میں مٹی کھاتی ہوئی پکڑی گئی ہوں' یہ کیف بھی نا۔۔۔ چول ہی ہے۔" وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

جس وقت فریحہ مفضل منزل میں داخل ہوئی۔ صیام خوب بن ٹھن کر شامیر کی گاڑی کے پاس کھڑی مختلف پوز بنا بنا کر تصویریں کھنچوا رہی تھی۔ کبھی بونٹ پر ہاتھ رکھتی' کبھی دروازے سے ٹیک لگا لیتی۔ کبھی گاڑی کی چھت پر ایک ہاتھ ٹکا کر دوسرا ہاتھ ہونٹوں پر رکھتی اور آسمان کی طرف ایسے آنکھیں پھیلا کر دیکھتی جیسے کوئی اڑن طشتری نظر آ گئی ہو۔ اور تو اور ایک دو بار اس نے ہوا کو بوسہ دینے والا منہ بھی بنایا۔ اور اللہ جھوٹ نہ بلوائے' ایسا کرتے ہوئے اس کا چہرہ آم کی سوکھی گٹھلی جیسا دکھائی دینے لگا تھا۔

ہونے پہ مبارکہ تصویریں کھینچنے کے لیے جس ماہر فوٹو گرافر کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، انہیں باقی سارا گھر پیار سے اور خوش نصیب غصے سے طوطا بھائی کہتی تھی۔ فریحہ کے دیکھتے ہی دیکھتے طوطا بھائی نے صیام کو تصویر کھنچوانے کے ایسے ایسے پوز بنا کر دکھائے کہ بے چاری فریحہ پریشان ہی ہو گئی۔

وہ تو شکر ہے اسی وقت خوش نصیب وہاں آگئی اور چونکہ اس کے لیے صیام اور طوطا بھائی ___ کی یہ سرگرمیاں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ سو ذرا بھی اہمیت نہ دی۔ الٹا فریحہ کی پریشان شکل دیکھ کر حیران ہوئی۔ ""تمہیں کیا ہوا ہے؟""

فریحہ جواب تک طوطا بھائی اور صیام کو دیکھ کر پریشانی اور حیرانی سے فوت ہونے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ بڑی مشکل سے خوش نصیب کو ایک نظر دیکھ کر بولی۔

""مجھے چھوڑو... انہیں دیکھو... انہیں کیا ہوا ہے؟"" آواز دبا کر اس نے طوطا بھائی کی طرف اشارہ کیا جو صیام کو ایک نیا اسٹائل سمجھا رہے تھے۔ ذرا سا ترچھا کھڑا ہو کر دونوں بازو دور تک پھیلا لیے تھے اور ایک پاؤں کو ذرا سا اوپر اٹھا لیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی کے ابھی مغرب کی طرف اڑان بھر لیں گے۔ لیکن چہرے کے تاثرات تکلیف سے بھرپور تھے۔ کوئی بہت ہی عجیب و غریب پوز بن گیا تھا۔

""نہیں کیا ہوا ہے؟""

""اچھے بھلے تو ہیں۔"" خوش نصیب طوطا بھائی کو دیکھ کر لاپروائی سے بولی۔

""تم مانو نہ مانو... انہیں مرگی کا دورہ پڑنے والا ہے۔ جلدی کسی کو بلاؤ، انہیں اسپتال لے کر جائے۔"" وہ گھبرائی ہوئی تھی۔

""تم فکر نہ کرو۔ ان کی شکل بائے ڈیفالٹ ایسی ہے۔"" اس نے اتنے آرام سے کہا کہ فریحہ کو ہنسی آگئی۔

""میں سمجھتی تھی اس گھر میں صرف تم نمونہ ہو... لیکن ان دونوں نے تو تمہیں بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔""

""جی ہاں... نمونوں میں ہمارا خاندان خود کفیل ہے۔"" بڑے فخر سے بولی۔

فریحہ اس کی بات پر ہنسی، اسی وقت اندر سے شامیر نکلا۔ اسے دیکھتے ہی خوش نصیب نے سنجیدہ سی (بقول فریحہ پکی شکل) شکل بنالی۔ لیکن شامیر نے اپنی ملین ڈالر اسمائل بے دریغ سب پر لٹائی اور صیام کے پاس جا کر اس کا اسمارٹ فون ہاتھ میں لے کر ایک سیلفی لینے لگا۔

خوش نصیب کو نجانے کیوں بہت ہی برا لگا۔ اس نے فریحہ کا ہاتھ پکڑا اور فضل منزل سے باہر نکل آئی۔

""کیوں ایسے کھینچ رہی ہو مجھے؟..."" اس کے ساتھ کھنچتی ہوئی فریحہ جھنجلا کر بولی۔

""اللہ کی مہربانی سے اگر تمہارے گھر میں کوئی اچھی شکل و صورت کا نوجوان نظر آ ہی گیا ہے تو مجھے جی بھر کے دیکھ تو لینے دو... ویسے بھی اماں کو میری شادی کی بڑی فکر ہے۔ کہہ رہی تھیں کوئی اچھا لڑکا مل جائے تمرین کے ساتھ ہی مجھے بھی رخصت کر دیں گی۔"" بڑا دل جلا کر بتا رہی تھی۔

""تمرین کے ساتھ ہی کیوں...؟ اس کے نخریلے سسرال والوں کے لیے کوئی بچت پیکج نکالا ہے کیا تمہاری اماں نے... کہ ایک بیٹی لیں گے تو دوسری ساتھ میں مفت ملے گی؟""

فریحہ نے بدمزہ ہو کر اسے ایک زوردار دھپ رسید کی تھی۔ لیکن وہ خوش نصیب تھی، ایک آدھ ہاتھ سے اس کا کیا بگڑتا۔ کندھا سہلاتے ہوئے بولی۔

""اور شامیر کی طرف تو دیکھنا بھی مت... خیر سے ہمارے اپنے گھر میں ہی اتنی لڑکیاں ہیں کہ پرچیاں ڈالی جا سکتی

ہیں۔" وہ خوش نصیب تھی اس نے ثابت کیا۔

"تم نے کیف کی مرتبہ بھی یہی کہا تھا۔" فریحہ نے بدمزہ ہو کر یاد دلایا۔

"ہاں تو کیوں نہ کہتی؟..... سب کہتے ہیں ہیرا ہے وہ ہمارے خاندان کا۔" جلدی سے بولی۔ "مجھے یقین ہے جب کیف کی شادی کی باری آئے گی تو صباحت تائی جان سچ مچ پرچیاں ڈالیں گی لڑکیوں کے ناموں کی..... ظاہر ہے بھئی۔ اپنے جگر کے ٹوٹے کے لیے وہ کوئی عام لڑکی تو لائیں گی نہیں۔" لاپروائی سے بول رہی تھی۔

"فریحہ! تم ایسا کرو.... " ایک دم کوئی خیال آیا تو جوش سے بولی۔ "تم ایسا کرو۔ تم طوطا بھائی لے لو.... ان سے شادی کرنے پر کوئی لڑکی تیار نہیں ہوتی۔ تم راضی ہو جاؤ۔ اللہ ثواب بھی دے گا۔"

"یہ ثواب تم کیوں نہیں کما لیتیں؟" اس کی جان جل کر خاک ہو گئی تھی۔

"میں تو راضی ہو بھی جاؤں۔ طوطا بھائی کو کون راضی کرے گا.... وہ تو میری شکل دیکھتے ہی سہم جاتے ہیں۔" خوب ٹھٹھا لگا کر ہنسی تھی کیونکہ اپنی کارکردگی سے اچھی طرح واقف تھی۔ فریحہ مسکرانے لگی پھر بولی۔ "اچھا چھوڑو ساری باتیں.... یہ لڑکا کون تھا؟"

"فضیلہ چچی کا کوئی دور پار کا رشتہ دار ہے.... " وہ گلی میں چلتے ہوئے بات کر رہی تھیں۔ اندرون شہر کی چھوٹی چھوٹی لیکن صاف ستھری گلیاں۔

"آسٹریلیا سے آیا ہے۔ سکھ چین میں اپنا گھر بنوا رہا ہے۔ گھر بن جائے گا تو اپنی فیملی کو بھی یہیں بلوا لے گا.... اور جب تک گھر بن نہیں جاتا یہیں رہے گا۔" ادھر ادھر سے جتنی معلومات اکٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بتاتی چلی گئی۔

"شادی شدہ ہے؟" فریحہ نے اشتیاق سے پوچھا۔ خوش نصیب نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تمہیں کیا فکر ہے؟"

"بتا دو گی کون سی قیامت آجائے گی۔" فریحہ چڑ کر بولی۔ "مجھے تو لگتا ہے خوش نصیب اس پر خود تمہاری نظر ہے۔"

"بکو مت..... کسی نے سن لیا تو میری اور بھی شامت آجائے گی.... اور سب سے پہلے تو فضیلہ چچی میری آنکھیں ہی باہر نکالیں گی۔"

"تم عجیب ہو خوش نصیب! کبھی ذرا ذرا سی بات کی فکر میں ہلکان ہوئی پھرتی ہو۔ اور کبھی بڑی سے بڑی بات کو بھی اہمیت نہیں دیتیں۔"

"اور اس کے بعد جو روشن امی مجھے سزا دیتی ہیں۔" چڑ کر بولی۔

"کل بھی مجھے چھت پر سونا پڑا۔" بڑا دکھی منہ بنا کر کہا۔

فریحہ کو بڑی گدگدی ہوئی۔ "کیا واقعی؟"

"اور نہیں تو کیا۔" جل کر بولی اور ساری داستان فریحہ کے گوش گزار کر دی۔ فریحہ ہنس ہنس کر دہری ہو گئی۔

"خود کو بڑا پھنے خان سمجھتی ہو لیکن بستی (بے عزتی) تمہاری ہر بار ٹکا کر ہوتی ہے۔"

"فریحہ کی بچی! آستین کا سانپ..... کیسے مزے آرہے ہیں تمہیں..... دانت اندر کرو ورنہ یاد رکھنا اگلی بار تمہیں تمہاری اماں کے عتاب سے ہرگز نہیں بچاؤں گی۔"

"اچھا.... اچھا.... میں نہیں ہنستی..... ناراض کیوں ہوتی ہو۔" اس نے بمشکل ہنسی قابو کی۔ اسی وقت اسے ایک پتے کی بات یاد آئی تو جوش سے بولی۔

"ارے... تو یہ ہے وہ شامیر... جس کے نظر آنے پر تم نے باباجی کے پاس حاضری دیئے جانا تھا؟"
"ہاں... یہ ہے وہ شامیر..."
"لیکن یہ انگلش فلموں کا ہیرو تو نہیں لگتا۔" پرسوچ انداز...
"اچھا تو پھر...؟"
"یہ تو حمزہ علی عباسی لگتا ہے۔" اس نے مشہور زمانہ ٹی وی آرٹسٹ کا نام لیا۔
"جانے دو..." خوش نصیب نے ناک سے مکھی اڑائی۔ "وہ تو تمہیں اس سے محبت بہت ہے' اسی لیے ہر طرف وہ اداکار ہی نظر آتا ہے۔"
"ہائے... حمزہ... میری پہلی محبت..." اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر ایک لمبی "ہائے" کی تھی۔
"ویسے اس کا مطلب میرا اندازہ بالکل صحیح تھا۔"
"کون سا اندازہ...؟"
"یہ ہی کہ تمہاری اپنی نظر ہے شامیر پر..."
"کیا بکتی ہو۔" جھلا کر بولی۔ "اتنی چھوٹی چھوٹی تو گلیاں ہیں یہاں کی۔ ایسے ہی بس راہ چلتے ملاقات ہوگئی تھی۔"
"اور راہ چلتے ان ملاقاتوں میں معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ اسے بار بار دیکھنے کی خواہش کرنا شروع کردی تم نے..." فریحہ آنکھیں نچا کر بولی تھی۔
"توبہ ہے فریحہ! تمہیں کوئی بات سمجھانے سے بہتر ہے بندہ دیوار سے سر دے مارے... اس سے زیادہ آسانی سے تو طوطا بھائی کو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ او بھئی! کوئی خاص بات نہیں تھی... بس ویسے ہی کہہ دیا تھا میں نے..."
"ہوں... لیکن اب جو بھی ہے' باباجی کی بات تو ماننا ہی پڑے گی۔" اس نے جانچتی نظروں سے خوش نصیب کو دیکھا۔ "چلو پھر دربار پہ حاضری دے آتے ہیں۔"
"حاضری کس خوشی میں...؟"
"یاد نہیں باباجی نے تمہیں بلوایا تھا اور تم نے کہا تھا شامیر نظر آگیا تو ضرور جاؤ گی۔"
"ایسے ہی مذاق میں کہہ دیا ہوگا۔"
"خوش نصیب! پاگل پن مت کرو۔ سمجھ میں کیوں نہیں آرہا۔ یہ جو لڑکا ہے شامیر... یہ ایسے اچانک سے تمہارے گھر رہنے کیوں آگیا ہے؟ یہ آیا نہیں ہے' اسے دراصل بھیجا گیا ہے۔"
"کیا مطلب!" وہ حیران ہوئی۔
"میں نے تم سے کہا تھا نا... اگر خود باباجی سے ملنے نہیں جاؤ گی تو وہ تمہیں اپنے طریقے سے بلوالیں گے... دیکھ لو بلوانے کا انتظام تو کر ہی لیا ہے انہوں نے۔ ورنہ یہ وہی شامیر ہے جو اب تک ان ہی گلیوں میں بھٹکتا پھرتا تھا اور کبھی اس نے تمہارے گھر کی طرف نظریں اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔" بھلی فریحہ قابل غور نکتہ بیان کرتی چلی گئی اور خوش نصیب... وہ بالکل چپ چاپ ہوگئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

شازیہ الطاف ہاشمی

اک خواب آنکھوں میں

"السلام علیکم جی میں جاذب!" اس نے اپنی پینٹ کی جیبوں میں سے ہاتھ نکال کر دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ پتا نہیں وسیم گھر میں تھا بھی کہ نہیں' ایک تو گرمی سے برا حال تھا اور دوسرا وسیم منحوس نہ جانے کدھر گیا ہوا

تھا۔ صبح ہی بائیک مانگ کے لے گیا تھا اور واپسی کی راہ بھول گیا تھا' ایک تو لوگ چیز مانگ کے لے جاتے ہیں اور پھر واپس کرنے کی زحمت بھی نہیں کرتے' اس کا موبائل بھی مسلسل آف جا رہا تھا۔

"اب کبھی بائیک دے دوں بچو! تو میرا نام بدل دینا۔" وہ دل ہی دل میں ارادے باندھ رہا تھا۔

ایک خوشبو بھرے خوش گوار جھونکے کی طرح دروازہ کھلا اور سامنے مہرین تھی' نہائے ہوئے کھلے بال اور گلے میں پڑا دوپٹا اور اتنے گھنے لمبے بال وہ ساکت رہ گیا۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ کیا کرنے آیا تھا یہاں اور اگلے ہی پل وہ اندر قدم رکھ چکا تھا۔

"چائے پئیں گے کہ ٹھنڈا؟" اس کی آواز اتنی نرم تھی اور لہجہ دھیما کہ وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔

"جی پانی پلا دیں۔" وہ کن اکھیوں سے اسے تک رہا تھا۔ وسیم کی کوئی بہن بھی تھی' اسے پہلے شاید پتا نہیں تھا یا اس نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ ٹھنڈے ٹھار روح افزا کے نہ جانے کتنے ہی گلاس پی گیا تھا اور لگتا تھا ابھی بھی پیاس باقی ہے' بجھ ہی نہیں رہی۔ صبح دفتر جاتا تھا اور شام کو مغز ماری کر کے دھول چھانتا واپس آتا تھا' بلا وجہ ہی غصہ آنے لگتا تھا اور اب بھی وہ وسیم کو ٹھیک ٹھاک سنا کے جاتا۔ مگر اب اس کے دل کی دنیا تہ و بالا ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ بظاہر نیچے دیکھ رہا تھا' مگر آنکھیں اس کے لمبے خوشبو دار بالوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھی اور بھی باتیں کر رہی تھی' مگر اسے کچھ بھی نہیں سنائی دے رہا تھا' پتا نہیں وہ جواب بھی دے رہا تھا کہ نہیں' بس وہ اپنے نرم ہاتھ ہلاتی نظر آ رہی تھی۔

جاذب کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پتا نہیں' وہ کیا چوری کر بیٹھا تھا۔ نہ جانے کب عفت آنٹی آ گئی تھیں۔ انہوں نے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا اور بیٹھ گئیں۔

"وسیم آ رہا ہے بائیک لے کے پنکچر لگوا رہا ہے۔ منے کی شاپ سے میں سودا لے کے آ گئی' وہ پیچھے آ رہا ہے' بیٹا معذرت چاہتی ہوں' ہمیں بہت دیر ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں خالہ! کوئی بات نہیں۔" وہ غائب دماغی سے کہہ کر اجازت لے کر اٹھ گیا تھا' اسے اب وسیم کا انتظار بھی نہیں تھا۔ لوگ یوں ہی بے حد شریف سمجھتے تھے۔ جاذب میاں آپ تو بالکل بھی شریف نہیں ہیں' جاتے وقت گرمی نے برا حال کر دیا تھا۔ تپتی ہوئی گلیاں اب نخلستان میں تبدیل ہو گئی تھیں اور وہ مسکراتا ہوا اڑتا جا رہا تھا۔

"تو میرے نال وسل بجا' اور پھر خود ہی سیٹیاں مارتا جا رہا تھا' آگے اماں منہ کھولے گولے داغ رہی تھیں۔

"کہاں مر گیا وسیم! بڑی بری عادت ہے' اسے مانگنے تانگنے کی۔ اب اس کمینے نکمے کو بائیک دی نا تو میں تیرا علاج بھی اچھی طرح کروں گی۔" اماں مسلسل ہاتھ گھماتی وسیم کو برا بھلا کہہ رہی تھیں اور وہ مسکرا رہا تھا۔

"دماغ چل گیا ہے لڑکے کا' دھوپ میں عقل باہر ہی بھول آیا ہے۔" وہ کمرے میں جا رہا تھا اور اماں پیچھے سے بڑبڑا رہی تھیں۔ وہ مسرور سا بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔

"ان آنکھوں کی مستی کے افسانے ہزاروں ہیں۔"

آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی' بلکہ سرخ آگ میں بدل رہی تھی' مگر کہا وسیم نے اور وہ بھی شاید سننے کی منتظر ہی تھی' اب وہ اکثر چلا جاتا تھا وسیم کے پاس۔ ایک دم وسیم اسے پیارا لگنے لگا تھا۔ بوتل' سموسے' بریانیاں اب وہی اپنی جیب سے کھلاتا تھا وسیم کو۔ دونوں کی دوستی پہلے یک طرفہ تھی' اب دونوں طرف سے گرم جوشی کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ وسیم اس کی بائیک کے پیچھے اور جاذب اپنے دل کی خاطر۔ اب اکثر ہی چائے ٹھنڈا اپنے کو مل رہا تھا' کبھی کبھار کھانا بھی۔ اب وہ گھر میں کھانا زہر مار کرتا تھا اور یہاں خوشی سے کھاتا تھا۔ عفت آنٹی اسے اور مہرین کو پورا پورا وقت دیتی تھیں بات چیت کرنے کا۔ وہ چپکے سے اٹھ جاتیں اور جاذب کو اتنی پیاری لگتیں کہ جی چاہتا عفت آنٹی کا ہاتھ چوم لے' اب بھی وہ معمول کی طرح مہرین کے

ہاتھ کی بنی بریانی سے خوب انصاف کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ امی سے بات کر کے مہرین سے اب جلد از جلد شادی کر لینی چاہیے۔ آنٹی۔ بریانی اس کی پلیٹ میں ڈال رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"اماں! آپ کو میرا ہنسا اچھا نہیں لگتا نا۔ بس کھوتے کی طرح کام کرتا جاتا ہوں، بس نوٹ کمانے والی مشین بن کے رہ گیا ہوں۔" وہ اماں کے بار بار ٹوکنے اور غور کرنے پر عاجز آگیا تھا۔

اماں اس میں آنے والی تبدیلی سمجھ چکی تھیں، مگر وہ تھی کون یہ جاننا باقی تھا۔

"زیبی! جا بھائی کو ناشتا بنا دے۔" وہ نہانے باتھ روم گھسا تھا، زیبی کھانا بنا کے بھاپ اڑاتا چائے کا مگ اسے دینے آئی تھی تو جاذب نے ہاتھ تھام کر اپنے پاس بٹھالیا، پھر بٹوے سے ہزار ہزار کے تین نوٹ نکال کے زیبی کو تھما دیے۔

"بس! اماں کو منالو مہرین کے لیے۔"

وہ بات کہہ کر یہ جا وہ جا۔ زیبی ہکا بکا بھائی اور محبت... بہرحال تین ہزار کا ریلہ مزا دے گیا تھا۔ اماں سے بات بھی ہو جائے گی۔

"نہ تجھے اپنے الیاس ماموں کے گھر جاتے موت پڑتی ہے۔" اماں اسے جب بھی ماموں کے گھر بھیجتی تھیں۔ وہ غصے میں ہی گیا تھا، وہیں اس کی ایک عدد منگیتر بھی تھی۔ "زینب الیاس"

اسے زینب کبھی اچھی نہیں لگی تھی، سال کے سال تو مسکراتی تھی۔ یہ ایسی سخت لڑکی "اف وہ بڑبڑاتا ہی رہتا" ایک تو تعلیم بھی واجبی سی اور رنگت بھی سانولی اور یہ دوپٹا مائیوں والا، یا اللہ تو اس لڑکی سے میری جان چھڑوا دے، وہ دعائیں مانگتا سو گیا تھا۔

صبح ہی صبح اماں نے اسے بے نقط سنائی تھیں۔

"مہرین لفنگی ہے، پوری لفنگی۔ میں اسے بہو تو کیا گھر کی دہلیز پہ قدم بھی نہ رکھنے دوں چلے ہیں محبت

کرنے۔ میں اس بے حیا کے گھر رشتہ لے کے جاؤں، پہلے زہر نہ پھانک لوں اور پھر بھائی کو کیا منہ دکھاؤں کہ میرا نانہجار بیٹا اب عشق میں مبتلا ہو گیا ہے، اس لیے اب انکار کر رہی ہوں، تو نے باپ کے مرنے کے بعد ایسے ہی سر میں خاک ڈالنی تھی، مجھے پتا تھا۔" وہ رو دینے کو تھیں اور جاذب کے لیے سانس لینا بھی مشکل تھا۔

"کیسے سمجھاؤں آپ کو آخر کیسے نہیں ہے وہ بری۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا، نہیں رہ سکتا۔" اماں اور جاذب کے درمیان چھڑی جنگ خاصی طوالت اختیار کر چکی تھی۔ اماں کو بھائی کی بیٹی کی معصومیت رلاتی تھی۔ رشتے رلاتے تھے اور جاذب کو مہرین کے چہرے پر پھیلی شرمگیں مسکراہٹ کچھ بھی کر گزرنے کا حوصلہ دیتی تھی۔ وہ شادی تو مہرین سے ہی کرے گا۔ چاہے ماموں نہیں، دنیا اسے چھوڑ جائے یہ ہو کر رہے گا۔

اماں نے مہرین کا رشتہ نہ مانگنے کی قسم کھا رکھی تھی تو جاذب نے مہرین کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زیبی

چپ چاپ تماشا دیکھتی تھی' ایک طرف اکلوتا بڑا بھائی تو دوسری طرف ماں' کسے سمجھاتی آخر؟ اماں بخار میں تپ رہی تھیں۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے اور کمزوری میں بھی مہرین کو برا بھلا کہہ رہی تھیں' وہ ماں کی تیمارداری میں لگا ہوا تھا۔ محبت ایک طرف ماں کی خدمت ایک طرف۔ اس کی زندگی ہے اسے گزارنے کا حق حاصل ہے اپنی مرضی سے۔۔۔

"تیرے جیسے نہ جانے کتنے ہوں گے اس کی چوکھٹ پر چھوڑ دے اسے' نہ ماں کا دل دکھا۔" وہ التجائیں کر رہی تھیں' اس کا دل بھی رو رہا تھا' مگر کیا تھا جو وہ مان جاتیں میرے دل کی خوشی۔

"جا اپنے ماموں کے گھر تیرے ماموں کی طبیعت اچھی نہیں' پوچھ کر آجا میرے پتر اللہ ترقیاں دے' رب سوہنا تجھے خوش کرے میرے لال۔۔۔"

وہ برے دل سے ہی سہی' اٹھ گیا تھا' بائیک نکالی اور روڈ پہ آگیا' پھر سوچا پہلے مہرین کا دیدار کرتا چلے' جانا تو شام کو تھا' مگر اب مل لیتا تو ٹھیک تھا ماموں کو اسپتال لے جانا پڑتا تو شام ہو جاتی تھی۔

بائیک روک کر دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا' دروازہ کھلا ہوا تھا' وہ یوں ہی آگے آگیا تھا' سامنے صوفے پر پرویز بھی اسی کی طرح گال سرخ کیے بریانی کھانے میں مشغول تھا۔ مہرین بالوں کی نم لٹیں آگے ڈالے نہ جانے کیا سوال جواب کر رہی تھی' سامنے سینٹرل ٹیبل پر بہت سا سامان تحفے ٹائپ رکھے تھے' جو یقیناً "پرویز" ہی لایا ہو گا' کیونکہ وہ بھی تو اسی کی طرح خالی ہاتھ آنے سے شرمندگی محسوس کرتا ہو گا نا۔ جیسے وہ مٹھائیاں' کیک اور میک اپ کا دوسرا سامان آتے وقت لیتا آتا تھا' تو یہ مرغا بھی لاتا ہو گا۔ وہ الٹے قدموں واپس جا رہا تھا' کیونکہ اسے دیکھ کر وہ بس رسمی سا مسکرائی تھی اور عفت آنٹی کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔

"بیٹھو بیٹا!" جس طرح سرسری سا اصرار کیا تھا وہ بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور خواب ٹوٹ ٹوٹ کر گریبان بھگو رہے تھے۔ مہرین نے جس طرح سے اس کے دل سے کھیلا تھا اسے بہت شدت سے تکلیف ہوئی تھی۔ اس نے تو سچے دل سے اسے چاہا تھا' وہ تو اسے اپنانا چاہتا تھا' مگر وہ کیا نکلی تھی۔ اس کا حسین چہرہ' گہری نیلی آنکھیں صرف ایک دھوکا تھا اور کچھ نہیں' وہ تو کسی ماہر اداکارہ کی طرح ہر کسی کو یوں ہی ساحر نگاہوں سے تکا کرتی تھی اور وہ جو خود کو جہاں دیدہ سمجھتا تھا۔ دل کے راستوں پر عقل ہار بیٹھا تھا' دل روتا تھا اور عقل حیران تھی۔

"کھٹ کھٹ کھٹ۔۔۔" یہ دوسری بار تھا جو وہ دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ "جی کون" دروازہ کھلا نہیں تھا' صرف آواز باہر آئی تھی جو نرمی سے محروم تھی۔

"میں جاذب' دروازہ کھولو۔۔۔" وہ عجلت میں تھا' بے تاب' اندر لے جانا چاہتا تھا۔

"ابو اور امی تو اسپتال گئے ہیں"۔ اس نے دروازہ نہیں کھولا تھا اور اچھا تھا جو نہیں کھولا تھا۔ اسے بے اختیار یاد آیا۔

"نہ بچیوں کو ہر آنے والے کے لیے گھر کا دروازہ نہیں کھول دینا چاہیے۔" اسے اچھا لگا تھا نہ جانے کیوں۔ وہ واپس مڑ رہا تھا کہ ماموں لوگ واپس آگئے تھے۔ "زینب کو منع کر رکھا ہے بیٹا' دروازہ کھولنے سے آج کل تو حالات یوں بھی خراب ہیں۔"

ممانی بول رہی تھیں اور وہ پورے دھیان سے سن رہا تھا۔ ماموں اسپتال سے دوائیں لے کر آچکے تھے' اب ان کا بخار بھی کم ہو گیا تھا اور وہ موٹر سائیکل درست جگہ کھڑی کر کے اپنی زندگی کا صحیح پڑاؤ ڈھونڈ چکا تھا۔ زینب شربت دے کر رکی نہیں' اندر چلی گئی تھی' آج اسے زینب کا چہرہ دنیا میں سب سے حسین اور پاکیزہ لگا تھا۔ مہرین تو اس کی جیسی ہو بھی نہیں سکتی تھی اور تھی بھی نہیں۔ اب کے اس کی آنکھوں میں سجنے والا خواب سچا اور کھرا تھا۔ شربت خود ہی جگ سے انڈیل کر خود بھی پیا اور ماموں کو دیتے ہوئے نہ جانے کیوں مسکراتا ہی چلا گیا اور اس ہنسی میں ماموں' ممانی اور وہ خود دل سے شریک تھا۔

☆

سمیرا حمید

"سماز اپنی ساخت پر فاخر نہیں ہو سکتا' اسے تو اس دھن کا انتظار کرنا ہو گا جو دو دلوں کے ایک ہو جانے سے بجتی ہے۔"

دو گھوڑوں کی بگھی، چھپے ہوئے چاند اور گہری رات کے کہر میں جنگل سے گزر رہی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں نے جنگل کو بورشے کی محویت سے چونکا دیا تھا۔ درختوں کی سرگوشیاں جو لوری میں ڈھلنے لگی تھیں، وہ اب سہم گئی تھیں۔ جنگل کو ڈر تھا ماریہ کا راز افشا ہو جائے گا۔ کیونکہ آسکر رات کو اس وقت اکیلا بگھی میں سوار اسے دوڑائے چلا آرہا ہے۔ کوچوان کی نشست پر بیٹھا اور گھوڑوں کی لگاموں کو سختی سے تھامے ہوئے ہے۔

جنگل غیر دوستانہ ہو گیا... ساز خوش پذیرانہ...

پہلے وہ کچے راستے پر تھا پھر اس نے گھوڑوں کو جنگل کی طرف جانے دیا۔ یہ متبادل راستہ تھا جو اسے جنگل سے گزار کر جلد ہی گاؤں کی طرف لے جاتا۔ جنگل میں اندھا دھند بگھی دوڑاتے ہوئے وہ یہ بھول رہا تھا کہ درخت اس کے گھر کے ملازم نہیں ہیں جو راستے سے

ہٹتے چلے جائیں گے۔ درخت حکم ماننے والے تھے نہ دلیل۔ جنگل کو ہمراہی بنانے میں وقت لگتا ہے۔ جب تک جنگل ہمراہی نہ بنے اس کے راستوں پر اندھا دھند نہیں بھاگنا چاہیے۔

ایک درخت سے ٹکرا کر جب اس کی بگھی تقریباً الٹ ہی گئی تھی اور وہ اچھل کر بگھی سے باہر آگرا تو جو بات اسے آخری وقت تک یاد تھی وہ اتنی سی تھی کہ روشنی کی چند لہریں اس کی نظروں کے سامنے سے گزری تھیں اور گھوڑے بدک گئے تھے۔

اور پھر جب اسے ہوش آیا اور اس نے درخت کے تنے سے پیٹھ لگائی تو اسے یہ بھی یاد آیا کہ روشنی کی

ان لکیروں سے پہلے، بس ذرا دیر پہلے اس کے کانوں میں ایک آواز آئی تھی۔ پہلے اسے یہ آواز دور گاؤں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ پھر اسے لگا کہ شاید کوئی دیوانہ رات کے اس پہر جنگل میں گیدڑوں اور جھینگروں کے لیے کلارنٹ بجا رہا ہے۔ وہ اس آواز پر مزید غور کرتا اگر جو فوراً" ہی اچھل کر نیچے نہ جا گرتا۔

لمبے درخت سے ٹیک لگائے وہ اب ایسے اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے آئرلینڈ سے گاؤں کے اس جنگل تک کا سفر اس نے اسی درخت سے ٹیک لگا کر ستانے کے لیے کیا تھا۔ رات میں جو خنکی تھی اس کا مزہ چکھنے

کے لیے پتوں اور شاخوں میں جو راز چھپے تھے' انہیں چپکے سے کھوج لینے کے لیے ٹمٹماتی روشنیاں جو پتوں اور شاخوں میں سے ہو ہو کر آتی جاتی محسوس ہو رہی تھیں ان کا چپکے چپکے پیچھا کرنے کے لیے۔

گھوڑے بگھی کو گھسیٹتے' اس کے قریب آکر ہنہنانے لگے تھے۔ انہیں بھی اپنے مالک کا غصہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ اسے یہ جتانا چاہتے تھے کہ سرشام گھر چھوڑ دینا کہیں کی بھی عقل مندی نہیں ہے۔ وہ گردن اٹھا کر اسے دیکھنے لگے۔ مسٹر آسکر نے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے لگائے ایک آنکھ دبا کر گھوڑوں کو دیکھا اور پھر ایسے گھنے جنگل میں' اتنے درختوں میں' گھور اندھیرے اور بے وجہ تنہائی میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"مجھے مصور بننا ہے۔۔۔۔ تخلیق میرا خواب ہے۔۔۔۔ رنگ مجھے زندہ رکھتے ہیں۔۔۔۔"

دونوں گھوڑوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور جیسے کہا۔ "مسٹر بروک ہیگ نے بھی تو حقیقت میں رنگ بھر کر تمہیں روکنے کی کوشش ہی تو کی تھی۔"

"اب وہ مجھے ڈھونڈیں گے' جب پریشان ہو جائیں گے تو انہیں یقین کرنا ہی ہوگا کہ میں اپنے ارادوں میں کس قدر پختہ ہوں۔"

"مسٹر بروک ہیگ اتنی جلدی پریشان ہو جانے والوں میں سے نہیں ہیں۔"

"جلدی نہ سہی' دیر سے ہی سہی۔ کیا میں اپنے رنگ اور برشز پھینک دوں۔ اپنے کینوس کو آگ میں جھونک دوں؟ میں یہیں رہ کر اپنی پینٹنگز بناؤں گا۔ ان سے چھپ کر خود کو منوالوں گا۔"

"ان کا کہنا ہے کہ تم نہ ڈاونچی بن سکو گے نا تھامس۔۔۔ تم خود کو تھکا رہے ہو بس۔۔۔۔"

"خدا انسان بناتا ہے ان کی نقلیں نہیں۔ ڈاونچی ہو یا تھامس' ان کی نقول بنی ہیں نہ ان کے کام کی۔ خدا کو نقل منظور نہیں۔"

"پھر تمہیں ان کے کام اور تخلیقات سے آگے جا کر کچھ کرنا ہوگا۔"

"فنکار اگر یہی طے کرنے میں لگا رہے گا کہ اسے فلاں سے آگے جانا ہے یا فلاں کو پیچھے چھوڑ دینا ہے تو پھر سب کچھ ہوگا لیکن تخلیق کچھ نہیں ہوگا۔ خدا کو مقابلے بازی پسند نہیں۔"

لمبے تناور درخت کے تنے سے پیٹھ لگائے بیٹھے اسے کوئی دیکھ لیتا تو ڈر کر بھاگ جاتا کیونکہ رات کے اس پہر کوئی دیوانہ ہی اتنی بلند آواز میں خود کلامی کر سکتا ہے جبکہ وہ تو باقاعدہ تاثرات اور آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ مکالموں کی ادائیگی کر رہا تھا جیسے مسٹر بروک ہیگ اس کے سامنے ہی کھڑے تھے۔ اور جو حسرت دلائل دینے میں رہ گئی تھی' وہ اب پوری کر رہا تھا۔ چونکہ اجنبی کو گھوڑوں کی باتیں سنائی دینے والی نہیں تھیں' اس لیے اس کی دیوانگی تصدیق شدہ تھی۔

"آسکر دی ہیگ' پینٹنگز کے لیے گھر چھوڑ کر آچکا ہے اور ایسے ہی جنگل میں بھٹک رہا ہے۔ نشانیاں خوش آئند ہیں۔ اب دیکھتے ہیں کامیابی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔" آس پاس نظر دوڑا کر اس نے ہاتھ لہرا کر' بلند آواز سے کہا۔ ذرا دور گرے چابک کو ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا اور زور سے اسے ہوا میں اعلانیہ لہرایا۔

کسی اجنبی ساز کی آواز اس کے کان کے پردے کو چھو کر گزری اور یک دم اسے یاد آیا کہ اسی آواز پر وہ متوجہ ہوا تھا۔ بلکہ بگھی سمیت الٹ کر گر گیا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا کہ گاؤں شاید بہت قریب ہے۔ آواز وہیں کہیں سے آرہی ہوگی۔ ادھر ادھر سر اٹھا کر اور گھوم پھر کر دیکھا لیکن گاؤں کے آثار دور دور تک دکھائی نہیں دیے' البتہ آواز اور قریب آتی گئی۔ اپنے قدم آواز کی سمت بڑھاتے ہوئے وہ تھوڑی دیر کے لیے سہم گیا۔ رات کے اس وقت جنگل میں اس آواز کا خالق کون ہو سکتا ہے؟ اس بات نے اس کے ذہن میں سب خوفناک کہانیاں خاکوں کے ساتھ اجاگر کردیں۔ گھوڑوں کی پیٹھ تھپک کر وہ آگے بڑھا۔ یعنی کہ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرے پیچھے آنا نہ بھولنا۔

آواز اور قریب آتی گئی۔ وہ ٹھیک سمت میں جا رہا

تھا۔ اس کے ذہن کے کینوس پر پر ایک تصور ابھرا کہ کچھ ہی دیر میں اسے ایک چھوٹی سی غار نما جھونپڑی نظر آئے گی جس میں ایک بڑھیا بیٹھی بانسری بجا رہی ہو گی۔ جیسے ہی وہ بانسری کے سحر سے نکلے گا' خود کو ایک بڑی سی دیگ میں بیٹھا ہوا پائے گا۔ جس کے نیچے آگ کا الاؤ روشن ہو گا بلکہ چنگھاڑیں مار رہا ہو گا اور پھر۔۔۔ اور پھر۔۔۔۔

اور پھر یہ کہ درختوں کے تنوں اور پتوں' جنگل کی گھاس اور جھاڑیوں' نرم مٹی اور کیچڑ نے اسے روکنا چاہا لیکن آسکر نہیں رکا۔ ہر جنگل ایک راز رکھتا ہے۔ اگر اس جنگل کا راز یہ ساز ہے تو اب وہ بے نقاب ہونے کو ہے۔ جھاڑیوں نے اس کے پیروں کو اپنے شکنجے میں لیا اور اس نے کچھ قوت اور کچھ جھنجلاہٹ سے جھاڑیوں کو پیچھے دھکیلا اور رد عمل میں تیزی سے لڑکھڑاتا ہوا ایک درخت کے تنے کے ساتھ جا لگا۔۔۔۔ کھب گیا۔۔۔۔ چپک گیا۔

جیسے ہی اس نے اس درخت کی پشت سے سر تھوڑا باہر نکالا۔۔۔ وہ۔۔۔۔ دم بخود رہ گیا۔ دیکھ لینے پر بھی اسے یقین نہیں آیا کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے۔ وہاں موجود ہونے پر بھی اسے یقین نہیں آیا کہ وہ ایسے کسی منظر کے قرب و جوار میں موجود ہو سکتا ہے۔

ننھی روشنیوں کی اڑان دم بخود کر رہی تھیں۔ ٹمٹماہٹیں خیرہ کن تھیں۔ جگنوؤں کی فوج لہریں بناتے رقص کر رہی تھی۔ زمین سے اوپر اٹھتے' درختوں کی شاخوں سے لپٹ کر گزرتے' آسمان کی سمت جانا چاہتے' رک جاتے' گھوم جاتے' قطاروں میں تقسیم ہوتے اور اس لڑکی کے گرد گھوم گھوم کر واپس اپنا سفر پھر سے شروع کرتے۔ اس لڑکی کے گرد جس کے سر پر بڑا سا گول ہیٹ تھا' ہاتھ میں انجانا ساز اور آنکھوں میں وہ مستی جو جگنوؤں کی ایسی فرماں برداری پر نازاں تھی۔۔۔۔ وہ ایک جادوگرنی۔۔۔ اوہ جادوگرنی۔۔۔۔

یہ ایک دھوکا تھا جو کسی خواب سے پیوند لگتا تھا۔۔۔۔ ایک دیوانگی جو کسی جادو کے زیر اثر تھی۔۔۔ ورنہ کچھ نہیں۔۔۔۔ اور کچھ نہیں۔۔۔۔

زمین کی سطح گیلی اور نرم ہو گئی اور آسکر اس میں دھنس گیا۔ مجسمے کی طرح حرکت کرنے سے محروم ہو گیا۔ اتنی رات کو' ایسے گھنے جنگل میں وہ ایک بڑھیا کو دیکھنے کی امید تو رکھتا تھا لیکن لڑکی' ساز اور جگنوؤں کو ہرگز نہیں۔

ساز ابھی بھی بج رہا تھا۔ لڑکی دائرے میں گھوم گھوم کر جگنوؤں کی فوج کو اپنی دھن کے لے پر سنبھال رہی تھی۔ لڑکی اور اس کی ہوائی فوج میں ایسی ہم آہنگی تھی جیسے بارش کے قطروں اور پھول کی پنکھڑیوں میں ہوتی ہے۔ آسکر نے دیکھا کہ درختوں کی جڑوں سے دروازے کھول کھول کر۔ ننھے' چنے منے بونے بھی اپنے بہترین لباسوں میں کودتے پھاندتے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے لڑکی کے گرد دائرہ بنا کر اچھلنے کودنے لگے ہیں۔۔۔۔ آسکر کے لیے اس منظر کی تاب لانا مشکل بلکہ مشکل تر تھا۔ اس نے شدت سے اپنی آنکھیں مسلیں اور غور سے دیکھا۔ بونے غائب ہو چکے تھے جبکہ روشنی کی لہریں ویسے ہی موجود تھیں۔۔۔۔ تھرا رہی تھیں۔۔۔۔ گنگنا رہی تھیں۔۔۔۔ رقصاں تھیں۔۔۔۔ اب بھی وہ کیسے یقین کر لیتا کہ روشنی کے لاتعداد ننھے منے قمقمے ایک لڑکی کے ساز پر رقصاں ہیں۔ آنکھیں پھر سے صاف کرنی پڑیں' سر کو پھر سے ٹھونکنا پڑا۔۔۔ لیکن منظر وہی رہا۔۔۔۔ ساز ویسے ہی بجتا رہا۔۔۔ اور لڑکی جھومتی رہی۔۔۔۔ جھومتی رہی۔۔۔۔

ہاں یہ خواب در خواب ہے۔۔۔۔ یا پھر گمان در گمان۔۔۔۔ اور کچھ کیسے۔۔۔۔ بھلا کیسے۔۔۔۔

وہ درخت کی اوٹ میں ہو گیا اور بار بار آنکھیں مسل کر اس نظارے کی حقیقت کا یقین کرتا رہا۔ اسے واپس لوٹ جانا تھا تو بھی وہ وہیں کھڑا رہا۔ وہ خوف زدہ تھا تو بھی وہیں جامد تھا' اسے حیرت تھی تو بھی وہ بے یقینی لیے وہاں موجود تھا۔ اس نے لڑکی کے پاس جانا چاہا تو بھی وہ درخت کے سہارے ٹکا رہا۔ اسے زمین سے شکایت تھی' وہ اس کے دھنسے ہوئے پیر آزاد کیوں

نہیں کر رہی تھی۔

کچھ وقت گزرا اور اسے اپنے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ شاید وہ اس کے قریب آرہے تھے۔ وہ چونک گیا اور جلدی سے درخت کی اوٹ سے باہر نکلا! اور......

"یہ کیا ہو رہا ہے..... کون ہو تم؟ چابک اس کے ہاتھ میں تھا اور اس نے اسے جگنوؤں کی طرف لہرا کر بلند تر آواز میں پوچھا۔

"وقت، جنگل، جگنو اور لڑکی سب ساکت ہو گئے۔ حیرت سے گھوم کر اس کی طرف پلٹے۔ خوف سے لڑکی کے ہاتھ سے ساز گر گیا اور اس نے سہم کر سر اٹھا کر جگنوؤں کو دیکھا جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئے تھے۔ لڑکی نے جلدی سے ساز اٹھایا اور بھاگنے لگی۔ آسکر کو یقین نہیں آیا کہ ایک جادوگرنی ایسے خوف زدہ ہو کر بھاگ بھی سکتی ہے۔ وہ بھی اس کے پیچھے بھاگا کیونکہ ساری کہانیوں سے اس نے یہی جانا تھا کہ جادوگرنی کتنی بھی طاقتور کیوں نہ ہو، جیت ہمیشہ ہیرو کی ہی ہوتی ہے۔ اس وقت کا ہیرو وہ تھا..... آسکر دی ہیگ......"

جادوگرنی اپنی فراک سے الجھتی تیزی سے بھاگ رہی تھی لیکن وہ جادوگرنی سے زیادہ تیزی سے بھاگا اور پیچھے سے اس کے بازو کو پکڑ کر اپنی طرف گھما لیا اور......

روشنی اپنی مچانوں سے نکل آئی......

دھنیں عہد و پیماں لیے بجنے لگیں......

لڑکی کا ہیٹ گر گیا، اس کے دو رخی گندھے بال نمایاں ہو گئے اور اس کی آنکھیں لہریں بناتے ننھے قمقموں کی مانند ڈگمگانے لگیں۔

"تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتیں، میں اس جنگل کو تمہارے جادو سے آزاد کروا کر ہی رہوں گا۔" یہ بات کہہ چکنے کے بعد بھی آسکر کو یقین نہیں آیا کہ وہ ایسی بات کہہ دینے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا اور حوصلہ بھی۔ کچھ باتوں کا ادراک آدھی رات کو جنگل میں بگھی سے گر کر، جادوگرنی کا بازو پکڑ کر ہی ہوتا ہے۔

بہرحال اس کی بات پر درخت، جھاڑیاں، پھول، پودے اور رات اتنی زور سے ہنسے کہ اسے اندازہ ہو گیا کہ اس نے کس قدر مضحکہ خیز بات کی ہے۔

خوف سے لڑکی کی پلکیں لرزنے لگیں۔ آسکر نے بے یقینی سے جادوگرنی کو دیکھا۔ "تم تو مجھ سے ڈر رہی ہو؟"

جواب میں لڑکی نے اپنا بازو آزاد کرانا چاہا لیکن آسکر نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ "کیا تم سن نہیں سکتیں؟"

اب لڑکی نے غصے سے اپنا بازو آزاد کرانا چاہا۔ آسکر نے اپنے پنجے اس کے بازو میں اور سختی سے گاڑ دیے۔

"تم ہو کون......؟" اور سر کو جھکا کر ہیٹ کے دائرے میں داخل ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا۔

"تم کون ہو......؟ لڑکی نے غصے ــــــــ سے پوچھا۔

آسکر نے داد دینے والے انداز سے لڑکی کو دیکھا۔ پہلے وہ سہم کر بھاگ رہی تھی۔ پھر وہ خوف زدہ ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ غصے سے چلا رہی تھی۔ اگر وہ ایسے ہی رنگ بدلتی رہی تو آسکر کو اپنی پینٹنگ کے لیے کچھ رنگ اس سے بھی ادھار لینے پڑیں گے۔

"چھوڑ دو میرا ہاتھ......" او ہاں، اب وہ قوت بھی لگا رہی تھی۔

"ورنہ......؟" لڑکی نے کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ آسکر کو لگا، وہ اسے نشانہ بازی کے لیے للکار رہی ہے۔

"میں سارے گاؤں کو چلا چلا کر اکٹھا کر لوں گی......"

اس کا انداز ٹھیک تھا وہ للکار رہی تھی۔ "گاؤں تو بہت دور ہے..... چلاؤ! ہو سکتا ہے گاؤں والے تمہاری بھنبھناہٹ سن لیں۔"

لڑکی نے پھر سے اپنا بازو آزاد کرانے کی کوشش کی جو ناکام ٹھہری۔ "مجھے چھوڑ دو..... انکل جاگ جائیں گے وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے..... وہ بورشے کو چھین لیں گے۔" اب وہ بے چارگی سے التجا کرنے لگی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں کے ہم راہی ہوئے تو آسکر نے چونک کر لڑکی کو غور سے دیکھا۔ جادوگرنی رو رہی

ہے۔ چچ چچ......

"کون ہو تم...... یہاں کیا کر رہی تھیں......" سوال پھر سے دہرایا گیا۔

"کیا تمہیں نظر نہیں آرہا کہ میں ایک لڑکی ہوں۔ وہ دیکھو...... دور...... وہاں کیچڑ میں گرنے سے میرا بورشے گندا ہو گیا...... میرے جگنو تم سے ڈر کر بھاگ گئے...... تم نے ان پر کتنی بے دردی سے چابک لہرایا...... کیا انسانیت سے کبھی تمہارا کوئی واسطہ نہیں رہا۔" غصہ اتنی اچھی چیز بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جنگل میں ساز بجاتی لڑکی کے گال ایسے دہکا دے' اور بگھی لے کر گھر چھوڑ آنے والے لڑکے کو محظوظ کر دے...... ایسے غصے کی ناپسندیدگی پر...... چچ چچ......

"میرا بازو چھوڑتے ہو یا نہیں...... تم کون ہو...... کیوں روک رکھا ہے مجھے۔" غصہ اور مزید غصہ......

"اوہ...... کیا تمہیں نظر نہیں آرہا کہ میں آسکر ہوں...... وہ دیکھو...... دور...... کیچڑ سے آگے تمہارا ساز اور تمہارے جگنوؤں نے میری بگھی الٹ دی اور میں گر کر درخت سے ٹکرا گیا...... کیا تم اسی لیے راتوں کو جنگلوں میں بھٹکتی ہو تاکہ تم مجھ جیسے اجنبیوں کو گرا کر مار سکو...... کیا انسانیت سے کبھی تمہارا کوئی واسطہ نہیں رہا۔"

لڑکی نے ایک لحظے کے لیے اپنا بازو آزاد کرانے کی کوشش ترک کر دی اور وہ آسکر کو دنگ دیکھتی رہی۔ جبکہ اپنی پشت پر گھوڑوں کی اچانک آمد سے آسکر ڈر سا گیا اور لڑکی کا ہاتھ چھوڑ بیٹھا۔ آسکر کے ایسے یک دم ڈر جانے سے لڑکی بے ساختہ ہنس دی' پھر اپنے قہقہے کو بھی نہیں روک سکی۔ بے طرح ہنستے' اپنی فراک کے گھیر کو جنگل کی ہوا کے سپرد کرتے گاؤں کی سمت بھاگ گئی......

اور آسکر...... اس نے کچھ دیر تک آس پاس کا جائزہ لیا اور یہ جان کر کہ یہاں وہی ہوا ہے جو اس نے ابھی ابھی دیکھا ہے تو اس نے مسکراتے ہوئے بلند آواز میں کہا...... "کوئی بتائے گا مجھے' میں خواب دیکھ رہا ہوں یا نیند میں چل رہا ہوں؟"

دونوں حسوروں میں مجھے جگایا نہ جائے۔ سونے دیا جائے۔۔۔ خواب دیکھنے دیا جائے۔۔۔۔

☼ ☼ ☼

جان ایسے اچانک رات کو اس کی آمد پر حیران رہ گیا تھا۔ یہ بھی نہیں پوچھ سکتا تھا کہ آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی کہ وہ گھر کو اس کی رہائش کے لیے تیار کر دیتا۔ کھانے کے نام پر ملنے والے بچے کچھے سوپ کو پی کر جب وہ بستر پر ڈھیر ہونے لگا تو اس نے روشنی گل کرتے جان کو روک لیا۔

"گاؤں میں کچھ پُر اسرار لوگ رہتے ہیں۔۔۔ ہیں نا؟"

"کیوں نہیں۔۔۔ چھ عدد خوفناک جادوگر، تین مکار جادوگرنیاں، کچھ بدروحیں اور چند سو بونے۔۔۔ بس۔۔۔"

آسکر نے قہقہہ لگایا اور سو گیا۔

رات بھر گاؤں کی سبز گھاس سے جگنو لپٹے رہے۔ جنگل کے راستوں پر ساز کی دھنیں بکھرتی تھمتی رہیں اور وہ سوتا رہا، سوتا رہا۔

☼ ☼

اپنی فراک سمیٹ کر ماریہ کھڑکی کے راستے اپنے کمرے میں کود گئی۔ الوا اور کیتھی دونوں اپنے اپنے بستر پر سو رہی تھیں۔ اپنے کمرے میں انکل ولسن اور آنٹی بھی سو ہی رہے ہوں گے۔ ماریہ نے اپنا ہیٹ اتار کر الماری میں رکھا اور اپنے ساز کو مخمل کے پاؤچ میں ڈال کر اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ یہ ساز کچھ دیر تک اس تکیے کے نیچے رہنے والا تھا، پھر وہ اس کے ہاتھ میں آجانے والا تھا، ہاتھ سے وہ گال کے نیچے رکھا جانے والا تھا۔ اپنی ٹانگیں موڑ کر، اپنے ہاتھوں کو اپنے گال کے نیچے رکھ کر، وہ آنکھیں بند کر کے سونے لگی تو۔۔۔۔

"تم بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتیں، میں اس جنگل کو تمہارے جادو سے آزاد کرا کر ہی رہوں گا۔" اس کے کانوں میں گونجنے لگا اور وہ مسکرا دی اور پھر۔۔۔۔

رات بھر مخمل میں لپٹا ساز بجتا رہا، جانوروں کے باڑے کی بھیڑیں، اجنبی گھوڑوں کی ٹاپوں کو خوش آمدید کہتی رہیں اور وہ سوتی جاگتی رہیں، سوتی جاگتی رہی۔۔۔ ماریہ جادوگرنی۔۔۔۔

☼ ☼ ☼

صبح، دن کے ساتھ طلوع ہوئی۔ اس کا ارادہ جلدی اٹھ کر گاؤں کی سیر تھا لیکن وہ سوتا رہ گیا۔ کچن سے اسے کافی شور سنائی دے رہا تھا۔ جب وہ کھانے کے کمرے میں آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا گھر کئی طرح کے افراد سے بھر گیا ہے۔

"جان، اس کی بیوی، اس کے چھوٹے بڑے، سب ہی بچے، طرح طرح کے کاموں میں مصروف تھے۔ کوئی کھڑکیاں صاف کر رہا تھا، کوئی ناشتے کی میز کا میز پوش بدل رہا تھا۔ گلدان میں پھول سجا رہا تھا، فرش چمکا رہا تھا، کوئی پانی بھر کر لا رہا تھا۔ باہر باغیچے میں بھی اسے چند لوگ کام کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ گھاس کو تراشا جا رہا تھا اور باغیچے کی باڑھ سے لپٹی بیل کی کانٹ چھانٹ ہو رہی تھی۔

"جان! خود کو اتنا ہلکان نہ کرو۔۔۔۔ مجھے صفائی پسند ہے لیکن اتنی نہیں کہ وہ ننھے منے بچوں کو تھکا دے۔"

جان اور اس کے سب بچے مسکرا دیے۔ بچوں سے کچھ دیر بات چیت کے بعد وہ ناشتہ کرنے لگا اور پھر اپنے گھوڑوں کے پاس آیا جو اس سے کافی خفا لگ رہے تھے۔

"نئی جگہ پر تمہیں لانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم نئے نئے انداز سے مجھ سے ناراض ہو۔ سمجھے۔ چلو گاؤں گھومتے ہیں اور مس لائٹ بگ کو ڈھونڈتے ہیں۔" گھوڑے پر سوار ہو کر جب وہ گاؤں کی طرف جا رہا تھا تو جان بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔

"آپ دوپہر اور رات کے کھانے میں کیا کھائیں گے؟"

"جو تم کھلا دو۔۔۔۔"

"گراس سوپ چلے گا؟ جلے ہوئے، میرا مطلب بھنے ہوئے آلو ودھ چکن بون ساس؟" کہتے جان کے

سب ہی دانت نظر آنے لگے۔

سیاہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے لگاموں کو ہاتھ میں لیے اس نے گردن کو نیچے جان کی طرف جھکا کر کہا۔

"ماؤنٹ کے سامنے دوبارہ کبھی یہ مینونہ دینا' ورنہ اس کی پچھلی اور اگلی دونوں ٹانگیں اٹھنے میں وقت نہیں لیں گی۔"

جان، ہی ہی کرتے ہوئے پوچھنے لگا "کیا آپ کا گھوڑا حس مزاح نہیں رکھتا؟"

"حس مزاح رکھتا ہے۔ اسی لیے تو ٹانگیں اٹھا دیتا ہے۔" لگام کو جھٹکا دے کر مسکراتے ہوئے آسکر گھوڑے کو آگے لے گیا۔

کافی دیر تک وہ گاؤں میں گھومتا رہا۔ دادا مسٹر جیمز ہیگ جب تک زندہ رہے وہ ہر سال گرمیوں میں یہاں آیا کرتے تھے۔ پاپا بھی کبھار ان کے ساتھ آجایا کرتے تھے جبکہ باقی سب اس چھوٹے سے گاؤں کی نسبت ایڈن برگ فارم ہاؤس جانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس کی بہنیں جوزفین اور روزا ایک بار اپنی سہیلیوں کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔ جوزفین نے گھوڑے سے گر کر اپنا گھٹنا زخمی کرلیا۔ بس پھر وہ اس گاؤں سے اتنی نالاں ہو گئی کہ نہ کبھی خود آئی نہ 'آسکر اور روزا کو یہاں آنے دیا۔

گاؤں ویسے کا ویسا ہی تھا۔ البتہ کچھ لوگ جو پہلے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ اب وہ بڑے ہو چکے تھے۔

"کیا دس سال پہلے مس لائٹ بگ کو بھی میں نے یہیں دیکھا ہوگا۔" اس نے دس سال پہلے کے اپنے ایک دن کے قیام کو یاد کرنا چاہا' جس میں گرینڈ پا اسے گاؤں میں لے کر گھومتے رہے تھے۔ وہ لمبی گھاس میں کھیلنے والے بچوں کے ساتھ کچھ دیر کھیلتا رہا تھا۔ وہ لوگ درختوں پر بھی چڑھتے رہے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ اپنی پینٹنگ پر کام کرتا رہا۔ اس کے عین سامنے جنگل تھا۔ کچھ دور ایک چھوٹی سی جھیل تھی جس کے کنارے بیٹھے بچے جھیل سے اٹکھیلیاں کررہے تھے۔ جھیل کے اطراف گھاس کے قطعات گاؤں کے پھیلاؤ تک جاتے تھے۔ دور مسٹری کے باڑے کی بھیڑیں اسے یہاں سے بھی دکھائی دے رہی تھیں۔

"دس سال پہلے مجھے بھیڑیں نامعقول کیوں لگی تھیں۔" برش کو روک کر آسکر نے سوچا۔ "اور اب یہ مجھے اتنی معقول بلکہ قابل قبول کیوں لگ رہی ہیں؟ گرینڈ پا ٹھیک کہتے تھے 'زندگی کی ابتدا جاننا چاہتے ہو تو کسی گاؤں میں قیام کرو' اگر اس پر اعتبار چاہتے ہو تو بھی۔ مجھے دونوں ہی صورتوں کے لیے یہاں قیام کرلینا چاہیے۔" اسٹروک لگاتے آسکر نے سوچا۔

رات کو کھانے کے بعد اس نے جان کو روک لیا۔

"کیا گاؤں میں کوئی ایسی لڑکی رہتی ہے جو کوئی ساز بجاتی ہے اور بہت سے جگنوؤں کو اکٹھا کرلیتی ہے؟"

"گاؤں میں جگنو بہت ہیں خاص کر جنگل میں.... وہ کہیں بھی آسکتے ہیں...."

"میں لڑکی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں' مسٹر جان....!"

"لڑکیاں بھی بہت ہیں گاؤں میں.... مسٹر آسکر ہیگ....!"

"اب مجھے معلوم ہوا کہ گرینڈ پا یہ کیوں کہتے تھے کہ اگر گاؤں سے کچھ چیزوں کو نکال دیا جائے تو وہ جنت نظیر ہوسکتے ہیں۔ ان کچھ چیزوں میں سے ایک تم بھی ہوگے...."

"نہیں مسٹر آسکر ہیگ! وہ میں نہیں ہوں' وہ تو وہ اجنبی ہیں جو گاؤں کے لوگوں کی سادگی کا مذاق اڑاتے ہیں' انہیں بدھو سمجھتے ہیں۔ دوم وہ راستہ ہے جو انہیں گاؤں تک لاتا ہے' سوم وہ گھوڑے جن پر بیٹھ کر وہ آتے ہیں۔"

آسکر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ "میں اجنبی نہیں ہوں۔ دوم بدھو میں، صرف تمہیں سمجھتا ہوں' سوم مجھے کافی پینے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟"

جان ہنس دیا اور کافی لینے چلا گیا۔ آسکر اٹھ کر کھڑکی تک گیا اور دور جنگل کو دیکھنے لگا۔ آج جنگل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور وہاں روشنی کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا۔ "جنگل کس قدر اداس اور اکیلا لگ رہا

ہے۔" آسکر زیرِ لب بولا۔

اگلے دن وہ صبح ہی صبح اٹھ گیا تاکہ بے تھیوون موسیقار کی طرح قدرت میں کھو کر اس سے کچھ اخذ کر سکے جیسے اس نے اپنی لازوال دھنیں تخلیق کی تھیں۔ وہ بھی کچھ باکمال پینٹنگز تخلیق کر سکے۔ لمبی گھاس پر اپنا سامان رکھ کر وہ پینٹنگ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ اسے بار بار شدت سے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ اپنے کام میں بری طرح سے مصروف ہے۔ یہ نشانی تھی اس کامیابی کی جو ایک بڑے مصور کے نصیب میں لکھی جانے ہی والی تھی۔

"اوہ! میں اپنے کام میں کس قدر غرق ہوں۔" وہ گاہے بگاہے خود کو یاد دلاتا بلکہ داد دیتا رہا۔ رات میں بھی کچھ وقت وہ اس تصویر پر کام کرتا رہا تھا۔ اس نے اپنا ایزل کھڑکی کے قریب رکھ لیا تھا اور جنگل کو نظروں میں رکھے وہ تصویر پر کامیابی سے کام کرتا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس پینٹنگ کو دیکھ کر پاپا اس کے فن کے بارے میں اپنا خیال بدل دیں گے۔

"وہ مجھے ایک عظیم آرٹسٹ مان لیں گے۔" اس نے یہیں تک خود کلامی کی تھی کہ ڈھیر سارا پانی اس عظیم تخلیق پر آکر پھیل گیا۔ وہ بدک کر پیچھے ہوا اور غصے سے پیچھے مڑا، وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس کے پیچھے لکڑی کا ڈول دونوں ہاتھوں میں لیے مس لائٹ بگ کھڑی اس کی تخلیق کو سراہ رہی ہیں... اوہ برباد کر رہی ہیں... نہیں برباد کر چکی ہیں...

"تم نے میری بنائی ہوئی تصویر پر پانی پھینک دیا..." شدت غم سے اس کی آواز، صرف آواز نہ رہی۔

"میں نے اپنی تصویر پر پانی پھینکا ہے۔"

آسکر نے دو تین بار منہ کھولا کہ وہ اسے کچھ کہہ سکے، لیکن ایسے نادر شاہکار کے اس طرح ضیاع پر الفاظ اس کے منہ سے نکلے ہی نہیں۔ اسی دوران وہ آگے بڑھی اور ہاتھ سے پینٹنگ کے بچے کھچے حصے بھی برباد کر دیے اور سارے رنگوں کو مسل دیا۔ آج جو اس نے ہیٹ پہنا تھا وہ اس کے سر پر اتنا زیادہ فکس تھا کہ لگتا تھا اسے کیلوں سے سر پر ٹھونک دیا گیا ہو۔ ہیٹ کا ربن اس کی ٹھوڑی پر ایسے بندھا تھا جیسے ٹھوڑی کو گرنے سے بچانے کے لیے سہارا دے رہا ہو۔ ایسی سادہ اور گنوار زیبائش پر آسکر بعدازاں ہنسنے کے لیے تیار تھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا مس بگ؟" تصویر مکمل طور پر برباد ہو گئی تو وہ یہ کہنے کے قابل ہو سکا۔

"تم کون ہوتے ہو اس طرح میری تصویر بنانے والے؟"

"یہ تمہاری تصویر نہیں ہے۔ یہ جنگل میں ملنے والی ایک جادوگرنی کی تصویر ہے جو اپنے جادو سے جگنوؤں سے رقص کراتی ہے۔"

"میں جادوگرنی نہیں ہوں۔" اپنی آواز کو اس نے بلند ہونے سے روکا۔

"پھر تم نقل کرنے والی ہو۔ تمہیں پائیڈ پائپر کی نقل کرتے ہوئے شرمندہ ہونا چاہیے۔"

"پائیڈ پائپر آف ہیملن؟ اوہ! لیکن وہ تو پائپ بجاتا تھا۔ اس کی خدمات چوہوں کو شہر سے دور لے جانے کے لیے حاصل کی گئی تھیں جبکہ میں کسی خدمت پر مامور نہیں ہوں۔"

"تمہیں ننھے جگنوؤں کو پریشان کرنے سے باز رہنا چاہیے۔ اگر تم خود چین کی نیند نہیں سونا چاہتیں تو تمہیں جگنوؤں کی نیند کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"اگر تم اپنی تخلیقی قوت اجاگر نہیں کر سکتے تو تمہیں حقیقی مناظر کی نقل سے باز رہنا چاہیے۔"

"میں پھر سے ایسی پینٹنگ بنا لوں گا مس لائٹ بگ۔ میں نے جنگل میں ایک منظر دیکھا اور میں اسے کینوس پر لانے کا پورا پورا حق رکھتا ہوں۔"

"دوسروں کے راز کو افشا کرنے کا حق تمہارے پاس نہیں ہے۔"

"میں ایک مصور ہوں، شاہی محل کا ملازم نہیں، جو کئی رازوں کو کندھے پر اٹھائے پھرتے ہیں۔"

اپنی بات کو ٹھیک طرح سے سمجھا نہ پانے کی ناکامی سے ماریا کتنی ہی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے

ہونٹ کپکپا گئے اور اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔
پانی کا خالی ڈول ہاتھ میں جھلاتے وہ بھاگنے لگی۔۔۔ لمبی سبز گھاس پر اگے سرخ چھوٹے پھولوں سے ہو کر گزرتی ہوا کی سرسراہٹ اور اس کی سفید فراک کی پھڑپھڑاہٹ نے اسے کینوس پر لانے کے لیے ایک اور منظر کا عکس دیا۔

"فلائٹ بگ! میری بات سنو... رکو...." وہ اس کے پیچھے بھاگا' لیکن وہ رکی نہیں اور اسے پھر سے اس کا بازو پکڑ کر روکنا پڑا۔

"میں دوبارہ یہ تصویر نہیں بناؤں گا۔"

"کسی کو یہ بھی نہیں بتاؤ گے کہ تم نے مجھے جنگل میں دیکھا... رات کو...."

"کیا تم یہ چھپانا چاہتی ہو....؟ ٹھیک ہے نہیں بتاؤں گا' لیکن کیا تم مجھے پھر سے جگنوؤں کا رقص دکھا سکتی ہو؟"

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ "کیسا رقص.... کون جگنو؟"

"میں نئے سرے سے راز افشا کرنے جارہا ہوں...." وہ اپنے کینوس کی طرف بڑھا۔

"اوہ یعنی کہ بورشے.... میں تیار ہوں...." ماریا سادگی سے مسکرادی۔

☼ ☼ ☼

"یہ ساز میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔" وہ جنگل میں ماریا کے آنے سے کافی دیر پہلے آگیا تھا جبکہ وہ بہت بعد میں آئی تھی۔

"یہ میرے پاپا نے مجھے دیا تھا.... یہ انہوں نے خود بنایا تھا۔"

"کیا وہ موسیقار تھے؟"

وہ ہنسی۔ "نہیں' وہ تو جہاز راں تھے۔ مسٹر البرٹ رائٹ۔ جب میں دو سال کی تھی تو چند جگنوؤں کو دیکھ کر تالیاں بجانے لگی اور دیوانہ وار ان کے پیچھے بھاگنے لگی۔ یہ بات انہیں کبھی نہیں بھولی کہ جگنو مجھے خوش کرتے ہیں بلکہ دیوانہ کر دیتے ہیں۔"

"تو کیا انہوں نے کوئی جادو دیکھا اور یہ ساز بنادیا۔"

"نہیں.... سمندر میں ایک جزیرے پر انہوں نے جگنوؤں کی بہتات دیکھی تو وہ مجھے یاد کر کے رونے لگے۔"

"تو یہ ساز مسٹر البرٹ رائٹ کو اس جزیرے سے ملا؟"

"ایسا بھی نہیں ہوا... جن درختوں اور پودوں کے گرد جگنو جمع ہو رہے تھے۔ انہوں نے ان ہی درختوں کی لکڑی سے اسے بنانا شروع کیا۔ وہ سفر کے دوران فلوٹ بجایا کرتے تھے۔ پہلے انہوں نے فلوٹ کے ساتھ کچھ تبدیلیاں کرنی چاہیں تاکہ فلوٹ کی آواز سے جگنو کھنچے چلے آئیں' لیکن وہ ناکام رہے۔ آخر کار وہ ایک نیا ساز بنانے میں کامیاب ہو گئے.... یہ ساز.... یہ دیکھو' یہ ہاتھ کی ہتھیلی میں سما جاتا ہے۔ ایک ہاتھ سے پکڑ کر بھی اسے آسانی سے بجایا جاسکتا ہے۔ یہ اس کا بڑا سوراخ ہے' اور یہ دو چھوٹے۔" ماریا نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ساز سامنے کیا۔ "وہ اسے بورشے کہنے لگے۔"

"بورشے.... یہ کسی ساز کے نام کے بجائے کسی شہر کا نام لگ رہا ہے۔" وہ ہنس دیا۔

"شاید ایسا ہی ہو۔ ایک جہاز راں لفظوں کی گہرائی میں نہیں جاسکتا کیونکہ وہ تو سمندر کی گہرائی کو جانتا ہے۔" ماریا کو آسکر کی ہنسی مذاق اڑاتی ہوئی لگی۔

"میرے انداز نے تمہیں تکلیف دی ماریا....!"

"جب کوئی اپنی کسی پیاری چیز کے بارے میں بات کر رہا ہو تو اس پر اعتراض کا نکتہ نہیں اٹھاتے۔" کہہ کر وہ جانے لگی۔ وہ اپنا ارادہ بدل چکی تھی۔ بورشے کو اس نے اپنی فراک کی جیب میں رکھ لیا تھا۔

"اگر تمہاری جگہ مسٹر البرٹ رائٹ ہوتے تو وہ یقیناً" میرے لیے خوشی سے بورشے بجاتے۔ وہ مجھے معاف بھی کر دیتے۔" وہ رک گئی' مسٹر البرٹ کے نام نے شاید اسے جذباتی کر دیا تھا۔

"کیا مسٹر البرٹ بھی جگنو اکٹھا کیا کرتے تھے؟"

"انہوں نے کوشش کی تھی' لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ وہ بورشے سے کوئی دھن نہیں بنا سکے

تھے۔ جس وقت وہ مجھے یہ دے کر گئے اس کے بعد وہ دوبارہ واپس نہیں آسکے تھے۔ انہیں اسی جزیرے میں دفنا دیا گیا تھا جہاں بورشے بنانے کا خیال انہیں آیا تھا۔"

مسٹر البرٹ رائٹ کی موت کے تذکرے پر کچھ دیر آسکر خاموش رہا۔ "پھر تم نے یہ دھن کیسے سیکھی؟"

"ایسے....." ماریا نے بورشے کو منہ سے لگالیا اور الٹے پیروں آسکر سے دور جانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ اور اس کا بورشے دونوں ہی آفاقی تھے۔ وہ اتنی محویت اور خوش دلی سے بجارہی تھی کہ اسے لگا اگر وہ یہ کام ایسے ہی کرتی رہی تو جگنوؤں کے سنگ ستارے بھی آنے لگیں گے۔

آہستہ آہستہ جگنو دکھائی دینے لگے۔ بڑھتے بڑھتے وہ زیادہ ہوتے گئے۔ وہ اس کے گرد دائرہ بنانے لگے۔ اب وہ دھن کو بدل رہی تھی۔ دھن بدلتے ہی اس کے گرد بننے والا دائرہ کئی دائروں میں بٹ گیا۔ کچھ ہی دیر میں یہ دائرے چھوٹے چھوٹے کئی اور دائروں میں تقسیم ہونے لگے۔

وہ اس سارے منظر میں موجود تھا پھر بھی اسے گمان تھا کہ وہ کسی خواب کی کڑی میں ہے۔ وہ جو واقعی وہاں موجود تھی۔ وہ بہت مصروف بہت مگن تھی۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ کوئی آسکر ہیگ وہاں موجود ہے۔ اس کے باپ نے ایک ساز بنایا تھا۔ وہ اس ساز کو ناکام ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مسٹر البرٹ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسا کرسکے گی۔ وہ ایسا ہرگز نہ کرپاتی اگر وہ اسی جزیرے میں دفن نہ ہوتے جہاں سے یہ بورشے آیا تھا۔

"اگر تم ایک بھی جگنو کو لانے میں بھی کامیاب ہوگئیں تو سمجھ لینا کہ وہ جگنو میں ہی تھا۔"

ماریا نے مسٹر البرٹ کے الفاظ کو ہمیشہ یاد رکھا۔ وہ سات سال کی تھی جب وہ پہلا جگنو لانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اس کی عمر کے ساتھ ساتھ جگنوؤں کی تعداد بڑھتی گئی اور ایک رات اس نے اتنے جگنو اکٹھے کرلیے تھے کہ وہ انہیں دیکھ کر بے ہوش ہوگئی تھی۔

یہ رات ایوا کی سالگرہ کی رات تھی۔ مسٹر اینڈ مسز ولسن کی سب سے لاڈلی بیٹی کی سالگرہ کی رات۔ جس وقت وہ سب بچوں کے ساتھ گھر کی باڑھ کے پاس بیٹھی کیتھی کا وائلن سن رہی تھی' اس وقت اسے خیال آیا کہ اسے بھی اپنے ساز کی رونمائی کرنی چاہیے۔ ایوا کی سالگرہ کے نام' ایک دن اسے بھی بجانا چاہیے۔

بورشے کو اپنی جیب سے نکال کر وہ باڑھ کے کنارے کنارے گھومتے اسے بجانے لگی۔ اس کی محویت کا یہ عالم تھا کہ وہ یہ تک نہیں دیکھ سکی کہ کچھ بچے ڈر کر وہاں سے بھاگ گئے تھے' کچھ خوشی سے اچھل رہے تھے اور کچھ منہ کھولے جگنوؤں کی فوج' کو باڑھ کے گرد آتے اور ماریا کے ساتھ ساتھ سفر کرتے دیکھ رہے تھے۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے اطراف دیکھا تو اس کے اپنے ہوش جاتے رہے۔

اس رات کے بعد اس کے بورشے بجانے پر پابندی لگادی گئی۔ کچھ رشتے دار جو پہلی بار وہاں آئے تھے انہوں نے دیر تک ماریہ کو زیر بحث رکھا' لیکن وہ پھر بھی چھپ کر اسے بجاتی رہی۔ ایک رات چند اجنبیوں نے اسے دیکھ لیا اور انہوں نے گاؤں والوں سے استفسار کیا کہ کیا وہ جادوگرنی ہے۔

"یہ ایک ساز ہے انکل ولسن..... آپ جانتے ہیں یہ میرے لیے کتنا خاص ہے۔"

"یہ صرف ایک ساز نہیں ہے ماریہ..... کیا تم چاہتی ہو کہ تم جادوگرنی کے نام سے جانی جاؤ۔"

"مجھے پروا نہیں کہ لوگ کیا کہتے ہیں..... کیسی افواہیں پھیلاتے ہیں....."

"افواہیں بدنصیبی بن جایا کرتی ہیں ماریہ..... مت بھولو کہ جادوگرنیوں کو زندہ جلادیا گیا تھا....."

"یہ کوئی جادو نہیں ہے انکل.....!"

"یہ ان کے لیے جادو ہی ہے جو اس سے انجان ہیں۔"

"کیا میں اسے کبھی نہ بجاؤں.....؟"

"تم پیانو بجالیا کرو' کیتھی سے وائلن سیکھ لو....."

"اور بورشے؟"

”بورشے کو سنبھال کر رکھو۔ یہ البرٹ کی نشانی ہے۔“ انکل ولسن نے دوٹوک کہا۔

مسٹر البرٹ رائٹ کی نشانی کو وہ چھپا کر نہیں رکھ سکی، بلکہ خود چھپ کر جنگل میں آجایا کرتی۔

”تمہیں جنگل سے ڈر نہیں لگتا؟“ جب وہ اس کے گھر کے پاس پہنچ گئے تو آسکر نے ماریا سے پوچھا۔

کھڑکی کو آہستگی سے کھول کر، اس میں سے کود کر ماریا نے گردن موڑ کر آسکر کو دیکھا۔ ”کون سا جنگل؟“

آسکر مسکرا دیا اور پلٹ کر جانے لگا۔

”مجھے صرف اس بات سے ڈر لگتا ہے کہ مجھ سے بورشے چھین لیا جائے گا۔ بورشے مجھ سے دور ہو جائے گا۔“ اس نے گردن کھڑکی سے باہر نکال کر سرگوشی میں کہا اور کھڑکی بند کردی۔

”مجھے بھی اسی بات سے ڈر لگنے لگا ہے کہ تم سے تمہارا بورشے نہ چھین لیا جائے۔ وہ تم سے دور نہ کر دیا جائے۔“ اس کی بند کھڑکی کو دیکھ کر وہ اپنے گھر لوٹ آیا۔ کرسی پر بیٹھا جان اونگھ رہا تھا۔ اس کے بے آواز قدموں کی چاپ پر بھی وہ چونک گیا۔

”آپ کہاں گئے تھے؟“ جان نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

”جنگل کی سیر کرنے....“

”رات کے اس پہر.... سیر کرنے؟“

”میں یہ دیکھنے گیا تھا کہ جنگل رات کو سوتا ہے یا نہیں....“

”کیا وہ سویا ہوا ملا....؟“

”نہیں.... وہ محور قص ملا....“ اپنا ہیٹ اتار کر اس نے جان کے سر پر رکھا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

راہداری کی موم بتیاں گل کرتے ہوئے جان منہ ہی منہ میں گنگنا اٹھا.... بورشے.... بورشے.... بورشے....

☆ ☆ ☆

اگلے دن وہ مسز فلورا کے باغیچے میں انگور توڑ رہی تھی جب آسکر اپنے گھوڑے پر آیا۔

”کیا تم کسی کے انگور چرا رہی ہو؟“

”ہاں! کیا تم مجھے پکڑوانا چاہتے ہو....؟“

”نہیں! میرا خیال ہے، مجھے بھی تمہارے ساتھ مل کر چوری کرنی چاہیے....“ وہ گھوڑے سے کودا۔

”تین چور پہلے ہی ان بیلوں کے پیچھے موجود ہیں۔“ مسز فلورا ہنستے ہوئے انگور کی بیل سے باہر نکل آئیں۔ ساتھ ہی ماریا کی چچا زاد بہنیں ایوا اور کیتھی بھی۔ اس نے بھی ہاتھ میں ایک ٹوکری پکڑلی اور انگور توڑنے لگا۔

”مسٹر آسکر! ہم میٹھے انگور کھانا چاہتے ہیں، کھٹے نہیں۔“ مسز فلورا نے آسکر کی ٹوکری کی طرف سر جھکا کر کہا۔

وہ ماریا کے قریب ہو کر پوچھنے لگا۔ ”پہلے خوشے سے انگور توڑ کر چکھوں کہ کون سا میٹھا اور کون سا کھٹا ہے پھر خوشے کو توڑوں....؟“

ماریا سے پہلے انگور کے پتوں میں چھپی ایوا کھلکھلا کر بولی۔ ”آپ سب انگور کھا جائیں گے تو ٹوکری میں کیا بچائیں گے....؟“

آسکر نے بے چارگی سے ماریا کی طرف دیکھا جو انگور کے خوشے تک جاتی، سونگھتی اور پھر توڑتی۔

اس نے اس کی ٹوکری سے انگور نکال کر کھائے۔

”یہ سب میٹھے ہیں، لیکن تمہیں کیسے پتا چلتا ہے کہ یہ میٹھے ہیں؟“

ماریا ایک اور خوشے کے قریب ہوئی اور پھر یک دم اسے توڑ کر ٹوکری میں رکھ لیا۔ ”ایسے....“ اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ وہ بھی مسکرانے لگا اور اپنی ناک کو خوشوں تک بلند کرنے لگا۔

”میں دس سال پہلے گرینڈپا کے ساتھ یہاں آیا تھا تو یہ گاؤں مجھے اتنا اچھا نہیں لگا تھا جتنا یہ اب لگ رہا ہے۔“

”شاید اب آپ عقل مند ہو گئے ہیں۔“ کیتھی نے بیلوں کے جھنڈ میں سے سر نکال کر کہا۔

”ہمارے گاؤں کو ناپسند کرنے کی کوئی ایک وجہ تو بتائیں مسٹر آسکر؟“ انگوروں سے بھری ٹوکری لے کر

ایوا سامنے آکر بیٹھنے لگی۔ مسز فلورا اور ماریا بھی اپنا ہاتھ روک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے باری باری چاروں خواتین کو دیکھا۔

"ناپسند کرنے کی وجہ تو اب یاد نہیں، لیکن پسند کیے جانے کی وجہ معلوم ہے۔" ....بورشے...."

ماریا سہم سی گئی۔ ایوا، کیتھی اور مسز فلورا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر مسز فلورا نے اپنی انگلی ہونٹوں تک لے جاکر شش کہا۔ "اجنبی بورشے کے بارے میں بات نہیں کرسکتے۔"

"میں اجنبی نہیں ہوں۔ یہ میرے گرینڈپا کا گاؤں ہے۔ میرا بھی گاؤں ہے۔"

"ناشائستہ اجنبی بورشے کو تماشا سمجھتے ہیں اور شائستہ اجنبی اسے محض ایک نمائش قرار دیتے ہیں۔" انہوں نے مزید کہا۔

"بورشے تماشا یا نمائش ہرگز نہیں.... یہ تو وہ ساز ہے جو روشنیاں اکٹھی کرتا ہے۔"

اس دوران ماریا انگوروں کی بیل میں گم ہو گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس نے برا مانا ہے۔ اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ اس نے غلط کیا، وہ جان گیا۔ وہ اپنی ٹوکری لیے ماریا کو انگور کے پتوں کو ہاتھ سے پرے کرتے ڈھونڈنے لگا، لیکن نہیں ڈھونڈ سکا۔ جب بیلیں اسے الجھانے میں کامیاب ہو گئیں تو اس نے اتفاق سے ماریا کو بیل سے نکل کر باہر جاتے دیکھ لیا۔ وہ سخت ناراض تھی، اس کی ناراضی اس کے ہیٹ کے گلابی ربن کے ارتعاش سے ظاہر تھی۔ اس کی کمر کا بے ضرر خم، کچھ نمایاں سا ہو گیا تھا۔

جب سب نے مل کر انگوروں کا رس نکالا اور ایوا اور کیتھی نے مل کر انگور کے خوشوں کو اپنے اپنے ہیٹ پر ٹکالیا تب بھی ماریا نے اس سے بات نہیں کی۔ بلکہ وہ اٹھی اور اپنی ٹوکری لے کر غائب ہو گئی۔ وہ جلدی سے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کا پیچھا کرنے لگا، لیکن وہ اسے نہیں ملی۔

"گاؤں والے ٹھیک کرتے ہیں، وہ اجنبیوں کو اپنے رازوں میں شریک نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں بڑے شہروں سے آنے والے گاؤں کے رازوں کو چھوٹا سمجھ کر بے نقاب کردیں گے۔"

رات کو کھانا کھانے کے بعد اس نے جان کو پھر سے اپنے پاس بٹھالیا۔ "جب ماریا ننھی سی بچی تھی اور بورشے بجاتی تھی تو تمہیں کیسا لگتا تھا۔"

جان نے چونک کر آسکر کو دیکھا۔ "آپ کا بستر ٹھیک کردوں یا آپ کام کریں گے؟"

"نہ مجھے کام کرنا ہے نہ سونا ہے۔ برائے مہربانی جان! میری بات کو ٹالو مت، ایسے نظرانداز نہ کرو۔"

جان نے گہرا سانس لیا۔ "ماریا ایک بہت پیاری بچی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اسے کوئی نقصان پہنچے۔"

"میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

"ایک بار سرکس کے کچھ لوگ اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ان کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگی۔"

"اوہ جان! میں وعدہ کرتا ہوں، اسے راز ہی رکھوں گا۔"

جان نے پھر سے گہرا سانس لیا۔ وہ ابھی بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔ "مجھے نیند آرہی ہے.... مجھے صبح جلدی اٹھنا ہوگا...."

"بورشے سے نکلی پہلی دھن کے لیے.... خدا کے لیے جان...."

"ہم سب کے لیے یہ معمول کی بات تھی کہ وہ بہت اچھا بورشے بجانے لگی ہے۔ اکثر شام کو بجاتی تھی۔ چند جگنو بھی آنے لگے تھے۔ سرِشام اس کا بورشے سننے کی ہمیں عادت ہو چکی تھی.... بس.... ایک رات اس نے اتنے زیادہ جگنو اکٹھے کرلیے کہ ہم سب حیران رہ گئے۔ مسٹر ولسن نے اسے منع کردیا اور ٹھیک ہی کیا۔"

"ٹھیک ہے جان! تمہارا شکریہ...."

جس وقت جان رات کے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں جا رہا تھا، ٹھیک اسی وقت آسکر اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر کود کر ماریا کے گھر کی

طرف جا رہا تھا۔ ماریا کے گھر کی باڑھ پھلانگ کر وہ اس کے کمرے کی کھڑکی کو ہاتھ سے بجانے لگا۔ کھڑکی فوراً کھل گئی اور اس نے غصے سے سر باہر نکالا۔

"انکل جاگ جائیں گے۔ مسٹر آسکر آپ کو یہ سب نہیں کرنا چاہیے۔ آپ میری زندگی مشکل کر رہے ہیں۔"

"مس ماریا! میں معافی مانگنے آیا ہوں.... آپ میری شرمندگی میں اضافہ کر رہی ہیں...."

"آج کی رات اس دنیا کی آخری رات نہیں ہے، آپ کل صبح تک انتظار کر سکتے تھے۔"

"لیکن جگنو صبح تک انتظار نہیں کریں گے.... میں شدت سے بورشے سننا چاہتا ہوں۔"

"بورشے آپ کا ملازم نہیں ہے جو آپ کے ہاتھ کی تالی پر بجے گا...."

"بورشے میری دوست کا ساز ہے جو میری درخواست پر ضرور بجے گا...."

کھڑکی کے پٹ سختی سے بند کر دیے گئے۔ سختی سے ہی ان پر دوبارہ دستک دی گئی۔

"میں سونا چاہتی ہوں...."

"میں بورشے سننا چاہتا ہوں ورنہ صبح تک یہاں کھڑا رہنا چاہتا ہوں۔" دونوں ہاتھ سینے سے نیچے مودبانہ باندھ کر آسکر نے کندھے اچکا دیے، جب کہ کھڑکی کو پھر سے بند کر دیا گیا۔

"میں شرمندہ ہوں۔" کھڑکی پر دستک دے کر اس نے پھر سے کہا۔

کھڑکی کھلی اور بورشے والا ہاتھ باہر آیا۔ "یہ لیں اور جا کر بجائیں۔" کھڑکی بند ہو گئی۔

بورشے کو ہاتھ میں لے کر وہ مسکرانے لگا اور ٹہلتے ہوئے بجانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے بورشے سے کچھ ایسی دھن نکالی کہ باڑے کی رکھوالی کرتے کتے زور زور سے بھونکنے لگے۔ رات کا پہلا پہر بیت گیا اور وہ دیر تک ادھر ادھر ٹہل کر کتوں کو اور زیادہ زور سے بھونکنے پر مجبور کرتا۔ پھر کھڑکی کے راستے ہی کمرے میں واپس آ کر بورشے کو تکیے کے نیچے رکھ کر سو گیا۔

آسکر دی ہیگ سفید بستر میں دھنسا سو رہا ہے اور یہ بھول رہا ہے کہ وہ یہاں ایک عظیم مصور بننے آیا تھا۔ اسے کچھ شاہکار تصویریں بنانی تھیں۔ تصویر تخلیق کرنا تھا، خیال میں کمال کرنا تھا، لیکن اب وہ بورشے کو تکیے کے نیچے رکھے سو رہا ہے۔ اس کے رنگ اور کینوس اور سب برش اسے دیکھ رہے ہیں اور وہ سو رہا ہے....

پہلے سے میٹھی نیند.... میٹھی سے میٹھی ترنیند....

اگلی صبح وہ اٹھا ہی تھا کہ جان اس کے پاس آگیا۔

"ماریا کافی دیر تک انتظار کرتی رہی.... وہ صبح سے پانچ چھ بار آچکی ہے۔"

آنکھیں مسلتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ "ماریا کی صبح کب ہوتی ہے جان، جو وہ اتنی سی صبح میں بھی پانچ چھ بار آچکی ہے؟"

"وہ کافی پریشان اور بے چین تھی۔"

"تبدیلی کے لیے کبھی کبھی پریشان ہو جانا چاہیے، اس سے نعمتوں کی قدر بڑھ جاتی ہے۔"

وہ جانتا تھا وہ کیوں پریشان اور بے چین ہے۔ کمرے میں واپس آکر اس نے اس کا بورشے چھپا دیا۔ تیار ہو کر وہ ٹہلنے کے لیے باہر آیا تو اسے دور سے ماریا اپنی طرف آتی ہوئی نظر آئی۔ جب کہ اسے دیکھتے ہی آسکر نے اپنا رخ بدل لیا اور تیزی سے دوسری سمت جانے لگا۔ اپنے پیچھے اسے ماریا کی آوازیں آرہی تھیں وہ اسے رک جانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ آسکر نے اپنی رفتار تیز کر لی۔ اسے ماریا اپنے پیچھے بھاگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بے اختیار اس نے اپنی مسکراہٹ کو روکا۔

بورشے.... بورشے.... بورشے....

"مسٹر آسکر! میں کب سے آپ کو رک جانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔" پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہوئی۔ اس کی نیلی فراک اور سفید ہیٹ ہوا میں اڑ رہا تھا۔ اس کی فراک کی سامنے کی جیب جس میں بورشے نامی چیز ہمہ وقت پڑی رہتی

تھی۔ خالی خالی سی تھی۔

"آہا ماریا.... کیوں رک جانے کے لیے کہہ رہی تھیں مجھے؟"

"میں ساری رات سو نہیں سکی.... میرا بورشے مجھے واپس کردیں....."

"لیکن وہ تو تم نے مجھے خود دیا تھا....."

وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ "مجھے وہ واپس کردیں...."

"کس لیے.... وہ تو؟ اب میرا ہے....."

"میں غصے میں تھی.... اب وہ مجھے واپس کردیں....."

"میں نے کل رات اسے کہیں رکھا تھا اور بھول گیا۔ جیسے ہی مجھے یاد آئے گا کہ کہاں میں دے دوں گا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا.... بورشے رکھ کر بھول جانے والی چیز نہیں ہے....." غصہ اس کے گالوں پر کھل کھل گیا۔

"بورشے سن کر بھول جانے والی چیز بھی نہیں ہے مس ماریا! اگر کوئی مجھے آج رات بورشے سنا دے تو شاید مجھے یاد آجائے کہ وہ کہاں رکھا ہے۔" اس نے کندھے جھٹک کر کہا۔

غصے سے ماریا کے گال اور سرخ ہو گئے اور وہ تیزی سے جانے کے لیے پلٹی۔ آسکر کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ تقریباً" بھاگ رہی تھی۔ آسکر بھی اس کے پیچھے بھاگا کیونکہ وہ اس کے گھر کی طرف جارہی تھی۔

جس وقت وہ گھر پہنچا وہ اس کے کمرے میں تن دہی سے بورشے ڈھونڈنے میں مصروف تھی۔ جان اسے باز رکھنے میں بری طرح سے ہلکان ہو چکا تھا لیکن وہ باز نہیں آرہی تھی۔ وہ کمرے کے دروازے میں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا ہو گیا۔ بورشے فی الحال اسے نہیں مل سکتا تھا کیونکہ وہ دیوار پر ٹنگی تصویر کے پیچھے تھا۔ اس تصویر کی طرف ماریا دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔

"انکل جان! مجھے میرا بورشے چاہیے۔" کمرے کو تہ و بالا کرنے کے بعد اسے خیال آیا کہ انکل جان سے پوچھ لینا چاہیے۔

"بورشے....؟" جان نے پہلے اس کی طرف پھر آسکر کی طرف دیکھا۔ آسکر نے تو فوراً" لاعلمی سے کندھے اچکا دیے۔

"ماریا! تم تو کسی کو بورشے کو ہاتھ لگانے نہیں دیتیں تو پھر وہ یہاں کیسے آگیا؟"

ماریا نے ایک تیز نظر آسکر پر ڈالی اور انکل جان کو یہ بتا نہ سکی کہ وہ اس نے خود ہی اسے دیا تھا۔ وہ پھر سے کمرے پر نظر دوڑانے لگی اور اس بار اس کی نظر میز پر رکھے ہوئے ان چند ڈبوں تک گئی جن میں رنگ تھے۔ جتنی تیزی سے اس نے ان ڈبوں کو کھولا اتنی ہی تیزی اور فراغت سے وہ ڈبے اپنے رنگ سمیت اس پر اچھلے۔ اور وہ کھڑی کھڑی.... سبز.... نیلی.... سرخ.... ہو گئی.... اس کی سوتی فراک پر کچھ غیر ارادی تصویریں ابھر آئیں اور اس کا بورشے تصویر کے پیچھے خاموشی سے چھپا اس تصویر کشی پر آنکھیں پٹ پٹانے لگا اور پھر وہ تینوں ایک ہی وقت میں ہنس دیے۔

جان.... بورشے.... اور آسکر.....

☼ ☼ ☼

انکل ولسن دیکھ رہے تھے کہ ماریا کس قدر بے چین ہو رہی ہے۔ وہ کبھی یہاں بیٹھتی کبھی وہاں۔ کچھ دیر پہلے وہ ان کے سامنے کتاب لے کر بیٹھی تھی، پھر وہ کتاب چھوڑ کر پیانو بجانے لگی تھی۔ اس نے پیانو کو اس انداز میں بجایا کہ ایوا کی فراک کے لیے پھول کاڑھتے آنٹ کے ہاتھ سہم کر تھم گئے۔ "ماریا ڈیئر.... تم یہ تکلیف نہ کرو.... مجھے پیانو سے پیار ہے.... میں اسے پیارا ہی رہنے دینا چاہتی ہوں۔"

انکل ولسن بے ساختہ ہنس دیے۔ "لیڈی ماریا اگر یہ پیانو ایسے ہی بجتا رہا تو امید ہے حکومت اس کے استعمال پر پابندی لگا دے گی۔"

ماریا ان سنی کرتے ہوئے پیانو بجاتی رہی۔ ایوا اور کیتھی اپنی ہنسی دبائے اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ "بورشے نہیں ملا؟"

"نہیں....." اس نے غصے سے کہا۔

"مسٹر آسکر ہمارے گاؤں میں مہمان ہیں ماریا! تمہیں انہیں معاف کردینا چاہیے تھا۔"

ماریا نے اور تیزی سے پیانو پر انگلیاں مارنی شروع کردیں کہ آنٹ تو اٹھ کر باہر ہی چلی گئیں اور انکل ولسن نے خود کو اس صورت حال سے لطف اندوز ہونے دیا۔ شام گزر گئی اور رات آگئی۔ ایوا سے اپنی مسکراہٹ چھپائے رکھنا مشکل ہوگیا تو رات کا کھانا کھاتے ہوئے اس نے میز کے نیچے سے ہاتھ لے جاکر ماریا کے ہاتھ میں آسکر کا دیا' رقعہ تھمایا۔

"بورشے ملنے کا پتا..... جنگل..... وقت..... رات۔"

انکار کی صورت میں' میرا گھوڑا' بورشے اور آئر لینڈ.....

ماریا نے رقعے کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ بورشے ملنے کا پتا" مردہ لاش۔" وقت' رات۔

دونوں مٹھیوں کو بھینچے ہوئے وہ تیز تیز جنگل کی طرف جارہی تھی۔ غصے کی زیادتی نے اسے دو بار الجھا کر گرا دینا چاہا تھا لیکن وہ اپنا غصہ کم نہیں کرسکی۔ جب وہ جنگل میں اس جگہ پہنچ گئی جہاں وہ کھڑی ہو کر بورشے بجایا کرتی تھی تو اسے وہاں کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ کچھ دیر تک وہ انتظار کرتی رہی پھر گھر جانے کے لیے واپس پلٹی اور ایک درخت' اوہ مسٹر آسکر سے ٹکرا گئی۔

"مجھے انتظار کرنے کی عادت نہیں ہے..... میرا بورشے کہاں ہے؟"

"مجھے انتظار کی عادت ہے..... میرے جگنو کہاں ہیں؟"

ماریا نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "تمہارے جگنو؟ وہ میرے جگنو ہیں سمجھے۔ صرف میرے ہیں وہ۔ تم ساری عمر بھی لگادو تو دو جگنو نہیں لاسکتے۔"

آسکر ہنس دیا۔ "میں تمہاری آنکھوں کے جگنوؤں کی بات کررہا ہوں۔ آج ان میں جگنوؤں کی جگہ چنگاریاں کیوں ہیں؟"

"مجھے بورشے واپس چاہیے....."

"مجھے جگنو....."

وہ غصے سے پیر پٹختی واپس جانے لگی تھی کہ پیچھے سے اسے بورشے بجنے کی آواز آئی۔ وہ بے اختیار پلٹی اور پھر بے ساختہ مسکرادی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بورشے کو اتنے بھونڈے طریقے سے بھی بجایا جاسکتا ہے۔ آسکر منہ بورشے سے لگائے ٹھیک اسی کے انداز کی نقل کرتے ہوئے بجا رہا تھا۔ اسی کی طرح گھوم رہا تھا' اسی کی طرح اپنی غیر حاضر فراک کو لہرا رہا تھا' ہیٹ کو بلند کررہا تھا۔ ماریا مسکراتے مسکراتے قہقہے لگانے لگی۔ پھر جب جنگل سے جھینگروں کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئی۔

"میں اسے کبھی بھی نہیں بجاسکتا ماریا! اس لیے تم ایک بار پھر سے میرے لیے اسے بجادو....." وہ اس کے قریب آیا اور بورشے کو اس کے آگے کیا۔

"اسے ہر وہ انسان بجاسکتا ہے' جو روشنی کو پانا چاہتا ہے۔"

آسکر نے ناسمجھی سے اسے دیکھا اور مسکرادیا۔ "تمہیں فلسفیوں جیسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

"انکل ولسن کہتے ہیں' روشنی ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو ہماری زندگی میں بہار کو قائم رکھتی ہے۔"

آسکر نے سر ہلادیا۔ "میں بھی اپنی زندگی میں بہار کو ہمیشہ قائم رکھنا چاہتا ہوں لیکن میں جانتا ہوں میں بورشے کبھی نہیں بجاسکوں گا۔ لائٹ بگ تو نہیں لیکن ریڈ بگ ضرور مجھے کاٹ کھائیں گے۔"

"آج میں ایک نئی دھن بجاتی ہوں۔"

"کیا آج جگنو نہیں آئیں گے.....؟"

"آئیں گے لیکن صرف تمہارے لیے....."

وہ درخت کی اوٹ میں ہوگئی اور جیسے اسٹیج ڈرامے سے پہلے گرے ہوئے پردے کو اٹھایا جاتا ہے' ایسے ہی درخت کو پیچھے کرکے وہ درمیان میں آکر کھڑی ہوگئی اور فراک کے ایک کنارے کو ایک ہاتھ میں پکڑ کر تھوڑا بلند کرلیا اور پیروں سے زگ زیگ بناتے' لہراتے' چلتے' پھدکتے' بورشے بجانے لگی۔ کچھ ہی دیر میں اس کے دوست آنے لگے۔ پہلے وہ

شاخوں پر ہی اڑتے رہے پھر وہ نیچے آئے اور آسکر کے سر پر بیٹھنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں آسکر وہ پہاڑ بن گیا جس پر جگنوں بسیرا کیے ہوئے تھے۔ ماریا اس کے گرد گھومتے، بورشے بجاتے اسے ہاتھ کے اشارے سے حرکت نہ کرنے کا کہہ رہی تھی۔ ایک بھی جگنو ماریا کی سمت نہیں بڑھا تھا۔ سب جگنو آسکر پر ڈھیر ہو گئے تھے۔ اور وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ ماریا کی دبی دبی شرارتی مسکراہٹ کو وہ آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ جان گیا کہ ماریا اس سے بورشے کو چھین لینے کا بدلہ لے رہی ہے۔

اس کے ایسے معصومانہ انتقام پر وہ سر کو خم دے کر رہ گیا اور ترچھی آنکھوں سے اسے فراک کا کونا ہاتھ میں پکڑ کر لہراتے دیکھتا رہا۔ جب ایک آخری جگنو بھی آسکر کی ناک پر آکر بیٹھ گیا تو...... "گڈ نائٹ مسٹر لائٹ بگ۔" ہاتھ لہرا کر وہ بھاگ گئی۔

مسٹر لائٹ بگ، جنگل میں سارے بگوں شگوں کو اپنے ساتھ لپیٹے کھڑا رہا۔ اور وہ مسکراتے رہے...... مسکراتے رہے...... بھلا کون......؟

جگنو...... جنگل...... اور آسکر......

☼ ☼ ☼

مسٹر بروک البرٹ خود تو نہیں آئے تھے لیکن روز اور جوزفین اپنی لاڈلی دوست ازابیلا کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے آ چلی تھیں۔

"آپ نے ہمیں یاد نہیں کیا؟" روز اس سے شکایت کر رہی تھی۔

"یہ بھی کوئی کرنے کا کام ہے......" وہ اپنی چھوٹی بہن کے گال پر چٹکی بھرے بنا نہیں رہ سکا۔

"تو یہ ہے وہ گاؤں، جسے ہمیں سزا دینے کے لیے تم نے چنا آسکر۔" اس کا جائزہ لینے کے بعد جوزفین نے کہا۔

"اگر یہ گاؤں سزا ہے تو میں اس سزا کو طویل کرنا چاہوں گا۔"

"آپ بات کو اپنے حق میں کرنا جانتے ہیں مسٹر آسکر۔" ازابیلا داستانوں میں لٹی اپنی نازک انگلیوں کو منہ پر رکھ کر ہنس دی۔

"ہم یہاں دو دن آرام کریں گے پھر آپ ہمارے ساتھ جائیں گے۔" روز نے اپنی بچکانہ سی آواز کو حکمیہ بنا کر کہا۔

آسکر ہنس دیا۔ "میں نے ایک بھی پینٹنگ نہیں بنائی روزا۔"

"اتنے دنوں سے آپ نے ایک بھی پینٹنگ نہیں بنائی؟ پاپا ٹھیک کہتے ہیں آپ صرف خواب دیکھتے ہیں، لیکن آپ ان کی تعبیر حاصل نہیں کر سکتے۔"

خلاف معمول آسکر نے اس طنز کو خوش دلی سے سنا اور جواب میں مسکرانے لگا۔ جوزفین نے غور سے اسے دیکھا جس کا خون اتنا گرم رہتا تھا کہ وہ پاپا کی ایسی باتوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"جگہ کی تبدیلی نے تم پر اچھے اثرات مرتب کیے ہیں آسکر...... تم مسکرائے جا رہے ہو۔" جوزفین کہے بنا نہ رہ سکی۔

شام کو وہ چاروں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر گاؤں دیکھتے رہے۔ روز اور جوزفین کی تو گاؤں کے بارے میں ابھی بھی وہی رائے تھی لیکن ازابیلا کو گاؤں کافی اچھا لگا۔ ویسے بھی اسے ہر وہ چیز اچھی لگتی تھی جو آسکر کو اچھی لگتی تھی۔ آسکر جس جس طرف دیکھ رہا تھا، وہ بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

راستے میں انہیں ایوا، کیتھی اور ماریا ملیں تو وہ فوراً گھوڑے سے کود کر ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے گھوڑے سے کودنے میں ایسی تیزی اور ان تینوں کے ہاتھوں کو آنکھوں تک لے جانے میں اتنی عجلت نمایاں تھی کہ جوزفین نے سختی سے لگام کو پکڑا اور ازابیلا نے ایک نظر ان تینوں کو دیکھ کر اپنی مسکراہٹ کو مدھم کر لیا۔ روز ابھی فوراً آسکر کے پیچھے گھوڑے سے اتر گئی اور ان تینوں سے تعارف حاصل کرنے لگی۔ جوزفین اور ازابیلا نے کچھ وقت لیا تعارف کی تکمیل میں۔ ایوا نے انہیں اپنے گھر پر چائے کی دعوت دی۔ جو روزا نے فوراً قبول کر لی۔

گھر واپسی پر جوزفین پر سوچ انداز سے آسکر کو دیکھتی رہی جبکہ ازابیلا کچھ بے چین سی رہی۔ دونوں ہی شام سے کوئی دس بار بہانے سے کہہ چکی تھیں کہ انہیں واپس چلے جانا چاہیے۔ فلاں رقص اور فلاں گھڑ دوڑ کا دن قریب آنے ہی والا ہے لیکن آسکر نے واپسی میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اس نے انہیں وہاں رکنے پر مجبور بھی نہیں کیا۔

☼ ☼ ☼

آسکر جانے کے لیے تیار نہیں تھا تو وہ بھی تیار نہیں ہوئیں۔ روزا کا البتہ بہت دل لگ گیا تھا۔ وہ ایوا اور کیتھی کے ساتھ گاؤں میں گھومتی رہتی تھی۔ ان ہی کے ساتھ اس نے قریبی قصبے میں ہونے والی تقریبات میں حصہ لیا تھا۔ ویسے بھی روزا ہر اس چیز کو پسند کرتی تھی جسے آسکر کرتا تھا۔ ماں کی موت کے بعد آسکر اور روزا' دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے۔ جوزفین کی البتہ اپنی پسند ناپسند تھی۔ اسے نشست و برخاست اور لباس کی بہت فکر رہا کرتی تھی۔ زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی وہ بہت نازک مزاج ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن وہ اور ماریا اپنے اپنے گھوڑوں پر قریبی گاؤں سیر کرنے جا رہے تھے کہ جوزفین نے آسکر کو اتنے ناگوار انداز سے آواز دے کر رک جانے کے لیے کہا کہ آسکر اسے نظر انداز نہیں کر سکا۔ واپسی پر وہ جوزفین سے بات کیے بنا نہیں رہ سکا۔

"ماریا میری دوست ہے اور میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ اس کے سامنے ایسے سخت انداز میں بات کی جائے۔"

"میں نے تم سے صرف یہ پوچھا تھا کہ تمہاری واپسی کب تک ہوگی؟"

"اگر یہی پوچھا ہوتا تو مجھے برا نہ لگتا جوزفین۔ رنگ سب ہی اچھے ہوتے ہیں' برا تو انہیں غلط اسٹروک کر دیتے ہیں۔"

جوزفین خاموش ہوگئی۔ "تم کب واپس جانا چاہتے ہو......"

"میں نے ابھی طے نہیں کیا۔"

"تم جانتے ہو کہ روزا تمہارے بغیر نہیں رہتی۔ اس کے سب ٹیوٹرز یہاں تو اسے سبق دینے نہیں آئیں گے نا......"

آسکر نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تم لوگوں کو اب لوٹ جانا چاہیے۔"

جوزفین نے بے یقینی سے آسکر کو دیکھا۔ "کیا تم ہمیشہ یہاں رہنا چاہتے ہو؟"

"میں نے کہا نا جوزفین! میں نے ابھی کچھ طے نہیں کیا۔"

اگلے دن روزا اس سے ضد کر رہی تھی کہ اب انہیں واپس چلنا چاہیے۔ وہ روزا کی بات کم ہی ٹالا کرتا تھا۔

"تمہیں یہ جگہ پسند نہیں آئی؟"

"ہم یہاں پھر آجائیں گے۔ پاپا بھی وہاں اکیلے ہیں۔ کیا تمہیں پاپا یاد نہیں آتے۔ کیا تم اپنے دوستوں کو بھی بھول چکے ہو؟"

آسکر روزا کو اپنے کسی بھی جواب سے مطمئن نہیں کر سکا۔ اس تمام عرصے میں ازابیلا صبر سے انتظار کرتی رہی کہ آسکر کبھی اسے بھی اپنے ساتھ گھڑ سواری کی دعوت دے گا یا اسے اپنی کوئی آدھی ادھوری پینٹنگ ہی دکھا دے گا۔

☼ ☼ ☼

رات کو جب وہ باری باری اپنی دونوں بہنوں اور ازابیلا کو شب بخیر کہہ چکا تو اپنے کمرے میں آکر جنگل کی طرف دیکھنے لگا۔ جان کے کمرے کا دروازہ بھی بند ہو گیا تو وہ کھڑکی کے راستے باہر آگیا۔ جس وقت وہ ماریا کی کھڑکی بجا رہا تھا' اس وقت جوزفین اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی اس باڑھ کو دیکھ رہی تھی جسے پھلانگ کر جاتے ہوئے اس نے آسکر کو دیکھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ شال لپیٹے' باڑھ کے راستے کے اس پار دھیمی

رفتار سے چلنے لگی۔ کچھ دور لے سے آسکر اور ماریا آگے پیچھے چلتے ہوئے دکھائی دیے۔

جوزفین اپنے کمرے میں واپس آگئی اور بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ اس کی پیاری دوست مس ازابیلا ایک بے حد خوب صورت اور شائستہ لڑکی ہے۔ کیا ایسی لڑکی کی موجودگی میں گاؤں کی کسی لڑکی کی ضرورت رہتی ہے۔ جوزفین اس وقت تک نہیں سوئی جب تک اس نے آسکر کو واپس آتے ہوئے نہیں دیکھ لیا۔ اگلے دن صبح اس کے بہت شور مچانے پر بھی آسکر ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ وہ کسی صورت مان ہی نہیں رہا تھا۔

جوزفین کو ازابیلا کو اپنے راز میں شریک کرنا پڑا اور اگلی بار رات کو جب آسکر کھڑکی کے راستے باہر نکلا تو جوزفین اور ازابیلا بھی اس کے پیچھے جانے لگیں۔ لیکن جنگل کے اندر دونوں نے راستہ گم کردیا' اندھیرے میں انہیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ کچھ جنگل کا خوف بھی طاری ہوا اور وہ واپس آگئیں۔

روزا اور ماریا کی کافی دوستی ہو چکی تھی۔ روزا ماریا کے ساتھ کافی وقت گزارنے لگی تھی۔ ایک رات آسکر کے ساتھ روزا بھی جانے لگی تو جوزفین کی حیرت کی حد نہیں رہی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ وہ ازابیلا سے پوچھ رہی تھی۔ روزا' آسکر اور ماریا کا ایک ساتھ جنگل جانا' نظر انداز کیے جانے والی بات نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

روزا کی آنکھوں پر پٹی تھی اور وہ آسکر کے ساتھ کھڑی' ایک ایسے ساز کو سن رہی تھی جو اس نے آج سے پہلے نہیں سنا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اس ساز سے لطف اندوز ہوتی رہی پھر آسکر نے غیر محسوس انداز سے اس کی آنکھوں پر سے پٹی ہٹادی اور روزا دم بخود رہ گئی۔

"ماریا..... تم..... یہ سب..... یہ..... اوہ! میرے خدا..... کیا یہ کوئی جادو ہے..... کیا میں خواب دیکھ رہی

کچھ دیر دم بخود کھڑے رہنے کے بعد وہ ماریا کے ساتھ اس کے جگنوؤں کے دائرے میں گھس گئی اور خوشی سے بے قابو سی ہوگئی۔ روزا کچھ ایسے دل فریب انداز سے خوش ہو رہی تھی کہ ماریا کو ایسے لگنے لگا تھا کہ بورشے کو بجا کر اس نے حقیقی خوشی حاصل کرلی ہے۔ پھر جب روزا محبت سے ماریا سے لپٹ گئی تو وہ بھی جذباتی ہوگئی اور روزا سے لپٹ گئی۔ دونوں کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

کچھ دور چھپ کر کھڑی جوزفین اور ازابیلا کے لیے اس منظر کی تاب لانا تھوڑا مشکل ہو رہا تھا۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ دونوں نے الجھ کر ایک دوسرے کو دیکھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سارے منظر کو کیا نام دیں۔

گھر واپسی تک وہ شدید الجھن کا شکار رہیں۔ اگلے دن وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتی رہیں۔ روزا سے سب کچھ اگلوالینا اتنا مشکل نہیں تھا۔ روزا صرف چودہ سال کی تھی اور اپنی عمر سے بھی زیادہ معصوم بلکہ بے وقوف سی تھی۔ اس نے بہت آرام سے جوزفین کو سب بتادیا اور پھر کہہ دیا کہ یہ بات کسی اور کو معلوم نہیں ہونی چاہیے۔

"یہ بات کسی اور کو ہرگز معلوم نہیں ہوگی روزا۔" وہ دونوں ہنس دیں۔

پھر ایک رات جب روزا اور آسکر بورشے سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو وہ دونوں بھی ان کے سر پر پہنچ گئیں۔ ماریا بری طرح سے گھبرا گئی اور اس نے خائف نظروں سے آسکر کو دیکھا کہ تم نے سب کو بتادیا۔

"میں نے تمہیں اور روزا کو یوں رات کو اس طرف آتے دیکھا تو تمہارے پیچھے آگئی۔" جوزفین نے وضاحت دی۔

ماریا نے جو خاموش کھڑی اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ "میں گھر جا رہی ہوں۔" کہہ کر تیزی سے وہاں سے دور ہوجانا چاہا۔

"ماریا.... کیا تمہیں ہمارا آنا برا لگا۔" جوزفین نے جلدی سے ماریا کے قریب جاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم ہمیں اپنا دوست نہیں سمجھتیں۔" اس نے ماریا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

ماریا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آتا تھا کہ اسے بورشے کو آخر اتنا چھپا کر کیوں رکھنا ہے۔ وہ خود اس لکا چھپی سے نالاں تھی۔ وہ تو خود چاہتی تھی کہ ساری دنیا بورشے سے حاصل ہونے والی خوشی حاصل کر لے۔

"تم حیران کن شخصیت کی مالک ہو ماریا.... تم نے مجھے مبہوت کر دیا۔" جوزفین کے اس جملے نے ماریا کو مسکرانے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنی ساری سادگی اور معصومیت سمیت، جوزفین کے ہاتھ میں اپنے ہاتھ کی گرفت کو محسوس کر کے خوش ہونے لگی۔

اگلا دن افراتفری کا شکار رہا۔ انہیں پاپا کے علیل ہونے کی اطلاع ملی تو وہ سب فوراً" آئرلینڈ واپس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ایو، کیتھی اور ماریا اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ان کی بگھی کو گاؤں کے آخری کنارے تک رخصت کرنے گئی تھیں۔ پریشانی کے باوجود آسکر نے کھڑکی سے سر نکال کر اپنے ہیٹ کو ہاتھ میں لے کر جوش سے لہرایا اور چلا کر کہا۔

"آئرلینڈ میں بورشے کا انتظار رہے گا۔"

ماریا کے گھنگھریالے بال ہوا میں اڑنے لگے اور اس کی آنکھوں کے جگنو روشن ہو گئے۔ گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دے کر اس نے جنگل کی طرف موڑ لیا اور اس کی فراک کی جیب میں رکھا بورشے خود بخود بجنے لگا۔

☼ ☼ ☼

آسکر کو آخر کار یہ معلوم ہو ہی گیا کہ مسٹر بروک ہیگ اس سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ ان کی سختی ہی دراصل نرمی تھی۔ وہ آسکر کو اپنے بستر کے قریب بیٹھنے کے لیے کہتے اور اس سے بے معنی باتیں کرتے رہتے۔ آسکر نے ماؤتھ آرگن بجانے کی کوشش کرنی چاہیے تو وہ ہنس دیے۔

"اس ساز کو چھوڑ دو، اس کی اتنی بے عزتی نہ کرو آسکر.... "

آسکر کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"تمہیں میری اب کوئی بات بری نہیں لگتی آسکر! تمہارے کان سرخ نہیں ہوتے، اور تم پیر پٹخ کر بھی نہیں چلتے۔ تمہارا اب دنیا کو بھاڑ میں جھونک دینے کا ارادہ بھی نہیں رہا اور کھلی آنکھوں سے تم نے تصورات کی دنیا میں رہنا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"کیا میں یہ سب کرتا رہا ہوں؟"

نقاہت کے باوجود وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ "اوہ! آسکر.... تمہیں کیا ہو گیا ہے.... "

"میں نے پرسکون رہنا سیکھ لیا ہے۔"

"گاؤں کے لوگوں سے مل کر تمہیں کیسا لگا؟"

"وہ سب بہت اچھے ہیں۔ گرینڈ پا اسی لیے وہاں بار بار جایا کرتے تھے۔ وہ ٹھیک کہا کرتے تھے، ساری دنیا سے زندگی کہیں کھو جائے تو اسے کسی گاؤں میں جا کر ڈھونڈ لینا چاہیے۔"

"ہاہاہا.... تمہیں ایسی باتیں بھی یاد آنے لگی ہیں آسکر.... کیا تمہیں وہاں کوئی بورشے ملا؟"

آسکر نے چونک کر انہیں دیکھا؟ "بورشے.... آپ اسے کیسے جانتے ہیں.... کیا روزا نے بتایا؟

"میں جانتا تو تھا لیکن اب تک بھول چکا تھا.... تمہیں دیکھ کر پھر سے یاد آ گیا۔"

"مجھے دیکھ کر آپ کو بورشے کیسے یاد آ سکتا ہے؟"

"آ سکتا ہے.... تم نہیں سمجھو گے.... تمہارے دادا کے ساتھ آخری بار جب میں وہاں گیا تھا تو وہاں مجھے ایک پیاری سی لڑکی کے پاس لے گئے تھے جو سرِ شام سبز گھاس پر بیٹھ کر بورشے بجایا کرتی تھی۔ تمہارے دادا اکثر کہا کرتے تھے جس شام وہ بورشے نہیں سنتے، انہیں میٹھی نیند نہیں آتی۔"

آسکر حیرت سے پاپا کو دیکھنے لگا۔ "بورشے سن کو بھول جانے والی چیز تو نہیں ہے۔ آپ نے اسے دوبارہ کیوں نہیں سننا چاہا؟"

"شاید میں یہ چاہتا تھا کہ اسے تم سن لو۔"

ہوں......"

کچھ دیر دم بخود کھڑے رہنے کے بعد وہ ماریا کے ساتھ اس کے جگنوؤں کے دائرے میں گھس گئی اور خوشی سے بے قابو سی ہو گئی۔ روزا کچھ ایسے دل فریب انداز سے خوش ہو رہی تھی کہ ماریا کو ایسے لگنے لگا تھا کہ بورشے کو بجا کر اس نے حقیقی خوشی حاصل کرلی ہے۔

پھر جب روزا محبت سے ماریا سے لپٹ گئی تو وہ بھی جذباتی ہو گئی اور روزا سے لپٹ گئی۔ دونوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

کچھ دور چھپ کر کھڑی جوزفین اور ازابیلا کے لیے اس منظر کی تاب لانا تھوڑا مشکل ہو رہا تھا۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ دونوں نے الجھ کر ایک دوسرے کو دیکھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سارے منظر کو کیا نام دیں۔

گھر واپسی تک وہ شدید الجھن کا شکار رہیں۔ اگلے دن وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتی رہیں۔ روزا سے سب کچھ اگلوا لینا اتنا مشکل نہیں تھا۔ روزا صرف چودہ سال کی تھی اور اپنی عمر سے بھی زیادہ معصوم بلکہ بے وقوف سی تھی۔ اس نے بہت آرام سے جوزفین کو سب بتا دیا اور پھر کہہ دیا کہ یہ بات کسی اور کو معلوم نہیں ہونی چاہیے۔

"یہ بات کسی اور کو ہرگز معلوم نہیں ہوگی روزا۔" وہ دونوں ہنس دیں۔

پھر ایک رات جب روزا اور آسکر بورشے سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو وہ دونوں بھی ان کے سر پر پہنچ گئیں۔ ماریا بری طرح سے گھبرا گئی اور اس نے خائف نظروں سے آسکر کو دیکھا کہ تم نے سب کو بتا دیا۔

"میں نے تمہیں اور روزا کو یوں رات کو اس طرف آتے دیکھا تو تمہارے پیچھے آگئی۔" جوزفین نے وضاحت دی۔

ماریا نے جو خاموش کھڑی اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ "میں گھر جا رہی ہوں۔" کہہ کر تیزی سے وہاں سے دور ہو جانا چاہا۔

رفتار سے چلنے لگی۔ کچھ دور اسے آسکر اور ماریا آگے پیچھے چلتے ہوئے دکھائی دیے۔

جوزفین اپنے کمرے میں واپس آگئی اور بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ اس کی پیاری دوست مس ازابیلا ایک بے حد خوب صورت اور شائستہ لڑکی ہے۔ کیا ایسی لڑکی کی موجودگی میں گاؤں کی کسی لڑکی کی ضرورت رہتی ہے۔ جوزفین اس وقت تک نہیں سوئی جب تک اس نے آسکر کو واپس آتے ہوئے نہیں دیکھ لیا۔

اگلے دن صبح اس کے بہت شور مچانے پر بھی آسکر ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ وہ کسی صورت مان ہی نہیں رہا تھا۔

جوزفین کو ازابیلا کو اپنے راز میں شریک کرنا پڑا اور اگلی بار رات کو جب آسکر کھڑکی کے راستے باہر نکلا تو جوزفین اور ازابیلا بھی اس کے پیچھے جانے لگیں۔ لیکن جنگل کے اندر دونوں نے راستہ گم کر دیا' اندھیرے میں انہیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ کچھ جنگل کا خوف بھی طاری ہوا اور وہ واپس آگئیں۔

روزا اور ماریا کی کافی دوستی ہو چکی تھی۔ روزا ماریا کے ساتھ کافی وقت گزارنے لگی تھی۔ ایک رات آسکر کے ساتھ روزا بھی جانے لگی تو جوزفین کی حیرت کی حد نہیں رہی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ وہ ازابیلا سے پوچھ رہی تھی۔ روزا' آسکر اور ماریا کا ایک ساتھ جنگل جانا' نظر انداز کیے جانے والی بات نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

روزا کی آنکھوں پر پٹی تھی اور وہ آسکر کے ساتھ کھڑی' ایک ایسے ساز کو سن رہی تھی جو اس نے آج سے پہلے نہیں سنا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اس ساز سے لطف اندوز ہوتی رہی پھر آسکر نے غیر محسوس انداز سے اس کی آنکھوں پر سے پٹی ہٹا دی اور روزا دم بخود رہ گئی۔

"ماریا..... تم..... یہ سب..... یہ..... اوہ! میرے خدا..... کیا یہ کوئی جادو ہے..... کیا میں خواب دیکھ رہی

"ماریا...... رکو...... کیا تمہیں ہمارا آنا برا لگا۔" جوزفین نے جلدی سے ماریا کے قریب جاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم ہمیں اپنا دوست نہیں سمجھتیں۔" اس نے ماریا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

ماریا کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس کی سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آتا تھا کہ اسے بورشے کو آخر اتنا چھپا کر کیوں رکھنا ہے۔ وہ خود اس لکا چھپی سے نالاں تھی۔ وہ تو خود چاہتی تھی کہ ساری دنیا بورشے سے حاصل ہونے والی خوشی حاصل کرلے۔

"تم حیران کن شخصیت کی مالک ہو ماریا..... تم نے مجھے مبہوت کردیا۔" جوزفین کے اس جملے نے ماریا کو مسکرانے پر مجبور کردیا اور وہ اپنی ساری سادگی اور معصومیت سمیت، جوزفین کے ہاتھ میں اپنے ہاتھ کی گرفت کو محسوس کرکے خوش ہونے لگی۔

اگلا دن افراتفری کا شکار رہا۔ انہیں پاپا کے علیل ہونے کی اطلاع ملی تو وہ سب "فوراً" آئرلینڈ واپس جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ الو، کیتھی اور ماریا اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ان کی بگھی کو گاؤں کے آخری کنارے تک رخصت کرنے گئی تھیں۔ پریشانی کے باوجود آسکر نے کھڑکی سے سر نکال کر اپنے ہیٹ کو ہاتھ میں لے کر جوش سے لہرایا اور چلا کر کہا۔

"آئرلینڈ میں بورشے کا انتظار رہے گا۔"

ماریا کے گھنگھریالے بال ہوا میں اڑنے لگے اور اس کی آنکھوں کے جگنو روشن ہوگئے۔ گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دے کر اس نے جنگل کی طرف موڑ لیا اور اس کی فراک کی جیب میں رکھا بورشے خود بخود بجنے لگا۔

☆ ☆ ☆

آسکر کو آخر کار یہ معلوم ہو ہی گیا کہ مسٹر بروک ہیگ اس سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ ان کی سختی ہی دراصل نرمی تھی۔ وہ آسکر کو اپنے بستر کے قریب بیٹھنے کے لیے کہتے اور اس سے بے معنی باتیں کرتے رہتے۔ آسکر نے ماؤتھ آرگن بجانے کی کوشش کرنی چاہیے تو وہ ہنس دیے۔

"اس ساز کو چھوڑ دو۔ اس کی اتنی بے عزتی نہ کرو آسکر......"

آسکر کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"تمہیں میری اب کوئی بات بری نہیں لگتی آسکر! تمہارے کان سرخ نہیں ہوتے، اور تم پیر پٹخ کر بھی نہیں چلتے۔ تمہارا اب دنیا کو بھاڑ میں جھونک دینے کا ارادہ بھی نہیں رہا اور کھلی آنکھوں سے تم نے تصورات کی دنیا میں رہنا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"کیا میں یہ سب کرتا رہا ہوں؟"

نقاہت کے باوجود وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ "اوہ! آسکر...... تمہیں کیا ہوگیا ہے......"

"میں نے پرسکون رہنا سیکھ لیا ہے۔"

"گاؤں کے لوگوں سے مل کر تمہیں کیسا لگا؟"

"وہ سب بہت اچھے ہیں۔ گرینڈپا اسی لیے وہاں بار بار جایا کرتے تھے۔ وہ ٹھیک کہا کرتے تھے، ساری دنیا سے زندگی کہیں کھو جائے تو اسے کسی گاؤں میں جاکر ڈھونڈ لینا چاہیے۔"

"ہاہاہا...... تمہیں ایسی باتیں بھی یاد آنے لگی ہیں آسکر...... کیا تمہیں وہاں کوئی بورشے ملا؟"

آسکر نے چونک کر انہیں دیکھا؟ "بورشے...... آپ اسے کیسے جانتے ہیں...... کیا روزا نے بتایا؟"

"میں جانتا تو تھا لیکن اب تک بھول چکا تھا...... تمہیں دیکھ کر پھر سے یاد آگیا۔"

"مجھے دیکھ کر آپ کو بورشے کیسے یاد آسکتا ہے؟"

"آسکتا ہے...... تم نہیں سمجھو گے...... تمہارے دادا کے ساتھ آخری بار جب میں وہاں گیا تھا تو وہاں مجھے ایک پیاری سی لڑکی کے پاس لے گئے تھے جو سرِ شام سبز گھاس پر بیٹھ کر بورشے بجایا کرتی تھی۔ تمہارے دادا اکثر کہا کرتے تھے جس شام وہ بورشے نہیں سنتے تھے انہیں میٹھی نیند نہیں آتی۔"

آسکر حیرت سے پاپا کو دیکھنے لگا۔ "بورشے سن کو بھول جانے والی چیز تو نہیں ہے۔ آپ نے اسے دوبارہ کیوں نہیں سننا چاہا؟"

"شاید میں یہ چاہتا تھا کہ اسے تم سن لو۔"

آسکر پایا۔ "میں نے ایسا ساز کبھی نہیں سنا۔ اس کی دھنیں نائی ہیں۔"

"مجھے ایسے ہی کسی جملے کی توقع تھی آسکر۔" ان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ "تم اپنی دوستوں کو آئرلینڈ آنے کی دعوت کیوں نہیں دیتے۔"

آسکر نے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر اچھل پڑنے والے انداز سے کھڑا ہو گیا۔ "یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔"

بعض معاملات میں تم حد سے زیادہ نالائق ہو۔"

"ٹھیک کہا آپ نے۔ میں تو کافی سے زیادہ نالائق ہوں۔"

☼ ☼ ☼

ماریا اپنی دونوں چچا زاد بہنوں ایوا اور کیتھی کے ساتھ ۔ آئرلینڈ اپنی ایک رشتے دار خاتون کے ساتھ آئی تھیں، جو آئرلینڈ میں ہی رہتی تھیں۔ ان دونوں کا کچھ عرصہ آنٹ ایلی کے ساتھ آئرلینڈ میں ہی رہنے کا ارادہ تھا۔

"کیا تم بور ہے لائی ہو؟" اپنا ہاتھ آگے کر کے اس کا ہاتھ تھام کر اسے بگھی سے اترنے میں مدد دیتے ہوئے آسکر نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ ماریا نے جواب دینے سے پہلے سر اٹھا کر اس کے گھر کو دیکھا اور پھر آسکر کو۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ روزا اتنے بڑے گھر میں رہتی ہو گی۔" آسکر کے نام کے بجائے اسے روزا کا نام لینا پڑا۔

آسکر نے گھر پر ایک سرسری نظر ڈالی جیسے دیکھنا چاہا کہ کیا واقعی اس کا گھر ایسا ہی بڑا ہے کہ پہلا سوال اسی کے بارے میں کیا جائے۔

گاؤں کے معمول کے لباس کی نسبت اس نے نسبتاً جدید فیشن کی ہلکے سبز رنگ کی فراک پہنی تھی۔ اس کے ہیٹ کے کنارے لگی جالی اس کی ایک آنکھ کے کنارے کو چھپا رہی تھی۔ گھنگھریالے بالوں کے کچھ کنڈل اس کی پیشانی اور کان کی لو کے آس پاس موجود تھے۔

جس وقت ماریا آسکر کے ساتھ بیرونی سیڑھیاں چڑھتی گھر کے اندر داخل ہو رہی تھی اس وقت آسکر نے ماریا کے تاثرات کو خوف زدہ سا پایا۔ راہداری کی ایک کے بعد ایک قد آدم کھڑکی کے پاس سے گزرتے جہاں سے باغ کا منظر دکھائی دیتا تھا وہ ایک لمحے کے لیے سہم سی گئی اور اس نے راہداری میں لگی تصویروں، پردوں اور فانوس کو دیکھا۔ کچھ دیر پہلے بگھی کی کھڑکی کے اس طرف دکھائی دینے والے اس کے بے ساختہ ہنستے مسکراتے چہرے کی چمک اب معدوم ہونے لگی تھی۔ کیا گھر کی آرائش اس پر وحشت طاری کر رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ آسکر سے دو قدم پیچھے رہ گئی اور آسکر کو رک کر اسے دیکھنا پڑا۔

"کیا ہوا ماریا..... کیا تمہیں میرا گھر پسند نہیں آیا۔"

ماریا گھبرا کر اپنا ہیٹ درست کرنے لگی اور جوزفین سے ملنے کے لیے آگے بڑھی، جو ہال کی سیڑھیوں سے اتر کر اسی کی طرف آرہی تھی۔

"ماریا ڈیئر..... کتنا اچھا لگا تمہیں یہاں دیکھ کر۔"

جوزفین اسے دیکھتے ہی چہچہانے لگی اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کے دونوں گالوں کو اپنے گالوں سے مس کرنے لگی۔

کچھ ہی دیر میں وہ مسٹر ہیک کے سامنے بیٹھی تھی۔ مسٹر ہیک سے پہلی ملاقات، پہلی ملاقات جیسی نہیں تھی۔ یہ ایسی ملاقات تھی جو کئی ملاقاتوں کی بے تکلفی سے بھی کہیں آگے کی تھی۔ وہ ماریا سے اس کی دلچسپی کے بارے میں پوچھتے رہے اور پھر انہوں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"سچ بتاؤ، تمہارا ساز جگنوؤں کو کھینچ لاتا ہے یا تمہاری دعا؟"

ماریا ہنس دی۔ "میرے ساز میں چھپی میری دعا۔"

"تم ذہین ہو..... لیکن ذہانت سے زیادہ مجھے جرات پسند ہے۔"

"جرات مند ہونے کے لیے کبھی کبھی خود غرض بھی ہونا پڑتا ہے۔ ایسی خوبی جو خامی کو منسلک رکھے

کس کام کی۔ مجھے بورشے کو چھپا کر رکھنا پڑتا ہے اور مجھے یہ منظور ہے۔"

"اگر یہ ساز کسی مرد کے پاس ہوتا تو وہ اس وقت تک دنیا کا ہیرو بن چکا ہوتا۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہارے ساز کے لیے جادو کا لفظ استعمال کیا گیا۔"

"کیا ہیرو بننے کے لیے ہجوم کی تالیاں اور داد ضروری ہے؟ کیا ہیرو ہونا اسے ہی کہتے ہیں کہ دنیا آپ کو تسلیم کرلے؟ کیا جنگلوں اور بیابانوں میں ہیرو دم توڑ دیتے ہیں۔ میں اپنے جگنوؤں کی ملکہ ہوں' کیا مجھے کسی اور کی ضرورت ہے؟"

مسٹر بیگ اس کے جواب سے بہت خوش ہوئے۔

"پاپا تم سے کیا باتیں کررہے تھے ماریا۔" شام کو آسکر باغ میں لے کر اسے ٹہلنے لگا۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ میں ان کی باتیں دہراؤں؟"

ماریا باغ کے فوارے کے قریب جاکر کھڑی ہوگئی۔

"میں نے تم سے پوچھا تھا کیا تم بورشے لائی ہو؟"

"میں اسے کبھی جدا نہیں کرتی۔" اس نے اپنی پوشیدہ جیب کو تھپتھپایا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم میرے لیے بورشے ضرور لاؤ گی۔"

"انکل ولسن نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ میں اسے ہرگز یہاں نہیں بجاؤں گی۔"

"انکل ولسن نے گاؤں میں بھی بجانے سے منع کیا تھا' لیکن تم بجاتی تھیں۔"

"تب انہوں نے منع کیا تھا' اب وعدہ لیا ہے۔"

"تمہیں یہ ڈر کیوں ہے کہ سب تمہیں جادوگرنی کہیں گے۔ شہر کے لوگ باشعور ہیں۔"

"گنوار تو گاؤں کے لوگ بھی نہیں ہیں۔" ماریا کو برا لگا۔

"تھوڑا سا ہی سہی کچھ فرق تو ہے۔ گاؤں کے لوگوں کی زندگیوں میں مقامی رقص کے علاوہ ہے ہی کیا؟ وہ شہر کے لوگوں کی طرح اوپیرا اور تھیٹر نہیں جاتے' شیکسپیئر کے مکالمات کو دم سادھے نہیں سنتے' ان کی زندگیاں جامد ہیں' وہ بہت سست آگے بڑھتے ہیں۔"

ماریا کو یہ سن کر بہت غصہ آیا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم شہر اور گاؤں کے لوگوں میں فرق تلاش کرتے رہتے ہو۔ پھر تو میں بھی گنوار ہوں۔ میری زندگی بھی مقامی رقص اور گھڑسواری تک محدود ہے۔ شاعری اور معاشرتی اصلاحات کے فلسفے ہمارے لیے بے کار ہیں۔ نہ ہم انقلاب لاتے ہیں نہ اس کا موجب بنتے ہیں۔ تمہیں ایک ساز سننے کے لیے گاؤں کے لوگوں کی بے عزتی نہیں کرنی چاہیے۔"

"میں نے حقیقت بیان کی ہے....."

"حقیقت یہ ہے کہ شہر والوں کے لیے بورشے کسی تماشے سے بڑھ کر نہیں ہوگا' وہ اس سے محظوظ ہوں گے اور بس۔ بورشے کھیل تماشا نہیں ہے آسکر۔ جان لو۔ میرے لیے وہ صرف ایک ساز نہیں ہے۔"

ماریا کے لہجے نے آسکر کو غصہ دلا دیا۔ وہ ماریا سے اس انداز میں بات کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ "میرا خیال تھا۔ تم اپنے دوست کی فرمائش کو اہمیت دو گی۔"

ماریا نے باغ میں چہل قدمی منسوخ کی اور کہا۔ "میرا بھی خیال تھا تم اپنے دوست "کو عزت" دو گے۔"

وہ وہیں کھڑا رہ گیا اور وہ تیزی سے آگے چلی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ چاروں بگھی میں بیٹھ کر واپس چلی گئیں۔

آسکر کو توقع نہیں تھی کہ اتنے لمبے انتظار کے بعد ہونے والی ملاقات ایسے ختم ہوگی۔ اسے اتنی بدمزگی کی امید نہیں تھی۔ ماریا حساس تھی' وہ یہ جان گیا تھا لیکن اب وہ خود بھی غصے میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ماریا نے بچکانہ رویے کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ ہوجاتی ہے۔ وہ ایک لمحے میں اجنبی بن جاتی ہے۔ آسکر کو ماریا کے اس انداز سے دکھ پہنچا تھا۔ اسے لمحے میں اجنبی بن جانے والے لوگوں سے چڑ تھی۔

روزا نے اس سے پوچھا کہ کیا ماریا کسی بات پر ناراض ہوگئی ہے تو اس نے کندھے اچکا دیے۔

"میں نہیں جانتا اور نہ ہی مجھے پروا ہے۔"

آسکر! ماریا۔ "میں نے ایسا ساز کبھی نہیں سنا۔ اس کی دھنیں نرالی ہیں۔"

"مجھے ایسے ہی کسی جملے کی توقع تھی آسکر۔" ان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ "تم اپنی دوستوں کو آئرلینڈ آنے کی دعوت کیوں نہیں دیتے۔"

آسکر نے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر اچھل پڑنے والے انداز سے کھڑا ہو گیا۔ "یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔"

"بعض معاملات میں تم حد سے زیادہ نالائق ہو۔"

"ٹھیک کہا آپ نے۔ میں تو کافی سے زیادہ نالائق ہوں۔"

☼ ☼ ☼

ماریا اپنی دونوں چچا زاد بہنوں ایوا اور کیتھی کے ساتھ — آئرلینڈ اپنی ایک رشتے دار خاتون کے ساتھ آئی تھیں جو آئرلینڈ میں ہی رہتی تھیں۔ ان دونوں کا کچھ عرصہ آنٹ ایلی کے ساتھ آئرلینڈ میں ہی رہنے کا ارادہ تھا۔

"کیا تم بور ہو کے لائی ہو؟" اپنا ہاتھ آگے کر کے اس کا ہاتھ تھام کر اسے بگھی سے اترنے میں مدد دیتے ہوئے آسکر نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ ماریا نے جواب دینے سے پہلے سر اٹھا کر اس کے گھر کو دیکھا اور پھر آسکر کو۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ روزا اتنے بڑے گھر میں رہتی ہو گی۔" آسکر کے نام کے بجائے اسے روزا کا نام لینا پڑا۔

آسکر نے گھر پر ایک سرسری نظر ڈالی جیسے دیکھنا چاہا کہ کیا واقعی اس کا گھر ایسا ہی بڑا ہے کہ پہلا سوال اسی کے بارے میں کیا جائے۔

گاؤں کے معمول کے لباس کی نسبت اس نے نسبتاً" جدید فیشن کی ہلکے سبز رنگ کی فراک پہنی تھی۔ اس کے ہیٹ کے کنارے لگی جالی اس کی ایک آنکھ کے کنارے کو چھپا رہی تھی۔ گھنگھریالے بالوں کے کچھ کنڈل اس کی پیشانی اور کان کی لو کے آس پاس موجود تھے۔

جس وقت ماریا آسکر کے ساتھ بیرونی سیڑھیاں چڑھتی گھر کے اندر داخل ہو رہی تھی اس وقت آسکر نے ماریا کے تاثرات کو خوف زدہ سا پایا۔ راہداری کی ایک کے بعد ایک قد آدم کھڑکی کے پاس سے گزرتے جہاں سے باغ کا منظر دکھائی دیتا تھا وہ ایک لمحے کے لیے سہم سی گئی اور اس نے راہداری میں لگی تصویروں، پردوں اور فانوس کو دیکھا۔ کچھ دیر پہلے بگھی کی کھڑکی سے اس طرف دکھائی دینے والے اس کے بے ساختہ ہنستے مسکراتے چہرے کی چمک اب معدوم ہونے لگی تھی۔ کیا گھر کی آرائش اس پر وحشت طاری کر رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ آسکر سے دو قدم پیچھے رہ گئی اور آسکر کو رک کر اسے دیکھنا پڑا۔

"کیا ہوا ماریا... کیا تمہیں میرا گھر پسند نہیں آیا۔"

ماریا گھبرا کر اپنا ہیٹ درست کرنے لگی اور جوزفین سے ملنے کے لیے آگے بڑھی' جو ہال کی سیڑھیوں سے اتر کر اسی کی طرف آ رہی تھی۔

"ماریا ڈیئر... کتنا اچھا لگا تمہیں یہاں دیکھ کر۔"

جوزفین اسے دیکھتے ہی چہچہانے لگی اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کے دونوں گالوں کو اپنے گالوں سے مس کرنے لگی۔

کچھ ہی دیر میں وہ مسٹر ہیگ کے سامنے بیٹھی تھی۔ مسٹر ہیگ سے پہلی ملاقات' پہلی ملاقات جیسی نہیں تھی۔ یہ ایسی ملاقات تھی جو کئی ملاقاتوں کی بے تکلفی سے بھی کہیں آگے کی تھی۔ وہ ماریا سے اس کی دلچسپی کے بارے میں پوچھتے رہے اور پھر انہوں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"سچ بتاؤ' تمہارا ساز جگنوؤں کو کھینچ لاتا ہے یا تمہاری دعا؟"

ماریا ہنس دی۔ "میرے ساز میں چھپی میری دعا۔"

"تم ذہین ہو... لیکن ذہانت سے زیادہ مجھے جرات پسند ہے۔"

"جرات مند ہونے کے لیے کبھی کبھی خود غرض بھی ہونا پڑتا ہے۔ ایسی خوبی جو خامی کو منسلک رکھے

کس کام کی۔ مجھے بورشے کو چھپا کر رکھنا پڑتا ہے اور مجھے یہ منظور ہے۔"

"اگر یہ ساز کسی مرد کے پاس ہوتا تو وہ اس وقت تک دنیا کا ہیرو بن چکا ہوتا۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہارے ساز کے لیے جادو کا لفظ استعمال کیا گیا۔"

"کیا ہیرو بننے کے لیے ہجوم کی تالیاں اور داد ضروری ہے؟ کیا ہیرو ہونا اسے ہی کہتے ہیں کہ دنیا آپ کو تسلیم کرلے؟ کیا جنگلوں اور بیابانوں میں ہیرو دم توڑ دیتے ہیں۔ میں اپنے جگنوؤں کی ملکہ ہوں' کیا مجھے کسی اور کی ضرورت ہے؟"

مسٹر ہیگ اس کے جواب سے بہت خوش ہوئے۔

"پاپا تم سے کیا باتیں کررہے تھے ماریا۔" شام کو آسکر باغ میں لے کر اسے ٹہلنے لگا۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ میں ان کی باتیں دہراؤں؟"

ماریا باغ کے فوارے کے قریب جاکر کھڑی ہوگئی۔

"میں نے تم سے پوچھا تھا کیا تم بورشے لائی ہو؟"

"میں اسے کبھی جدا نہیں کرتی۔" اس نے اپنی پوشیدہ جیب کو تھپتھپایا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم میرے لیے بورشے ضرور لاؤگی۔"

"دانکل ولسن نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ میں اسے ہرگز یہاں نہیں بجاؤں گی۔"

"انکل ولسن نے گاؤں میں بھی بجانے سے منع کیا تھا' لیکن تم بجاتی تھیں۔"

"تب انہوں نے منع کیا تھا' اب وعدہ لیا ہے۔"

"تمہیں یہ ڈر کیوں ہے کہ سب تمہیں جادوگرنی کہیں گے۔ شہر کے لوگ باشعور ہیں۔"

"گنوار تو گاؤں کے لوگ بھی نہیں ہیں۔" ماریا کو برا لگا۔

"تھوڑا سا ہی سہی کچھ فرق تو ہے۔ گاؤں کے لوگوں کی زندگیوں میں مقامی رقص کے علاوہ ہے ہی کیا؟ وہ شہر کے لوگوں کی طرح اوپیرا اور تھیٹر نہیں جاتے' شیکسپئر کے مکالمات کو دم سادھے نہیں سنتے' ان کی زندگیاں جامد ہیں' وہ بہت سست آگے بڑھتے ہیں۔"

ماریا کو یہ سن کر بہت غصہ آیا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم شہر اور گاؤں کے لوگوں میں فرق تلاش کرتے رہتے ہو۔ پھر تو میں بھی گنوار ہوں۔ میری زندگی بھی مقامی رقص اور گھڑسواری تک محدود ہے۔ شاعری اور معاشرتی اصلاحات کے فلسفے ہمارے لیے بے کار ہیں۔ نہ ہم انقلاب لاتے ہیں نہ اس کا موجب بنتے ہیں۔ تمہیں ایک ساز سننے کے لیے گاؤں کے لوگوں کی بے عزتی نہیں کرنی چاہیے۔"

"میں نے حقیقت بیان کی ہے...."

"حقیقت یہ ہے کہ شہر والوں کے لیے بورشے کسی تماشے سے بڑھ کر نہیں ہوگا' وہ اس سے محظوظ ہوں گے اور بس۔ بورشے کھیل تماشا نہیں ہے آسکر۔ جان لو۔ میرے لیے وہ صرف ایک ساز نہیں ہے۔"

ماریا کے لہجے نے آسکر کو غصہ دلا دیا۔ وہ ماریا سے اس انداز میں بات کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ "میرا خیال تھا۔ تم اپنے دوست کی فرمائش کو اہمیت دوگی۔"

ماریا نے باغ میں چہل قدمی منسوخ کی اور کہا۔

"میرا بھی خیال تھا تم اپنے دوست" کو عزت دوگے۔"

وہ وہیں کھڑا رہ گیا اور وہ تیزی سے آگے چلی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ چاروں بگھی میں بیٹھ کر واپس چلی گئیں۔

آسکر کو توقع نہیں تھی کہ اتنے لمبے انتظار کے بعد ہونے والی ملاقات ایسے ختم ہوگی۔ اسے اتنی بدمزگی کی امید نہیں تھی۔ ماریا حساس تھی' وہ یہ جان گیا تھا لیکن اب وہ خود بھی غصے میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ماریا نے بچکانہ رویے کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ ہوجاتی ہے۔ وہ ایک لمحے میں اجنبی بن جاتی ہے۔ آسکر کو ماریا کے اس انداز سے دکھ پہنچا تھا۔ اسے لمحے میں اجنبی بن جانے والے لوگوں سے چڑ تھی۔

روزا نے اس سے پوچھا کہ کیا ماریا کسی بات پر ناراض ہوگئی ہے تو اس نے کندھے اچکا دیے۔

"میں نہیں جانتا اور نہ ہی مجھے پروا ہے۔"

اس فقرے اور انداز نے جوزفین کو مسکرانے پر مجبور کردیا۔ اگلے دن صبح جب آسکر گھر سے باہر تھا تو وہ اس کی ڈائری پڑھنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ ایک بری عادت تھی، لیکن جوزفین اس عادت کا شکار تھی۔ وہ روزا اور آسکر دونوں کی ڈائریاں پڑھ لیا کرتی تھی۔ یہ حرکت وہ اس مقصد کے تحت کیا کرتی تھی کہ کہیں اس کے چھوٹے بہن بھائی کسی مشکل کا شکار تو نہیں یا کسی نفسیاتی تکلیف سے تو نہیں گزر رہے۔ بہر حال ایسے فلسفوں سے تسلی دے کر جوزفین خود کو مطمئن کرلیا کرتی تھی۔

"مجھے ماریا کے رویے سے تکلیف پہنچی۔ اسے ایسا کیوں لگا کہ میں اسے گنوار سمجھ کر اس کا مذاق اڑا سکتا ہوں؟ اس کا کہنا ہے کہ وہ بورشے نہیں بجانا چاہتی کیونکہ انکل ولسن نے منع کیا ہے، لیکن شاید اسے اب مجھ پر یقین نہیں رہا۔ وہ مجھ پر اعتماد نہیں کرتی۔ اسے لگتا ہے کہ میں اس کا راز کھول دوں گا۔ وہ اپنے فن کو راز میں کیوں رکھنا چاہتی ہے۔ بورشے جیسی پیاری چیز کیا چھپا کر رکھنے والی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بورشے ہمارے لیے صرف ایک تماشا ہے۔ وہ اپنے بورشے اور جگنوؤں کے لیے اتنی حساس ہے اور میرے لیے؟"

اتنا ہی پڑھ کر جوزفین نے ڈائری بند کردی اور ازابیلا سے ملنے چلی گئی۔ دیر تک جوزفین اور ازابیلا باتیں کرتی رہیں اور پھر نئے سال کی تقریب پر ان کی باتوں نے نیا رخ اختیار کرلیا۔

☼ ☼ ☼

ایوا دیکھ رہی تھی کہ ماریا بہت چپ چپ سی ہے۔ اس نے یہ بھی نوٹ کیا کہ ماریا کچھ زیادہ ہی آئینے کے سامنے آکر اپنا جائزہ لے رہی ہے۔

"ماریا... میں نے تمہیں کبھی اتنی دیر تک آئینہ دیکھتے ہوئے نہیں پایا۔ تم آج خود میں کیا ڈھونڈنے کی کوشش کررہی ہو؟"

ماریا نے ایک گہرا سانس لی اور ایوا کی طرف رخ موڑ کر کھڑی ہوگئی۔ "کیا میں دیکھنے میں گنوار لگتی ہوں؟"

ایوا کے لیے یہ سوال اور ایسے انداز میں اظہار ناقابل یقین تھا۔ اس نے ماریا کو کبھی کسی بھی طرح کے غم یا دکھ میں مبتلا نہیں دیکھا تھا۔ وہ کبھی بھی کسی بھی طرح کے احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتی تھی۔ وہ خوش باش رہا کرتی تھی، سوائے بورشے کے اسے کسی بات کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ ماریا کی ماں نے مسٹر البرٹ کو چھوڑ دیا تھا اور دوسری شادی کرلی تھی۔ وہ ماریا کو ان کے گھر چھوڑ گئیں تو بھی ماریا کو کوئی دکھ یا ماں سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ ماں کے خطوط کبھی کبھار آجایا کرتے تھے اور وہ اسی پر خوش رہتی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں ہر چیز سے مطمئن تھی۔

"تم نے یہ سوال کیوں کیا ماریا؟"

ماریا کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ "آنٹ ایلی اور سارہ کتنی شائستہ ہیں۔ ان کا لباس، ان کی نشست و برخاست، ان کے زیورات۔ یہ سب ہم سے مختلف ہیں ایوا۔ آسکر کی بہنیں مس جوزفین اور روزا بھی۔"

"ماریا تم خود کہا کرتی ہو کہ گاؤں کی زندگی اور شہر کی زندگی، کتنی بھی ہم آہنگ ہونے کی کوشش کریں فرق پھر بھی رہ ہی جاتا ہے۔ اب تمہیں یہ فرق برا کیوں لگ رہا ہے؟"

ماریا نے ہونٹ سکیڑے اور خاموش ہوگئی اور آئینے کے سامنے سے ہٹ کر کھڑکی کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ "ہاں فرق تو ہمیشہ رہتا ہے۔ یہ فرق نمایاں بھی تو کتنا رہتا ہے نا۔"

ایوا دیکھ رہی تھی کہ جب سے وہ آسکر کے گھر سے آئی ہے بجھی بجھی سی ہے۔ "کیا تمہیں آسکر کے گھر جا کر اچھا نہیں لگا۔ کوئی بات ہوئی تھی وہاں؟"

"مسٹر بروک ہیگ کا گھر بہت عالی شان ہے... مجھے ان کے گھر نے خوف زدہ کردیا ایوا..."

ایوا چلتی ہوئی ماریا کے پاس آئی اور اس کے گال کو محبت سے چھوا۔ "تم بے وجہ پریشان ہو... کیا مسٹر

آسکر نے کچھ کہا؟"

"وہ چاہتا تھا میں بورشے بجاؤں... انکل ولسن نے مجھ سے وعدہ لیا تھا۔ آسکر کو میرا انکار کرنا برا لگا۔"

ایوا نے ہمدردی سے ماریا کو دیکھا۔ "کیا تم پاپا کو نہیں جانتیں ماریا... تم جانتی ہو کہ وہ جانتے ہیں کہ تم بورشے کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ انہوں نے تمہیں بورشے سے منع کیا پھر بھی تم چھپ چھپ کر بجاتی رہیں۔ تمہیں کیا لگتا ہے کیا انہیں معلوم نہیں کہ تم چھپ کر بجاتی ہو۔ تم سے وعدہ لینے کا مقصد بھی یہی تھا کہ تم اسے بجانے میں احتیاط کرو جب کہ وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ تم اسے بجائے بغیر نہیں رہوگی۔"

ماریا اچھل پڑنے والے انداز سے کرسی سے کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"پاپا مسکرا رہے تھے، جب وہ وعدے کے لیے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رہے تھے۔"

"سچ میں؟" ماریا کا چہرہ اور کھل اٹھا۔

"بجائے اس کے تم سارے شہر کو جگنوؤں سے بھر دو، تمہیں آسکر کے گھر میں اسے بجا دینا چاہیے تھا۔"

ماریا مسکرانے لگی۔ "مسٹر آسکر کو بورشے کے لیے انتظار کرنے دو۔"

"آسکر کسی معجزے کی طرح ہے۔ وہ تمہیں نئے انداز سے بدل رہا ہے۔"

"معجزہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا... جب بورشے سے میں نے پہلی دھن کو نکالا تھا۔"

☼ ☼ ☼

آسکر نے دو تین دن خود کو مصروف رکھنا چاہا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ رات کو تھیٹر گیا، برج کھیلا، مچھلیوں کے شکار کے لیے گیا۔ پھر بھی اسے یہ خیال ستاتا رہا کہ ماریا نے اس کے ساتھ اچھے رویے کا اظہار نہیں کیا۔ یہ بات اسے تکلیف دیتی رہی کہ ماریا گاؤں سے شہر آچکی ہے اور اب تک وہ صرف ایک بار ملے ہیں۔

"ہو سکتا ہے وہ واپس جا چکی ہو۔" اچانک یہ خیال اس کے دل میں آیا اور وہ فوراً "مسز ایلی" کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ماریا، ایوا اور کیتھی کے ساتھ قیام پذیر تھی۔ میڈ سے اسے معلوم ہوا کہ پانچوں خواتین خریداری کے لیے گئی ہیں۔

"خریداری... کیا یہ بھی کوئی کام ہے کرنے لائق... ماریا کو ایسے غیر ضروری کام نہیں کرنے چاہئیں۔"

بازار کی روش پر چلتے، دکانوں کے اندر جھانکتے، اس کی بے چینی اتنی نمایاں تھی کہ بہت سی خواتین اسے اچنبھے سے دیکھ کر ناک بھوں چڑھا رہی تھیں۔ خوشبویات کی دکان میں اسے گھنگھریالے بالوں کی ایک لٹ نظر آئی اور وہ تیزی سے تانکا جھانکی کرتے رک گیا۔ ماریا کی اس کی طرف پشت تھی۔ وہ خوشبو کی بوتل کو ناک تک لے جا کر بار بار سونگھ رہی تھی۔ پھر اس نے ایک ننھا قطرہ اپنی ہتھیلی کی پشت پر ٹپکایا اور جس وقت اپنی ہتھیلی کو ناک سے لگائے وہ خوش کن انداز سے ذرا سا پلٹی، ٹھیک اسی وقت اس کی نظر آسکر سے ٹکرائی۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ وہیں مجسمہ سی بن گئی پھر غصے سے اپنا رخ بدل لیا۔

تین دن کے بعد بھی ناراضی سے اس کی آنکھیں وزنی ہو رہی تھیں۔ گال پھولے پھولے اور ہونٹ لٹکے ہوئے، جس وقت وہ دکان کے اندر آیا، اس کے قدموں کی چاپ اپنی پشت پر محسوس کر کے وہ دکان دار کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"مجھے کسی بھی خوشبو نے متاثر نہیں کیا۔ دراصل مجھے شہر کی کسی بھی چیز نے متاثر نہیں کیا۔ شاید میں گنوار ہوں اس لیے۔ کیا ہم جیسے گاؤں کے گنواروں کے لیے کوئی ایسی خوشبو ہے جسے لگانے سے شہروں کے لال بیگ ہم سے دور رہیں۔"

لال بیگ بے ساختہ مسکرا دیا۔ چاروں دوسری خواتین اس سے آگے بڑھ کر ملیں جبکہ ماریا بدستور اس سے انجان بنی کھڑی رہی۔

"شہر کے لارڈ بیگ گاؤں کے جگنو سے معذرت چاہتے ہیں۔" آسکر نے تھوڑا سا آگے جھک کر اس کے کان کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔ ماریا ایک دم پلٹی اور اس کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔ آسکر نے چند خوشبوؤں کی جانچ پڑتال کی اور پھر ایک بوتل اس کے آگے کی۔

"یہ خوشبو اچھی ہے۔۔۔ یہ تمہیں شہر کے ان لوگوں کی یاد دلائے گی جو بورشے کو پسند کرتے ہیں اور تمہارا احترام کرتے ہیں۔"

ماریا نے خوشبو کی ننھی بوتل اس کے ہاتھ سے لے لی اور مسکرا دی۔ "یہ مجھے ان لوگوں کی یاد بھی دلائے گی جو صرف بورشے کو یاد کرتے ہیں۔"

آسکر کا بے ساختہ قہقہہ اثر انگیز تھا۔ "ہو سکتا ہے بورشے اپنی یاد میں کئی دوسری یادیں رکھتا ہو۔"

جس وقت دونوں دکان سے باہر نکل کر بازار میں ٹہل رہے تھے تو آسکر کو محسوس ہوا کہ وہ بلاوجہ ہی بہت زیادہ مسکرا رہا ہے۔

"میں آج رات تھیٹر جا رہا ہوں، تم ساتھ چلو گی؟"

ماریا نے کچھ دیر تک سوچا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ "آج رات مجھے سارہ کے ساتھ اس کی سہیلی کے گھر جانا ہے۔ میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں۔ وہ کھانے پر ہمارا انتظار کرے گی۔"

"نئے سال کی تقریب کے بارے میں، میں ابھی سے بتا دیتا ہوں، اس تقریب میں تمہیں آنا ہے۔ جوزفین بہت اچھی منتظم ہے۔ ہر سال ہمارے گھر کی تقریب کا انتظار کیا جاتا ہے۔ وہ بہت شان دار تقریب کا انتظام کرتی ہے۔"

"کیا تمہارے یہاں تقریبات کی دعوت ایسے دی جاتی ہے۔۔۔ سر راہ؟"

"اس سے پہلے کہ تم اس دن کے لیے بھی کسی اور کی تقریب میں جانے کا وعدہ کر لو میں نے سوچا "فوراً" تمہیں بتا دوں اور تم سے وعدہ لے لوں۔ سر راہ ہی سہی۔"

ماریا کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کے آگے آگے چلتی جا رہی خواتین نے گردن موڑ کر ان دونوں کو دیکھا اور پھر سارہ نے کیتھی کے کان میں سرگوشی کی۔ "تین دن بعد ماریا کی ایسی ہنسی سنی ہے۔"

کیتھی نے ایوا کو دیکھا اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ مسکرانے لگیں۔

"تین دن بھی ہو سکتے تھے اگر آج بھی مسٹر آسکر نہ آ جاتے۔"

☼ ☼ ☼

نئے سال کی تقریب کے لیے ماریا کافی پُرجوش تھی۔ آنٹ ایلی اور ان کی بیٹی سارہ اس کی خاص مدد کر رہی تھیں۔ سارہ ہی کی پسند اور تجربے کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے اپنے لیے لباس بنوایا تھا۔ مسٹر بروک بیگ کی طرف سے انہیں باقاعدہ مدعو کیا گیا تھا۔ روزا اور مس جوزفین خود مدعو کر کے گئی تھیں۔ جوزفین اور ماریا کی اچھی دوستی ہو چکی تھی۔ بلکہ جوزفین سارا وقت ماریا سے ہی باتیں کرتی رہی۔

تقریب سے دو دن پہلے ماریا اپنی فراک پہن کر کئی بار دیکھ چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ کہیں سے بھی گنوار لگے۔ یہ ایسا خیال تھا جو اس کے دل میں راسخ ہو چکا تھا۔ اس نے سارہ سے فیشن ایبل لوگوں کی طرح بات کرنا، بیٹھنا اور بولنا بھی سیکھ لیا تھا۔ رات کو سونے کے کمرے میں یہ سب باتیں ان کے قہقہوں کا موجب بنتیں جب سارہ فیشن زدوں کی مصنوعی ادائیں دکھا رہی ہوتی اور ماریا انہیں نقل کرنے کی کوشش کر رہی ہوتی۔

سال کی آخری رات۔۔۔ ان کے استقبال کے لیے آسکر بیرونی دروازے پر موجود تھا۔ ان کی بگھی کے رکتے ہی وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے آنٹ ایلی باہر آئیں، پھر ایوا، کیتھی اور سارہ۔۔۔

"کیا ماریا نہیں آئی؟" کیتھی کے باہر نکلتے ہی اس نے بے چینی سے پوچھا۔

تینوں لڑکیاں جواب میں ہنس دیں۔ ماریا اپنی فراک سنبھالتی بگھی سے باہر آئی اور اپنا ہاتھ بڑھایا تاکہ آسکر

اسے تھام لے اور اسے اترنے میں مدد دے۔ آسکر اس کا ہاتھ پکڑنا بھول گیا اور ماریا نے اسے خائف نظروں سے دیکھا۔

"کیا مہمانوں کا استقبال ایسے کیا جاتا ہے؟"

آسکر مسکرا دیا "کیا میزبانوں کو ایسے حیران کیا جاتا ہے۔"

ماریا اور آسکر ایک ہی وقت میں مسکرا دیے۔ آسکر نے اس کے ہاتھ کو اپنے بازو کی گرفت میں لیا اور اسے ہال تک لایا۔ ماریا نے خود کو حیران پایا اور گاؤں کی عام سی لڑکی ہونے کا احساس پھر سے جاگ گیا۔ ہال کی آرائش حیران کن تھی۔ ماریا نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ جھکانا بھول گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ نئے سال کی تقریب کے لیے ایسے بھی اہتمام کیا جاسکتا ہے۔ گاؤں میں وہ لوگ اپنے گھروں کو سجاتے تھے' ایک ساتھ کھانا کھاتے۔ موسیقی ہوتی' رقص ہوتا اور رات ختم.....

آسکر اسے دیکھ رہا تھا۔ "تمہیں اچھا لگا؟"

"بہت..... کیا نئے سال کو ایسے بھی خوش آمدید کہا جاسکتا ہے؟"

آسکر اس کے معصومانہ انداز پر اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"کیا تم نے دیکھا نہیں کہ میں نے تمہیں کیسے خوش آمدید کہا۔" آسکر نے عین اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ماریا کے لیے نظریں چرا لینا ضروری ہو گیا۔

"میں آج تمہارے لیے بورشے بجاؤں گی۔ تقریب کے بعد کسی بھی وقت۔ مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ میرے جگنو یہاں بھی ویسا ہی رقص کرتے ہیں جیسا جنگل میں کرتے ہیں یا نہیں..... یا انہیں شہر کی فضائیں سہا دیتی ہیں۔"

آسکر نے بے یقینی سے ماریا کو دیکھا۔ "اور انکل ولسن؟"

ماریا کھلکھلا دی۔ "ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر انہیں سرگوشی میں بتایا جاسکتا ہے کہ ان سے کیا گیا وعدہ صرف ایک بار فراموش کیا گیا ہے۔"

"ہاہاہا.....!" آسکر پورے دل سے ہنس دیا۔ "نئے سال کا تحفہ..... بورشے"

"یہ خوب صورت لڑکی کون ہے آسکر.....؟" مسٹر بروک ہیگ ماریا کو خوش آمدید کہنے کے لیے آئے۔

ماریا کا چہرہ شادمانی سے دمک اٹھا۔ ویسی ہی دمک مسٹر ہیگ نے آسکر کے چہرے پر دیکھی اور وہ دل ہی دل میں کہہ اٹھے۔

"اوہ..... ماریا..... بورشے اور آسکر....."

جوزفین نے ماریا کا تعارف مہمانوں سے کرایا۔ پھر رقص شروع ہوا۔ وہ اور آسکر کئی بار ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئے۔ ماریا جتنی خوش ہو سکتی تھی اتنی خوش تھی۔ رات پر شادمانی کا عالم گہرا ہوتا گیا۔

رقص کے اختتام پر جوزفین نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"آج کی رات گزر چکی ہر تقریب اور آنے والی ہر تقریب سے کہیں زیادہ یادگار ہوگی۔ موسیقی اپنی تعریف بدل دے گی۔ دھن اپنے ساز سے نکل کر حد کردے گی۔ اگر ساز خوشیوں کے پیامبر ہیں تو آج کی رات یہ پیامبر کچھ نئے پیغامات دیں گے۔ ایسی دھن جسے صرف سنا ہی نہیں جائے گا بلکہ اسے دیکھ کر محظوظ بھی ہوا جائے گا۔ بورشے..... آج کی رات بورشے بجایا جائے گا..... باقی کا نظارہ راز ہے..... جو آپ پر بورشے ہی کھولے گا..... میری پیاری ماریا بورشے بجائیں گی....."

جوزفین کے عین سامنے کھڑی ماریا کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین کھسک گئی۔ اس نے بے یقینی سے آسکر کو اور پھر جوزفین کو دیکھا۔ آسکر نے جوزفین کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ بورشے کو یہاں بجا لینے میں کوئی حرج نہیں۔

"ہرگز نہیں....." ماریا نے سرگوشی کی جو آسکر نے سن لی.....

"پتا نہیں جوزفین کے دل میں کیا آئی کہ اس نے یہ سب کہا ہے۔ میں جوزفین سے بات کرتا ہوں۔"

"ماریا اتنے لوگوں میں ساز نہیں بجائے گی۔" آسکر نے جوزفین سے کہا۔

"کیوں نہیں آسکر..... یہ تو ایک اعزاز ہے بورشے

کے لیے۔ تم جانتی ہو کہ شہر کے لوگ باشعور اور عقل مند ہیں۔"

"لیکن ماریا نہیں بجانا چاہتی۔ تمہیں اس سے پوچھ کر اعلان کرنا چاہیے تھا۔"

"اوہ!" جوزفین نے ہونٹ سکیڑ لیے۔۔۔ "میں اعلان کرچکی ہوں آسکر۔۔۔ اب میری کتنی سبکی ہوگی۔"

آسکر ماریا کے پاس واپس آیا' پیچھے ہی جوزفین بھی آگئی اور دونوں کے قریب کھڑی ہوگئی۔ اس سے پہلے ایوا اس کے پاس آکر اسے سمجھا رہی تھی کہ وہ تھوڑا سا بورشے بجادے پھر طبیعت کی ناسازی کا بہانا کردے۔

"بورشے کم یا زیادہ نہیں بجتا ایوا۔۔۔ میں بورشے کی بے عزتی نہیں کرسکتی۔"

آسکر نے یہ آخری بات سن لی۔ "پلیز ماریا! میں تم سے درخواست کرتا ہوں صرف ایک بار میرے کہنے پر بورشے بجادو میری بہن نے اعلان کردیا ہے میں جانتا ہوں اس کی کتنی سبکی ہوگی۔ آئندہ وہ کسی تقریب کا انتظام نہیں کرسکے گی۔"

ماریا نے بے چارگی سے آسکر کو دیکھا اور رو دینے کو ہوگئی۔ "آسکر بورشے کوئی تماشا نہیں ہے' جگنو جوکر نہیں ہیں کہ وہ محظوظ کریں۔ انہیں عزت دینی ہوگی۔"

آسکر اس کی بات سمجھ گیا تھا لیکن پھر بھی وہ کہنے لگا۔ "سب بورشے کو پسند کریں گے۔ یہ ایک اعزاز ہوگا ماریا۔"

"میں نہیں بجانا چاہتی آسکر۔۔۔ مجھے یہ ٹھیک نہیں لگ رہا۔۔۔ میرے انکار کو انکار ہی رہنے دو۔۔۔ مجھے مجبور نہ کرو۔۔۔"

آسکر کو افسوس ہوا کہ ماریا اس کی اتنی سی بات بھی نہیں مان سکتی۔ "میرا خیال تھا شاید میں تمہارے لیے تھوڑی سی اہمیت تو رکھتا ہوں۔"

ماریا کی آنکھیں نم ہوگئیں اور اس نے ہار مانتے ہوئے آسکر کو دیکھا پھر ہال کو۔

"یہاں بہت روشنی ہے یہ موم بتیاں' مشعلیں اور آگ کے الاؤ انہیں بجھانا ہوگا۔ انہیں تب تک روشن نہ کیا جائے جب تک سارے جگنو واپس نہیں چلے جاتے' ایک ایک جگنو۔ بورشے انہیں بے خود کردیتا ہے' وہ آگ کی تپش کو بھی محسوس نہیں کرسکیں گے اور جل جائیں گے۔"

آسکر مسکرا دیا۔ "میں روشنیاں گل کرادیتا ہوں تم فکر نہ کرو' تمہارے جگنوؤں کو کچھ نہیں ہوگا۔"

☼ ☼ ☼

مشعلیں اور آگ کے الاؤ بجھادیے گئے۔ کرسٹل بند موم بتیاں روشن رہیں' ہال نیم اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ماریا کو افسوس ہوا کہ اس نے آسکر سے کیوں کہا کہ وہ ایک بار اس کے لیے بورشے بجادے گی۔ اچھا ہوتا کہ وہ کہہ دیتی کہ وہ انکل ولسن سے کیا گیا وعدہ کسی صورت نہیں توڑ سکتی۔ اسی وقت اس نے یہ سیکھ لیا کہ وعدے کو عارضی طور پر معطل نہیں کیا جاسکتا اسے پورے عہد کے ساتھ نبھانا پڑتا ہے۔

بورشے بجانا اسے ہمیشہ سے خوشی دیتا تھا لیکن وہاں موجود طبقہ اشرافیہ کے چہروں کی سختی' ان کی مصنوعی بناوٹ' ان کے انداز و اطوار اتنے دل پسند نہیں تھے کہ وہ ان کے لیے بورشے بجاتی۔ بورشے سادہ دلوں کا ساز تھا جن کے اطوار انسان دوست ہوں۔ بورشے ان سخت دلوں کے لیے بے کار تھا جو محبت اپنی شرائط پر کرتے ہیں' عزت دینے سے پہلے مقام ٹٹولتے ہیں رحم کا استعمال اپنی ترجیحات کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت وہ آسکر کو یہ سب باتیں نہیں سمجھا سکتی تھی۔

وہ ہال کے وسط میں آکر کھڑی ہوگئی اور بورشے کو اپنے پاؤچ سے نکال لیا۔ نہ جانے کیوں آج اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کاش جوزفین آسکر کی بہن نہ ہوتی' کاش وہ اور آسکر مل کر جنگل میں بورشے کی دھن پر رقص نہ کیا کرتے۔ کاش آسکر اس کے لیے اتنا خاص نہ ہوتا۔

آسکر کو دیکھتے ہوئے اس نے بورشے کو منہ سے لگایا اور اس پر اپنی سانسیں چھوڑ دیں۔ دھن کی ابتدا

نے ہال میں سکوت طاری کر دیا۔ اس کی گلابی فراک کی جھلمل نے نیم اندھیرے ہال کو ستاروں سے بھر دیا۔ اس کے گندھے ہوئے بالوں میں لگی سنہری پن اس کے حسن کے آسمان پر چاند کی مانند ہو گئی۔

آسکر اس پر سے نظریں نہیں ہٹانا چاہتا تھا۔

ابتدائی دھن انتہا کیے بجنے لگی۔۔۔ ماریا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ہال میں موجود مہمان جو پہلے بے توجہی سے ساز سن رہے تھے اور انہیں اب متوجہ ہونا پڑا۔ ماریا کی خوب صورتی دو چند ہونے لگی اور وہاں کھڑے لوگوں کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

دھن وسط کی طرف جانے لگی۔۔۔ ماریا نے اپنی آنکھیں کھولیں۔۔۔ چند جگنو اسے نظر آئے۔۔۔ ماریا مسکرا دی۔ بورشے اور جگنو ہمیشہ سے اسے بے خود کر دیتے تھے۔ وہ بھول جاتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے پھر سے اپنی آنکھیں بند کیں اور دھن کو پوری توجہ سے بجانے لگی۔ کھلی کھڑکیوں سے جگنو قطار باندھے اپنی اپنی دھن میں مگن اس کی دھن کی طرف آنے لگے اور ہال کی وسعت میں بکھرنے لگے۔

دھن اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ہال کی نیم تاریکی میں ننھے **قمقمے** پرواز کرنے لگے۔ ماریا نے آنکھیں کھولیں۔ اپنی فراک کا ایک کونا پکڑ کر اٹھالیا اور ہال کے عین وسط میں جھک کر کورنش بجایا اور پھر سر اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ دھن نے صبر کا ایک سانس لیا' وہ رکی ٹھہری اور نئی تازگی سے بجنے کے لیے کمربستہ ہو گئی۔

آسکر نے دنیا میں اتنی خوب صورتی اور ایسی معصومیت کے ساتھ نہیں دیکھی تھی۔ ایسی بے خودی اور اتنی محویت کے ساتھ نہیں دیکھی تھی۔ ساز تو جہاں بھر میں بجتے ہیں' ساز کے کمال میں ایسی جمالیت نہیں دیکھی تھی۔ ہال کے کونوں سے روشنیاں اڑتی ہوئی آئیں اور ماریا کے آس پاس منڈلانے لگیں۔ مہمانوں نے سر اٹھا اٹھا کر دیکھا اور بے ساختہ داد دینے لگے۔ ان کی سرخوشی کا عالم قابل دید تھا۔

"ناقابل یقین۔۔۔" آسکر کے دوست نے بے ساختہ کہا۔ مسٹر ہیک بھی سر اٹھا کر دیکھ رہے تھے لیکن وہ یہ سب دیکھ کر خوش نہیں ہو سکے اور انہوں نے جوزفین کو ملامتی نظروں سے دیکھا۔

فراک کا کونا ماریا کے ہاتھ میں ہی تھا۔ اس کی دھن کی لے بدلی اور سب جگنو اڑ کر اس کی فراک کے اسی کونے کے ساتھ آ لگے۔۔۔ فرماں برداری۔

"اوہ۔۔۔" ہال میں مشترکہ آواز گونجی اور تالیاں بھی۔ آج بورشے کی تقریب رونمائی تھی تو ماریا بھی اس رونمائی کو عروج تک لے جانا چاہتی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ بورشے آدھا اور ادھورا نہیں بجتا۔

دھن نے پھر لے بدلی تو جگنو ایک ہی دائرے میں اڑ کر اس کے گرد چکر لگانے لگے۔ چکر لگاتے رہے چکر لگاتے رہے۔۔۔ تیزی سے۔۔۔ فرماں برداری سے۔۔۔ محبت سے۔ ان کے دائرے میں موجود ماریا بھی ان کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ دھن کی لے پھر بدلی اور جگنو ایک دائرے میں سمٹ کر ہال کی وسعت میں نیچے سے اوپر اٹھ گئے۔ سب سر اٹھا کر دیکھنے لگے۔

"ناقابل یقین۔۔۔" ملی جلی آوازیں ابھریں۔

بورشے اب روشنی کے **قمقموں** کو رقص کروا رہا تھا۔ ماریا اپنے آپ کو حالت رقص میں رکھتے ہوئے بورشے بجا رہی تھی۔ نظارہ لاجواب تھا اور جنون جواب طلب۔ ماریا خود بھی یہ بھول گئی تھی کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور آسکر بھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ماریا کے دائرے میں گھس جائے اور اس کے ساتھ مل کر رقص کرے۔ ہال میں جگنوؤں کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بڑھتے بڑھتے اتنے زیادہ ہو گئے تھے کہ سارا ہال ان سے بھر گیا تھا۔ اگر ان کی تعداد گنی جاتی تو بھی نہ گنی جا سکتی۔ ماریا کو اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ وہ آسکر کی طرف ہی دیکھ لیتی۔

وقت گزر رہا تھا۔۔۔ بورشے بج رہا تھا۔۔۔ جگنوؤں کا رقص جاری تھا۔۔۔

اور پھر۔۔۔ دیواروں سے لگی **مشعلیں**۔۔۔ ہال کی وسعت میں جگہ جگہ بنے روشنی کے الاؤ یک دم بھڑکے۔۔۔ آگ نے یک دم جیسے چھت کو چھوا۔۔۔

نئے سال کا باقاعدہ آغاز ہوا...

ماریا نے ایک دل خراش چیخ ماری... بورشے اس کے ہاتھ سے دور جا گرا... جگنوؤں کا ڈھیر کا ڈھیر ہال کی چھت سے ہو کر اس تک آتا زمین پر جل کر ڈھیر ہو گیا۔ وقت کی تبدیلی کی ہلکی سی جنبش سے یہ ڈھیر بڑھتا گیا بڑھتا ہی گیا ماریا کا سفید رنگ جل کر سیاہ ہوا۔ اس کی آنکھیں بے نور ہوئیں۔ وہ زمین پر ڈھیر ہو کر بیٹھ گئی۔ ہچکی' آخری سانس کی طرح اس کے جسم سے نکلی۔ اس کی جیسے روح پرواز کر گئی۔

''آگ کس نے جلائی ہے؟'' آسکر پوری قوت سے دھاڑا...

''آپ نے ہی تو کہا تھا... بارہ بجتے ہی سب الاؤ روشن کر دیے جائیں... آپ کے حکم پر ہی تو...''

آسکر نے لپک کر ان سب ملازموں تک جانا چاہا جو نیم اندھیرے میں اپنی اپنی جگہ مستعد کھڑے آگ روشن کر چکے تھے لیکن اسے ماریا کی فکر تھی۔

''ماریہ...'' آسکر فوراً اس کے پاس جا کر نیچے بیٹھ گیا۔ ایوا نے جلدی سے لپک کر بورشے اٹھایا اور اسے ماریہ کے ہاتھ میں دینا چاہا۔ اتنی سی دیر میں ماریہ کی آنکھیں زندگی کی طوالت کے سارے آنسو بہا چکی تھیں۔

''ماریہ...'' آسکر نے ہاتھ بڑھا کر ماریہ کے چہرے کو اوپر اٹھانا چاہا لیکن ماریہ نے طیش کی شدت سے ایک زوردار تھپڑ آسکر کے منہ پر دے مارا...

ہال جو پہلے سے ہی سناٹے کا شکار تھا۔ تھپڑ کی گونج سے بالکل ہی بہرا ہو گیا۔

آسکر سکتے کی حالت میں ماریہ کو دیکھنے لگا۔ اسے ماریہ سے ہر رویہ کی توقع تھی سوائے اس کے۔ دکھ سے آسکر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بے عزتی کا احساس 'جلتا کوئلہ بنا' روح بند ہو گیا۔

ماریہ اپنی جگہ سے اٹھی اور زمین پر نظریں گاڑے' سوختہ جگنوؤں کو دیکھتے' انہیں اپنے پیروں تلے آنے سے بچاتے باہر کی طرف یک دم بھاگی۔ آسکر بھی ماریہ کے پیچھے بھاگا۔ جس وقت وہ راہ داری سے گزر کر' سیڑھیاں اتر رہی تھی' آسکر نے اسے پیچھے سے تھام کر روک لیا۔

''میری بات سنو ماریہ... تم ایسے نہیں جا سکتیں۔''

ماریہ نے نفرت سے آسکر کو دیکھا اور اپنا بازو اس سے آزاد کرانا چاہا۔

''میں نے سب کو سختی سے منع کیا تھا کہ میرے کہنے سے پہلے روشنی نہ کی جائے۔ انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔''

''غلط فہمی تو مجھے تھی کہ تم سب اچھے لوگ ہو...''

اس جملے نے آسکر کو چونکا دیا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟ تمہیں لگتا ہے یہ پہلے سے طے شدہ تھا کہ انہیں جلایا جائے گا۔''

''طے شدہ تھا یا نہیں لیکن وہ جل چکے ہیں۔ زندگی کے معاملات میں ایسے غفلت نہیں برتی جا سکتی کہ وہ موت تک لے جائیں۔''

''تم میرے ساتھ اندر آؤ۔ میری بات سنو۔''

''تمہیں لگتا ہے میں تمہاری بات سننے کے لیے تیار ہوں گی۔ تم نے میرے باپ کو جلا دیا۔'' ماریہ چلائی۔

''ایسا کچھ نہیں ہوا' تم جذباتی ہو رہی ہو۔''

''تم نے مجھ سے کیوں کہا کہ میں بورشے بجاؤں؟ تم نے یہ کیوں چاہا کہ جوزفین کی عزت قائم رہے لیکن میرے جگنو جان سے جائیں؟ گاؤں کے گنوار لوگ تم جیسے لوگوں کی بے رحمی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ انکل ولسن نے ٹھیک کہا تھا شہر کے لوگوں کے لیے بورشے کسی تماشے سے زیادہ اہم نہیں ہو گا۔ وہ محظوظ ہوں گے' تالیاں بجائیں گے اور فراموش کر دیں گے۔ مجھے ایسے لوگوں کے سامنے بورشے کو بے نقاب نہیں کرنا چاہیے۔'' ماریہ نے چلا کر کہا۔

''تمہیں لگتا ہے میں بے رحم ہوں۔'' آسکر نے بھی چلا کر کہا۔

''ہاں! بے رحم ہو تم...''

"تم ان حشرات کے لیے مجھے بے رحم کہہ رہی ہو... مر گئے ہیں تو اور آجائیں گے۔ تم ان کے لیے میری بے عزتی کر رہی ہو۔" آسکر کا انداز اتنا ہتک آمیز تھا کہ تکلیف کے احساس سے ماریہ جھلس گئی۔

"حشرات... جو مر گئے ہیں' وہ اب واپس نہیں آئیں گے۔ انہیں موت کے لیے میں نے بلایا... اس بورشے نے بلایا..." ماریہ نے ہاتھ میں پکڑے بورشے کو زور سے آسکر کے قدموں میں دے مارا۔

"اس موت کے پیامبر کو اب تم رکھو... زندگی کے خاتمے کو تم بجاؤ... بے رحمی تمہاری ہی میراث لگتی ہے۔"

تیزی سے ماریہ سیڑھیاں اترتی چلی گئی اور جس گلابی فراک کے کونوں پر کچھ دیر پہلے جگنو آکر ٹھہرے تھے' وہ فرشی فراک زمین کو چھوتی اپنی کم مائیگی کا ثبوت دینے لگی۔ ماریہ بیرونی گیٹ سے بھاگتی ہوئی نکل گئی۔

اندر نئے سال کا جشن شروع کر دیا گیا تھا۔ رقص پھر سے شروع تھا... موسیقی کو نئے شوق سے بجایا جا رہا تھا۔ تماشا ختم ہو گیا تھا۔ بورشے اور جلے ہوئے جگنوؤں کو فراموش کر دیا گیا تھا۔ آسکر سیڑھیوں کے کنارے کھڑا رہ گیا تھا۔

اور بورشے آسکر کے قدموں میں پڑا اپنی موت کا ماتم کرتا رہا۔

☆ ☆ ☆

مسٹر ہیگ' آسکر کے کمرے میں آئے۔ وہ کسی کتاب کو پڑھنے کے جتن کر رہا تھا۔

"تمہیں ماریہ کے پاس جانا چاہیے تھا۔"

"اس کا خیال ہے میں بے رحم ہوں۔ میرا بھی یہ ہی خیال ہے۔ میں اسے اپنی بے رحمی سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے لیکن زیادہ دیر نہ کرنا... معصوم لوگ انتظار کرنے کے بہت عادی ہوتے ہیں۔" کہہ کر وہ چلے گئے۔

اگلے دن صبح ہی آسکر نے سارے معاملات معلوم کر لیے تھے۔ ملازموں کو یہ ہی حکم ملا تھا کہ عین جگنوؤں کے رقص کے دوران وہ آگ کے الاؤ روشن کر دیں اور سب ایک ساتھ روشن ہوں۔ یہ جوزفین کا حکم تھا' لیکن اس کا اعلان آسکر کے نام سے ہونا چاہیے۔ سب ملازمین کو جوزفین ہی دیکھتی تھی اور وہ اسی کا حکم مانتے تھے۔ ماں کی موت کے بعد سارے گھر کا انتظام وہی دیکھتی تھی۔

وہ جوزفین کے پاس گیا جو گھر کے حسابات لکھنے میں مصروف تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد اس نے اپنی زندگی کو گھر کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت گھر کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی تھی اور شاید اسی سب نے اسے بدل کر رکھ دیا تھا۔ آسکر کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔

"آسکر تم... آؤ بیٹھو..." جوزفین نے اسے ایسے کھڑے دیکھ کر کہا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا جوزفین؟" اس نے جوزفین کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ وہ جانتی تھی جب آسکر ایسے بات کرتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے۔ میں سب جان گیا ہوں۔

کچھ دیر کے سکوت کے بعد جوزفین نے کندھے اچکا دیے۔ "تمہیں ملازموں کی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔"

"سچ کو سامنے آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ ماں کے مرنے سے پہلے اکثر تم یہ بات کیا کرتی تھیں۔"

جوزفین نے آسکر کے چہرے کی سنجیدگی کو دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لی۔ "ازابیلا مجھے بہت پسند ہے۔ وہ میری دوست بھی ہے۔ تم بھی اسے پسند کرتے ہو۔ تم کچھ اور وقت اس کے ساتھ گزارو گے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ وہ تمہارے لیے کس قدر مناسب ہے۔"

آسکر نے افسوس سے جوزفین کو دیکھا۔ "تمہیں ماریہ ناپسند تھی۔"

"میں اسے ناپسند نہیں کرتی آسکر... وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔"

"لیکن ازابیلا زیادہ اچھی ہے۔" اس نے زہر خند کہا۔

"ہاں۔۔۔ مجھے بہت آگے تک کا سوچنا ہے آسکر۔۔۔ ازابیلا کا تعلق ایک اونچے خاندان سے ہے۔ تم جانتے ہو کہ شاہی خاندان سے بھی ان کے تعلقات ہیں۔"

آسکر کی نظروں میں جوزمین کے لیے افسوس بڑھتا جارہا تھا۔ "تم نے ماریہ کو جوزفین کی جگہ رکھ کر کیوں نہیں سوچا؟"

"ماریہ جوزفین کی جگہ لے ہی نہیں سکتی تھی آسکر۔۔۔ وہ ایک گنوار لڑکی ہے۔ کیا تم جوزفین اور ماریہ میں فرق محسوس نہیں کرتے؟"

آسکر استہزائیہ ہنس دیا کیا یہ بات وہی جوزفین کہہ رہی ہے۔ جو رات کو سونے سے پہلے ہاتھ باندھ کر دعا کیا کرتی تھی۔"

جوزفین نے الجھ کر آسکر کو دیکھا۔

"وہ دعا کیا کرتی تھی کہ دنیا میں سب انسان ایک جیسے کپڑے پہنیں، ایک جیسا کھانا کھائیں، ایک جیسے گھر میں رہیں، پھر مل کر سب رقص کریں۔"

جوزفین آسکر سے رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ "وہ سب بچکانہ باتیں تھیں۔"

"ایک بار وہ مسز ولیم سے الجھنے لگی کیونکہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے ملازموں کے کپڑے سستے اور بدرنگ تھے۔ مسز مارک سے کیونکہ وہ اپنے ملازموں کو وہ کھانا نہیں دیتی تھیں، جو وہ خود کھاتی تھیں۔ وہ دوسروں کے کچن میں بہانے سے صرف اس لیے جایا کرتی تھی تاکہ دیکھ سکے کہ اس گھر کے ملازم کس حال میں ہیں۔ ایک بار وہ ماں سے تکرار کرنے لگی، کیونکہ وہ اس کے پرانے کپڑے ملازمہ کی بیٹی کو دے رہی تھیں، جو جوزفین کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ جوزفین کا کہنا تھا کہ اس کی دوست کو اس کی اترن نہیں دی جا سکتی یا اسے نیا لباس لے کر دیا جائے یا پرانا بھی نہ دیا جائے۔ یہ اس کی بے عزتی کے مترادف ہو گا۔

جوزفین نے کرسی کی پشت میں اپنی انگلیاں گاڑ دیں۔

"جوزفین! کیا ماریہ اس ملازمہ کی بیٹی جیسی بھی نہیں تھی جسے تم اپنے گھر میں عزت دے سکتیں۔ مس ازابیلا دنیا کی خوب صورت خواتین میں سے ایک ہیں یا ان کا تعلق اونچے خاندان سے ہے، پھر بھی وہ ماریہ کی جگہ نہیں لے سکتیں۔ اگر تمہیں ماریہ اور مس ازابیلا میں سے کسی ایک کے لیے سودے بازی کرنی ہی تھی تو پہلے کرتیں، میں ماریہ کو بے رحمی سے بچا لیتا اور مس ازابیلا کا ہاتھ تھام لیتا۔"

"میں نے سب تمہارے لیے کیا آسکر۔۔۔"

"میں جانتا ہوں۔ تم نے یہ سب میرے لیے کیا۔ اور برا کیا۔۔۔ ماریہ نے کہا تھا کہ بورشے ہر اس دل کی آواز ہے، جس کے دل میں برتری کا احساس نہیں ہے، جو محبت کرنا اور عزت دینا جانتا ہے۔ بورشے اسی لیے تمہارے دل میں جگہ نہیں بنا سکا جوزفین۔۔۔"

اس آخری بات نے جوزفین کا حال کچھ ایسا کر دیا کہ ایک آنسو اس کی آنکھ سے نکل کر اس کے دل پر بہہ گیا۔

☼ ☼ ☼

مسز ایلی کے گھر اسے معلوم ہوا کہ ماریہ اگلے ہی دن واپس گاؤں چلی گئی تھی۔ وہ گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا۔ انکل ولسن سے ملتے ہی اس نے انہیں سب بتا دیا۔ وہ خاموشی سے سب سنتے رہے۔

"وہ اپنا بورشے بھی میرے پاس چھوڑ گئی ہے۔ وہ تو بورشے کے بغیر ایک دن نہیں رہتی، پھر اتنے دن کیسے رہی؟"

انکل ولسن نے چونک کر بورشے کو دیکھا۔ "اوہ! میں سمجھ گیا۔"

"کیا؟" آسکر کو بے چینی ہو رہی تھی کہ وہ ماریہ کو وہاں اس سے ملنے کے لیے بلا کیوں نہیں رہے تھے۔

"اس نے خط میں یہ کیوں لکھا تھا کہ۔۔۔ مجھے جنگل سے خوف آتا ہے، رات کی آمد میرے لیے ایک ایسا خوف ناک خواب بن چکی ہے جس سے میرے جسم میں تکلیف سے سوئیاں چبھتی ہیں۔"

آسکر سناٹے میں آگیا اور اگلا سوال پوچھنے کے لیے اس نے بڑی ہمت مجتمع کی۔ ”خط کیوں لکھا؟ ماریہ کہاں ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”جس دن ماریہ یہاں واپس آئی تھی اس کے تین دن بعد ہم نے اسے گھر میں نہیں پایا۔ اس کا ایک خط موجود تھا۔ اس نے لکھا کہ وہ اپنی ماں کے پاس جارہی ہے۔“ انکل ولسن نے ماریہ کا خط لاکر آسکر کو دے دیا۔

آسکر نے ایک دو ”تین“ پھر کئی بار اس خط کو پڑھا اور بے قراری سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

”اور بورشے... اس کا کیا ہوگا؟“ اپنے نام کے بجائے اسے بورشے کا نام لینا پڑا۔

”اب یہ تمہارا ہے آسکر.....“

آسکر کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اسے انکل ولسن سے اتنی سفاکی کی توقع نہیں تھی۔

”یہ میرا کیسے ہوسکتا ہے۔ ماریہ تو اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔“

”اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ اب یہ تمہارا ہے۔“ کتنی ہی دیر آسکر سر جھکا کر بیٹھا رہا۔ ”مجھے ماریہ کے پاس جانا ہے آپ مجھے پتا دے دیں۔“

”آسکر! مسز جین کے ساتھ ہمارا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ میں ماریہ کے لیے بھی فکر مند ہوں۔ وہ سال میں ایک آدھ بار ماریہ کو ایک خط لکھ دیا کرتی تھیں۔ کبھی تو سالوں بھی گزر جاتے تھے۔ دراصل البرٹ کی وجہ سے ہمارے مسز جین کے ساتھ تعلقات زیادہ اچھے نہیں رہے تھے۔ وہ بھی ہمیں پسند نہیں کرتی تھیں۔ ماریہ کے کمرے کی تلاشی لی تو وہاں ایسا کچھ نہیں ملا جو مسز جین کے بارے میں بتا سکے۔ ماریہ ان کے خطوط بھی ساتھ لے گئی ہے۔ ماریہ ایسے ہی چھپ کر جانا اور رہنا چاہتی تھی۔“

”ماریہ نے کبھی تو ذکر کیا ہوگا کہ اس کی ماں کہاں رہتی ہے۔“

”مجھے ایک ہی جملہ یاد ہے، ماریہ نے کہا تھا کہ ماں فرانس چھوڑ کر جارہی ہے اور یہ بھی کافی پرانی بات ہے آسکر۔“

آسکر پھر سے وہ خط پڑھنے لگا جو ماریہ لکھ کر گئی تھی جس کی آخری سطر کچھ ایسے تھی۔

”ایسے گھر چھوڑ دینے کے لیے مجھے معاف کردیجیے گا انکل ولسن! لیکن اگر آپ میری کیفیت سمجھ جانے میں کامیاب ہوگئے تو آپ مجھ سے ناراض نہیں رہیں گے۔“

”ماریہ ہمیشہ سے ایک خوش باش بچی رہی ہے آسکر! وہ چھ سال کی تھی جب اس کے فادر کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔ وہ نہ دنیا سے بے زار تھی، نہ مایوس۔ اس کے پاس ہر دکھ درد کا علاج بورشے تھا۔ اس نے کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔ اس نے ہمیں کبھی بھی تنگ نہیں کیا۔ وہ بہت پیاری، فرماں بردار بچی رہی ہے۔ میں نے اسے بورشے بجانے سے منع کردیا تو وہ چھپ کر بجانے لگی۔ میں یہ ہی چاہتا تھا کہ وہ چھپ کر بجالے، لیکن سب کے سامنے آکر نہیں۔ اگر اس نے بورشے کو خود سے الگ کردیا ہے تو اس کا مطلب.....“

آسکر کے چہرے پر پرچھائیاں بڑھ گئیں اور اس نے تاریک رات کی طرح اپنے اندھیرے کو ٹٹولا، انکل ولسن، آسکر کو دیکھ کر اپنی بات مکمل کرنے کی جرات نہیں کرسکے۔

”کیا مجھے کسی ایسے رشتے دار کے بارے میں بتاسکتے ہیں جو ماریہ کی ماں کے بارے میں جانتے ہوں۔“

”میں ہی ماریہ کا سب سے قریبی رشتے دار ہوں۔ چچا ہوں اس کا۔ میں نے سب رشتے داروں سے معلوم کرلیا ہے۔ کچھ جگہوں پر خطوط لکھے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہاں سے کوئی حوصلہ افزا جواب آسکتا ہے۔“

”اگر آپ کو ماریہ کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو آپ مجھے فوراً بتادیں گے۔“

”تمہیں فوراً بتادینا فرض ہے مجھ پر آسکر۔“

آسکر نے ساری دنیا کو جنگل ہوتے دیکھا اور اسی جنگل کو ابدی نیند سلا دینے والے جادوگر کو بھی.... جو وہ خود تھا۔

مسٹر بروک ہیگ نے اسے ایسی ناکام چال سے چل

کر گھر آتے دیکھا کہ ان کے دل پر وزنی بوجھ آ گرا۔ وہ اسکاٹ لینڈ سے بھی ہو آیا تھا جہاں ماریہ کے کچھ رشتے دار رہتے تھے۔ اس کے پاس ماریہ کی ماں اور سوتیلے باپ کے بارے میں ان کے ناموں کے علاوہ کوئی معلومات نہیں تھی۔ گھر واپسی پر اس نے اپنی جیب سے بورشے نکال کر اپنے ہاتھ میں لیا اور کتنی ہی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اسے اپنے منہ سے لگا لیا.... رات ایسے ہی بیت گئی۔ جوزفین' روزا اور مسٹر بروک ہیگ ساری رات بورشے کو روتے ہوئے سنتے رہے۔

☆ ☆ ☆

اگلے دان صبح ہی مسٹر ہیگ اس کے کمرے میں آئے۔ بورشے کو سینے پر رکھے' وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے اونگھ رہا تھا۔ انہوں نے اسے اٹھا کر بستر تک جانے کے لیے کہنا چاہا لیکن پھر رک گئے اور اس کے سامنے بیٹھے رہے۔ کچی پکی نیند سے جاگ کر اس نے کمرے میں دیکھا تو مسٹر ہیگ کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں تمہارے لیے پریشان ہوں آسکر...." مسٹر ہیگ اتنا ہی کہہ پائے۔

اٹھ کر اپنا لباس درست کرتا آسکر کوئی جواب نہ دے سکا۔

"اتنے ہفتوں بعد تم گھر واپس آئے ہو۔ تم نے اطلاع دینا بھی مناسب نہیں سمجھا۔"

"اگر میں اسی رات ماریہ کے پیچھے چلا جاتا تو وہ مجھے مل جاتی' وہ ایسے غائب نہ ہو جاتی۔" وہ یک دم ان کے سامنے گھٹنوں کے بل آ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں...." مسٹر ہیگ نے سر ہلایا۔

"مجھے دکھ تھا کہ اس نے مجھے بے رحم کیوں کہا۔ مجھے دکھ تھا کہ اس نے میرے منہ پر تھپڑ کیوں مارا۔ مجھے اپنے دکھ کی پروا تھی' اس کے نہیں...." مسٹر ہیگ اسے دیکھتے رہے۔

"بولو میں سن رہا ہوں۔"

جب تک انسان کی انا بلند رہے گی۔ اس کی محبت بلند نہیں ہو سکے گی۔ اس رات میری انا بلند رہی اور میں اس کے پیچھے نہیں گیا۔ گاؤں کی ایک معمولی لڑکی کے پیچھے بھاگ کر جانا' مجھے اپنی حیثیت کے مقابلے میں معمولی لگا۔"

"تم ایک محبت کرنے والے اور ہمدرد انسان ہو آسکر.... تمہیں اپنے بارے میں وہم نہیں پالنے چاہئیں۔"

"ہم سب ہی محبت کرنے والے اور ہمدرد انسان ہوتے ہیں پاپا۔ اس وقت تک جب تک ہماری محبت اور ہمدردی کا امتحان نہ لے لیا جائے۔ ہم سب ہی اچھے ہوتے ہیں' جب تک ہماری برائی کا نقاب نہ الٹ دیا جائے۔"

"میں تمہاری بات سے متفق ہوں۔"

"مجھے اندازہ تھا کہ ماریہ بہت حساس ہے۔ وہ صرف میرے لیے آئرلینڈ آئی تھی' مجھے اس بات کا یقین ہے۔ وہ بورشے بجائے بغیر نہیں رہا کرتی تھی لیکن پھر وہ میرے لیے جنگل میں بورشے لے کر جایا کرتی تھی۔ مجھ سے ملنے کے بعد ہی اس نے نئی دھنوں کو بجانا شروع کر دیا تھا۔ پھر بھی.... پھر بھی میں اس کے پیچھے بھاگ کر نہیں جا سکا۔ میں اس کا راستہ نہیں روک سکا۔ چند قدم ہی تو تھے.... وہ میرے سامنے ہی تو مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اسی وقت اسے روک لینے میں کیا حرج تھا۔ اسے بھی یہ ہی دکھ ہو گا کہ میں نے اسے جانے دیا۔"

"اس کے ساتھ ہمیشہ یہ دکھ نہ رہنے دو کہ تم نے اسے جانے دیا۔"

آسکر نے سر اٹھا کر مسٹر ہیگ کو دیکھا۔

"یہ ملاقات یہیں ختم ہو گئی۔"

چند دنوں بعد آسکر مسٹر ہیگ کے پاس آیا۔ "آپ نے میرے بارے میں آج تک جو کچھ کہا' وہ سچ ثابت ہوا۔ آپ نے کہا تھا کہ میں کبھی اچھا شکاری نہیں بن سکوں گا اور یہ ہی ہوا۔ ایک وقت آیا جب میں رات دن شاعری کیا کرتا تھا۔ پھر میں نے کینوس اور رنگ خرید لیے۔ وہی ہوا جو آپ نے کہا تھا' نہ میں شاعری کی

گہرائی میں اتر سکا' نہ رنگوں سے مزین کچھ تخلیق کرسکا۔ اب آپ بتائیں 'کیا میں ماریہ کو ڈھونڈ لوں گا۔ میں سچ سننا چاہتا ہوں۔"

"اوہ! میرے پیارے آسکر! تم اچھے شکاری ضرور بنتے اگر تم بہادری سے اپنی کمزوری سے مقابلہ کرنا سیکھ جاتے۔ تم اچھے شاعر بھی ضرور بن جاتے اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ احساسات کی ترجمانی زبان اور قلم سے پہلے روح سے کی جاتی ہے۔ تم مصور بھی بنتے اگر رنگوں سے پہلے کی بے رنگ دنیا کو دیکھنا سیکھ جاتے۔"

"کیا میں ماریہ کو ڈھونڈ لوں گا؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"یہ تم طے کرو گے... یا..."

"یا...؟"

"یا بورشے...؟"

"بورشے... بورشے..." وہ بڑبڑایا۔

اس رات بورشے پھر رات بھر بجتا رہا... پھر سے روتا... غم زدہ... دل گرفتہ...

✡ ✡ ✡

نئے سال کی سردی اپنے عروج پر ہی رہی اور وہ برفانی رات میں جنگل میں اپنے گھوڑے پر سوار اس وقت کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا' جب وہ پہلی بار یہاں آیا تھا۔ اس نے بورشے کو اپنے منہ سے لگایا اور اس دھن کو ذہن میں جگا کر اپنی سانسوں سے نکال کر بورشے کی دھن تک لانا چاہا جو اس جنگل میں اس رات گونج رہی تھی۔ بورشے سے چند بے ہنگم آوازیں نکلیں اور جواب میں اس کے گھوڑے کی ناراض ہنہناہٹ۔ پھر بھی وہ کتنی ہی دیر تک کوشش کرتا رہا' لیکن بورشے سے دھن کے نام پر ایک سر بھی نہیں نکلا۔

اگلے دن گاؤں والوں نے ہیگ خاندان کے خوب صورت جوان بیٹے کو چراگاہ میں ٹہلتے' گھاس پر لیٹے' درخت سے پیٹھ لگائے بیٹھے' جھیل کے پانی میں پیر سے ارتعاش پیدا کرتے' بورشے بجانے میں خود کو ہلکان کرتے دیکھا۔

"یہ ایک لڑکی کا ساز ہے... تمہیں زیب نہیں دیتا..." گاؤں کے ایک بوڑھے نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔

آسکر ہنس دیا۔ "یہ کسی صنف کا نہیں انسان کا ساز ہے۔"

اس کا ماننا تھا کہ ماریہ کا گاؤں اسے بورشے کی کچھ دھنیں دے دے گا' لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جوزفین نے اسے ایک لمبا خط لکھا تھا' اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی شادی کی تیاریاں اس وقت تک شروع نہیں کرسکتی جب تک وہ واپس نہیں آجاتا۔

"تمہیں اپنا خیال رکھنا نہیں بھولنا چاہیے۔" جوزفین کے لیے جب وہ واپس آگیا تو اس نے نظریں چرا کر اس کے بڑھے ہوئے بالوں اور بے ہنگم مونچھوں کو دیکھ کر کہا۔

وہ مسکرا دیا۔ "تم صرف اپنی شادی کے دن کی فکر کرو' میری نہیں۔"

شادی کے دن جوزفین کا ہاتھ پکڑے جب وہ اسے دولہا کے پاس لے جا رہا تھا تو جوزفین نے اپنے سفید نقاب کے پیچھے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے معاف کردو آسکر..."

آسکر نے جوزفین کی طرف محبت سے دیکھا۔ "نئی زندگی کی شروعات' پرانی غلطیوں کی نشان دہی سے نہیں کرنی چاہیے۔" کہہ کر اس نے جوزفین کا ہاتھ اس کے دولہا کے ہاتھ میں دے دیا۔

✡ ✡ ✡

"تم لزا کو پیانو کیوں نہیں سکھا دیتیں۔" ایک دن ماں نے اس سے کہا۔ اسے تھوڑا بہت جتنا بھی پیانو بجانا آتا تھا' اس نے لزا کو سکھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی کیونکہ لزا خود کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی تھی۔

"کیا مسٹر ولسن نے میری بیٹی کو پیانو سکھانے کی زحمت بھی نہیں کی۔" ماں کو بہت برا لگا۔

"انگلینڈ میں تم وہ واحد لڑکی ہو گی جو اتنا برا پیانو بجاتی ہو گی۔ تمہاری تربیت پر انہوں نے بالکل توجہ نہیں دی۔ کیا اسی لیے تمہارے باپ نے تمہیں ان کے پاس چھوڑا تھا۔"

"انہوں نے مجھے ایوا اور کیتھی کی طرح ہی رکھا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔"

"کیا کیتھی اور ایوا کو پیانو بجانا آتا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ بہت اچھا۔۔۔"

"پھر تمہیں کیا بجانا آتا ہے؟ کیا سیکھا ہے تم نے ماریہ؟"

"میں نے۔۔۔ م۔۔۔"

"بولو' جواب دو۔۔۔ کیا تم جانتی ہو' یہاں لڑکیاں کیا کچھ کرنا جانتی ہیں' تمہارا تعارف کراتے ہوئے تو مجھے شرمندگی ہی اٹھانی پڑے گی۔"

ماریہ سر جھکا کر بیٹھی رہی۔

"میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے انداز و اطوار میں شائستگی بھی نہیں ہے' تم بالکل اجڈ گنوار لگتی ہو۔"

"میں گنوار ہی ہوں ماں۔"

"اسی لیے میرے بار بار بلانے پر بھی تم میرے پاس نہیں آئیں' تاکہ تم پھوہڑ اور گنوار رہ سکو۔" ماریہ خاموشی سے سنتی رہی۔

اس کی ماں کے سات بچے تھے اور وہ ان کی دیکھ بھال میں کتنی بھی مصروف رہتی تھی لیکن وہ اپنا خیال رکھنا نہیں بھولتی تھی۔ انہیں اپنے لباس' اپنی خوب صورتی کی بہت فکر رہتی تھی۔ جب ماریہ دو سال کی تھی' تب مسٹر البرٹ اور مسز جین نے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ ایک ایسے انسان کے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھیں جسے سمندر سے محبت تھی۔ ایک جہاز راں کی واپسی کا انتظار شروع شروع میں تو انہیں اچھا لگا' پھر انہیں کوفت ہونے لگی اور وہ دونوں الگ ہو گئے۔ ماریہ اپنے چچا کے ساتھ رہنے لگی اور وہ اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ آئرلینڈ چھوڑ کر چلی گئیں۔

ماریہ کو اس بات کا کبھی دکھ نہیں رہا تھا کہ ماں نے اسے چچا کے پاس ہی رہنے دیا تھا۔ لیکن ماں کا انکل ولسن کے لیے سخت رویہ اسے اچھا نہیں لگا۔ وہ خاموشی سے سن بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے کانوں میں شائیں شائیں سی ہوتی رہی تھی۔

سات بچوں' چار ملازموں اور دو منزلہ گھر کی دیکھ بھال ماریہ نے کرنی شروع کی تو مسز جین خوش ہو گئیں اور انہوں نے انکل ولسن کے لیے سخت الفاظ استعمال کرنے بند کر دیے۔ مسز جین سر شام ہی کہیں نہ کہیں چلی جاتی تھیں۔ ان کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ گھر ان کی سہیلیوں کی آمد سے بھی پر رونق رہتا تھا۔ ماریہ' ماں کے نت نئے ڈیزائن کے کپڑے دیکھ کر حیران رہ جایا کرتی تھی۔ کیا کوئی سوچ سکتا تھا کہ اس جیسی فیشن سے نابلد لڑکی کی ماں فیشن کی اتنی دلدادہ ہو سکتی ہے۔

رات کو اس کے چھوٹے بہن بھائی سو جاتے تو وہ روشنیاں گل کر کے اندھیرے میں چپ چاپ بیٹھ جاتی۔ کھڑکی کے باہر کوئی جنگل نہیں تھا' وہ جانتی تھی' پھر بھی اسے لگتا وہ جنگل میں بیٹھی ہے اور اڑ کر آنے والوں کی بددعائیں سمیٹ رہی ہے۔ اب وہ اس کے گرد رقص نہیں کر رہے بلکہ اسے نفرت سے دیکھ کر دور بھاگ رہے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔

"ماریہ۔۔۔ ماریہ۔۔۔ کیا ہوا ہے تمہیں۔"

ماں تشویش سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ دونوں چھوٹے بچے بھی اسے اپنے اپنے بستر پر بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نیند تھی اور وہ ڈرے ہوئے لگتے تھے۔

"آپ آ گئیں؟ کیسی رہی دعوت؟"

مسز جین نے اچنبھے سے ماریہ کو دیکھا۔ "دعوت سے تو میں کب کی آ چکی ہوں ماریہ۔۔۔ میں تو تمہاری چیخ سن کر اپنے کمرے سے بھاگتی ہوئی آئی ہوں۔ کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔ تم اپنے بستر پر سو کیوں نہیں رہیں۔ ایسے یہاں کیوں کھڑی ہو۔۔۔ یہ بورشے کون ہے؟"

اس نے آس پاس دیکھا۔ "وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی اور اس کی فراک کا ایک کونا اس کی کلائی کے ساتھ بندھا تھا۔"

☼ ☼ ☼

اس نے پیانو سیکھنے کی کوشش شروع کردی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت پیانو کو بجانے کی کوشش کرتی۔

مسز جبین گھر ہوتیں تو افسوس سے سرہلاتی رہتیں۔

"ایسے لگتا ہے تمہاری انگلیوں کو بددعا دی گئی ہے' یہ کبھی کوئی ساز نہیں بجاسکیں گی۔ تم پر سازوں کی روح مہربان نہیں ہے ماریہ۔۔۔ شروع میں تو سب ہی برا بجاتے ہیں' لیکن تم تو بدترین بجارہی ہو۔ تم پیانو بجانے کی کوشش ترک کردو۔ تم خود کو تھکا رہی ہو۔"

وہ باز نہیں آئی اور اپنی کوشش جاری رکھی۔

ایک رات ماریہ باغ میں چہل قدمی کررہی تھی کہ اس نے فضا میں روشنی کے نقطے کو حرکت کرتے دیکھا۔ اتنے عرصے میں ایسا پہلی بار ہوا کہ وہ تھوڑا سا مسکرادی۔ اسے لگا کہ اس کے دوست اسے ڈھونڈتے پھررہے ہیں۔ یہ گمان اتنا زور آور تھا کہ وہ خوش دلی سے ٹہلتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔ وہ ایک پودے پر بیٹھا تھا۔ ابھی ماریہ کا سایہ بھی اس پودے تک نہیں پہنچا تھا کہ اس نے اسے اڑتے ہوئے دیکھا۔ وہ اتنی تیزی سے اڑ گیا کہ ماریہ کو گمان ہوا کہ وہ اسی کی موجودگی سے دور بھاگا ہے۔ یہ خیال اس کے دل میں اتنی بری طرح سے راسخ ہوگیا کہ وہ باغ میں دیر رات تک ٹہلتی رہی۔ وہ جگنوؤں کا انتظار کرتی رہی لیکن دوبارہ پھر ان کے باغ میں کوئی جگنو نہیں آیا۔ اس گمان نے اسے نیم پاگل سا کردیا اور شام کو وہ شہر کے ایک دوسرے باغ میں گئی اور وہاں کتنی ہی دیر تک ٹہلتی رہی۔ پھر اس نے یہ معمول بنالیا کہ وہ باغ میں دیر گئے تک ٹہلتی رہتی۔ مسز جبین کو اس سے کوفت ہونے لگی تھی۔

"ماریہ! کیا تم نے زندگی کا مقصد چہل قدمی ہی بنالیا ہے۔"

ماریہ نے ماں سے چھپ کر رات کو باغ میں ٹہلنا شروع کردیا۔ وہ رات گئے تک جگنوؤں کا انتظار کرتی رہتی۔ ایک دن مسز جبین اسے اپنی سہیلی کے گھر لے گئیں۔ وہاں بھی ماریہ دیر تک ان کے باغ میں چہل قدمی کرتی رہی۔ اور پھر سر شام فوارے کے گرد اسے چند جگنو نظر آگئے۔ وہ دیر تک انہیں دور سے دیکھتی رہی اور پھر جیسے ہی ان کے قریب گئی وہ اس سے دور ہوگئے۔

ماریہ فوارے کے پاس سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ یہ گمان حقیقت بن چکا تھا کہ وہ ننھے قمقموں کے لیے قابل نفرت بن چکی ہے۔ اب وہ کبھی اس کے پاس نہیں آئیں گے۔ بورشے رحم دلی کا ساز ہے' اس نے بے رحمی کا ساز بجایا تو وہ اس سے دور ہوگئے۔

"میں جان گئی ہوں' اب میں بورشے بجاتی بھی تو کوئی نہ آتا۔" میں نے سب کچھ کھودیا۔

روشنی۔۔۔ رقص۔۔۔ اور بورشے۔۔۔

☼ ☼ ☼

آئرلینڈ کی راتوں میں ویرانی بڑھتی جارہی تھی۔ ویرانوں کی تنہائی کو بورشے کا بے ہنگم ساز اور ویران کررہا تھا۔ مسٹر بیگ کے گھر کے ملازموں کو بورشے کی بے ہنگم دھن میں سونے کی عادت ہوچکی تھی۔ وہ رات کو اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لینے پر مجبور تھے۔ دن میں' رات کی باتیں کرتے کرتے بھی وہ تھک چکے تھے۔

اپنے کمرے کی کھڑکی کی چوکھٹ میں بیٹھے بورشے کو منہ سے لگائے' آسکر اس دھن کو اپنی بند آنکھوں سے پڑھنے کی کوشش کرتا رہتا جو اس نے جنگل میں سنی تھی۔ وہ دھن اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتی تھی لیکن وہ اس کے ساتھ ساز میں نہیں آتی تھی۔ ایک بھی بار' کبھی ایک بھی بار بورشے سے اس دھن کا ایک آدھ سر بھی نہیں نکلا تھا۔ وہ جانتا تھا' جاڑے کی ساری ٹھنڈی راتوں کی کوشش کے باوجود وہ ناکام ہے۔۔۔ ناکام ہے۔۔۔

"جگنو اتنی جلدی نہیں آیا کرتے۔۔۔" وقت نے آسکر کے کانوں میں سرگوشی کی اور وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"جانتے ہو آسکر! تمہارے دوست تمہارے بارے

میں کیا کیا باتیں کر رہے ہیں۔" ایک دن روزا نے معصومیت سے پوچھا۔

"میں جان کر کیا کروں گا روزا۔۔۔!"

"وہ کہتے ہیں کہ تم ناکارہ ہو چکے ہو۔۔۔"

"میں واقعی ناکارہ ہوں۔۔۔ میں اب تک بورشے سے ایک دھن نہیں بجا سکا۔"

"مجھے اچھا نہیں لگتا' سب تمہارے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔" روزا نے اپنا نچلا ہونٹ لٹکا کر کہا۔

"کرنے دو۔۔۔"

"وہ کہتے ہیں تم دیوانے ہو۔۔۔"

"کہنے دو۔۔۔"

"مسٹر کارٹر کی پارٹی میں سب کہہ رہے تھے کہ تمہیں شہر سے باہر نکال دینا چاہیے' کیونکہ تمہارے ساز کی آواز جھینگروں کی آوازوں سے بھی بدتر ہے۔" پھر وہ سب ہنسنے لگے۔ آسکر بھی ہنسنے لگا۔

"وہ لوگ سچ کہہ رہے تھے۔ کیا ان کو اتنا بھی حق نہیں کہ وہ سچ کہیں اور اس پر ہنسیں۔"

"انہیں ایسے تمہارا مذاق نہیں اڑانا چاہیے آسکر۔۔۔!"

"دوسروں کو کیا کرنا چاہیے' یہ ہم طے نہیں کر سکتے روزا۔ دوسروں کے لیے اپنے دل سے غصہ نکال دو۔ ناپسندیدگی' نفرت میں بدلے گی اور نفرت سب کچھ لے ڈوبے گی۔"

"آسکر! تمہیں اس حد تک نہیں بدلنا چاہیے کہ معاشرے میں تمہارا مقام گر جائے۔"

"معاشرتی پیمانوں کی اتنی فکر نہیں کرنی چاہیے روزا۔۔۔ ان کے معیار بدلتے رہتے ہیں۔"

"مجھے تم سے خوف آنے لگا ہے آسکر۔۔۔ تم نے ایسی انوکھی باتیں کیسے سیکھ لیں؟"

"بورشے اس وقت تک نہیں بجے گا روزا! جب تک میرا دل صاف نہیں ہو گا' دھن اس وقت تک تکمیل کی طرف نہیں آئے گی جب تک میں ہر خاص و عام کے لیے احترام نہیں رکھتا۔ بورشے دل کی سادگی اور بے نیازی کا ساز ہے روزا۔۔۔"

"آسکر! تم بورشے کو پھینک دو۔۔۔"

آسکر نے مسکرا کر روزا کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"تم ایسی بات کرو گی تو میرا دل اور دکھے گا۔"

"تم کبھی ماریہ کی طرح بورشے نہیں بجا سکو گے۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔۔۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں ماریہ سے اچھا بورشے بجانے لگوں۔"

☼ ☼ ☼

آسکر نے اپنے جانے کی تیاری مکمل کر لی تو وہ مسٹر ہیگ کے کمرے میں انہیں الوداع کہنے آیا۔

"خط لکھتے رہنا آسکر۔۔۔ ایسا نہ ہو تمہیں ڈھونڈنے کے لیے مجھے بھی کسی ساز کا سہارا لینا پڑے۔"

آسکر ہنس دیا۔ وہ ایک بار پھر سے ماریہ کو ڈھونڈنے کے لیے آئرلینڈ سے باہر جا رہا تھا۔ اسے مسز جین کے کچھ رشتے داروں کے بارے میں انکل ولسن نے بتایا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ انہیں خط لکھ چکے ہیں لیکن آسکر نے خط کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ وہ اتنا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

جس وقت وہ فرانس جانے کے لیے جہاز پر بیٹھا' اس وقت پانی کی سطح پر سورج اپنی آخری کرنیں چھوڑ رہا تھا۔ پانی کی سطح بے شمار جگنوؤں سے سجی ہوئی لگ رہی تھی۔ آسکر مسکرا دیا۔ اسے لگا قدرت کی طرف سے یہ ایک اچھا اشارہ ہے۔ شاید اسے فرانس میں ماریہ مل جائے' ورنہ جہاز میں جگنو۔۔۔؟

☼ ☼ ☼

سمندر کی سطح پر تیرتے اکلوتے جہاز کو دیکھ کر اسے مسٹر البرٹ یاد آ گئے۔ آج سے پہلے اس نے ہمیشہ انہیں خوش ہو کر یاد کیا تھا۔ لیکن آج وہ دکھی ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

"کیا ہوا ماریہ ڈیئر۔۔۔" مسز جین کی سہیلی لیڈی الزبتھ نے پوچھا۔

"یہ پینٹنگ اچھی ہے۔" ماریہ نے دیوار پر لگی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ یہ پینٹنگ۔۔۔ یہ مجھے بھی بہت پسند ہے۔ یہ

مجھے یاد کراتی رہتی ہے کہ مجھے جلد سے جلد اپنے اگلے سفر کی تیاری کرلینی چاہیے۔"

"ماں بتا رہی تھیں آپ کو سیاحت کا بہت شوق ہے۔"

"بہت زیادہ... افریقہ کے سفر نے مجھے بہت سی عجیب و غریب چیزیں حاصل کرنے کا موقع دیا۔ جبکہ لوگوں کا کہنا ہے کہ میں افریقہ جادو سے جوان ہوئی تھی۔ اگر سمندر کے سفر نے ہی مجھے جوان رکھا ہوا ہے تو اس میں میرا کیا قصور..." یہ کہہ کر وہ کافی دیر تک ہنستی رہیں۔

"کیسی چیزیں؟" ماریہ نے صرف بات کو طول دینے کے لیے پوچھا... اور اس کے پاس تھا ہی کیا باتیں کرنے کے لیے...

لیڈی الزبتھ نے ملازمہ سے کسی خاص صندوق کو لانے کے لیے کہا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک ننھی سی شیشی کو اس کے سامنے کھول کر رکھ رہی تھیں۔ ماریہ سمجھی، وہ کوئی خوشبو ہے۔ کھول کر وہ ناک تک لے گئی، لیکن اسے کوئی خوشبو نہیں آئی۔ لیڈی الزبتھ ہنسنے لگیں۔

"یہ خوشبو نہیں ہے ماریہ...! یہ مجھے حاصل ہونے والی خاص چیزوں میں سب سے زیادہ خاص ہے... یہ تو جگنو ہیں۔"

چھوٹی سی بوتل ماریہ کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی اور وہ پوری کی پوری کانپ گئی۔ اسے لگا لیڈی الزبتھ اس پر طنز کر رہی ہیں۔ وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"میں بھی ایسے ہی حیران رہ گئی تھی، جب مجھے اس کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ تم ان جنگلی لوگوں کو نہیں جانتیں، میں تو انہیں جادوگر ہی کہوں گی۔ مجھے اس کے لیے کافی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی، لیکن یہ مجھے مل ہی گئی۔ دیکھو اس کا ایک قطرہ عام پانی میں شامل کرکے اسے باغ، پودوں، پھولوں پر چھڑک دینے سے کچھ ہی دیر میں جگنو ان پر آکر بیٹھنے لگتے ہیں۔"

"کیا آپ نے اس کا استعمال کیا ہے؟" ماریہ کی آواز کانپ گئی۔

"کیا تمہاری ماں نے تمہیں نہیں بتایا؟ یہ بات تو ٹاک آف دا ٹاؤن رہی ہے۔ چند ہفتے پہلے کی دعوت میں... میں اس کا استعمال کر چکی ہوں۔ میرے مہمان حیران تھے کہ میں نے حیرت کا ایسا سامان کہاں سے لیا۔ سب مجھ سے اس کے بارے میں پوچھ رہے تھے ماریہ!"

ماریہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہی۔ پھر لیڈی الزبتھ اچانک آنے والے کسی ملاقاتی سے ملنے گئیں تو ماریہ نے جلدی سے بوتل کو کھول کر اس کے کئی قطرے اپنے ہاتھ پر ٹپکا کر اپنے چہرے، بازو، کپڑوں پر مسل لیے... خود غرضی کی حد کو چھوتے ہوئے اس نے تھوڑی سی اور چوری کی اور چند اور قطرے لے کر ایسا ہی کیا، اگر لیڈی الزبتھ واپس نہ آجاتیں تو یقیناً" وہ پوری بوتل کے ساتھ ایسا کر جاتی۔

ماریہ نے جلدی سے ان سے رخصت چاہی اور ان کے گھر سے باہر آگئی اور گھر جانے کے بجائے باغ میں آگئی۔ شام، رات سے ملنے کی تیاریوں میں تھی۔ وہ افریقی جادو آزمانے آئی تھی۔ وہ پودوں اور پھولوں کے درمیان کھڑی ہوگئی۔

اندھیرے نے روشنی کے دھبے نمایاں کرنے شروع کیے اور دور سے اسے روشنی کے قمقمے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ ایک نہیں کئی ایک تھے۔ وہ ٹھیک ان ہی پودوں اور پھولوں کی طرف آرہے تھے جہاں وہ کھڑی تھی۔ ان کے آنے کا انداز قدرتی نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی، وہ کسی چیز کی طرف کھنچے چلے آرہے تھے۔ افریقی جادو کی طرف... ماریہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اسے لگا کہ وہ خوشی سے پاگل ہی ہوجائے گی۔ سب جگنو اسی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ہاں اب وہ واپس جائے گی، آئرلینڈ بھی اور گاؤں بھی... وہ آسکر کو ایک خط فوراً" لکھ دے گی کہ وہ واپس آرہی ہے۔ انکل ولسن کے گلے سے لگ جائے گی۔ ایک بار پھر وہ فراک اٹھائے گی اور اپنے دامن میں سب جگنو سمیٹ لے گی۔ بورشے پھر سے اس کے

ہاتھ میں ہوگا۔ جگنو اس سے اپنی ناراضی ختم کر چکے تھے۔ انہوں نے اسے معاف کر دیا ہے۔

اتنے لمبے عرصے بعد ماریہ مسکرانے لگی تھی۔ اس نے اپنے دل کو خوشی سے ناچتے دیکھا اور کچھ دیر بعد وہ خود بھی ناچنے لگے گی۔ اِدھر اُدھر سے جگنو آنے لگے اور پودوں، پھولوں کے جھنڈ کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے۔ ماریہ پودوں سے نکل کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ ایک جگنو جھومتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس کے سر کے گرد منڈلانے لگا۔ خوشی سے ماریہ نے سر کو اٹھا کر دیکھا۔

اور جیسے کہ وہ ماریہ کی خوشبو پا گیا۔ وہ مخالف سمت میں اڑا اور تیزی سے ان جگنوؤں کے درمیان چکر لگانے لگا جو اس کے دائرے میں تھے۔ لمحوں کی بات تھی، لمحوں میں ہی سمٹ گئی کہ جیسے اس نے اعلان کر دیا کہ یہاں وہی ہے۔ جس نے ایک محبت کے لیے ہماری محبت جلا دی۔ جس نے کبھی جنگل سے خوف نہیں کھایا تھا۔ وہ آسکر کے گھر سے خوف زدہ ہو گئی۔ آسکر کی دولت، رتبے کو یہ بورشے سے پٹانا چاہتی تھی۔۔۔ یہ ماریہ۔۔۔ جو ہماری دوست تھی، اس نے ہماری دوستی کی تجارت کی۔۔۔

افریقی جادو پراثر تھا، وہ جگنوؤں کو اس تک لے آیا تھا۔۔۔ آگ کا جادو اس سے بھی زیادہ زور آور رہا، وہ سارے جگنو اس سے دور لے گیا۔ انسان اپنی نسل سے وفا نبھائے نہ نبھائے، جگنو یہ وفا ضرور نبھاتا ہے، وہ اپنی نسل کے دوست کو بھی یاد رکھتا ہے اور دشمن کو بھی۔۔۔

ماریہ نے گردن اٹھا کر رو دینے والے انداز سے اوپر دیکھا۔۔۔ اس کا دل پھٹ جانے کے قریب ہو گیا۔۔۔ بورشے کی دھن کو اپنے منہ سے، سیٹی سے بجانا چاہا، لیکن کوئی ایک بھی ردعمل کسی کو واپس نہ لا سکا۔ ماریہ نے لپک کر چند جگنوؤں کو ہاتھ بڑھا کر پکڑنا چاہا لیکن وہ اس سے اتنی تیزی سے دور ہوئے کہ وہ دم بخود رہ گئی۔ حقیقت واضح ہو گئی۔ اب بورشے بجے گا تو بھی جگنو نہیں آئیں گے۔

"تم جانتی ہو ماریہ، جگنو تمہارے پاس کیوں آتے ہیں۔"

"کیوں انکل ولسن؟"

"وہ بورشے یا اس کی دھن پر نہیں آتے، وہ تمہارے دل کی آواز۔۔۔ تمہاری محبت میں آتے ہیں۔۔۔ جو اتنی زور آور ہے کہ وہ تمہاری طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ تمہارے علاوہ کوئی اور بورشے بجائے تو جگنو اس کے پاس بھی آئیں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ جگنو ہمیشہ تمہارے پاس ایسے ہی آئیں تو تمہیں ان سے ہمیشہ ایسی ہی سچی محبت کرنی ہوگی۔"

"میری محبت میں کبھی کمی نہیں آئے گی انکل۔۔۔"

"میری محبت میں کمی بھی آئی اور کھوٹ بھی۔۔۔"

باغ کی وسعت میں۔۔۔ درختوں میں چھپے کھڑے، ماریہ نے خود کو گھاس پر گر جانے دیا۔ اس نے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اپنی ساری دھنیں فراموش کیں۔۔۔ سب جگنو جلا دیے۔ بورشے، ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔

٭ ٭ ٭

"جگنوؤں کے جل جانے کے بعد بورشے جیسے ہمیشہ کے لیے خاموشی میں کھو گیا تھا۔"

فرانس کی سرائے میں بیٹھا وہ پاپا کو خط لکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سرائے بندرگاہ کے قریب تھی جہاں وہ جہاز کے انتظار میں تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ بورشے بجانے لگا تھا۔ کھانا کھاتے بہت سے لوگوں نے اپنی گردنیں گھما کر اسے دیکھا۔ لیکن وہ خاموش نہیں ہوا۔ اسے ایسی نظروں کی عادت پڑ چکی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اتنے لمبے عرصے کے بعد بھی وہ بورشے کو ٹھیک سے بجا نہیں پا رہا۔ لیکن وہ رکنے والا نہیں تھا، وہ ماہر شکاری نہیں بن سکا تھا، کیونکہ وہ اپنی کمزوری کو بہادری میں نہیں بدل سکا تھا۔ وہ شاعر نہیں بن سکا تھا کیونکہ اس کے احساسات سطحی رہے تھے اور مصور بھی نہیں بن سکا، کیونکہ وہ رنگوں سے پہلے کی دنیا کو نہیں دیکھ سکا تھا، لیکن وہ بورشے ضرور بجا لینا چاہتا

تھا کیونکہ وہ ماریہ کے بغیر نہیں رہنا چاہتا تھا۔۔۔ اور ماریہ اپنے جگنوؤں کے بغیر نہیں رہے گی۔

سب کھانے سے فارغ ہو گئے تو کافی پیتے ایک بوڑھے نے سر گھما کر آسکر کی طرف دیکھا۔ "ذرا ہمت سے بجاؤ' ڈر کیوں رہے ہو کیا تم نہیں جانتے' ڈر کے نہ گایا جاتا ہے اور نہ ساز بجایا جاتا ہے۔"

بورشے کے لیے ایسا فقرہ پہلی بار آسکر کی سماعت سے ٹکرایا تھا۔ ورنہ جیسا بورشے وہ بجاتا تھا' وہ لوگوں کو غصے میں مبتلا کر دیتا تھا یا وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے۔

"کیا مجھ سے کچھ کہا۔" تصدیق کے لیے آسکر نے رک کر پوچھا۔

"ہاں نوجوان! تم سے۔۔۔ یہاں ادھر آؤ۔۔۔ اس کھڑکی کی جان چھوڑ دو' نہ رات تمہیں چھوڑ کر بھاگ رہی ہے' نا جہاز چھوڑ کر بھاگے گا۔"

خوشی سے آسکر جیسے دیوانہ ہونے لگا اور وہ اچھل کر میزوں کے درمیان جا کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں' یہاں ٹھیک ہے۔۔۔ اب بجاؤ۔۔۔ کیا ساز ہے یہ؟"

"بورشے۔۔۔" آسکر کھل کر مسکرایا۔

"بورشے۔۔۔! بجاؤ اسے۔۔۔ آج کی رات میں مسکرانا چاہتا ہوں۔۔۔ میں دکھی ہو کر فرانس کو الوداع نہیں کہنا چاہتا۔"

یہ فقرہ سمندر کی اس تیز لہر جیسا تھا جس کے سہارے جہاز سفر طے کرتے ہیں۔ اپنی گھنی سنہری مونچھوں کے نیچے بورشے کو منہ سے لگا کر وہ دھن بجانے لگا جسے وہ اتنے لمبے عرصے سے بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ڈرو نہیں اور ہمت سے بجاؤ۔۔۔" ایک اور بوڑھے نے اپنی میز بجا کر کہا۔ اس نے اور ہمت سے دھن بجائی۔

"اور زور لگاؤ جوان! کیا تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔"

آسکر نے پوری طاقت لگا دی۔

بوڑھے ہنسنے لگے۔ "جسمانی طاقت نہیں' دل کی طاقت' ذرا اور زور لگاؤ۔"

ہاں وہ سب کے سب جہاں دیدہ تھے۔ دنیا گھوم چکے' ہر خطے اور ہر ساز کو سن چکے۔ وہ سمندروں کے ہم سفر تھے' وہ جانتے تھے ساز کیسے بجتا ہے۔۔۔ منہ سے نہیں دل سے۔۔۔ جسم سے نہیں روح سے۔۔۔ سطح سے نہیں زیر سطح سے۔۔۔

رات گزرنے لگی' بورشے بجتا رہا۔

اور جب صبح بندرگاہ پر جہاز نے اپنا بھونپو بجایا تو کتنے ہی ہاتھ تالیاں بجانے کے لیے اٹھے۔ بورشے نے سرائے میں آہستہ آہستہ مجمع لگا دیا تھا' بوڑھوں کے ساتھ جوان بھی آکر بیٹھ گئے تھے' پھر جہاز کا عملہ۔ بورشے کے ساتھ ساتھ میز بجے تھے' چائے' کافی پی گئی' تاش اور شطرنج کھیلتے اس کی طرف سر ہلا کر اسے داد دی گئی تھی۔

"آج کی رات بورشے کے نام۔" ایک جام بورشے کے نام کیا گیا۔

آسکر اپنا سامان اٹھا کر بھاگتا ہوا جہاز میں سوار ہوا۔ اسے اپنے کیبن میں بیٹھ کر روزا اور پاپا کو ایک خط لکھنا تھا۔ ایک خط جس کی ابتدائی سطر کچھ ایسے لکھی جانے والی تھی۔

"خدا کی مہربانی کا اشارہ لوگوں کی مسکراہٹ سے ملتا ہے' خاص کر اگر وہ بوڑھے یا بچے ہوں۔ آج ساری رات میں ان اشاروں کے لیے بورشے بجاتا رہا ہوں۔۔۔ مجھے اگلے اشاروں کا انتظار ہے۔"

☼ ☼ ☼

"کیا تم نے کھانا پینا بالکل ترک کر دیا ہے ماریہ؟ تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟؟"۔

"میں ٹھیک ہوں۔"

"تم ٹھیک ہو؟ شکریہ اس اطلاع کا۔۔۔ کیا تم جانتی ہو تمہارے لیے کیسی کیسی باتیں کی جا رہی ہیں؟ تم آدھی رات تک اس باغ میں کیا کرتی رہی ہو۔ کس سے ملنے گئی تھیں۔ ماریہ! یہ تمہارا گاؤں نہیں ہے جہاں

تمہارا جب دل چاہے گا تم اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں بھی چلی جاؤ گی۔ تم میری سوچ سے بھی سے زیادہ بے وقوف ہو۔"

"اب میں کسی باغ میں نہیں جاؤں گی ماں....."

"اب تو تمہیں میرے ساتھ ہر دعوت میں جانا ہوگا۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ ایسے گھر بیٹھے تمہاری شادی ہو جائے گی۔"

"شادی....." اس نے زیر لب آہ بھری۔

"دور بہت دور ایک جنگل رہ گیا ہے، جہاں گھوڑے پر سوار کوئی جنگل کو اس کے جادو سے آزاد کروانے آیا تھا"۔

"ماریہ! کیا تم سن رہی ہو' میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

"آپ جو کہیں گی' میں وہی کروں گی۔ مجھے رقص میں جانے کے لیے کیا تیاری کرنی ہوگی' مجھے بتادیں۔"

ماں نے چونک کر ماریہ کو دیکھا اور پھر اپنے لہجے کو نرم کرلیا۔ "تم میری سوچ سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت نکلی ہو ماریہ۔ جہاز سے تمہیں اترتے دیکھ کر مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ تم ہی ہو' میری بیٹی۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تمہیں کس چیز نے اس قدر حسین بنادیا ہے۔ میرے حلقے میں تمہارا حسن میرے لیے فخر کا باعث ہے۔ مجھ سے ہر رقص میں پوچھا جاتا ہے کہ میں تمہیں ساتھ کیوں نہیں لائی۔"

"وہ چیز کبھی بھی خوب صورت نہیں ہوتی جو ڈھل جائے۔ خوب صورتی ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے' وہ کوئی انسان ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تو کیا ہو سکتا ہے۔"

"محبت..... ہمیشہ قائم رہتی ہے' کبھی نہیں ڈھلتی' کبھی نہیں بدلتی۔"

"اتنی چھوٹی سی عمر میں تمہیں اتنی خطرناک باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ تم آئینہ دیکھا کرو' بال بنایا کرو اور اپنے کپڑوں کے رنگوں اور جدت کے بارے میں سوچا کرو بس۔ اپنے لباس کی تیاری کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"اب میں کسی لباس میں خوب صورت نہیں لگ سکتی اور کسی دھن پر رقص نہیں کرسکتی۔" آہ پھر زیر لب ہی رہی۔

ماں کے سامنے اس نے سر ہلا دیا اور اس وقت بھی سر ہلاتی رہی جس وقت مسز جین دعوت میں اس کا تعارف کرا رہی تھیں۔ اس سے پہلی بار ملنے والے' دیکھنے والے' چونک رہے تھے۔ اس کا ہاتھ پکڑنے کے لیے سر کو جھکا رہے تھے اور وہ ہال کی دیواروں کو دیکھ رہی تھی' جہاں کتنی ہی آرائشی موم بتیاں اور مشعلیں دیواروں کے ساتھ ساتھ روشن تھیں۔ اس کی نظر ایک بار ان سب پر گئی تو پلٹ نہیں سکی۔ جس وقت وہ تیزی سے ہال چھوڑ کر جا رہی تھی' اس وقت مسز جین اپنی شرمندگی چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

جہاز کے عرشے پر بیٹھے پانی پر پڑتے چاند کے عکس کو دیکھتے آسکر مسکرا دیا۔ رات کے دو پہر بیت چکے تھے۔ دور ایک سایہ نیچے سے اوپر' عرشے تک آیا۔ آسکر جنگلے کے ساتھ لگا ہوا نیچے بیٹھا تھا۔ سایہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور کچھ دور رک کر اسے دیکھنے لگا۔

وہ ایک لڑکی تھی جس نے اپنے لباس پر کوٹ پہن رکھا تھا اور شانوں کے گرد شال لپیٹ رکھی تھی۔ کچھ دیر وہ کھڑی رہی' پھر وہ ٹہلنے لگی اور پھر عین آسکر کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔

"تم نے مجھے نیند سے جگا دیا..... یہ دھن میرے خواب میں بھی بجتی رہی۔"

آسکر بورشے بجاتا رہا' البتہ جواب میں وہ مسکرا دیا۔

"دور بہت دور کوئی میرا انتظار کر رہا ہے۔ تمہاری دھن خوشی کا پیام ہے۔ میں سمجھ گئی' یہ اشارہ ہے کہ انتظار' اب' ختم ہونے جا رہا ہے۔"

"ہاں یہ اشارہ ہی ہے۔" آسکر نے دل میں سوچا اور جب وہ اپنے کیبن میں واپس آیا تو اس نے روزنامچے کے خط میں ایک اور سطر کا اضافہ کیا۔

''محبت سے معمور ایک دل کو بورشے نے نیند سے جگا دیا' یہ اشارہ ہے اس انتظار کا جواب ختم ہونے جا رہا ہے۔''

☆ ☆ ☆

جس وقت وہ اٹلی میں اترا' اس وقت نہ جانے کیوں اسے لگا کہ اسے یہاں ایک لمبا عرصہ قیام کرنا ہو گا۔ وہ انجانی خوشی سے مسکرا رہا تھا۔ دلی طور پر وہ مطمئن تھا۔ اس کے ہاتھ میں ماریہ کی ماں کے گھر کا پتا موجود تھا جو اسے فرانس سے ملا تھا۔ وہ لوگ پریقین نہیں تھے کہ ماریہ کی ماں وہاں ہو گی انہیں تھوڑی بہت خبر ملی تھی اور آسکر اس خبر کی تصدیق کے لیے خود وہاں آ گیا تھا۔

دن بھر وہ مطلوبہ جگہ ڈھونڈنے میں لگا رہا اور پھر رات کو وہ ایک گھر کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے ماریہ کے بارے میں استفسار کیا۔

''مس ماریہ' مادام کے ساتھ تھیٹر گئی ہیں۔''

تو آسکر کے لیے اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔

''م۔۔۔ میں ابھی فوراً'' وہاں جانا چاہتا ہوں۔۔۔ اسی وقت۔۔۔''

اس نے اتنی شدت سے کہا کہ گھر کے سب ہی ملازم ڈر کر اسے دیکھنے لگے۔ ان کے تاثرات بھانپ کر آسکر نے ماریہ کے گاؤں کا نام لیا اور انکل ولسن کا حوالہ دیا۔

جس وقت اس کی نظر ماریہ تک گئی اس وقت ایک لڑکا اس کے کان کے قریب جھکا اسے کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا' وہ ہاتھ کے اشارے سے کسی طرف اشارہ بھی کر رہا تھا۔ ماریہ نے ہاتھ کے اشارے کی طرف دیکھنا چاہا تو اس نے وہاں دیکھ لیا جہاں آسکر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

گاؤں کی گھاس یاد سے بھیگ گئی۔۔۔ جنگل کا شور سکوت میں ڈھل گیا۔

لمحوں میں ہی ماریہ نے نظریں پھیر لیں اور تیزی سے تھیٹر کی بالکنی کے پردوں کے پیچھے غائب ہو گئی۔

آسکر اس بار کوئی بدمزگی نہیں چاہتا تھا' وہ خاموشی سے ماریہ کے پیچھے گیا۔ مسز جین نے ماریہ کو بدتہذیبی سے لوگوں کو تقریباً'' پرے دھکیلتے ہوئے باہر جاتے ہوئے دیکھا تو وہ غصے سے لال ہو گئیں۔ وہ بمشکل خود کو ماریہ کے قریب جا کر اسے تھپڑ مارنے سے باز رہ سکیں۔ ہر بار ماریہ انہیں شرمندہ کرتی تھی۔

''ماریہ۔۔۔!'' آسکر نے حتی الامکان کوشش کی کہ آواز زیادہ اونچی نہ ہو۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جوش کی گونج ماریہ کے لیے کسی بھی پریشانی کا باعث بنے۔

ماریہ نہیں رکی۔ آسکر کو اس کے رویے پر حیرت تھی۔ اتنا وقت گزر چکا تھا' کیا ماریہ اب تک ناراض تھی۔ وہ اس کی طرف تیزی سے لپکا اور اتنی سرعت سے اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا کہ ماریہ رک جانے پر مجبور ہو گئی۔

''ماریہ۔۔۔ کیسی ہو۔۔۔ تم ایسے کیوں آ گئیں۔۔۔ ایک خط بھی نہیں لکھا۔''

ماریہ آسکر کی طرف دیکھنے سے باز رہی۔ ''میں تمہیں خط کیوں لکھتی؟؟''

نئی سرزمین ماریہ کے لہجے میں باسی پن لے آئی ہے۔ آسکر نے سوچا۔ اس کے لیے ماریہ کا انداز تکلیف دہ تھا۔ اسے دکھ ہوا یہ جان کر کہ ماریہ اسے اس حد تک فراموش کر چکی ہے۔ کیا وہ یہ بھی نہیں دیکھ پا رہی کہ اس کی آنکھیں' اس کی یاد میں پگھل کر اندر دھنس چکی ہیں اور ان کی چمک ماند پڑ چکی ہے۔ کیا اسے اس کے جوتوں کی دھول نظر نہیں آ رہی اور یہ بھی کہ وہ سفر کرتے کرتے تھک چکے ہیں۔ کیا وہ آسکر کے چہرے پر کوئی ایک بھی لکیر نہیں دیکھ پا رہی' جو اس کی تلاش میں سرگرداں سرگرداں ویران ہو چکی تھی۔ کیا ماریہ کو کچھ نظر نہیں آ رہا۔

''میں نے ایک بار یہ غلطی کی تھی کہ تمہیں جانے دیا تھا۔ میں دوبارہ یہ غلطی نہیں کروں گا۔''

آسکر نے کچھ ایسے درد سے کہا کہ ماریہ نے ناگواری سے آسکر کو دیکھا۔ اسے حیرت تھی آسکر پر۔ کیا وہ دیکھ

نہیں رہا تھا کہ وہ جدید فیشن کے بہترین لباس کو زیب تن کیے تھیٹر ایکٹ دیکھنے آئی ہے۔ اس کا حسن شہری زندگی کی ساری آرائش نچوڑ چکا ہے۔ حسن جو ڈھل جاتا ہے۔ حسن جس کی چکاچوند پر شام کسی عہد کی طرح ضرور آتی ہے۔ کیا وہ دیکھ نہیں رہا تھا کہ اب وہ گاؤں کی سیدھی سادی لڑکی نہیں رہی' پھر کس حیثیت سے آسکر اس سے بات کر رہا ہے۔

ماریہ کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر آسکر نے غور سے اسے دیکھا' پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اسے باہر نکالا۔

"ماریہ! میں تمہارا بورشے اور تمہارا آسکر تمہارے پاس واپس لے آیا ہوں۔" بورشے کے ساتھ اس نے اپنا ہاتھ بھی ماریہ کے آگے کر دیا۔

تھیٹر کے باہر لوگوں کے اندر باہر جاتے ہجوم' ان کی بگھیوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان' آسکر نے اپنی محبت کا اقرار نامہ پیش کر دیا۔

"کون سا بورشے....؟" اسی اقرار پر ماریہ نے ایسے سوال اٹھایا۔

آسکر نے بے یقینی سے ماریہ کو دیکھا۔ کون سا بورشے کے ساتھ اس نے کون سا آسکر بھی پوچھ لیا تھا۔

"تم تو بورشے کے بغیر ایک پل نہیں رہتی تھیں' تم نے اتنا وقت کیسے گزار لیا ماریہ....؟"

"میں تمہیں جواب دہ نہیں ہوں۔ تمہیں یہاں سے جانا ہوگا۔"

"تم ابھی تک ناراض ہو.... مجھ سے.... آسکر سے.... بورشے سے.... تمہیں کیا ہو گیا ہے ماریہ؟"

ماریہ پلٹ کر اندر جانے لگی تو آسکر نے اس کے بازو کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ "تمہیں جواب دینا ہوگا۔ کیا تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ میں کتنی لمبی مسافت طے کر کے تمہارے پاس آیا ہوں۔ مجھ سے پوچھو تو سہی' میں کن کن راستوں پر صرف تمہیں دیکھنے کے لیے خاک اڑاتا رہا ہوں۔"

ماریہ نے نفرت سے خود کو آزاد کروایا۔ "کیوں آئے ہو؟ کیا میں نے کہا تھا آنے کے لیے؟ تم میرے لیے بورشے لائے ہو.... ٹھیک ہے.... لیکن کیا میری دھنیں بھی لائے ہو....؟"

"ہاں! میں نے ایک دھن بجانی سیکھ لی ہے.... لوگ اس دھن کو پسند کرتے ہیں ماریہ...."

"ٹھیک ہے' بجاؤ وہ دھن.... بجاؤ اور لاؤ میرے جگنو...."

آسکر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"میں نے کہا' بجاؤ بورشے.... نکالو اس میں سے وہ دھن جو میرے گرد روشنی کی لہریں بناتی تھی۔ یہ میرا بورشے نہیں ہے۔ میرا بورشے اسی دن جل گیا تھا جس دن میں نے اس کی نمائش کی تھی۔ تمہاری محبت کا میں نے ان کی محبت سے سودا کیا تھا۔ میرے پاس وہ نہیں رہے تو تم بھی نہیں رہو گے۔"

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی ماریہ.... یہ لو بورشے اور بجاؤ اسے.... وہ کیوں نہیں آئیں گے۔"

ماریہ تلخی سے ہنس دی۔ "محبت اپنا وجود چھپا سکتی ہے' نفرت نہیں۔"

آسکر نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

"تم بورشے لائے ہو میرے لیے آسکر.... جب بورشے کے ساتھ محبت بھی لا سکو تو پھر آنا۔" ماریہ نے تلخی سے کہا۔

"ماریہ.... بورشے کے ساتھ محبت ہی تو آئی ہے۔" آسکر کی آواز لرز گئی۔

"جب فن اور محبت کو فائدے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو وہ اپنا اثر کھو دیتے ہیں۔ تم نے مجھے جادوگرنی کہا تھا' انہوں نے بھی جادوگرنی کہا تھا جو بورشے سے اجنبی تھے۔ اب میں واقعی جادوگرنی بن چکی ہوں۔ میں جگنوؤں کو ہاتھ میں پکڑنا چاہتی ہوں تو بھی وہ مجھ سے دور چلے جاتے ہیں۔ وہ میری بو پاتے ہی مجھ سے ایسے بھاگ جاتے ہیں جیسے میں انہیں ایک بار پھر سے جلا دوں گی۔ تم نے انہیں حشرات کہا تھا' میں نے بھی حشرات ہی سمجھا۔ وہ میری دھن پر نہیں آتے تھے۔ وہ میرے دل کی پاکیزگی' میری محبت پر آتے تھے۔ میری

یہ پاکیزگی جاتی رہی، محبت ختم ہوئی۔ اگر لوٹا سکو تو لوٹا دو۔۔۔ لاسکو تو لا دو۔۔۔"

کہہ کر وہ چلی گئی۔ آسکر نے پھر دوبارہ اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ جادو تو واقعی ہو گیا تھا، جنگل پر، جنگل کے قمقموں پر، آئرلینڈ کے آسکر پر۔۔۔ گاؤں کی ماریہ پر۔۔۔ لیکن اب اس کا توڑ کیا تھا؟

"یہ تم طے کرو گے۔۔۔" پاپا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے اور رات کو ان کے لیے ایک اور خط لکھتے اس نے یہ سطر لکھی۔

"میرے احساسات میری روح میں پگھل کر میری زبان پر آکر پھڑپھڑانے لگے۔ جب ماریہ نے میری محبت پر ایک پل کی بھی توجہ نہیں دی۔

میں نے ہر چیز کا رنگ اڑتے دیکھا، جب میرے جوتوں کی دھول کو دیکھے بنا اس نے پلٹ کر مجھ سے رخ بدل لیا۔ دنیا بے رنگ ہو گئی، جب اس نے کہا کہ وہ میرے پاس نہیں رہے تو تم بھی نہیں رہو گے۔

بورشے میرے ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ نہ اس نے میرا ہاتھ تھاما، نہ بورشے۔۔۔ میری محبت اس جدائی پر سوار ہو کر چابک لہرانے لگی، جب اس نے کہا۔ جب بورشے کے ساتھ محبت بھی لا سکو تو پھر آنا۔" کرائے کے کمرے کی بالکنی میں بیٹھ کر اس رات آسکر نے بورشے بجایا۔۔۔ بجاتا رہا۔۔۔ بجاتا رہا۔

اس رات اور تو کچھ نہیں ہوا لیکن راہ گیر ٹھہر ٹھہر کر چلتے رہے اور صبح تک یہ بات کتنی ہی سماعتوں تک پھیل گئی کہ وہاں ایک اجنبی کوئی ساز بجا رہا ہے۔ جسے سن کر دل ہے کہ رک رک جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

بورشے سے نکلی دھن، بالکنی پر پھیلی شہر کی راہوں میں بکھر گئی۔

وہ پھر ماریہ کے پاس نہیں گیا۔ وہ ماریہ کے شہر میں ہی رہا۔ اسی جگہ جہاں ماریہ کا گھر تھا، لیکن وہ ماریہ کے پاس جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر قدرت نے یہ ہی طے کیا تھا تو وہ ساری زندگی بورشے بجانے کے لیے تیار تھا، لیکن روشنی سے پہلے اندھیرا کرنے ماریہ کے پاس جانے کے لیے ہرگز نہیں۔ اس کے بورشے کے لیے باغ تھے، راستے تھے، بالکونیاں تھیں۔ اس کے پاس بہت جگہ تھی، جہاں وہ بے رنگ دنیا کے لیے لفظوں سے رنگ تیار کرتا۔

"کیا تم اس اجنبی کو جانتی ہو جو شہر کے کونوں میں ساز بجاتا پھرتا ہے۔" ایک دن مسز جین نے ایسے ہی ذکر چھیڑ دیا۔

ماریہ نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا پھر بھی مسز جین بولتی رہیں۔

"میں اور مسز کولن باغ میں ٹہل رہی تھیں کہ وہاں اس کی دھن سنائی دی۔"

اتنا کہہ چکنے کے بعد کافی دیر خاموشی رہی۔

"اس دھن کو سنتے ہی میرا دل ڈوب سا گیا، اور میں نے رونا چاہا۔"

ماریہ نے چونک کر ماں کو دیکھا۔

"البرٹ مجھ سے محبت کرتا تھا اور اس کا قصور ہی کیا تھا۔ میں نے اسے چھوڑنے میں اتنی جلدی کیوں کی۔"

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس کی ماں نے اس کے باپ کو چھوڑ دینے پر کسی پچھتاوے کا اظہار کیا تھا۔

"وہ اکثر باغ میں آتا ہے ماریہ۔۔۔ تمہیں بھی اس کی دھن سننی چاہیے۔ وہ اجنبی ہے، کسی بھی دن شہر چھوڑ سکتا ہے۔ ویسے مسز کولن کوشش کر رہی ہیں کہ اپنے ہاں کی دعوت میں اسے بھی مدعو کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ایسے اجنبی ساز سے ان کے مہمانوں کو بھی ضرور محظوظ ہونا چاہیے۔"

اجنبی سے، اس کے اجنبی ساز سے مہمان محظوظ ہو رہے تھے۔ آسکر بورشے ایسے بجا رہا تھا جیسے وہ یہ بھول چکا ہے کہ دنیا میں اس سے پہلے بھی انسان بنائے گئے ہیں اور بعد میں بھی۔ یاد رہا تو اتنا کہ ایک وہ ہے اور ایک اس کا بورشے۔۔۔ ماریہ ماں کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ وہ نہ آسکر کی طرف دیکھ رہی تھی نا بورشے کی طرف۔ وہ ایک جلتی ہوئی موم بتی کو دیکھنے پر مجبور

تھی۔

"روشنی کے کتنے ذرائع ہیں دنیا میں۔ پھر بھی کتنا اندھیرا ہے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔

"روشنی کے اتنے ذرائع ہیں کہ کسی ایک پر نظر رکھنا مشکل ہے۔" آنکھیں بند کیے بورشے بجاتے آسکر نے سوچا۔ وہ جب بھی اپنی شاعری کو دھن میں لاتا، روشنی کے قافلوں کو اپنی طرف آتے دیکھتا تھا۔ وہ اس چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ بورشے ناکام ہو سکتا ہے۔ بھلا بتایئے محبت بھی کبھی ناکام ہو سکتی ہے۔ ایسی محبت جو روح کی گہرائی سے شاعری بن کر دھن میں ڈھلے اور بورشے سے نکل کر روشنیوں کے قافلے اکٹھے کرلے۔ اگر ایسی محبت ناکام ہو سکتی ہے تو پھر دنیا میں کہیں کوئی محبت ہی نہیں..... کہیں کوئی دھن نہیں..... کہیں کوئی بورشے نہیں..... اور کوئی آسکر ماریہ نہیں.....

☆ ☆ ☆

اس رات ماریہ نے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو ایک ایسی لڑکی کی کہانی سنائی جو روشنی کے سنگ رقص کرتی تھی۔

"پھر ایک رات ساری روشنیاں بجھ گئیں۔ روشنی کو لانے والے قافلے جل گئے اور ننھی لڑکی پھر کبھی رقص نہیں کر سکی۔"

اس نے کہانی یہاں ختم کی۔ اس کے بہن بھائی دل گرفتہ نظر آنے لگے تھے۔ انہیں ماریہ پر غصہ آرہا تھا کہ اس نے رات کے وقت انہیں ایسی دل کو دکھا دینے والی کہانی سنا دی تھی اور پھر ان کے اصرار پر بھی کہانی کا انجام بدلنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"جگنو لڑکی سے ناراض ہو گئے اور وہ اس سے دور جانے لگے۔" آسکر نے مالک مکان کے بچوں کو کہانی سناتے ہوئے کہا۔

"کیا اب وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔" مالک مکان کی بیٹی نے تقریباً رو دینے والے انداز سے پوچھا۔

"جس طاق پر محبت اپنا چراغ روشن کر چکی ہو، اس طاق پر نفرت کا چراغ زیادہ دیر تک روشن نہیں رہ سکتا۔ وہ واپس آئیں گے، کیونکہ اگر وہ واپس نہیں آئے تو محبت اپنا عقیدہ بدل دے گی۔ بورشے گونگا ہو جائے گا اور جگنو بہرے۔"

☆ ☆ ☆

آسکر باقاعدگی سے پاپا، روزا اور جوزفین کو خطوط لکھتا تھا۔ مسٹر بروک ہیگ اس کی مستقل مزاجی پر حیران تھے۔ اس کا اظہار وہ خطوط میں بھی کرتے رہتے تھے، جس پر آسکر ہنس دیتا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ اس قدر مستقل مزاج ہو سکتا ہے۔ بورشے نے اسے دریافت کیا۔ جس ساز کے بجتے ہی لوگ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے، اب وہ انگلیاں اٹھا اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کرتے تھے کہ دیکھو یہ ہے وہ دیوانہ جو بورشے ایسے بجاتا ہے جیسے دھنیں اس پر فدا ہوں اور یہ ان دھنوں پر..... ساز اس کا حسن ہے اور دھن اس کا جمال.....

رات کالا جادو تھی، اپنے وجود میں سوئیاں پیوست کیے اس کی طرف بڑھی چلی آتی تھی۔ رات اسے جنگل، روشنی اور رقص کی یاد دلاتی تھی۔ ہر رات اس پر عذاب تھی۔ ہر رات اس کا امتحان تھی۔ جزیرے کی قبر افسردہ و غمگین ہو جاتی اور جہاں بھر کے ساز ماتم کناں۔

"جب تک یہ ساز تمہارے ساتھ ہے، میں تمہارے ساتھ ہوں ماریہ۔ مجھے یقین ہے تم اسے بجالو گی۔ تم اس کا حق ادا کرو گی۔"

ایک جہاز راں کو کیا ضرورت تھی سازوں سے اتنی محبت کرنے کی؟ کیا ہر شخص ابدیت چاہتا ہے؟ وہ کسی نہ کسی بہانے سے خود کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ ایسا تھا بھی کیا یہ بھی، ضروری تھا کہ ماریہ اس ساز کو اپنے دل کے اتنے قریب کر لیتی کہ اس کے بغیر ایسے تڑپنے لگتی۔

اپنے گاؤں کی طرح وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے

نکلی اور رات کے پہلے پہروہ اس گھر کی طرف جانے لگی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے ایک کمرے کی بالکنی سے ہر رات بورشے کی آواز ایسے نکلتی ہے جیسے رات دن کے پہلو سے نکلتی ہے۔

وہ دیکھ سکتا تھا' اندھیرا کتنا ہی روشنی پر قابض تھا' پھر بھی وہ دیکھ سکتا تھا کہ کچھ دور درخت کی اوٹ میں کون کھڑا ہو کر بورشے سن رہا ہے۔ کوئی اپنے جسم کے کسی ایک حصے کے بغیر کیسے رہ سکتا ہے؟ اگر رہ سکتا ہے' تو پھر وہ تکلیف واذیت میں ہی رہ سکتا ہے۔

درخت کی اوٹ سے وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی اور پھر بورشے کی دھن نے ماریہ کی آہوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ وہ بورشے کے لیے رو رہی تھی' وہ جانتا تھا لیکن اسے یہ گمان بھی ہوا کہ کچھ آنسو اس کے لیے بھی بہائے جارہے ہوں گے۔

ماریہ کے ہاتھ میں ایک ساز رہا تھا' اس ساز کا ایک کمال تھا' وہ کمال ختم ہو گیا تو نہ وہ ساز رہا' نہ ساتھ....

آسکر دیکھ رہا تھا کہ وہ ابھی بھی رو رہی ہے۔ خوش باش رہنے والی لڑکی اب رو رہی ہے۔ کتنی مگن تھی وہ اپنے گاؤں میں' گاؤں کے جنگل میں' جنگل کے دوستوں اور ان کی محفل میں.... وہ اپنی فراک کے کونے اٹھا اٹھا کر ان پر روشنیوں سے گل کاریاں کیا کرتی تھی اور اب....؟ روتے روتے وہ اب جارہی تھی۔

جسے جنگل سے ڈر نہیں لگتا تھا' وہ آسکر کو کھونے کے ڈر سے ڈر گئی۔ اندھیرے میں ماریہ کو دور جاتے وہ دیکھ رہا تھا۔ اس رات بورشے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکا اور مکان مالک کو اگلے دن یہ اعتراف کرنا پڑا۔

"تمہاری نئی دھن میری سماعت کے اندھیروں میں روشنی کے ننھے جگنوؤں کی طرح دمکتی رہی۔ مجھے بیک وقت رونا بھی آیا اور اطمینان بھی ملا۔"

☼ ☼ ☼

شہر میں گھومتے' بہت سے لوگوں سے اس کی جان پہچان ہو چکی تھی۔ سب اسے بورشے کے نام سے جانتے اور پکارتے تھے۔ آسکر نام سے اسے کم ہی لوگ مخاطب کرتے تھے۔ جب اسے بورشے کہہ کر پکارا جاتا تو وہ مسکرا دیتا۔ وہ خوش ہوتا تھا۔ سرشام کبھی کبھی وہ بازار میں کھڑا ہو کر بھی بورشے بجا دیتا تھا۔

"تو تم ہو بورشے...." لمبی سفید داڑھی والا ایک بوڑھا اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

آسکر مسکرا دیا.... پھر سر ہلایا "ہاں"

"میں سمجھا تھا بورشے صرف ایک انسان ہے لیکن یہ تو ساز اور انسان دونوں ہے۔ تمہاری دھن اچھی ہے لیکن یہ التجائیہ کیوں ہے۔ تم کس سے التجا کر رہے ہو' تم کسی کو پکار رہے ہو نا؟"

بورشے' آسکر کے ہاتھ میں کانپ کر رہ گیا۔ آج تک کسی نے اسے یہ سب نہیں کہا تھا۔

"یہ ماریہ کا ساز ہے۔ وہ اسے بجا کر جگنو اکٹھے کیا کرتی تھی۔ میں اسی دھن کو بجانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"جب ماریہ بورشے بجاتی ہو گی تو وہ التجائیہ نہیں بجاتی ہو گی.... ہے نا؟ تمہیں التجا نہیں کرنی چاہیے۔ التجا کرنا چھوڑ دو' اہتمام کرو...."

"کیسے....؟"

"وہ میں نہیں جانتا.... شاید تم خود معلوم کر سکو...." کہہ کر وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

اس رات بورشے نہیں بجا۔ آسکر بورشے کو ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا.... سوچتا رہا.... بورشے اس سے اگلی رات بجا....

☼ ☼ ☼

یہ اس رات کا قصہ ہے۔ جس رات کے بعد آسکر پیسا شہر سے غائب ہو گیا۔

دن میں اسے پاپا کا خط ملا تھا۔ "لوٹ آؤ آسکر.... تمہاری یاد مجھے جلانے لگی ہے۔ میں تمہاری محبت کا بورشے بجا رہا ہوں' کیا میری کوئی دھن تم تک نہیں پہنچی۔"

ان لفظوں نے آسکر پر محبت کے احساس کو حدت

بنا کر اس طرح طاری کیا کہ وہ گھائل ہو گیا۔ اس کا دل اس احساس سے جلنے لگا کہ کیسے محبت خارج از بہار ہوتی جا رہی ہے اور خزاں ہے کہ اس کی جڑوں میں بیٹھتی جا رہی ہے۔ اس کا باپ اس کے لیے بورشے بجا رہا ہے اور وہ ماریہ کے لیے۔ کیا محبت کو پالینا اتنا ہی مشکل ہے؟ کیا محبت وہ جگنو ہیں جو ایک بار ناراض ہو جائیں تو لوٹ کر نہیں آتے؟ کیا کائنات کی ہر چیز کو محبت کے تابع نہیں کیا گیا؟ کیا ہر روح کی بنیاد محبت نہیں؟ اگر ہاں تو پھر بورشے بجتا کیوں نہیں؟ روشنی کے قافلے آ کر کیوں نہیں دیتے؟

آسکر کے اندر لو جلنے لگی۔ وہ کراہنے لگا اور بورشے کو اپنے سینے سے لگا کر اپنا سینہ مسلنے لگا۔ اس کا سینہ جل رہا تھا... یہ آگ... یہ آگ گاؤں کے جنگل سے شروع ہوئی تھی... محبت وہاں چنگاری بنی تھی اور پھر جدائی کے الاؤ میں بدل گئی تھی... کیا یہ آگ بورشے محسوس نہیں کرتا تھا۔ ماریہ اس کے قریب سے گزر جاتی تھی لیکن اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے جنگل میں روشنیوں کے سنگ رقص کرتی لڑکی سے محبت کی تھی۔ اس لڑکی کے لیے وہ سمندروں میں بہہ کر آیا تھا' زمین پر رینگتا رہا تھا۔ پھر بھی تپش تھی کہ سرد نہیں ہوتی تھی۔ شدت تھی کہ کم نہیں ہوتی تھی ... اور بورشے تھا کہ خاموش تھا... گونگا تھا... یہ تو بے رحمی کی انتہا ہے۔

"التجا کرنا چھوڑ دو... اہتمام کرو..."

بازار میں اس نے ایک بچے کو شیشے کی بوتل میں جگنو کو لے جاتے دیکھا۔ کم سے کم بچے میں اتنی قابلیت تو تھی کہ وہ جگنوؤں کو جھاڑیوں سے نکال کر اپنے ساتھ رکھ سکے اور اپنی خوشی کا اہتمام کر سکے۔ محبت اہتمام ہی چاہتی ہے۔ التجا تو مانگنے والوں کا شیوہ ہے۔ التجا تو انہیں درکار ہے جنہیں کسی چیز کی ضرورت ہو۔ محبت میں ضرورت کہاں رہ جاتی ہے۔

"جب بورشے کے ساتھ محبت بھی لا سکو تو پھر آنا۔"

آگ اپنے اہتمام کی پہلی سیڑھی پر کھڑی ہو گئی' جب آسکر نے بورشے کو اپنے منہ سے لگایا اور یہی وہ لمحہ تھا جب شاعر پر آمد کا ایک بار آور لمحہ آیا اور الفاظ تہہ و بالا ہوتے' زیر سطح ہلچل مچاتے' چٹانوں سے ٹکراتے' الاؤ میں جلتے دھن تک آئے۔

"میرا بورشے اسی دن جل گیا تھا جس دن میں نے ان کی نمائش کی تھی۔ تمہاری محبت کا' میں نے ان کی محبت سے سودا کیا تھا۔ میرے پاس وہ نہیں رہے تو تم بھی نہیں رہو گے۔"

آگ کی لپیٹیں بلندی کو چھو لینے کے لیے بے قرار تھیں کہ مصور کو ایک شاہکار دے دیا گیا' بے رنگ دنیا میں اس نے رنگ بھرنے کا اہتمام کیا... ابتدا اس نے اپنے رنگ سے کی... پہلا اسٹروک اس نے اپنی ذات سے نکال کر لگایا۔

"وہ میری دھن پر نہیں آتے تھے۔ وہ میرے دل کی پاکیزگی' میری محبت پر آتے تھے۔ میری یہ پاکیزگی جاتی رہی' محبت ختم ہوئی۔ اگر لوٹا سکو تو لوٹا دو... لا سکو تو لا دو..."

شاعر نے اپنے حلق کو کرب سے تڑپایا اور آسکر نے بورشے میں پہلی پھونک ماری اور بورشے بجنے لگا۔ آسکر کو بورشے سننے کی فرصت نہیں تھی وہ اپنے دل کی جی حضوری میں مگن تھا...

"اس موت کے پیامبر کو اب تم رکھو... زندگی کے خاتمے کو تم بجاؤ... بے رحمی تمہاری ہی میراث لگتی ہے۔"

اگر بورشے موت کا پیامبر ہی تھا تو وہ اسے وصول کرنے جا رہا تھا... اگر خراج موت ہی تھی تو وہ قربانی دینے جا رہا تھا۔

اس دھن نے حد کر دی اور ہر طرف آگ بھڑکا دی۔ اسے یہی آگ چاہیے تھی۔ وہ جلتا رہا' تپش اس کے کانوں' لوؤں کو چھونے لگی' اس کے دل تک پہنچنے لگی۔ وہ گرم انگارہ بن گیا۔ الاؤ چار اطراف بھڑکنے لگا اور ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔ جیسے اس رات اس نے ڈھیروں جگنوؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

"اگر توازن ہی درکار تھا تو لو میزان برابر ہوا..."

جگنوؤں کی روشنیاں آگ ہو گئیں تو یوں آسکر بھی آگ ہوا...."

بورشے البتہ بجتا رہا... آخری وقت تک... اس وقت تک جس وقت....

☆ ☆ ☆

اس وقت تک، جس وقت وہ اپنے اندر کی ساری آگ بورشے میں انڈیل رہا تھا۔ اسی وقت مالک مکان اور چند دوسرے لوگ خود کو موٹے کمبلوں میں لپیٹے، اس کے کمرے کا دروازہ توڑ کر اس پر کمبل ڈال کر گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ پھر وہ ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔

مالک مکان کا گھر اور ساتھ کے تین اور گھر آگ سے جل رہے تھے۔ کسی ایک گھر کے ملازموں کی غفلت سے آگ یک دم بھڑکی اور دیکھتے ہی دیکھتے تین گھروں تک پھیل گئی۔ تینوں گھروں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ گھر جل رہے تھے۔ وہ بالکنی بھی، جس میں بیٹھا وہ بورشے بجا رہا تھا۔ اس کے کمرے کی ساری دیواریں جل چکی تھیں اور اس کے ہاتھ میں موجود بورشے آگ کی حدت سے انگارہ ہو رہا تھا۔

جلتے ہوئے گھروں کے باہر کھڑے لوگ حیرت زدہ تھے کہ وہ اپنے نام کی پکار پر متوجہ کیوں نہیں ہوا، جب وہ اسے وہاں سے نکل جانے کے لیے اپنے حلق پھاڑ رہے تھے۔ آگ کی لپٹوں کے باوجود وہ ساز کیسے بجاتا رہا۔ کیا وہ دیوانہ ہو گیا ہے؟ کیا اسے نظر نہیں آرہا تھا کہ اس کے لباس نے آگ پکڑ لی تھی۔ کیا اسے اپنے جلتے ہوئے گالوں، کانوں کی لووں کی تکلیف کا احساس نہیں تھا، جو وہ اس بلا کو بجاتا رہا....

اسے زمین پر پٹخا گیا اور سوکھی مٹی میں لوٹ پوٹ کیا گیا۔ جس وقت اسے ہوش آیا، وہ میدان میں درخت کے نیچے پڑا تھا اور لوگ ابھی تک آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو درخت کی شاخوں کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا جن پر چند جگنو بیٹھے پھڑپھڑا رہے تھے۔ ایک جگنو اس کے سر کے گرد گھوم رہا تھا۔ اسے یہ طے کرنے میں وقت لگا کہ وہ پہلے سے وہاں موجود تھے یا وہ بورشے سن کر آئے تھے۔

☆ ☆ ☆

اجنبی پیپسا سے غائب ہو گیا۔ وہ اجنبی جسے سب بورشے کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ ماریہ کو اگلے دن صبح آگ کے بارے میں معلوم ہوا اور وہ ناشتے کی میز کو تقریباً" الٹتی ہوئی باہر بھاگی۔ سڑکوں، گلیوں کو بھاگتے ہوئے اس نے ایسے پار کیا کہ اپنی ہی فراک سے کئی بار الجھ کر گری۔ اس نے اس چیز کی بھی پرواہ نہیں کی کہ اس نے کتنے ہی انسانوں کو پرے دھکیلا اور جھیل پر بنے پل پر دوڑتی بگھیوں کی زد میں آنے سے خود کو بمشکل بچایا۔

سارا گھر ہی جل کر کھنڈر ہو چکا تھا۔ وہ آسکر کے کمرے میں گئی تو اسے وہاں کوئی ایک بھی چیز ایسی نظر نہیں آئی جو جل کر راکھ نہ ہو چکی ہو۔ اسے اس کی کچھ جلی ہوئی چیزیں اور جلے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑے دکھائی دیے اور وہ ان کے پاس بیٹھ کر انہیں اپنی آنکھوں سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"آسکر... اوہ میرا بورشے... اپنے جگنوؤں کی طرح میں نے تمہیں بھی جلا دیا نا...."

کتنی ہی دیر وہ وہاں فرش پر بیٹھی ہچکیاں لیتی رہی۔ اس کی آنکھوں نے کمرے کی ساری سیاہی نگل لی اور آنسوؤں نے کرب کے پیالوں کو الٹ دیا۔ گردن گھما کر اس نے کمرے کی جلی ہوئی دیواروں کو دیکھا اور اس چیز نے اس پر صدمے کی انتہا کر دی کہ وہ ان جلتی ہوئی دیواروں کے درمیان بیٹھا بورشے بجاتا رہا تھا۔ اس کی ادھ جلی کرسی جس پر وہ بیٹھا تھا اس کی پشت ساری کی ساری جل چکی تھی تو گیا آسکر کی پشت بھی۔ اس خیال سے ماریہ پھر سے اتنی بے دم ہو گئی کہ کوئلے کا ڈھیر ہو گئی۔

"تو کیا قیمت کی ادائی آسکر نے خود کو جلا کر کی۔"

بورشے اس کے دل میں بجنے لگا اور اس کی محبت کے جگنو ایک ایک کر کے جل کر راکھ ہونے لگے۔ اب اس راکھ کے ڈھیر کی مالکہ تھی وہ۔ اس کا دل بلکنے لگا۔

"ماریہ..... بورشے کے ساتھ محبت ہی تو آئی ہے۔"

اوہ آسکر..... میرے آسکر..... بورشے کے ساتھ محبت ہی آئی تھی..... کاش بورشے کے ساتھ میرے دل کی بینائی بھی آجاتی۔ کاش میں جان جاتی کہ جگنوؤں کے جانے سے میری بہار گئی ہے لیکن تمہارے جانے سے میری زندگی ہی ختم ہو جائے گی۔"

مسز جبین ماریہ کے ایسے گھر سے بھاگ آنے پر تشویش سے اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی آئی تھیں۔ اب وہ کمرے کی دہلیز میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں' اپنی بیٹی ماریہ کو جو جلے ہوئے فرش سے سیاہی سمیٹ سمیٹ کر اپنے اندر اتار رہی تھی۔ ساری کہانی ان پر واضح ہو گئی۔

"ماریہ.....!" مسز جبین نے لرزتی ہوئی آواز میں قریب آکر پکارا اور پھر وہ بھی ماریہ کے ساتھ فرش پر ڈھیر ہو گئیں۔ اپنی قیمتی پوشاک کی فکر کیے بغیر' اپنی بیٹی کو غم میں ایسے تہہ و بالا ہوتے دیکھ کر۔ ماریہ نے سر اٹھا کر دیکھا شدت غم سے اس کی آنکھیں بینائی سے محروم لگ رہی تھیں۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا ماریہ....."

"جو لوگ اپنے پیچھے آنے والوں کو انتظار کرواتے ہیں ماں! وہ میری طرح پھر جدائی کی سیاہی چاٹتے ہیں۔ دیکھو ماں! میں کیسے جل رہی ہوں۔ میں نے اپنے آسکر کو جلنے دیا۔ یہ سارا گھر جلتا رہا۔ یہ کمرہ' یہ دیواریں اور وہ بورشے بجاتا رہا۔ ماں ایسے تو میں نے بھی بورشے نہیں بجایا تھا۔ مجھے تو گاؤں' جنگل اور جگنو ملے تھے۔ اسے کرب' ماریہ اور آگ کیوں ملی۔ محبت کی بازی میں جل کر وہ جیت گیا۔ بورشے بھی اس کا ہوا اور اس کی ساری دھنیں بھی۔ وہ ہیرو رہا بورشے کا۔ محبت کی ساری پاکیزگی اس کی ہوئی۔ محبت کی ساری ادائیگیاں اس کے نام ہوئیں۔ اور میں پھر سے خالی ہاتھ۔" اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس پر سر رکھ کر رونے لگی۔

"وہ ٹھیک ہے ماریہ..... بس وہ یہاں سے چلا گیا ہے۔"

"جگنو بھی جل کر چلے گئے تھے۔ پھر واپس نہیں آئے..... اوہ آسکر..... میرا جگنو..... وہ بھی واپس نہیں آئے گا۔"

"وہ آئے گا..... جب تم دل سے اسے پکارو گی....."

"نہیں ماں.....! اب کوئی بورشے نہیں بجے گا..... کوئی دھن نہیں نکلے گی..... اب کہیں سے کوئی روشنی اڑ کر نہیں آئے گی۔ وہ مجھے جنگلوں میں ڈھونڈتا رہا۔ کتنی ہی سرزمینوں کو اس نے میرے لیے کھنگالا۔ پھر بھی میں نے پلٹ کر اسے نہیں دیکھا۔ میں جانتی تھی' وہ کبھی جگنو نہیں لاسکے گا۔ میں جانتی تھی پھر بھی میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے جگنو لادے۔ شرط..... اتنا..... غصہ..... میرا دل اس تک کیسے پلٹتا۔ اس نے میرے لیے ہر دھن بجائی اور میں نے سننے کی زحمت ہی نہیں کی۔ ماں پیسا کے گلی کوچے' باغ و دیوار تو اس کے بغیر رہ لیں گے' میں کیسے رہوں گی..... میرے دل کا شہر سونا کر دیا..... اب میرے دل کے گلی کوچوں کے لیے بورشے کون بجائے گا؟"

اس وقت مسز جبین نے جان لیا کہ کس چیز کے سہارے وہ ان کے بغیر بھی گاؤں میں زندہ تھی..... بورشے..... کون سی چیز اب اس زندہ ماریہ کی جان نکالے جا رہی ہے..... آسکر.....

جس وقت مسز جبین ماریہ کو سہارا دیے گھر لائیں اس وقت گھر کے ملازم یہ دیکھ کر ڈر گئے کہ مسز جبین کسی اجنبی دیوانی کو اپنے ساتھ لا رہی ہیں۔ جس کے کپڑے داغ دار ہیں اور جس کے حسن پر کرب' سیاہ قسمت بنا کندہ ہے۔ کیا یہی وہی لڑکی ہے جس کے حسن کے چرچے شہر بھر میں ہوتے رہے تھے' جس کی خاموشی عبادت میں مگن لگتی تھی تو اب وہ عبادت خانے سے نکالی ہوئی کیوں لگتی ہے۔ اگر وہ واقعی میں حسین رہی ہے تو اب وہ اتنی بدصورتی کہاں سے لے آئی ہے؟

اس وقت مسز جبین نے جان لیا تھا کس چیز نے ان کی بیٹی کو ایسا لازوال حسن دیا تھا..... بورشے کس چیز نے وہ حسن چھین لیا تھا..... بورشے.....

ماریہ کی بد صورتی کے چرچے گھر سے نکل کر شہر بھر میں ہونے لگے۔ ہونے تو اور بھی بہت کچھ ہونے لگا تھا پیسا میں۔۔۔۔

☆ ☆ ☆

"سنا ہے۔" آگ اس کے ساز نے لگائی تھی؟"
کچھ ایسی باتیں ہونے لگی تھیں۔
"ایسی بچکانہ بات میں نے آج سے پہلے نہیں سنی۔ ساز آگ کیسے لگا سکتا ہے؟"
"کیا ہم جانتے نہیں کہ وہ کس محویت سے ساز بجاتا تھا۔"
"ہاں! اس کی محویت حیران کن تھی۔ اتنی کہ وہ یہ تک محسوس نہیں کر سکا کہ گھر میں آگ لگ گئی ہے اور باہر کیسی بھگدڑ مچی ہے۔ اس کے کمرے کی دیواریں جلنے لگیں اور وہ بورشے بجاتا رہا۔ کیا وہ دیوانہ تھا؟"
"یقیناً" وہ دیوانہ ہی تھا۔"
"اگر وہ جل جاتا۔۔۔۔"
"وہ جل ہی گیا تھا اگر اتنی بھگدڑ میں اس کے ساز کی آواز نہ سن لی گئی ہوتی۔" ہجوم قسم کھانے کی حد تک حیران تھا۔
"کیا وہ چاہتا تھا کہ وہ جل کر مر جائے۔۔۔۔ مجھے لگتا ہے' اسے معلوم تھا کہ آگ لگی ہے اور بس وہ یہی چاہتا تھا۔"
"تو اب اس نے شہر کیوں چھوڑ دیا۔"
"اس نے شہر کیوں چھوڑ دیا؟" ماریہ نے خود پر ملامت کی حد کر دی اور وہ یہ سوال خود سے اتنی بار کر چکی تھی کہ نیم پاگل ہو گئی۔ اس نے چاہا کہ وہ انکل ولسن کو خط لکھے۔ روزا اور مسٹر بروک ہیک کو بھی۔ لیکن پھر اس نے خود کو روک لیا۔ جب دستک پر اس نے خود ہی دروازہ نہیں کھولا تو اب اس کے پاس نہ واویلا کرنے کا حق ہے نا بڑھ کر دستک دینے کا۔ یہی قسمت تھی جو اس نے خود اپنے لیے لکھی۔ یہ سب اس نے خود ہی اپنے لیے طے کیا تھا۔

یہ سب طے تھا پھر بھی وہ رات دن پھوٹ پھوٹ کر روتی رہتی۔ مسز جین نے اسے رونے دیا اور پھر کبھی اس سے نہیں کہا کہ وہ خود کو بدلنے کی کوشش کرے۔ اپنے حسن کو برباد نہ کرے۔
گھر کے ملازموں سے نکل کر بات کئی کانوں تک پہنچ گئی کہ اجنبی آئرلینڈ سے ماریہ کے لیے آیا تھا۔ ساری کہانی کھل کر سامنے آ گئی۔ اجنبی جسے بھلایا جانے لگا تھا اسے پھر سے یاد کیا جانے لگا۔ اور پھر اس کے بارے میں قیاس آرائیاں کی جانے لگیں۔ اس کی خبر رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ زور و شور سے اس کی باتیں کی جانے لگیں۔
"میرا نہیں خیال اس نے شہر چھوڑ دیا ہے۔ میرے ملازم کا کہنا ہے چائے خانے میں اس نے چند دیہاتیوں کو باتیں کرتے سنا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے گاؤں میں ایک دیوانہ آیا ہے۔ جو اپنے ساز سے فضا کو روشن کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ وہی اجنبی ہے۔"
"روشن۔۔۔۔ وہ کیسے؟ تم جانتے ہی ہو' ان دیہاتیوں کو بے پر کی اڑانے کی کتنی عادت ہوتی ہے۔ یہ لوگ تو بھونرے کو بھی پرندہ سمجھتے ہیں۔۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔۔"
"میں نے تو یہ سنا ہے کہ وہ جنگلوں اور ویرانوں میں بھٹک رہا ہے۔۔۔۔ میرا کوچوان بتا رہا تھا۔۔۔۔" کسی تیسرے نے کہا۔
"وہ کہیں نہیں بھٹک رہا ہو گا' وہ اپنے شہر واپس جا چکا ہو گا۔ اجنبی ایسے ہی اچانک آتے اور چلے جاتے ہیں۔"
"اگر اسے واپس ہی جانا تھا تو وہ بے چاری ماریہ کے پیچھے آیا ہی کیوں۔۔۔۔"
"اسے سزا دینے۔۔۔۔ انتظار کی ایک مدت ہوتی ہے۔۔۔۔ اس مدت کے بعد اسے سزا بنا دیا جاتا ہے۔۔۔۔"
"ان دونوں کے لیے اتنی سفاکی ٹھیک نہیں۔۔۔۔"
"یہی ان کا انجام ہے۔۔۔۔ دیکھنا' اب وہ کبھی نہیں لوٹے گا۔۔۔۔"
"وہ کبھی نہیں لوٹے گا ماریہ۔" مسز جین نے ایک

دن دل پر پتھر رکھ کر کہہ دیا۔ "میں تمہیں ایسے نہیں دیکھ سکتی۔ کاش مجھے پہلے معلوم ہو جاتا کہ تم کیوں میرے پاس اچانک آگئی تھیں۔ کاش میں تم سے تمہارے دل کی باتیں معلوم کرنے کی کوشش کرتی۔"

ماریہ نے اپنے گیلے گال صاف کیے اور بس اتنا ہی کہا۔ "وہ چلا گیا اس نے ٹھیک کیا۔"

"اس کے انتظار میں ایسے نہ رویا کرو ماریہ۔"

"انتظار ان کا کیا جاتا ہے جنہیں لوٹ آنے کا کہا جائے، جنہیں زندگی سے نکال پھینکا جائے، ان کا غم کیا جاتا ہے۔"

☆ ☆ ☆

"اگر انجام کہانیوں کا مقدر ہوتے ہیں تو اس کہانی کا مقدر کوئی انجام نہیں۔"

اس دن کو طلوع ہونے کی اتنی جلدی تھی کہ رات خائف ہو گئی تھی۔ ماں ایک ہفتے بعد ہونے والی دعوت کی تیاریوں میں بری طرح سے مصروف تھیں۔ گھر بھر کی آرائش کی جا رہی تھی۔ ملازموں کو مختلف کاموں میں ہلکان کیا جا رہا تھا۔ وہ اپنے تینوں چھوٹے بہن بھائیوں کو لے کر گھر سے باہر آگئی تھی۔ خاص طور پر چھوٹے تین اتنے شرارتی تھے کہ ماں کا غصہ بڑھا رہے تھے۔ ماں نے اس سے درخواست کی کہ وہ ان کا کچھ ایسا انتظام کر دے کہ وہ سکون سے انتظامات کو دیکھ سکیں۔

جب سے آسکر گیا تھا۔ وہ گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ ماں کی ملتجیانہ درخواست کو وہ رد نہیں کر سکی اور تینوں کی انگلی تھام کر انہیں چہل قدمی کے لیے باغ میں لے جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

باغ گھر سے کچھ ہی دور تھا لیکن اس کے شرارتی بہن بھائیوں کو تو موقع چاہیے تھا۔ وہ اسے پتا نہیں کہاں کہاں گھسیٹتے رہے۔ جب وہ رکی تو اس نے خود کو بازار میں پایا۔ جوکر کے سامنے جو ہوا میں نہ جانے کتنی گیندیں اچھال رہا تھا اور اس کے سامنے کھڑے اس کے بہن بھائی محظوظ ہوتے ہوئے تالیاں بجا رہے تھے۔

وہ بھی بڑی سی سرخ ناک والے جوکر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اسے دیکھنے لگی.... دیکھتی رہی.... دیکھتی رہی.... جو کہ وہ آسکر کے جانے کے بعد کیا کرتی تھی۔ جہاں بیٹھتی، کھڑی ہوتی، بت بن جاتی۔ زندگی کی حرکت اس کے اندر سے کھسک جاتی۔ دل کی دھڑکن ماند پڑ جاتی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت معدوم ہو جاتی۔ یاد رہ جاتا تو بس اتنا کہ کوئی اپنی گہری آنکھوں سے چھپ کر اسے دیکھتا رہا ہے۔ کوئی اس کے دل کی لے کو پانے کے لیے شاعرانہ دھنیں ڈھالتا رہا ہے۔ وہ کوئی جو، اب کہیں نہیں ہے۔ جو نظروں میں تو ہے لیکن نظروں کے سامنے نہیں۔ وہی جو کہیں دور.... دور، بہت دور بھی نہیں....

ایک ایک کر کے گیندے اچھل رہی تھیں۔ اور وہ جوکر کی بڑی سی سرخ ٹوپی کو دیکھ رہی تھی۔

سرخ انگارہ ہے جدائی کا ساز.... سرخیلا زہر ہے جدائی کا مشروب....

ان انگاروں پر اس کا قیام ہے اب.... یہ زہر اس کا جام ہے اب....

گیندیں سرخ ہیں سبز اور نیلی ہیں۔ گاؤں کی گھاس کے جگنو گیلے نم ہیں اور باڑے کی بھیڑیں اجنبی کے قدموں کی چاپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے سر اٹھائے انتظار میں ہیں۔ جنگل کے درختوں کے تنوں سے نکلتے ننھے منے بونے چپنے منے دروازے کھول کر باہر نکل آنے کے لیے بے تاب ہیں اور وہ ہے کہ سر کو ساکت کیے جوکر کو دیکھے جا رہی ہے.... دیکھے جا رہی ہے.... جبکہ....

دور، بہت دور کوئی ساز بج رہا تھا.... وہ ایک لمبے سفر سے ہو کر آیا لگتا تھا....

ہلتے ہلتے سرخ ٹوپی ٹھہر گئی۔ جوکر نے اپنی گیندیں فضا سے اکٹھی کیں اور اپنے ہاتھ روک لیے۔ پھر بھی ماریہ اسے ہی دیکھتی رہی۔

ساز کی دھن انوکھی تھی.... نئی تھی.... حیران کن تھی۔

اس کے بہن بھائیوں نے اپنی اچھل کود بند کر دی تھی۔ جو کر سیدھا کھڑا ہو کر ایک خاص سمت دیکھنے لگا تو بھی ماریہ اسے ہی ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔۔۔ دیکھتی رہی۔۔۔ جبکہ۔

ساز جمال و کمال کی راہ پر گامزن تھا۔۔۔ اس کا بجانے والا دل کا پاکیزہ لگتا تھا۔۔۔ اس کا دل محبت سے معمور لگتا تھا۔۔۔ وہ جو پیسا والوں کے لیے اب اجنبی نہیں رہا تھا۔۔۔ آسکر۔۔۔ وہ دور بہت دور سے بورشے بجاتا بازار کی طرف آرہا تھا۔۔۔ اس کے سر پر۔۔۔ دائیں بائیں کچھ منڈلا رہا تھا۔۔۔ بادلوں کے مرغولوں کی طرح۔۔۔ لیکن روشن۔۔۔ اور اڑتا ہوا۔۔۔

کیا وہی جنہیں وہ ویرانوں، جنگلوں، دیہاتوں سے اکٹھا کرتا رہا۔۔۔

جو کر اپنے لکڑی کے اونچے اسٹول سے اتر کر نیچے کھڑا ہو گیا تو بھی ماریہ ویسے ہی کھڑی اسی جگہ کو دیکھتی رہی۔

"وہ ان کے پیچھے تصدیق کے لیے گیا تھا تاکہ وہ اس کی دھن پر آئیں گے۔۔۔ ان سے عہد لینے گیا تھا کہ وہ ہر بار آئیں گے۔۔۔ اور پھر ماریہ تک بھی جائیں گے۔۔۔ جنگلوں اور بیابانوں میں وہ یہی ثبوت اکٹھے کرتا رہا تھا، محبت کے مینار پر روشنی کرنے وہی چڑھا تھا۔"

ایک رات جو روشنی کے ننھے قمقموں پر بسرام تھی، یہ بس اس کی آخری ساعت تھی۔

اور پھر جہاں جو کر کھڑا تھا، اس خالی جگہ پر کچھ جگنو اڑ کر آئے اور لہرانے لگے۔ ماریہ یک دم چونکی اور اس نے دیکھا کہ جگہ خالی ہے جیسے جگنو بھر رہے ہیں۔ وہ ڈر کر سہم گئی۔ اس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا۔ وہ ایک بار پھر اس تلخی کا مزا چکھنا نہیں چاہتی تھی جس کا وہ بہت پہلے چکھ چکی تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کرنی چاہی لیکن اس سے پہلے ہی چند جگنو اس کے گال سر اور پیشانی پر آکر بیٹھ گئے۔ پھر ان کی تعداد بڑھنے لگی۔

پیسا شہر کے پل سے شفاف پانی بہتا آرہا ہے۔۔۔ اس پانی کا رنگ روشیلا ہے۔۔۔ اس پانی کا رنگ بورشیلا

ہے۔۔۔

ماریہ دم بخود رہ گئی۔۔۔ وہ اپنی جگہ سے ایک دم متحرک ہوئی اور پھر۔۔۔ پھر اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔۔۔

کوئی محبت بجاتا آرہا تھا۔۔۔ کوئی خواب کو تعبیر کرتا آرہا تھا۔۔۔

کوئی بورشے تھا۔۔۔ کوئی اجنبی تھا۔۔۔ وہ آسکر تھا۔

وہ جنون کے اس عالم پر فدا ہو گئی۔۔۔ اپنے دل کے شہر کی ایسی آبادکاری پر وہ نہال ہو گئی۔۔۔

آسکر بورشے بجاتا اس کی روشنیوں کو لیے آرہا تھا۔۔۔ اس کے سر پر ان کا ہجوم محو اڑان تھا۔ وہ وہاں کھڑی تھی پھر بھی اسے لگا' وہ خواب در خواب میں ہے۔ آسکر اس کے سامنے تھا پھر بھی اسے لگا وہ گمان در گمان میں ہے۔۔۔ اور کچھ کیسے۔۔۔ بھلا کیسے۔۔۔

کتنے ہی لوگوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور راہ گیر رک گئے۔ وہ آسکر کو پہچان گئے تھے۔ چلتی ہوئی گھوڑا گاڑیاں روک لی گئیں۔ خریداری میں مصروف لوگوں نے اپنی مصروفیت ترک کر دی۔ پیسا شہر نے اپنی فضاؤں کو جگمگ ہوتے دیکھا اور دیر تک دیکھا۔

دور بہت دور ایک جنگل ہے۔۔۔ ہاں اب وہ روشن ہے۔۔۔ روشن تر ہے۔۔۔

جگنوؤں کا سیلاب تھا جو ماریہ کی طرف آرہا تھا۔ آسکر تو صرف بورشے بجا رہا تھا۔ یہ تو ماریہ کے جگنو تھے جو آسکر کو ماریہ تک لے جارہے تھے۔ وہ آسکر کے آگے آگے تھے۔ وہ اب پیچھے سے نہیں آئیں گے۔ وہ بھاگ کر نہیں جائیں گے۔

دھن نے اپنی لے بدلی۔۔۔ اور سب جگنو۔۔۔ سب ہی جگنو یکدم اڑ کر ماریہ کے گرد دائرے میں سمٹ گئے۔

دور بہت دور ایک رقص کیا گیا۔۔۔ ہاں' اب وہ پھر سے کیا جائے گا۔۔۔"

آنسوؤں کی زیادتی نے ماریہ کو بے حال کر دیا اور وہ بار بار اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔

محبت کے جگنوؤں کے پر کبھی نہیں جلتے۔ اگر جل جائیں تو محبت بنا پروں کے پرواز کرنا سیکھ جاتی ہے۔

ماریہ کے گرد دائرہ بڑھتا ہی جارہا تھا اور پھر آسکر بورشے کو ہاتھ میں لے کر ماریہ کے قریب آگیا۔ بورشے والے ہاتھ کو آسکر نے ماریہ کے آگے کیا اور کہا۔

"دیکھو ماریہ میں لے آیا۔۔۔ تمہارے جگنو۔۔۔ تمہارا بورشے۔۔۔ اور تمہارا آسکر۔۔۔"

ماریہ کھلکھلا کر ہنس دی اور ہاتھ بڑھا کر اس نے پہلے آسکر کا ہاتھ تھاما۔۔۔ پھر بورشے اور پھر جگنو۔۔۔

"جگنو کبھی اندھے نہیں ہوتے کیونکہ بورشے کبھی گونگے نہیں ہوتے۔۔۔"

ماریہ نے بورشے کو اپنے منہ سے لگالیا۔ جگنوؤں کے دائرے میں' آسکر کے ساتھ کھڑے' اپنی فراک کا کونا بلند کر کے دھن کو بجانا شروع کی۔۔۔

"محبت کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔۔۔ کیونکہ وہ کبھی چھوڑ کر نہیں جاتی۔۔۔"

ماریہ کے منہ سے لگا بورشے بج رہا ہے۔ اس نے اپنی دھن بجائی اور پھر یکدم اس کی لے بدلی اور سب ہی جگنو اڑ کر بلند ہوئے اور پھر یکدم ان دونوں پر ڈھیر ہو گئے۔

میں نے کہا تھا نا کہ اس کہانی کا کوئی انجام نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تو اس کا آغاز ہے۔

جگنوؤں کی آمد کا۔۔۔ "رقص"

ماریہ اور آسکر کی ابتدا کا۔۔۔ "محبت"

دھنوں کے بجنے کا۔۔۔ "بورشے۔۔۔ بورشے۔۔۔ بورشے۔۔۔"

فُل ٹائم

سمابنتِ عاصم

مسائل کا انبار... مشکلات کی بھرمار... راشن، دودھ والے کا ادھار... ابا کی للکار... امی کی چیخم پکار... بھائیوں کی بیگمات سمیت راہ فرار... ایسے میں کیا کرے بے چاری شہوار... اچھا بھلا گھر میدان کارزار بن کر رہ گیا تھا۔

بڑا ہی آسان اور سادا سا حل تھا۔

کوئی فل ٹائم جاب... نائن ٹو فائیو بشکل گم...

دل کے بہلانے کو یہ خیال نہایت اچھا ثابت ہوا کہ پارٹ ٹائم میں تو کئی جگہ سر پھوڑ لیا۔ سوائے "ڈگومز" کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ بیمہ کے نام پر پالیسز فروخت کرنے والی کمپنیز یا ڈور ٹو ڈور سیل... اور اسے اپنے حسن جہاں سوز سے ایسی بھی پرخاش نہ تھی۔

شہوار آستین چڑھا کر میدان میں اتر آئی۔ ایک کے بعد ایک 'ضرورت ہے' کے کالم پڑھتی چلی گئی۔ مگر ڈیمانڈز! اف خدایا! پہلے ہی مرحلے پر عقل غوطہ کھا گئی۔ ہر جگہ تنخواہ حسب قابلیت... ابھی تو میٹرک بھی پورا نہ تھا۔ اٹھارہواں سن لگا ہی نہ تھا کہ شناختی کارڈ بنتا۔ باقی سب تو بعد کی بات تھی۔ اس کی اگلی اڑان عزیز از جان صبا کے پاس تھی۔

"بس اتنی سی بات... کسی کے بھی کاغذات کے مطابق سی وی بنوالو... بس نام ہی تو بدلنا ہوگا۔ فوٹو کاپی میں تو اپنی شکل ویسے بھی کسی اور کی لگتی ہے۔"

تجویز نامعقول سہی... مگر قابل عمل تھی۔ سو ایک بار پھر خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئی۔ چھانٹ کر قدرے قریبی اشتہار منتخب کیا۔ کسی آفس کو آفس کلرک کی ضرورت تھی۔ تنخواہ حسب قابلیت...

☼ ☼ ☼
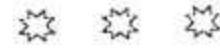
خدا جھوٹ نہ بلوائے تو امی کی اپنی سسرال سے کبھی ایک پل کی نہ بنی۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ آبائی مکان کے درمیان دیوار اٹھا کر دو بھائیوں کے پورشن الگ کیے گئے تھے۔ مگر یہ ہی دیوار آئے دن کے جھگڑوں نے دلوں میں بھی کھڑی کر دی۔ بچے چھپ چھپ کر کھیلتے۔ امائیں للکار کر گھسیٹتیں۔ جواباً"

زبانی کلامی معرکے جو تم بے زار تک جا پہنچتے۔ جٹھانی صاحبہ کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا۔ اسی آئے دن کی کل کل سے امی نے جلد پسپائی اختیار کی۔ مکان کا اپنا حصہ کرایہ پر اٹھادیا۔ جو ملتا وہ اپنے ٹھکانے کا بھگتا دیتیں۔ اس وقت گھر ایک ابا کی کمائی پر چلتا تھا۔ اب چند ہزار میں کوئی کیا پہنے۔ بچا لے کیا کھائے۔۔۔ خیر سے چھ بیٹوں کی ماں تھیں۔۔۔ مگر سارے ایک سے بڑھ کر ایک نالائق نکمے۔۔۔ دربدری کے سبب ٹھکانے بدلتے گئے۔ بچے نہ ڈھنگ سے پڑھ سکے۔۔۔ نہ کوئی ہنر سیکھ کے دیا۔ نتیجتاً " کھینچ تان سب کا مقدر رہی۔ ابا کی آمدنی دال دلیہ میں ہی پھنک جاتی۔ وہ اپنی دربدری ہی نہیں۔۔۔ تنگ دستی کا بھی الزام سسرالیوں کے سر رکھتیں۔ سب سے منہ پھیر کے کلپتیں۔۔۔ مگر ابا کا خون جوش مارتا۔ وہ چپکے چپکے جا پہنچتے۔ پھر وہی ہوا۔۔۔ جو ان معاملات میں ہوا کرتا ہے۔

"افسانہ بنالیں گے۔۔۔ لوگوں کی تو عادت ہے۔"

تائی امی سمیت تمام سسرالی خواتین زمانہ بھر میں اتراتی، گاتی پھریں۔۔۔ کہ خیر سے ابا محترم ان کو "پیارے" ہو چکے ہیں۔ کیسی اولاد اور کاہے کی بیوی، وہ سب پر خاک دھول ڈال کر ان کی قدم بوسی فرماتے ہیں یہ بات ہزار کانوں میں پڑی۔ پھر کہاں ممکن تھا کہ چرچا سارے زمانے میں ہو اور امی کے کانوں تک نہ پہنچے۔ لوگ تو کھینچ تان کے معاملات کو مرچ مسالا لگا کر چٹخارہ لیتے ہیں۔ انہوں نے ابا کو گھر، اولاد کے ہر معاملہ سے بے دخل کر کے ایک چپ سادھ لی۔ چپ بھی ایسی کہ دنیا نے سر پٹخ لیا۔ یہ چپ نہ ٹوٹی۔ ابا بکتے جھکتے۔ وہ نہ سنتیں، نہ جواب دیتیں۔ بیمار پڑتے تو رو پیٹ کر خود ہی اٹھ جاتے۔ گوارا یوں رہے کہ بچوں کے ابا تھے۔ ٹھپا ملنے کی دیر تھی کہ لات پڑتی۔ مگر نہ ٹھپا ملا، نہ لات پڑی۔ جبکہ دوسری جانب معاملہ برعکس رہا۔ جٹھانی صاحبہ کی گوٹی ہر معاملہ میں اوپر رہی۔ امی کو سسرال سے گزر کر آتی ہوا سے بھی پرخاش تھی، یہ تو پھر جیتی جاگتی تائی امی تھیں اور یہ پرخاش اس وقت کھلی جنگ میں بدل گئی جب سب کی باہمی گٹھ جوڑ سے بالا ہی بالا

نکاح کے نصف کا جو بنتا تھا۔ ابا کو پکڑا دیا گیا۔ مانو وہ ہمیشہ کے لیے دربدر ہو گئیں۔ امی دل کی بری نہ تھیں۔ مگر لوگوں کو ان کے مزاج کی گہرائی تک کون کھوجتا ہے۔ ابا نے غیروں کے ساتھ مل کر ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔ ان سب کے غیر منصفانہ فیصلہ کے سبب وہ ہنوز دربدر تھیں اور یہ خطا وہ کبھی معاف نہ کر پائیں۔ امی نے ابا کا مکمل بائیکاٹ کر دیا۔ ابا کا کردار بس اتنا رہ گیا کہ ہر ماہ کی مقررہ تاریخ کو اپنی آمدنی کسی بچے کے ہاتھ امی تک پہنچا دیتے۔ ان کی حیثیت بارہویں کھلاڑی سے بھی بدتر رہ گئی۔ گھر ان کے لیے سرائے بن گیا۔ آنا' سونا' چلے جانا۔ امی کو ابا کی خیریت سے بڑھ کر اپنی ہتک اور رمات کا رنج مارے ڈالتا۔ گھر، بچوں کی ڈور امی کے ہاتھ رہی۔ وہ سب کو حسب توفیق بیاہتی گئیں۔ ان کے ٹھکانے الگ کرتی گئیں۔ مگر ابا کے معاملہ میں کسی سمجھوتے' نرمی' یا لچک کو نہ اپنا سکیں۔

☼ ☼ ☼

عمارت کی تین منزلیں سر کر کے کوریڈور کے آخری سرے پر آفس تھا۔ وہ چھپاک سے داہنی جانب گلاس وال کا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر گھس گئی۔

"ایکسکیوزمی!"

"معاف کرو۔۔۔" اخبار میں منہ دیے، پاس کی کرسی پر براجمان آدمی نے سر اٹھائے بغیر مزے سے کہا۔

وہ بھاگم بھاگ جس حال میں آئی تھی یقیناً" اس سے زیادہ کی مستحق تھی۔ کھنکھار کے ایک بار پھر کہا۔ "ایکسکیوزمی"

"آپ کے ہاں سلام کرنے کا رواج نہیں ہے کیا؟" اس بار جھٹکے سے سر اٹھایا گیا۔ فرصت سے منہ چلاتا۔ گھنیرے بالوں اور کشادہ آنکھوں والا سوٹڈ بوٹڈ بندہ کہیں سے بھی بابا نظر نہ آتا تھا۔ اوپر والے کی "نو لفٹ" پر رنج دگنا ہو گیا۔ "ہاہ! کیسے کیسوں کو دیا ہے۔"

"اوہ! السلام علیکم۔۔۔ مجھے طاہرہ خاتون سے ملنا ہے۔"

"جی۔۔۔ وہ میں تو ہرگز نہیں ہوں۔"

"جی ہاں۔۔۔ وہ تو نظر آ ہی رہا ہے۔ وہ کہیں ملیں گی نا۔"

"جی ہاں۔۔۔ بیٹھیے۔۔۔ کس سلسلے میں ملنا ہے۔"

اسے اشتہار کا حوالہ دے کر سی وی سامنے رکھنی پڑی۔ پیر پسار کر وہ بغور اس کا جائزہ لینے لگے۔

"ثمر جلال۔۔۔ یہ آپ کا اپنا نام ہے؟"

"جی۔۔۔ آپ کو کسی اور کا لگا؟" اندر کا چور کلبلایا۔۔۔

"جی ہاں۔۔۔ کیونکہ مجھے تو آپ ثمر جلال کم' بھوری بلی زیادہ نظر آتی ہیں۔"

وہ بھونچکا سی رہ گئی۔

"معاف کیجئے گا۔ آپ کیا ہر کسی سے یوں ہی فری ہو جایا کرتے ہیں؟"

"سنا تو یہ ہی ہے کہ انسان کی بات اور باپ ایک ہوتے ہیں۔"

"دماغ درست ہے آپ کا۔ آپ کیا جانتے ہیں انہیں؟"

"کیوں نہیں۔ میں ان کا اکلوتا بھتیجا نجیب ہی تو ہوں۔ نجی' جسے آپ بچپن میں نجی کھجی کہا کرتی تھیں۔"

"ہائیں۔۔۔ اس بات کا تو سارے فسانے میں ذکر ہی نہ تھا۔"

سمجھ میں نہ آیا کہ اس انکشاف پر روئے یا ہنسے۔ بغور جائزہ لیا تو بیان درست ہی نکلا۔

"اوہ! دراصل تمہارے چہرے پر مونچھوں نے جو قبضہ کر لیا ہے۔"

"لیکن تمہاری تو مونچھیں بھی نہیں۔۔۔ میرا مطلب تم تو بالکل ویسی کی ویسی ہو۔ بھوری بلی۔"

"اور تم آج بھی اتنے ہی سوکھے سڑے مردار نظر آتے ہو نجی کھجی۔" اس نے حساب برابر کیا۔

اب کوئی اچھی امید حماقت ہی رہتی۔ سو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے۔۔۔ کہاں چلیں۔۔۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس خوشی میں لڈو بانٹتیں۔۔۔ مجھے ہار پھول پیش کرتیں۔ آخر کو فرسٹ کزن ہوں تمہارا۔"

"ہونا تو بہت کچھ چاہیے' لیکن سب کچھ حسب منشاء ہوتا نہیں ہے۔ کبھی کبھی لڈو کی جگہ جوتے بھی کھانے پڑ جاتے ہیں۔"

"تم ذرا نہیں بدلیں۔" کھسیا کر ارشاد کیا۔ وہ اس کے نوچنے' کھسوٹنے پر ہی اسے بھوری بلی کہتا تھا۔ بچپن کی ناک سڑکتی نجی آج اپنے حسن کی بدولت کھٹ سے دل میں اتر گئی۔

"کام کی بات کریں؟" سرد و خشک لہجہ۔۔۔

"کام کی بات کام والے کرتے ہیں۔ میں تو بس ملازم ہوں۔ میڈم طاہرہ گیارہ بجے تک آتی ہیں۔"

قصور اسی کا تھا' وہ جلد آ گئی تھی۔ مالکان کی آمد تاخیر سے ہوتی۔ دیوار گیر گھڑی کے مطابق ایک گھنٹہ باقی تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"میں لوٹ آؤں' پلٹ جاؤں کہ انتظار کروں۔" ناچار وہ جگہ بدل کر اخبار کھنگالنے لگی' مگر یہ گھنٹہ اس کی جان کو آ گیا۔ چائے کے کپ پر کپ چڑھاتا وہ اتنا نامعقول تھا کہ آتے جاتے اس کے سر پر سوار ہوتا۔

"کچھ چاہیے۔۔۔ کچھ لیں گی؟"

جی ہاں۔۔۔ ایک پتھر جس سے آپ کا سر توڑا جا سکے۔

وہ کھسیا گیا۔ "میرا مطلب تھا بور تو نہیں ہو رہیں؟"

اگرچہ یہ پوچھنے والا سوال ہی نہ تھا۔ وہ بور ہی نہیں۔ بدمزا بھی ہو رہی تھی' مگر شاید۔۔۔ اس طرح ہی ہوتا ہے' اس طرح کے کاموں میں۔۔۔ پورا گھنٹہ صبر کے گھونٹ پیتے گزرا تھا۔

قیامت کو ملو گے تو قیامت کیوں نہیں آتی۔ کیا مجال جو ایک پل کی خلاصی ہو۔

"معاف کیجئے گا۔ آپ کی سیٹ میں اسپرنگ لگے ہیں کیا؟" اسے کہنا پڑا۔

"میں تو بس یہ کہنے آیا تھا کہ گھر میں جو کام ہوتے ہیں' یہیں اٹھا لاتیں۔"

اب وہ گھر کے بھانڈے جھاڑن تو اٹھا کر لانے سے رہی اور یہ سرکس کے جوکر کو شرماتا چھ فٹ کا بندہ۔

اس کے گمان کو بھی چھو جاتا" تو وہ اس بلڈنگ کے نیچے سے بھی گزرنے سے کان پکڑتی مگر اس کا کیا کیا جائے کہ انسان کی ساری خطائیں لاعلمی کے کھاتے میں جاکے پڑتی ہیں۔ سو یہ بھی رہی۔

آخر کار قیامت آہی گئی۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے...

اور ان کی آمد پر سچ مچ قیامت کا ہی سامنا تھا کہ پہلا ہی سوال جان لیوا نکلا۔

"اتنی سی تو ہو... نوکری کر کے کیا کرو گی؟"

اب ان سے کون پوچھتا کہ پیسے کی ضرورت بھلا کسے نہیں ہوتی اور اس میں اس کا کیا قصور کہ وہ جتنی تھی اتنی بھی نہ لگتی تھی۔

"اتنی سی عمر میں کیسے نوکری کے بکھیڑوں میں سر کھپاؤ گی؟"

"جی... پیپرز دے کر فارغ ہوں تو سوچا۔" سوچا سمجھا جواب۔

"جی ہاں... اتنی دیر سے میں بھی یہ ہی سمجھ رہا تھا۔ گھر بیٹھ کر آرام سے روٹی پکانا سیکھیں۔" یہ نغمہ اسی کی طرف سے تھا۔ مسکراتا' جان جلاتا وہ زہر لگا۔

"نجیب! تم سے کتنی بار کہا ہے' آفس کے معاملات میں چپ رہا کرو۔" (تو پھر تو انہیں شکل تاکنے کو رکھا ہے کیا؟)

"یہ تمہاری تصویر ہے؟" انہوں نے موٹا عینک لگا کر بغور جائزہ لیا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ (ثابت ہوا کہ ہیرا پھیری بھی جی داروں کا کام ہے۔)

"ویسے کیا ایج ہے تمہاری؟"

"اٹھارہ سال..."

"ہائیں... یہ لگتی ہے اٹھارہ سال کی؟"

"معلوم نہیں مادام! ابھی کچھ دیر پہلے تو انہوں نے سولہ بتائی تھی۔ اتنی سی دیر میں دو سال کیسے بڑھ گئے۔ مجھے خود حیرت ہے۔"

"توبہ! حد ہوتی ہے ہلکے پن کی... اب ایسا بھی کیا اوچھا پن کہ تولہ بھر بات بھی پیٹ میں نہ ٹکے۔ اقرباء پروری بھی کسی شے کا نام ہے کہ نہیں۔ کیا تھا' تو ذرا سا پردہ ہی رکھ لیتے۔ خواہ مخواہ دوسروں کو نکو بناتا۔"

"نجیب' دور ہو جاؤ میری نظروں سے... جا کے اپنی سیٹ پر بیٹھو۔" طاہرہ خاتون کی گھوری میں پیار تھا۔ وہ اٹھ گیا۔ مگر چلتے چلتے ان کے کانوں میں جانے کیا پھونکا کہ ان کی ٹون بدل گئی۔

"اپنے ہاتھوں سے ایک درخواست لکھ کر نجیب کو دے دو۔ وہی تمہیں کال کریں گے۔" (اسے جانے کی جلدی تھی۔ یہ دل کچھ اور سمجھا تھا۔ انہوں نے دور اک کونا بخش دیا تھا۔ جہاں اطمینان سے بیگ میں پڑی ٹائپ شدہ درخواست اپنی رائٹنگ میں نقل کر کے موصوف کو تھمادی۔)

"اوکے... دو دن بعد پتا کر لیجیے گا۔"

"جی... میں... مجھے آنا پڑے گا؟"

"مجھے پتا بتا دیجیے... بہ سرو چشم حاضر ہو جاؤں گا۔" دانتوں کی فراخدلانہ نمائش...

اور وہ اتنی بھی احمق نہ تھی۔ اک ذرا سا حوالہ کیا نکل آیا' موصوف جان کو آ گئے۔ پتا ٹھکانہ بتا دیا تو گھر کے باہر دھرنا دیتے نظر آئیں گے۔ موبائل اس کے پاس تھا ہی نہیں۔ گھر میں بھی ایک ابا کا موبائل تھا۔ اسی کے ذریعہ سب پیغام سلام چلتے۔ اس نے وہی نمبر گھسیٹ دیا۔

"توبہ توبہ... لڑکی تھی کہ دودھاری تلوار"۔ اس کے جانے کے بعد نجیب نے کان چھوئے۔

یہ تو چند دن گزرنے پر ہی معلوم ہو سکا کہ وہ زبان کی جتنی تیز تھی' عقل کی اتنی ہی کوری چٹ...

وہ دن اتنا ہی بدمزا اور ناخوشگوار رہا تھا کہ امید کی ڈور ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ مگر کمال یہ رہا کہ اس دن کی تمام تر تلملاہٹ کے باوجود جوائننگ کال آ گئی۔ شہوار گھر بھر میں ناچتی کودتی پھری۔ سب سے پہلے صبا کو بتایا۔

"توبہ ہے... تقرری نہ ہوئی' مژدہ حیات ہو گیا۔" امی جی بھر کے بدمزا ہوئیں... مگر وہ منٹوں میں جیسے ماؤنٹ ایورسٹ پر جا بیٹھی تھی۔ جی جان سے اگلے دن کی تیاری کی۔

☆ ☆ ☆

چھوٹا سا آفس تھا۔ "حسب قابلیت" کلرکی

نصیب ہو گئی تھی۔ جو غنیمت تھی۔ چند ہزار میں گھر تو کیا خاک چلتا۔ ذہنی فراغت ضرور حاصل ہو جاتی۔ اس کا دن اچھا گزر جاتا تو یہ بھی کم نہ تھا۔ آفس کا ماحول نہایت ہلکا پھلکا سا تھا۔ مالک نوکر سب ایک ٹیبل پر کھانا کھاتے۔ جس دن مادام کوئی خاص چیز منگواتیں تو پیون تک کو شامل رکھتیں۔ (شاید ایسے ہی لوگوں کے سبب دنیا قائم ہے۔) جس دن مادام نہ آتیں، صرف ملازمین رہ جاتے۔ جن کی تعداد محدود تھی۔ مادام کے امریکہ پلٹ نور نظر۔ جو امریکہ پلٹ کم 'سڑک چھاپ' انگوٹھا ٹیک زیادہ نظر آتے۔ جاذب سلطان۔ جن میں پاس والی کوئی خوبی نہ تھی۔ اور نظریں۔۔۔ توبہ 'توبہ' نظریں تھیں کہ دو دھاری تلوار۔ وہ جس رخ بیٹھتی، وجود کو چھیدتی محسوس ہوتیں۔ نجیب سے ان کی غضب کی بنتی۔ جس روز مادام نہ ہوتیں۔ آفس میں صرف 'ہا' ہو ہی رہ جاتی۔ اک پیون بابا۔ جو اونچا سنتے۔ زیادہ بولتے تھے۔ یا پھر اب وہ خود یعنی در شہوار۔ جاذب سلطان بار بار مخاطب ہوتے، مسکراتے، نصیب دشمناں، انہیں جھیلنا پڑتا، بعد ازاں پتا چلا یہ تبسم و تکلم ان کی عادت ہے۔ مالکہ پارہ صفت۔ کسی کل نچلی نہ بیٹھتیں۔ منٹ بھر میں آتیں۔ کھٹا کھٹ حکم نامہ جاری اور یہ جا وہ جا۔ معلوم ہوا کہ عنقریب امریکہ سدھارنے کی تیاری ہے۔ ساری بھاگ دوڑ اسی سبب ہے۔

"پورا آفس تمہارا ہے۔ اپنا ٹھکانہ خود بناؤ۔" پہلے دن وہ کہہ کر چلتی بنیں، مگر چھوٹا سا جملہ اس کی جان کو آگیا۔ داخلی دروازے سے جائزہ لیا جاتا تو داہنی جانب کا حصہ شیشے کی دیوار سے الگ کیا گیا تھا۔ مالکان کا پورشن۔ جس میں اے سی چلتا۔ فون کی گھنٹیاں ٹناٹن بجتی ہی رہتیں۔ لیپ ٹاپ بھی وہیں تھا۔ جس کو کام پڑتا، وہیں جا کے بیٹھنا پڑتا۔ خاصی پر سکون جگہ تھی۔ اس جانب کی کھڑکیاں مین روڈ کی جانب کھلتی تھیں۔ اس نے قصداً" اپنی سیٹ کھڑکی تلے رکھوائی تھی۔ نیچے سڑک چلتی تھی۔ دکانیں، گہما گہمی، آوازیں، تنہائی میں بھی رونق کا سا احساس رہتا۔ اے سی کی ٹھنڈی ٹھار فضا، ایک تھلگ جگہ۔ سامنے کی کھڑکی تلے نجیب کی سیٹ تھی جو اکثر خالی ہی رہتی۔ وہ ادھر ادھر بیٹھا اول فول ہانکتا، موبائل پر لمبی لمبی گپیں لگاتا پھرتا۔ شعر گیت، ادھورے مصرعے، فقرے لیے گاتا گنگناتا پھرتا۔

دکھائے دل جو کسی کا وہ آدمی کیا ہے
کسی کی کال نہ آئے تو زندگی کیا ہے

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دن بھر میں دو سو سے تو کیا ہی کم بیلنس پھونکتا ہو گا۔ ہر روز شام تک اس کا بیلنس صفر ہو جاتا۔ نون بجتی تو وہ کیپ الٹی کر کے جاذب کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔

"سو روپے کا سوال ہے بابا!"

"جوابا" وہ دو سو روپے ڈال دیتے۔ ایک کارڈ میرے لیے بھی لے لیتا۔"

شہوار کے نزدیک یہ بے شرمی تھی اور نجیب کہتا۔ ان لوگوں کو تو بس نچوڑو اور پی جاؤ۔

تف ہے ایسی زبان پر، جو منہ میں آئے بک دو' نمک خواری بھی کسی شے کا نام ہے کہ نہیں۔۔۔ اور ایسے لوگ۔۔۔ اس نے سر جھٹکا۔ طے ہے کہ سنگین ثابت ہوتے ہیں۔ مگر مالکان کا سر چڑھا تھا۔ سنا کہ ،ارکیٹنگ بھی بھگتاتا۔ مگر کب اور کیسے۔۔۔ یہ سوال ہنوز جواب طلب تھا۔

پہلا دن ہی خاصا جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ اٹھائی دھرائی میں ہی وقت تمام ہوا۔ شام تک ٹانگیں دہائیاں دے رہی تھیں۔ شام میں وہ بائیک سمیت ہم قدم تھا۔ مگر یہ سفر اسے روز ہی کرنا تھا۔ سو صاف ہری جھنڈی دکھائی اور وہ اتنی آسانی سے کہاں ماننے والا تھا۔

"اپنا ہی اپنے کے کام آتا ہے۔" "کیوں۔۔۔ میں آپ کو اندھی لولی، لنگڑی نظر آتی ہوں؟"

"نہ سہی۔۔۔ مگر احمق تو ہو نا! پہلے روز راستے اتنی آسانی سے کہاں سمجھ آتے۔" وہ ناچار بیٹھ گئی' کھٹارا سی اسکوٹر تھی۔ رستے میں ہزار جھٹکے لیتی۔ مگر گھر تک تو پہنچا ہی دیا۔ مگر امی نے جانے کہاں سے دیکھ لیا۔ انہیں

وسوسوں نے آگھیرا۔

"ہئے ہئے.... جوان جہان آدمی ہے' روز لینے اور چھوڑنے آئے گا تو دنیا کیا کیا نہ کہے گی؟"

شہوار کے تلووں سے لگی سر پر بجھی۔" اور وہ جو ویگنوں میں سیکڑوں ساتھ سفر کرتے ہیں۔ وہ ہمارے سگے ہیں کیا؟"

وہ چپ تو ہو گئیں' مگر پھر ان کی لے دے کافی دیر چلی۔ یہ لے دے بھی اس پر تھی کہ اس نے نجیب کی اصلیت سے آگاہ نہ کیا تھا۔ ورنہ ان سے کیا بعید تھا۔ نوکری کو لات مارنی پڑتی۔ مادام یا تو مشکوک طبیعت تھیں یا زمانہ شناس۔ پہلے ہی روز جتا دیا تھا۔ آفس میں کوئی "ایسی ویسی" بات نہ ہونے پائے۔ سو اس نے نجیب اور اپنے مابین رشتہ بھی مخفی ہی رکھا تھا۔

اور شاید یہ اسی لے دے کی پھٹکار تھی کہ اگلے روز ہڑتال پڑ گئی اور یہ اسے گھر سے نکل کر پتا چلا۔ جیسے تیسے آفس تو پہنچ گئی۔ مگر آفس میں داخل ہونے کے بعد واپسی کا دروازہ مالک کے حکم پر کھلتا۔ جو خیر سے لنچ تک پہنچے۔

"آگئے! اور لنچ وغیرہ کر لیا؟" نجیب نے چھوٹتے ہی اپنے مطلب کی بات کی اور لنچ کر کے وہ پہلے کب آتے تھے جواب آتے۔ اگلے ہی لمحے مینوز زیر غور تھا۔ قریبی فوڈ اسٹریٹ سے چرغہ منگوا کر کھایا جائے۔ نجیب سدھارا تو اس نے خود کو کام میں مصروف کر لیا۔ مگر وہ اوٹ پٹانگ ہانکتا کافی دیر بعد لوٹا۔

"ہڑتال کے موسم میں
تنہائی کے عالم میں
میں گھر سے نکل آیا
انڈے ہی اٹھا لایا۔"

"سب کچھ بند تھا۔ بڑی مشکل سے انڈے ہاتھ لگے۔"

"کوئی مرغی چرائی تھی کیا؟" جاذب نے چڑایا۔

"جی ہاں.... کوئیک سروس مرغی۔ ایک منٹ میں چھ انڈے...." وہ کہاں ہارنے والوں میں سے تھا۔

"ابے انڈے ابال کے کیا چمچے سے کھائیں گے۔ چل چائنیز آرڈر کرتے ہیں۔"

"پیسے کون دے گا؟"

"جو آرڈر کرے گا۔"

"جاؤ میں نہیں کرتا۔"

"تو پھر بھوکے مرو۔ کیونکہ میرے پلے کچھ نہیں ہے۔" نجیب کی ڈھٹائی کے سامنے کس جی دار میں دم تھا کہ ٹھہرتا۔ جاذب کو آرڈر کرنا پڑا۔

"اب ان انڈوں کا کیا کروں؟"

"میرے سر پر مار دو۔" جاذب جھلایا۔

اگلے ہی پل انڈوں کا سیال مادہ جاذب سلطان کے سر سے بہتا آنکھوں میں گھسا جا رہا تھا۔ پھر تو امن کی توقع بھی فضول تھی۔ اچھا بھلا آفس اکھاڑہ بن کر رہ گیا۔ شہوار ہنس ہنس کر دہری ہو گئی۔ جاذب مار دھاڑ سے "فراغت" پا کر الٹی کرسی کی پشت پر ٹھوڑی لگائے اک محویت سے اسے تکتا چلا گیا۔ سبز آنکھوں میں جل تھل تھی۔ جیسے دھوپ میں بارش کا سماں۔ اور جاذب سلطان کی سوچ کسی اور نہج پر سفر کر رہی تھی۔ ایسی حسین و دلکش لڑکیوں کی بڑی "مانگ" ہے۔ مگر لڑکی معصوم تھی۔ شمع محفل بنانے کے لیے "دانہ" تو ڈالنا پڑے گا۔ اسی محویت سے اسے تکتے ہوئے جاذب' نجیب کے اسٹائل میں شعر پڑھنے لگا۔

"ان کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز!
سونے والوں کی طرح....

وہ نجیب ہی کی طرح آدھا مصرعہ بھول گیا۔

"مسٹر جاذب سلان' جاگ جائیے...." نجیب نے عقب سے آکر کندھے پر ہاتھ رکھا۔ خطرناک حد تک سنجیدہ لہجہ میں رقابت کی آنچ تھی۔ جاذب کی نظروں کا میلا پن کھٹک رہا تھا۔ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی اور شہوار کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی۔

"ہاں.... یاد آیا.... جاگنے والوں جیسی۔"

"مسٹر جاذب سطان! بلبلے ڈراما کم دیکھا کریں۔" وہ پلٹ کر اس کے سامنے آبیٹھا۔ پھر بغور اسے دیکھا۔

"کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تو سوچا بھی نہ ہو گا کہ امریکہ یوں گلے پڑ جائے گا۔" نجیب کے لہجے میں آنچ

تھی۔ جاذب کچھ سمجھا' کچھ نہ سمجھا۔

لنچ آگیا۔ جاذب چائنیز کے نام پر جانے کون کون سے ڈبے لفافے کھول رہا تھا۔ ''یہ عورتوں کے کام ہوتے ہیں۔۔۔ کل سے کھانا آپ نکالیں گی۔'' نجیب کا موڈ بحال ہو ہی گیا۔

''واہ! ایسے ہی۔۔۔'' اسے بلاوجہ فری ہونا ایک آنکھ نہ بھایا۔ اور ایسا لنچ نکال کر دینے سے بہتر تھا وہ سب کے منہ میں زہر کے لڈو ٹھونس دیتی۔ چائنیز کے نام پر جو کچھ سامنے آیا' اس سے کبھی واسطہ ہی نہ پڑا تھا۔ اس کا سارا کھایا پیا باہر آگیا۔ وہ واش روم سے آنسو صاف کرتی برآمد ہوئی تھی۔

''اگر باہر کا کھانا پسند نہیں تو کل سے لنچ گھر سے لے آیئے گا۔ زیادہ تردد کی ضرورت نہیں۔ میں لنچ میں صرف دو روٹیاں کھاتا ہوں۔'' نجیب نے اسے چڑایا۔

''اچھا! اور وہ دو روٹیاں جاتی کہاں ہیں' کیونکہ۔۔۔ لگتی تو نظر نہیں آتیں؟'' نجیب نے سخت برا منایا۔ رخ پھیر کر بیٹھ رہے۔ اس نے خاک بھی پروانہ کی۔ کچن امی کے چارج میں تھا۔ دو جمع دو' چار روٹیاں امی تو اسے مشین میں ڈال کر قیمہ نکال دیں گی۔ وہ رخ پھیرے رہے۔ دن بھر خلاصی رہی۔ یہ اور بات کہ ان کی بابت ہر اچھا گمان کونے میں پڑا سسکتا نظر آتا۔

چھٹی کے بعد وہ پلکیں بچھائے راہ میں حائل تھے۔

''بڑی بے مروت ہو' کل رسماً' بھی نہ چائے پانی کا پوچھا نہ گھر دکھایا۔''

''یوں کہو کہ میرا ٹھکانہ معلوم کرنا ہے۔''

''آپ کے گھر تو بس ایک ہی بار آئیں گے۔''

''میں آپ کا خون نہ پی جاؤں گی۔'' چشم تصور میں مار دھاڑ سے بھرپور مناظر گھوم گئے۔ پہچان کے مرحلے کھلتے ہی ماضی سامنے آگیا تھا۔ مگر اس بار سرخ ہنڈا آڑے آگئی۔

''میڈم کی کال آئی تھی۔ آج حالات خراب ہیں' بے بی کو گھر ڈراپ کرو۔''

شہوار منہ چڑاتی جان جلاتی جا بیٹھی۔ وہ بھی اگلے ہی لمحے اپنی ''اوقات'' پر آگئے۔

''زہے نصیب۔۔۔ نصیب جاگ گئے آج ہمارے۔''

''آپ تو آفس سے نکل گئے تھے۔''

''بس یوں ہی ایک بار پھر رخ روشن کے دیدار کو جی چاہا۔'' انہوں نے خود اپنی پول کھول دی۔ دل اپنی اہمیت پر نازاں ہوا اور اگلے ہی پل پہ ناز اٹھ آیا۔ جانے بھی دیجئے۔۔۔ یہ آپ کا حسن نظر ہے' حسن نظر نہ آئے تو نظریں بھی کہاں کام کرتی ہیں۔ وہ کچھ اور بولتی تو وہ مزید کھلتے۔ سو لب سیے بیٹھی رہی۔ پتا بتایا۔

''آپ اس علاقے میں رہتی ہیں؟''

''جی ہاں۔۔۔ اسّی گز کا گھر ہے' وہ بھی کرایے کا۔ آپ کا سرونٹ کوارٹر بھی شاید اس سے بہتر ہو۔''

''آپ کو تو کسی محل کی شہزادی ہونا چاہیے تھا' سنڈریلا۔''

''ہاں۔۔۔ شہزادی! سب خوابوں کی باتیں ہیں۔''

''خواب ہی تو خیال بخشتے ہیں۔''

''خیالوں کی ڈور تو ٹوٹ جاتی ہے۔''

''اگر میں کہوں' آپ سنڈریلا نہ سہی۔۔۔ سنڈریلا جیسی تو ہیں۔''

''تو میں کہوں گی' کہ آپ کو عینک کی ضرورت ہے۔''

''اور اس دل کا کیا کروں۔ دل تو بچہ ہے ناجی!'' پل بھر کو جی میں آئی کہہ دے۔ اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دیجئے۔ ایسے نابجار ناداں دل کو۔۔۔ مگر سوال چونکہ نوکری کا تھا۔ اس لیے مسکرا کر اپنے مطلوبہ مقام پر اتر گئی۔

☼ ☼ ☼

نہ نہ کرتے بھی سارے آفس کا بار اس کے نازک کندھوں پر آپڑا تھا۔ اس کا سارا دن ادھر ادھر کے کاموں میں سر کھپائے ہی گزرتا۔ اور اک وہ تھا۔ کوئی کام جس کے کیے بنا ہی نہ تھا۔ بیلنس پر فاتحہ پڑھ کر جو موبائل کان سے لگتا تو جانے کہاں کہاں کی ہانکتا۔ اس کی جان جلانے کو دنیا زمانے کی ''نگوڑیوں سے لمبی

لمبی گپیں، اوٹ پٹانگ فقرے، ادھورے شعر، گیت ادھر پرواکس کافر کو تھی۔ اس پر دھاندلی ایسی جیسے باپ کا راج ہو۔

"کیا ہے، جو پیار تو پڑے گا نبھانا"

رکھ دیا قدموں میں دل نذرانہ۔۔۔ شہوار۔۔۔ اس کا اگلا کیا ہے؟ پھر اس کی جانب سے نو لفٹ پاکر خود ہی کہا "ہاں۔۔۔ قبول۔۔۔ قبول۔۔۔ قبول ہے؟"

"ہونہہ۔۔۔ جاؤ منہ دھو کے آؤ۔"

"صبح ہی دھویا تھا۔"

"تو پھر آئینے میں اپنی شکل دیکھو۔"

"وہ بھی دیکھی تھی، تمہاری قسم۔۔۔"

"تو پھر میری شکل دیکھو کہ یہ مجھ معصوم پر کتنا بڑا ظلم ہو گا۔"

"دنیا میں ہر کوئی کسی نہ کسی کے لیے ہے۔"

"مگر جو جیسا ہے، اس کے لیے ویسا ہی ہے۔" اس نے چڑایا۔

"تم اگر میری ہو تو ہزار بہانوں سے مجھ تک آؤ گی۔"

"میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔"

"اور میں تمہارا سر۔۔۔ حساب برابر۔۔۔"

"باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔"

"اور دل چرانا۔۔۔" شہوار کا دل دھک دھک کرنے لگا، چونک کر اسے دیکھا۔ وہ نظروں میں وارفتگی کے رنگ سموئے وفورِ شوق سے اسے تک رہا تھا۔ اس نے بات چٹکی میں اڑائی۔

"یوں ہی تو نہیں عشق کو دماغ کا خلل کہا گیا۔" وہ سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ لنچ ٹائم نزدیک تھا۔ بابا لنچ کے لیے گھر جاتے، لوٹتے ہوئے سب کا لنچ لے آتے۔ اس نے اگلے ہی روز سے لنچ کے نام پر فوڈ اسٹریٹ کی چھولے کی چاٹ منگوانی شروع کر دی تھی۔ آج بھی چٹخارے لے لے کر کھائی۔ رسماً بھی نہ پوچھا۔ اس نے بہت بُرا منایا۔ رخ پھیر کے بیٹھا کلستا نظر آیا۔ یہ آئیڈیا مجھے کیوں نہ سوجھا۔ اسی وقت جاذب آن دھمکا۔ آتے ہی چاٹ پر رال ٹپکائی (یک نہ شد دو شد)

اسے پوچھنا پڑا۔

"آپ چھولے کی چاٹ کھا لیتے ہیں؟"

"جی ہاں۔۔۔ اگر کوئی اپنے ہاتھوں سے کھلائے تو۔۔۔" وہ جھٹ سے سامنے آبیٹھا۔ ناچار شہوار نے پلیٹ اس کے سامنے سرکا دی۔ وہ منٹوں میں چٹ کر گیا۔ اگلے کونے میں جلتے کلستے نجیب پر اچانک نظر پڑی۔

"اوہ۔۔۔ تمہیں تو پوچھنا بھول ہی گیا۔"

"تم پوچھ لیتے تو کون سا میں سچ مچ آن بیٹھتا۔" لطیف سا طنز۔۔۔ وہ کھسیا کر رہ گیا۔

"ہاہ۔۔۔ ہاہ۔۔۔ تم نے مائنڈ کیا نا؟"

"جی۔۔۔ مائنڈ ہو گا تو مائنڈ کریں گے نا۔"

جواب شہوار کی جانب سے آیا تھا۔ وہ کلس کر باہر چلا گیا۔

"کبھی کبھی تو یہ مجھے سائیکو کیس لگتا ہے۔" جاذب نے شہوار کی جانب دیکھا۔ سی گرین ڈریس اس کی آنکھوں کے رنگ سے میچ کر رہا تھا۔ سرخ و سپید رنگت دمک رہی تھی۔ سنہری بالوں میں عقبی کھڑکی سے آتی دھوپ بھر گئی تھی۔ مانو سونے کی کان میں آگ لگ گئی ہو۔

"کبھی کبھی کیا؟ یہ ہے ہی سائیکو کیس۔۔۔" وہ اپنی جھونک میں کہہ گئی۔

"واہ۔۔۔ اسی بات پر ملاؤ ہاتھ۔۔۔" تنہائی پاکر یک دم اس کی نظروں کے تیور بدلے۔ وہ آگے بڑھا تو شہوار یہ کہہ کر پیچھے ہٹی۔ "ایکسکیوز می!" خطرے کی گھنٹی ٹناٹن بجنے لگی۔ نجیب نے عین وقت پر چھاپہ مارا تھا۔ جاذب کے بے اختیار بڑھتے قدم رک گئے۔

"میں ایک فائل بھول گیا تھا۔" وہ خواہ مخواہ کیبنٹ میں جا گھسا۔ مگر چھٹی تک اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہا۔ سوچا تو یہی تھا کہ اب کبھی اس کی طرف رخ کر کے بات تک نہ کرے گا۔ مگر۔۔۔

"ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں۔"

✵ ✵ ✵

شہوار کے لیے ایسا اعلا رشتہ آیا کہ پورا گھرانہ

سٹ پٹا گیا۔ کہاں اٹھائیں' کہاں بٹھائیں۔ سارے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ صرف چار دن جاب بھگتانے کا نتیجہ تھا۔ طاہرہ خاتون خاصی خوش دلی و انکساری سے دامن پھیلانے آئی تھیں۔ عنقریب ان کی فیملی امریکہ میں بسنے والی تھی۔ "بس دو کپڑوں میں شہوار کو دو بول پڑھوا کر حوالے کردو۔" انہوں نے بڑی محبت سے دامن پھیلایا تھا۔ امی اس کی بلائیں لیتے نہ تھکتیں۔ ان کی بیٹی ایسی ہی چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔ ایسے رشتوں کی تو لوگ آرزو کرتے ہیں۔ جاذب بھی ہمراہ تھا۔ لیکن سب کی خوشیوں کا یہ دورانیہ زیادہ طویل ثابت نہ ہو سکا۔ ان کا سدھارنا تھا کہ امی کی خوشیوں نے ٹون بدلی۔

"بڑے لوگوں سے رشتہ داری مہنگی پڑتی ہے۔"

شہوار کے اندر اک دھکڑ پکڑ سی مچ گئی تھی۔ آس پاس کسی خطرے کا الارم بج رہا تھا' مگر کون سنتا۔

"رخ روشن پر بڑی آب و تاب ہے۔ لگتا ہے دو دن گھر میں بیٹھ کر شکل رگڑتی رہی ہو۔"

"جی ہاں... مجھے فل ٹائم جاب جو ملنے والی ہے۔ ہاؤس جاب۔ تو سوچا گھر بیٹھ کر روٹی پکانے کی ٹریننگ ہی لے لوں۔" اس نے خواہ مخواہ مسکراہٹ اپنائی اور نجیب کا دل چاہا اس کامنی سی لڑکی کو اٹھا کر کھڑکی سے پھینک دے یا خود ہی تیسری منزل سے چھلانگ لگا دے۔

"تم کسی کو چاہو تو اس کا ساتھ ہی نہیں۔ اس کا پیار بھی مانگو۔ کیونکہ ساتھ چلنا ہم سفری نہیں۔ ساتھ دینا ہم سفری ہے۔" نجیب سے بڑھ کر کون جانتا تھا۔ جاذب جیسے لوگوں کی "تھاہ" تک بھلا کون پہنچ سکتا ہے۔

وہ سر جھٹک کر اپنی سیٹ پر آ بیٹھی۔ ایک خوش حال زندگی کا خواب ہر احساس پر حاوی ہونے لگتا تھا۔ مگر دل تھا کہ اچھل اچھل کر سرکشی پر آمادہ تھا۔ لاکھ ڈانٹا ڈپٹا' مگر ناجی!

بمشکل وقت تمام کیا۔ آفس کی فضا اک گمبھیر خاموشی کی لپیٹ میں تھی۔ آج ان دونوں کے سوا کوئی نہ تھا اور دونوں ہی اپنے اندر کی جنگ سے برسرپیکار تھے۔ نجیب نے لاکھ چاہا۔ خاک دھول ڈال دے اس پر... اس جیسی ہزار... مگر دل کہاں مانتا تھا۔ اس کا دھیان بار بار بھٹک جاتا۔ کوئی آگ میں کودے اور دوسرا دیکھتا رہے' کہاں ممکن تھا۔

چھٹی کے وقت پھر ریڈ کرولا منتظر تھی۔ مگر وہ راستے میں کانٹے بو نے کھڑا تھا۔

"تم آگ اور پانی کا کھیل' کھیل رہی ہو؟" خبردار کرتی نظریں۔

"آپ سے مطلب؟" اس نے خاک بھی پروا نہ کی۔ مسکراتی جان جلاتی بڑھ کر ریڈ کرولا میں جا بیٹھی۔ مگر اندر اک شور مچ گیا۔ وہ بارہا دل کو سمجھاتی' مناتی' وہ مان بھی جاتا مگر اگلے ہی پل لوٹنیاں کھاتا' پھر ادھر ڈھلک جاتا۔ عجیب ڈپلومیسی تھی۔ جاذب کا پروپوزل زیر غور تھا اور آج رات جاذب و میڈم طاہرہ کی روانگی تھی۔ فیصلہ ان کی واپسی پر رکھا گیا۔ مگر کچھ فیصلے کیے نہیں جاتے۔ خود بخود ہو جاتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

مادام اپنے نور نظر سمیت سکھ چین کی بنسی بجاتی' امریکہ سدھاری تھیں۔ تقریباً" سارا آفس اس کے ناتواں کندھوں پر آ رہا تھا۔ نجیب مارکیٹنگ کے بہانے سارا سارا دن غائب رہنے لگا تھا۔ آتا' شکل دکھاتا اور گم۔ اب خطرہ ٹل گیا تھا' تو کاہے کو اس کی جوکسی میں وقت کھوٹا کرتا۔ میڈم طاہرہ اس پر اندھا یقین کرتی تھیں اور صحیح کرتی تھیں۔ شہوار پر آفس کے کام کا سارا بار تھا۔ وہ ڈھیر سارا کام گھر بھی لے کر آتی۔ رات گئے تک مصروف رہتی۔ اس دن آفس سے نکل گئی تھی۔ کل چھٹی تھی اور اسے ڈھیر سارا کام سمیٹ کر لانا تھا۔ جانے کیا رہ گیا تھا کہ اسے لوٹنا پڑا۔ بجلی اپنے وقت کے مطابق غائب تھی۔ چوکیدار بابا نماز مغرب کی ادائیگی کو گئے تھے۔ وہ بھاگم بھاگ آئی تھی۔ ایک ننھی سی ٹارچ کی مدد سے آفس کے آخری سرے پر دیوار کی اوٹ میں دھرے کیبنٹ سے مطلوبہ فائل تلاشتے

ہوئے کلک کی آواز پر وہ سرعت سے مڑی تھی۔ بابا داخلی کمرہ باہر سے لاک کر رہے تھے۔ ان کی دانست میں آفس خالی ہو چکا تھا۔ آفس ٹائم ختم، مگر اس کی بدنصیبی اسے واپس گھسیٹ لائی تھی۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے بڑھ کر دروازہ شدت سے بجایا تھا۔ مگر بابا اونچا سنتے تھے۔ آس پاس کے آفسز بھی ویران ہو چکے تھے۔ ساری عمارت میں تاریکی کا راج تھا۔ واش روم کے دروازے پر کھٹ پٹ سے وہ ہراساں ہو کر پلٹی تھی۔ ایسے نازک وقت پر نجیب ہی نازل ہو سکتا تھا۔ سو وہ بہ سر چشم موجود تھا۔ شاید اسے بھی کوئی ضرورت کھینچ لائی تھی۔ ورنہ ان دنوں وہ سارے کام بالا ہی بالا بھگتا رہا تھا۔ اس کے آس پاس خطرے کی گھنٹیاں ہی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اندھیرا سناٹا، تنہائی اور وہ دشمن جاں......

اس نے صورت حال جانچ کر بڑی اچھل کود مچائی۔

"پھر تو آج گولڈن نائٹ ہے۔" میز بجا بجا کے...... "تھا یقیں کہ آئے گی یہ راتاں کبھی......" گایا، مگر معاملہ گمبھیر تھا۔ بابا آفس باہر سے لاک کر کے نکل گئے تھے۔ ساری بلڈنگ میں اندھیرا، سناٹا، ویرانی۔ آفس فون پر زیرو لاک تھا۔ شہوار کے پاس موبائل تھا ہی نہیں اور نجیب کے موبائل میں ہمیشہ کی طرح بیلنس صفر۔ لون بھی وہ لے چکا تھا۔ ہوتا بھی تو اس کا نمبر چونکہ ابا کا تھا اس لیے سیو (Save) کیا ہی نہ تھا۔ اسے اور کچھ نہ سوجھا تو دھواں دھار رونے بیٹھ گئی۔

"اب اچھل کود بے کار ہے۔ سب لاک ہو چکا ہے۔ رابطے بند، اب سکون سے بیٹھو اور مجھے کچھ سوچنے دو۔ چلو میں دروازے کے پاس جا کر تین مرتبہ کہتا ہوں، کھل جا سم سم......"

مگر یہ ہنسنے کا وقت تھا، نہ مقام..... اگلے چند لمحوں میں اس کے آنسوؤں کی رفتار سو قطرہ فی منٹ کے حساب سے بڑھ گئی۔ شاید ایسے ہی لمحات میں کسی اپنے کا ساتھ تقویت بخشتا ہے۔ مگر وہ تنہا ہوتی تو شاید اتنی ہراساں نہ ہوتی۔ وہ مقدور بھر تسلی سے نواز تا، مگر تسلی کہاں تھی۔

"دیکھو صبح ہونے میں ابھی اتنے گھنٹے باقی ہیں۔ سب سے پہلے بابا آئیں گے۔ میں انہیں باتوں میں لگاؤں گا، تم چپکے سے نکل جانا۔ اتنی صبح صرف جمعدار ہوتے ہیں۔ اگر کسی نے دیکھ بھی لیا تو اس کی مٹھی گرم کر دیں گے۔"

مگر صبح تک کیا کچھ بدل جائے گا۔ وہ جان کر بھی انجان بنا ہوا تھا۔

اگر وہ اس پر اپنی طاقت آزماتا تو وہ "چوں" کے بھی قابل نہ تھی۔ مگر اس کی نیت تو کیا نظر تک میں فتور نہ آیا تھا۔ وہ ہر پانچ سات منٹ بعد میز بجا کر گیت گاتا۔

"ہم تم اک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے......" پھر درمیان میں رک کر کہتا۔ "شہوار اس کا اگلا کیا ہے، ذرا بتانا تو......" اس کی سسکیاں زور پکڑتیں تو نئے سرے سے اسے تسلی دینے بیٹھ جاتا۔ وہ ہراساں ہو کر بار بار دروازہ بجا رہی تھی، مگر کون سنتا۔ ایسے ہی لمحات کے لیے کہا جاتا ہو گا کہ سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ اس کی ساری رات سسکتے ہوئے گزری تھی۔ کسی انجانے خوف سے ایک پل آنکھ نہ جھپکی تھی۔ جیسے آنکھ جھپکی تو جانے کیا ہو جائے گا اور اک وہ تھا۔ جسے معاملہ کی سنگینی چھو کر نہ گزری تھی۔

"اگر دروازہ کھل بھی گیا تو دو باتیں ہوں گی یا تو میں تمہیں تمہارے گھر لے جاؤں گا یا اپنے گھر۔ اپنے گھر لے گیا تو خیر ہے اور تمہارے گھر لے گیا تو دو باتیں ہوں گی۔ یا تو تمہارے گھر والے تمہیں قبول کر لیں گے' یا واپس میرے ساتھ روانہ کر دیں گے۔ تمہیں قبول کر لیا تو ٹھیک' واپس کیا تو دو باتیں ہوں گی' یا تو میں تمہیں دارالامان چھوڑ دوں گا یا پھر دوبارہ اپنے گھر..... دارالامان چھوڑ دیا تو ٹھیک' اپنے گھر لے گیا تو دو باتیں ہوں گی یا تو وہ تم سے میرا نکاح پڑھوا دیں گے یا پھر......"

تادیر ان ہی دو باتوں کی گردان رہی اور وہ..... وہ خوف ناک نقشے کھینچے گئے کہ زمین و آسمان ایک ہو جائیں۔ رات بھر جیسے اسے کوئی کانٹوں پر گھسیٹتا رہا تھا۔ آنے والا وقت گزرے وقت سے زیادہ خطرناک تھا۔ فجر کی اذان پر وہ سیٹ پر پیر پسار کر دراز ہو گیا تھا۔ دروازہ علی

الصبح ہی کھل سکا تھا۔ بابا او نچا سنتے، مگر دیکھتے پورا تھے۔ ذرا سی دیر میں خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ علی الصبح وہ لوٹی تو امی نے رو' رو کر آنکھیں سرخ کر رکھی تھیں۔ ادھر فون کھڑکا کر' جسے نہ بھی پتا چلتا' اسے بھی پتا چل چکا تھا۔ اس کی پارسائی مشکوک ٹھہری۔ وہ رات بھر اک اجنبی کے ساتھ آفس میں بند رہی تھی اور دنیا تو بس دوسروں کے کانوں سے سنتی اور دیکھتی ہے۔ سو وہ بھی خطا کار ٹھہری!!

☼ ☼ ☼

وہ اس دلخراش واقعہ کے بعد آفس نہ گئی۔ جاتی بھی تو کس منہ سے جاتی اور کیونکر جاتی۔ اس جانب بھی اک گہری گمبھیر خاموشی چھا گئی۔ گویا خلاصی آفس سے بھی تھی اور رشتے سے بھی۔۔۔ فیصلہ خود بخود ہو گیا تھا۔

"ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا"

یہ حال دنیا کا تھا۔ چند گھنٹوں میں وہ سارے زمانے کے لیے ناقابل قبول بن گئی تھی۔ لوگ ہمدردی کی آڑ میں زخم کرید کر نمک پاشی کرتے' چل دیتے۔ وہ کس کس پر اپنی بے گناہی ثابت کرتی اور کیوں کرتی۔ وہ کسی کونے کھانچے میں منہ سر لپیٹ کر پڑ جاتی۔ گھر بھر میں سناٹے گونجنے لگے تھے۔ جیسے کہنے سننے کو کچھ رہا ہی نہ تھا۔ کون تھا جو اس کا ہاتھ تھامے گا۔ اتنی سی عمر میں یہ بڑا داغ۔۔۔ امی کو یہی غم کھائے جاتا۔ حادثے کی دھول بیٹھنے تک منہ چھپائے گھر میں پڑی رہی۔ سنا تھا ابا اس رات کئی بار آفس گئے۔ ہر بار مایوس ہو کر پلٹے تھے۔ انہوں نے کسی اسٹیٹ ایجنسی میں دوسرے گھر کے لیے عرضداشت دے دی تھی۔

اسی سناٹے کو توڑنے اس روز تائی امی چلی آئیں۔ ساتھ وہ بھی تھا۔ تائی امی۔۔۔ امی سے لپٹ کر روئیں کہ گلے شکوے سب دھل گئے۔ گزرتے وقت کے ساتھ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ ابا سے معافی منگوائی گئی۔ ان کا جرم ناقابل معافی تھا۔ جو نقصان ہوا' پورا نہ ہو سکتا تھا۔ مگر جٹھانی کا جھکنا اور دست سوال دراز کرنا۔ امی کی شکست جیت میں بدل گئی تھی۔ ٹوٹا کنکشن بحال ہوا اور رشتہ بھی پکا۔ نجیب کو دہری خوشی میں مٹھائی لینے کو دوڑایا تو شہوار نے جا لیا۔

"میں سب سمجھتی ہوں۔ تم پرلے درجے کے خود غرض اور موقع پرست ہو۔" اس نے گلا صاف کر کے بولنا شروع کیا" کیونکہ میری پارسائی کے تم واحد گواہ ہو' تو سوچا اس بہانے احسان کا جھنڈا بلند ہو گا۔ کوئی لائن بحال ہو گی اور دردمندی کے نام پر مجھے ایک کونے میں ڈال کر تم نئی دنیاؤں کی سیر کرتے پھرو گے۔"

نجیب نے پہلے اپنا سر پیٹا' پھر اس کا پیٹنے کو تلا۔ وہ بدک اٹھی۔

"کیا کہنے! آپ کی عقل' سمجھ اس وقت گھاس چرنے گئی تھی۔ جب کولمبس اپنا جال بن رہا تھا؟ میری نیکی و شرافت کا یہ انعام۔۔۔؟"

"نیکی و شرافت!" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ سچ ہی تو ہے۔ اگر وہ اس رات کا فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کرتا تو۔۔۔

"کل بھی تم سے پیار تھا مجھ کو۔۔۔ تم سے محبت آج بھی ہے۔"

"اور وہ زمانے بھر کی نکمی لڑکیاں!" اسے اچانک یاد آیا۔

"وہ۔ ہاہ! آتے۔۔۔ جاتے ہوئے موسم تھے' زمانہ تو تھا۔" شاید پہلی بار کوئی مصرعہ ڈھنگ سے اور بروقت پڑھا۔

"مجھ سے زیادہ فری نہ ہو۔ بھاگو یہاں سے۔۔۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔۔۔؟"

"دیکھ لیا تو نہیں۔ دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ سن بھی رہے ہیں۔ اتنی دیر سے تمہاری گل افشانیاں۔۔۔ اور منتظر تھے اب تک' سب تمہارے فیصلے کے۔۔۔"

وہ سٹپٹا کر مڑی تو امی' ابا مسکرا رہے تھے۔ تائی امی نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور وہ "بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا۔" گنگناتا ہوا رفوچکر ہو گیا۔

☼

نمرہ احمد

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز تھا۔ فارس غازی اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف غازی کا بھانجا ہے جو اپنے ماموں فارس غازی سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ سعدی یوسف کی والدہ نے کڑی مشقت کرکے بچوں کی پرورش کی ہے' حنین اور اسامہ' سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر' سعدی یوسف کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مرجاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ فارس غازی' سعدی یوسف کا ماموں ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن

ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے.... ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کاردار کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔ ہاشم سونیا کی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

فارس غازی' ہاشم کاردار کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے' رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے۔ جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے' ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے' لیکن سعدی پکڑ میں آئے بغیر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکرمند ہے۔

حنین اپنے اور سیم کے مشترکہ کمرے میں آتی ہے جب الماری کھولتی ہے تو اس کی نظر سنہری مخملیں ڈبے پر پڑتی ہے تو اس کے اندر ایک لاکٹ رکھا تھا۔ اس کی زنجیر میں سیاہ ہیرے کی شکل کا پتھر پرویا تھا جس کے اوپر سنہرے حروف میں "اینئنس ایور آفٹر" کندہ تھا۔ یہ سعدی کی چین کا جڑواں تھا۔

سعدی زمر سے ایک رشتے دار کی شادی میں جانے کا پوچھتا ہے۔ جس میں زمر کا سابق منگیتر حماد بھی آئے گا۔ زمر سعدی سے کہتی ہے کہ اگر وقت ملا تو وہ شادی میں جائے گی یہ بات جب بڑے ابا کو پتا چلتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔

مصحف نادیہ

سارہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ فارس آجاتا ہے۔ فارس سارہ سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کے خیال میں اس نے ہی وارث کو قتل کیا تھا؟ سارہ جواب میں کہتی ہے کہ اسے یقین ہے کہ اسے پھنسایا گیا تھا۔

ہاشم کی سیکریٹری کال کرکے اسے بتاتی ہے کہ آج سعدی اپنی مصروفیت کی بنا پر نہیں آرہا۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ سعدی کو جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملے گا' وہ اس سے ملاقات کو یونہی ٹالتا رہے گا۔

ہاشم سعدی کو فون کرتا ہے کہ کیا ہم اچھے وقتوں میں واپس جاسکتے ہیں! جب تم مجھے دل سے ہاشم بھائی کہتے تھے۔ ہاشم کی بات پہ سعدی "شاید نہیں" کہہ کر کال کاٹ دیتا ہے۔

دوسری طرف سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہوجاتی ہیں۔ سعدی پریشان ہو کر سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔ اس وقت سعدی اپنے ماضی کے اچھے وقتوں کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ سب باتیں یاد آنے لگتی ہیں جب ہاشم کو دل سے بھائی کہتا تھا اور جواہرات کے دل میں اس نے کس طرح اپنی جگہ بنائی تھی اور نوشیرواں سے بھی اس کی اس وقت دوستی ہوگئی تھی۔ ماضی کے تمام واقعات ایک ایک کرکے سعدی کے سامنے کسی کہانی کے کرداروں کی طرح گھوم رہے تھے۔

بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہوجاتی ہیں۔

سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے' حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "آنس ایور آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہوجاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس' زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فہد سے زمر کی بات طے کردیتی ہیں۔ وارث غازی' ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پر کام کررہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی ہاشم کو خبردار کردیتا ہے۔ ہاشم' خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کررہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم' خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث' فارس کو وہ سارے شواہد میل کردیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم' فارس پہ ڈلواتا ہے۔

زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔' زرتاشہ مرجاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کرسکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہوجاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہوجاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً" بچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہوجاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔

حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی اپیل بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

جواہرات زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھالیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی' فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کرسکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکالرشپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر پڑھنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

زمر کو کوئی گردہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گردہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہوجاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی' علیشا کو راضی کرلیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔

ہاشم حنین کو بتادیتا ہے' کہ علیشا نے اورنگ زیب کاردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہوجاتی ہے۔

ہاشم' علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کرواچکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مرواسکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔

جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کررہا ہے۔

فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا جارہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے' لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کرلے جاچکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے' کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے' لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا' جسے انکار کردیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہوجاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر' جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہوجاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہوچکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو ماردیں گے۔

ہاشم' حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری سچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے' کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔

وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے' جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً "بعد کی تصویر ہوتی ہے' جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔

تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔

حنین، نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے، وہ کہتی ہے کہ نوشیرواپاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔
سعدی وہ فلیش سنتا ہے، تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔
سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کردیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔
سعدی، زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہوسکتا ہے۔
"مثلاً" کون؟" زمر نے پوچھا۔
"مثلاً"..... مثلاً" ہاشم کاردار....." سعدی نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہوگئی۔
زمر کو ہاشم کاردار کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلجی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔
حنین علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کرلی ہے جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو ان کا ہے۔
ہاشم کی بیوی شہرین ایک کلب میں جوا کھیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد لیتی ہے۔
ریحان خلجی عدالت میں زمر کو لاجواب کردیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔
فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔
زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتی ہے کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔
جیل سے علیشا حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کی علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے وہ ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔
حنین کو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے پڑھنے سے انکار کردیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔
اورنگ زیب نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصہ سے پاگل ہوجاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کردیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کرکے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کرلیتی ہے۔
زمر، فارس کی طرف سے مشکوک ہے۔ وہ اسے تہ خانے میں بنے کمرے میں جانے سے منع کرتا ہے لیکن زمر نہیں مانتی، وہ کمرے میں جاتی ہے تو وہ دیوار پر کچھ تصویریں لگی دیکھتی ہے 'یہ وہ لوگ ہیں جو فارس کے مجرم ہیں۔
جسٹس سکندر (فارس کے کیس کے جج) وارث غازی کا باس الیاس فاطمی، ڈاکٹر توقیر بخاری، ڈاکٹر ایمن بخاری (فارس کی سائیکالوجسٹ) اور دوسرے لوگ..... فارس کہتا ہے کہ وہ ان سب سے اپنے ساتھ کی گئی ناانصافی کا انتقام لے گا۔
سعدی جب نوشیرواں سے ملنے جاتا ہے تو ڈاکٹر سارہ کو ساتھ لے جاتا ہے۔ سعدی کو امید ہے کہ ڈاکٹر سارہ نے سب کو بتادیا ہوگا۔

ہاشم نے حنین سے وہ یو ایس بی مانگی جو سعدی نے اس کے لیپ ٹاپ سے چرائی تھی۔ حنین نے دے دی تو زمر اور فارس کو بہت غصہ آتا ہے لیکن حنین بتاتی ہے کہ اس نے اصلی یو ایس بی نہیں دی تھی۔

ہارون عبید مشہور سیاست دان جو اہرات کے حسن کے اسیر ہیں۔ وہ ایک اسے ہیرا تحفہ میں دیتے ہیں۔ زمر' احمر کو اپنا کوئی کام کرنے کے لیے کہتی ہے۔ احمر ہارون عبید کی الیکشن کمپین چلا رہا ہے۔ آبدار ہارون عبید کی بیٹی ہے۔ جو سعد کے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔

فارس' زمر سے کہتا ہے کہ اس نے تین وجوہات کی بنا پر زمر سے شادی کی ہے۔

(1) زمر کے والد کے احسانات (2) شادی کر کے وہ سب کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے' وہ سب کچھ بھول کر نئی زندگی شروع کر چکا ہے۔

تیسری وجہ وہ زمر کے اصرار کے باوجود نہیں بتاتا۔

حنین ہاشم کے بارے میں زمر کو بتا دیتی ہے۔ زمر کسی تاثر کا اظہار نہیں کرتی لیکن اسے ہاشم پر بہت غصہ ہے۔ زمر اسے اپنے جرم کے بارے میں بتاتی ہے تو زمر کہتی ہے کہ ایک او سی پی ایک معمولی سی لڑکی کو دھمکی سے بلیک میل نہیں ہو سکتا۔ اس کی موت کسی اور وجہ سے ہوئی ہے۔

سعدی کی یاد میں ایک تقریب منعقد کی گئی ہے' جہاں احمر شفیع' ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری بھی شریک ہیں۔ زمر اور فارس' حنین کو تقریر کرنے کا کہہ کر باہر نکل آتے ہیں۔

ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری کا نیا تعمیر شدہ شاندار اسپتال جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ فارس اور زمر واپس تقریب میں آ جاتے ہیں۔

حنین اور زمر' ہاشم کی سیکرٹری حلیمہ کا نام سن کر چونک جاتی ہیں۔

ہاشم' سعدی سے کہتا ہے کہ حنین اس کے کہنے پر اس سے ملنے ہوٹل آ رہی ہے۔ سعدی پریشان ہو جاتا ہے' پھر ہاشم اس کو فون پر حنین کا پروفائل دکھاتا ہے' تب وہ جان لیتا ہے کہ حنین چھ منٹ پہلے قرآن پاک کی وہ آیت پڑھ چکی ہے جو اس نے اپنے کمپیوٹر میں لوڈ کی تھی۔ سعدی پورے یقین سے کہتا ہے کہ "حنین ہاشم سے ملنے نہیں آئے گی۔" اور واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاشم تلملا کر رہ جاتا ہے۔

جسٹس سکندر کی ایک ویڈیو جس میں وہ او سی پی کو قتل کر رہے ہیں۔ ٹی وی چینلز پر چل جاتی ہے۔ یہ وہی ویڈیو ہے جو سعدی نے او سی پی کے گھر سے حاصل کی تھی۔

زمر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے تو اس کو پتا چلتا ہے کہ اس کا واحد گردہ جو سعدی نے دیا تھا' ناکارہ ہو چکا ہے۔

چوبیسویں قسط

میں نے دیا تمہیں سورج!
مگر چاہا تم نے چاند!
جب چاند دیا تم کو
تم نے مانگے ستارے
تو میں اندھا دھند پہنچی
لامحدود ستاروں کی کہکشاں میں
اور خود کو لپیٹا

ہر اک ستارے کے گرد
صرف تمہارے لیے
ستارے' چاند اور سورج باہم بھی
تمہارے متلون دل کے لیے کافی نہ ہو پائے
سو میں نے اٹھائے اپنے آنسو
اور تمہیں بنا دیا ایک سمندر
تاکہ تم زمین پہ بادگیری کرتے چلو

اور اس ناممکن خزانے کو کھوج نکالو
جس کی تمہیں مستقل تلاش ہے
البتہ ضرور ہر صبح
میرا سورج تم کو بیدار کرنے کے لیے موجود ہو گا
ہر رات میرا چاند حاضر ہو گا
تمہاری تشفی کے لیے
اور اگر کبھی تمہیں ہو میری طلب
تو دیکھنا ستاروں کے درمیان
ہر ایک تارے کے گرد لپٹی
میں وہیں ٹھہری ہوئی ملوں گی!

(Mirtha Michelle Castro Marmol)

صبح دھیرے دھیرے فوڈلی ایور آفٹر کے گرد دھند لکے تانے جا رہی تھی۔ ناشتہ یونہی ڈھکا رکھا تھا اور ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ زمر یوسف بازو میز پہ بچھائے، سر اس پہ ٹکائے، سو رہی تھی۔ دروازے کا لاک کھلنے کی آواز آئی تو اس کی آنکھ کھلی وہ تیزی سے سیدھی ہوئی اور نیند بھری آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ بیرونی دروازہ کھول کر جنید اندر داخل ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ رکا۔ آنکھوں میں حیرت در آئی۔

"آپ؟ اس وقت؟" اس نے گھڑی کے بجائے مڑ کر آسمان کے رنگ کو دیکھا۔ وہ بال کانوں کے پیچھے اڑستی الجھی الجھی سی اپنا سیل فون اٹھا کر دیکھنے لگی۔
"فارس نظر آیا کہیں جنید؟"
"نہیں تو مگر آپ کیسے آئیں؟ باہر تو کوئی کار بھی نہیں ہے۔"
زمر چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ "فارس کہاں گیا؟ گاڑی بھی لے گیا؟" وہ اسے کال ملانے لگی۔ گھنٹیاں جا کر پلٹ آئیں مگر جواب نہ ملا۔ جنید ناشتے کے برتن نظر انداز کرتا، کچن کی طرف بڑھ گیا۔ (کچن میں رات کے معرکے کے نشانات وہ حتی المقدور صاف کر چکی تھی)
فارس کا پیغام چند لمحوں بعد موصول ہوا۔

"ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم گھر چلی جانا۔"
زمر کے ابرو تن گئے۔ آنکھوں میں دبا دبا سا غصہ ابھر آیا۔ اس نے پرس اٹھایا، موبائل اندر پھینکا اور باہر نکل آئی۔
"کیب سے جاؤں گی کیا اب؟ اتنا بھی خیال نہیں آیا اسے۔" اس کا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں
بندے بندے میں بو خدائی کی

صبح کی دودھیا روشنی میں سورج کی سنہری کرنیں پھوٹیں تو آسمان مزید روشن ہو گیا۔ ایسے میں اس بلند عمارت کی بالائی ترین منزل کے کارنر آفس میں ہاشم اپنی پاور چیئر پہ موجود تھا۔ گرے سوٹ اور ٹائی میں ملبوس، بال جیل سے پیچھے کو جمائے، آنکھوں پہ عینک لگائے وہ چند کاغذات پڑھ رہا تھا۔ سامنے کرسی پہ احمر شفیع اٹھے کندھوں کے ساتھ، گھٹنے ملا کر بیٹھا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔
ہاشم نے دفعتاً" عینک اتاری اور چہرہ اٹھاتے ہوئے کاغذ میز پہ ڈالے۔
"بے کار ہیں یہ سب۔ اس سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ حنین نے او سی پی کو بلیک میل کیا تھا۔"
"لیکن اس سے یہ ثابت ضرور ہوتا ہے کہ اس نے او سی پی کی بیٹی کی ویڈیو تباہ کرنے کے عوض کوئی تحفہ وصول کیا تھا۔ وہ ان میلز میں حمیرا کو یہی بتا رہی ہے، مگر ظاہر ہے حمیرا یہ نہیں سمجھ سکی کہ یہ تحفہ لیک شدہ پیپرز تھے۔" احمر بے چینی سے بولا۔
"میں مانتا ہوں ایسا ہی ہوا ہو گا، لیکن کوئی ثبوت نہیں ہے اس بات کا۔" ہاشم نے کندھے اچکائے تھے۔
احمر گہری سانس لے کر کھڑا ہوا۔ "پھر میں نئی نوکری تلاش کرنا شروع کر دیتا ہوں سر۔ شکریہ آپ نے میری بات سنی۔" وہ واپس مڑا اور چند قدم دور گیا تھا جب

ہاشم نے پکارا۔

"تم اپنے آفس میں واپس آچکے ہو۔ میں بات کر کے مکرتا نہیں۔ میں اس کو دوسرے طریقے سے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" وہ اب فون اٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ احمر نے مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔

"شکریہ سر۔" وہ باہر نکلا اور دروازہ بند کر کے مکا فضا میں لہرایا "یس!" اور آگے بڑھ گیا۔ حلیمہ نے بے اختیار اسے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

اندر ہاشم فون کان سے لگائے 'میز پر رکھی اپنی ڈاک کھول رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ ناگواری سے انگریزی میں تیز تیز بولتا جا رہا تھا۔

"کون سا کیس؟ کوئی کیس نہیں چلے گا۔ میں نے چھ ماہ سے پہلے اگلی تاریخ نہیں لینے دینی ان کو۔ بوڑھا کر دوں گا ان کو یوں ہی۔"

ڈاک الگ الگ کرتے ہوئے اس نے چند لفافوں کو بنا کھولے ردی کی ٹوکری میں اچھال دیا اور کچھ کو علیحدہ رکھ دیا اور تب ہی اس نے وہ لفافہ دیکھا۔ بات کرتے ہوئے اس کے ابرو بھنچے۔ وہ پرانے کاغذ کا پیلا زرد سا لفافہ تھا۔ دیکھنے میں بھاری معلوم ہوتا تھا۔ اس نے تعجب سے موبائل رکھتے ہوئے اسے اٹھایا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر پیپر نائف کے ساتھ لفافہ چاک کیا۔

اندر کوئی ٹھوس شے تھی۔ ہاشم نے انگلی سے کھینچ کر اسے باہر نکالا۔

وہ ایک سبز پاسپورٹ تھا۔ فرنٹ کور اور چند صفحات۔ اس نے پہلا صفحہ پلٹا اور... ایک دم وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔ پاسپورٹ ہولڈر کی تصویر سامنے تھی۔ بڑھی شیو والا سعدی یوسف۔ لیکن... پاسپورٹ ادھورا تھا۔ اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر لفافے میں جھانکا۔ اندر ایک اور پرانے طرز کا کاغذ تہ کیا رکھا تھا۔ ہاشم نے اسے نکالا۔ اس پہ انگریزی میں قلم دوات سے چند الفاظ تحریر تھے۔

"سعدی یوسف کو عدالت میں دہشت گرد ثابت کرنے کے لیے یہ پاسپورٹ کافی ہے۔ لیکن اس کا مکمل ہونا ضروری ہے۔ اس نے یہ ٹریش کین میں اچھال دیا تھا۔ میں نے اس کے سارے ٹکڑے جمع کر لیے ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں اسے تمہیں مکمل کر کے دوں تو اپنے ٹویٹر اکاؤنٹ سے یہ نمبر لکھ کر ٹوئیٹ کر دو... میں سمجھ جاؤں گا۔"

فقط ایک خیر خواہ۔

نیچے ایک نمبر درج تھا۔ چند بے سروپا ہندسے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا' پھر اس لفافے سمیت تمام اشیاء کو دراز میں ڈال دیا۔

اسی پل اس کا فون بجا۔ "بلاکڈ نمبر کالنگ۔" اس نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے احتیاطاً "ہیلو کہا۔

"سر... کیا آپ میری بات سن سکتے ہیں؟" وہ خاور تھا۔ ہاشم نے ایک نظر بند دراز کو دیکھا اور پھر گہری سانس لی۔

"میں نے سعدی یوسف کی جان بچائی تھی' خاور۔ میرے اس کے ساتھ بہت سے اختلاف سہی اور اپنی اس ویڈیو کے بعد میں اس سے نفرت کرنے لگا ہوں لیکن ایک محب وطن لڑکے کو دہشت گرد قرار دینا... یہ ظلم میں نہیں کرنا چاہتا۔ کسی کو مارنا الگ بات ہے۔ جیتے جی مارنا بالکل الگ۔ اور مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ کیس کبھی عدالت میں نہیں چلے گا۔ اس لیے مجھے اس پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہے' جو تم رشوت کے طور پہ بھیج رہے ہو مجھے۔"

"سوری سر؟ کون سا پاسپورٹ؟" وہ اپنی جگہ الجھ گیا تھا۔ "میں نے آپ کو کچھ نہیں بھیجا سر۔" پھر روانی سے بولا۔ "اگر آپ مجھے اپنے بندوں سے تلاش کروانے کے بجائے میری بات سن لیں تو میں آپ کے والد کے قتل کا معمہ حل کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن اس کے لیے آپ کو مجھ پہ اعتبار کرنا ہو گا۔" پھر وہ ٹھہر کر بولا۔ "آپ کے لیے میں نے اپنی زندگی کے اتنے سال لگا دیے' مگر آپ نے مجھ سے ایک دفعہ بھی نہیں پوچھا کہ میں بے گناہ تو نہیں ہوں؟

کیا میرا اتنا بھی حق نہ تھا سر! ایک دفعہ تو پوچھا ہوتا سر کہ میرے باپ کا قاتل کون ہے، پھر میں پاتال سے بھی اس کو کھینچ کرلے آتا، مگر آپ اس لڑکے کی باتوں میں آ گئے۔"

"سنو خاور! جلد یا بدیر میرے آدمی تمہیں ڈھونڈ لیں گے۔ اس لیے اب دوبارہ فون نہ کرنا۔" ناگواری سے کہتے اس نے فون رکھ کر لیپ ٹاپ کھولا۔ البتہ دماغ میں ایک بتی مسلسل جلنے بجھنے لگی تھی۔ اگر خاور نہیں تھا تو یہ کون سا تیسرا فریق تھا جو درمیان میں کود پڑا تھا؟

چند منٹ ہی وہ کام کر سکا اور پھر ایک دم سے اس نے فون اٹھایا اور ایک نمبر ملا کر اسے کان سے لگایا۔ ماتھے پہ بل ڈالے وہ گھنٹی سنتا رہا۔

"تم نے کہا تھا، تم اس آخری چیز کی قیمت لگاؤ گی، کیا وہ یہ پاسپورٹ ہے، جو تم نے مجھے بھیجا ہے؟"

"کون سا پاسپورٹ؟" **علیشا** نے حیرت سے دہرایا۔

"اداکاری مت کرو۔" وہ اکتا کر کہہ رہا تھا "جب ـــــ"

"تمہارا ایک میموری کارڈ تھا میرے پاس۔" ہاشم ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"تمہارے باپ کا کمپیوٹر ہیک کیا تھا نا میں نے، یاد ہے؟ وہیں سے کچھ ملا تھا مجھے۔ مگر وہ معلومات ایسی تھیں کہ میں ان کو استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ سوچا کسی اور کو دے دوں ورنہ تم تو میری جان لے لو گے۔ خیر اب وہ سب میرے لیے بے کار ہے مگر وہ تمہیں اب بھی نہیں ملے گا۔ رہی میں... تو میں ملک چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے جا رہی ہوں۔"

ہاشم فون بند کر کے سوچتا رہا۔ اگر وہ سچ کہہ رہی تھی تو بھی اورنگ زیب کے کمپیوٹر میں کم از کم وارث غازی کی فائلز تو تھیں نہیں، سو وہ اس کے ہاتھ نہیں لگی ہوں گی۔ باقی ہر چیز کی خیر ہے۔ سر جھٹک کر وہ دوبارہ کام کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

اس بار وہ تلخی ہے کہ روٹھے بھی نہیں ہم
اب کے وہ لڑائی ہے کہ جھگڑا نہ کریں گے!

ہسپتال کی چمکتے فرش والی راہداری خاموش اور سرد پڑی تھی۔ فارس نے کمرے کے دروازے پہ انگلی کی پشت سے دستک دی، پھر دروازہ دھکیلا تو اندر کا منظر کھلتا چلا گیا۔

بیڈ پہ لحاف تانے آبدار ٹیک لگائے بیٹھی تھی، اور ایک نرس اس کے پیچھے تکیے برابر کر رہی تھی۔ اس کے سرخ بال پونی میں بندھے تھے اور چہرے پہ مردنی چھائی تھی۔ کلائیاں سخت پٹیوں میں بندھی تھیں اور وہ خراب موڈ کے ساتھ نرس سے نقاہت سے کچھ کہہ رہی تھی جب آہٹ سنی تو چہرہ پھیرا۔

اسے چوکھٹ میں کھڑے دیکھ کر نگاہوں میں تحیر در آیا۔ سانس بھی تھم گئی۔ پھر سر کے خم سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ سلام کہتا ہوا اندر داخل ہوا۔ کمرہ کافی وسیع و عریض اور پر تعیش تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب رکھے شاہانہ طرز کے کاؤچ پہ بیٹھ گیا اور ٹانگ پہ ٹانگ چڑھالی۔ پھر لبوں پہ بند مٹھی رکھے، خاموشی سے آبدار کو دیکھنے لگا۔ آبی نے نظریں جھکالی تھیں۔ نرس باہر نکلی تو وہ ہلکے سے کھنکھارا۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

آبدار نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا، پھر نقاہت سے مسکرائی۔ "اب ٹھیک ہوں۔" ذرا رکی۔ "بابا سے ملاقات ہوئی آپ کی؟"

"میری شکل پہ گدھا لکھا ہے کیا جوان کے ہوتے ہوئے ادھر آتا؟ وہ نکلے ہیں تو آیا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ انداز میں کاٹ سی تھی۔ وہ چپ ہو گئی۔ نظریں جھکالیں۔

"کیوں کیا آپ نے ایسا؟" اب کے وہ نرمی سے بولا تو وہ اپنے پٹیوں میں بندھے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

"مجھے اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ میری کال نہیں اٹھا رہے تھے۔"

"تو اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو اٹھا لیتا میں آپ کی کال۔ ایسے کون کرتا ہے؟ اپنے والد کا تو سوچنا تھا۔"

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے آنسو گالوں پہ لڑھک رہے تھے۔ "میں نے آپ کو اتنی کالز کیں آپ کیوں نہیں آئے؟"

"میں مصروف تھا۔"

"کس کے ساتھ؟" اس نے آنکھیں اٹھا کر تیزی سے پوچھا تو وہ بھی اتنی ہی تیزی سے بولا۔

"کیا آپ کو حق ہے یہ پوچھنے کا؟"

آب دار کی اس پہ جمی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔ "آپ چلے جائیں۔" اور وہ پیچھے سے اپنے تکیے جوڑنے لگی گویا اسے جانے کا عندیہ دے کر اب لیٹنے لگی ہو۔

"آب دار!" وہ کہتے ہوئے اٹھا مگر دروازے کی طرف جانے کے بجائے اس کی جانب قدم بڑھائے۔

"آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہیے تھا۔" اس کی آواز میں نرمی تھی۔ وہ تکیے جوڑتی رک گئی۔ چہرہ اٹھا کر بلی جیسی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی' جو ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے قریب آرکا تو وہ بیٹھے بیٹھے ذرا پرے ہوئی۔ وہ آہستہ سے اس کے بازو کے قریب بیڈ پہ بیٹھا۔

"اگر آپ کو مجھے بلانا تھا تو اس کے دوسرے طریقے بھی تھے۔ یہ سب کر کے آپ نے مجھے تکلیف دی ہے۔" وہ اسے فکر مندی سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اور آبی کی بھیگی آنکھیں' بے خودی کے عالم میں اس پہ جمی تھیں۔

"مجھے افسوس ہے اگر میری وجہ سے آب دار آپ کو کبھی کوئی غلط تاثر ملا' مگر میری نیت ہمیشہ صاف رہی۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔" وہ اس پہ نظریں جمائے دکھ سے کہہ رہا تھا۔ "کیونکہ میں نے اپنی ساری زندگی بہت احتیاط سے گزاری ہے۔ جس کے اوپر دل ہارا' اس کے نام کو بھی اپنے نام کے ساتھ آلودہ ہونے نہیں دیا اس لیے کوئی آپ کے نام کے ساتھ میرا نام جوڑے' مجھے اس بات نے بہت پریشان کیا ہے۔ اسی لیے ادھر آیا ہوں۔" وہ نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ آبی کے لب مسکراہٹ میں ڈھلتے گئے۔ آنکھیں' ہنوز ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

"آپ کو میری فکر تھی؟"

"ظاہر ہے مجھے فکر تھی۔" اسی نرمی سے کہتے ہوئے فارس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کا پٹیوں میں لپٹا ہاتھ تھاما۔ آب دار کا سانس رک گیا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ "اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ دوبارہ کبھی ایسی حرکت نہ کریں۔" اس کی آنکھیں آبی کی آنکھوں پہ جمی تھیں اور دونوں ہاتھوں میں اس کی باہنی کلائی تھام رکھی تھی۔

"پہلے آپ وعدہ کریں کہ میرے بلانے پہ آجایا کریں گے۔" فارس نے گہری سانس لی۔ "میں وعدہ کروں؟ میں مس عبید ایک شادی شدہ آدمی ہوں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایک شادی شدہ آدمی کو کیسے ڈیل کیا جاتا ہے؟"

"کیسے؟" وہ چیلنجنگ انداز میں مسکرائی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ چند پل۔ چند ساعتیں۔ بنا پلک جھپکے۔ اور پھر ایک دم فارس کی انگلیوں نے اس کی کلائی کی پٹی کو جھٹکا دیا۔ آب دار کے منہ سے کراہ نکلی مگر اس سے پہلے کہ وہ ہکا بکا سی' اپنا ہاتھ چھڑاتی' وہ درشتی سے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی تھامے' دوسرے سے اس پہ لپٹی پٹی کھینچ کر اتارتا رہا۔

"چھوڑیں' کیا کر رہے ہیں؟" وہ چلائی مگر فارس نے پٹی کی آخری تہ نوچ کر پرے پھینکی اور اس کی کلائی اٹھائی۔ وہ بے داغ تھی۔ خراش تک نہ تھی۔

"جس طرح آپ کے والد صاحب نے مجھ سے بات کی' مجھے بہت برا لگا۔ وہ ہوتے کون ہیں مجھے قصوروار ٹھہرانے والے۔"

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ غرایا تھا۔

آب دار کا چہرہ سفید پڑا۔ آنسو تک خشک ہو گئے۔

"میں نے آب دار بی بی! چار سال جیل میں گزارے ہیں۔ وہاں ایسے ایسے لوگ ہوتے تھے جن کی شکل دیکھ کر بھی آپ کی جان نکل جائے گی، میں نے ان کے ساتھ سروائیو کیا ہے۔ آپ کے یہ بے کار ڈرامے، سروائیو نہیں کروں گا کیا؟"

اس کی کلائی کو زور کا جھٹکا دے کر چھوڑا۔ وہ شل سی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ سرخ پڑتی آنکھیں اس پہ جمائے انگلی اٹھا کر بولا۔

"آئندہ اگر آپ نے مجھے کال کی یا میرے نام کے ساتھ اپنا نام جوڑنا چاہا یا میرے گھر اور ریسٹورنٹ کا رخ بھی کیا تو میں کس حد تک جاسکتا ہوں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ بات آئی ہے دماغ میں یا نہیں؟" غصے سے بولتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آبی نے شاکی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تو آپ یہاں صرف اپنا نام صاف کرنے آئے تھے۔"

"جی ہاں۔ کیونکہ جب میں نے آپ کو کبھی کوئی غلط تاثر نہیں دیا تو آپ کی ان جذباتی حرکتوں کے لیے مجھے ذمہ دار نہ ہی ٹھہرائیں آپ کے والد صاحب تو اچھا ہے۔"

وہ برہمی سے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"فارس۔۔۔!"

وہ دروازے تک پہنچا تھا جب اسے آواز آئی۔ اس نے چونک کر مڑ کر دیکھا۔ وہ اپنی دوسری کلائی کی پٹیاں نوچ نوچ کر اتار رہی تھی۔ فارس کے ابرو سکڑے، اس سے پہلے کہ وہ روک پاتا، وہ اپنی کلائی برہنہ کر چکی تھی۔

"یہ ہے وہ جو میں نے کاٹی تھی۔۔۔" گلہ آمیز نظروں سے اسے دیکھتی وہ بولی تھی۔ یہ والی کلائی۔۔۔ بری طرح زخمی دکھائی دیتی تھی۔ لمحے بھر کو وہ کچھ بول نہیں سکا۔

"وہ" "تمہارے لیے فارس غازی! وہ ایسا کبھی نہیں کرے گی۔ فارس نے بڑی مشکل سے قدم اٹھائے تھے۔ وہ بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا۔

آب دار تیزی سے اپنے جسم سے لگی نالیاں اور سوئیاں نوچ کر اتارنے لگی۔ اس کے برف ہوئے آنسو اب روانی سے گرنے لگے تھے۔

سواد درد میں تنہا کھڑا ہوں
پلٹ جاؤں مگر موسم نہیں ہے

سورج کی نرم گرم روشنی، مورچال کو اس دھند آلود صبح میں بھی دہکا رہی تھی۔ زمر واپس آکر اندر جانے کے بجائے لان میں گھاس پہ رکھے جھولے پہ آبیٹھی تھی۔ ٹھنڈی ہوا اس کے گھنگھریالے بال اڑا رہی تھی مگر وہ بے نیاز سی اسی طرح بیٹھی، آنکھیں موندے جھولتی رہی۔ جوتے اور پرس گھاس پہ ہی ادھر ادھر لڑھکے پڑے تھے۔

بالائی منزل کی کھڑکی سے اندر جھانکو تو حنین لیپ ٹاپ کے آگے بیٹھی تھی اور دلچسپی سے اسکرین پہ لکھی عبارتیں پڑھ رہی تھی۔

ساتھ بیڈ پہ اکڑوں بیٹھا اسامہ ٹھوڑی گھٹنے پہ ٹکائے گم صم سا نظر آرہا تھا۔

نچلی منزل کا منظر کسی عام صبح سے مختلف لگتا تھا۔ ندرت اور حسینہ کچن میں تھیں۔ ناشتے کی مہک، پراٹھوں کی خوشبو، برتنوں کی اٹھا پٹخ، ندرت بہن بہت جوش سے اہتمام کرنے میں لگی تھیں۔ لاؤنج میں بیٹھے ابا بھی صداقت کو ڈانٹ ڈپٹ کر ایک ایک کونا صاف کرنے کو کہہ رہے تھے۔ جانتے تھے سعدی، زمر کی طرح کتنا نفاست پسند ہے۔ حسینہ کو خوب تاؤ چڑھ رہا تھا۔ (نرا ڈرامہ ہے سارا خاندان۔ ناں میں پوچھتی ہوں اس زخم والے منہ کے "سوکھے سڑے لڑکے میں رکھا کیا ہے۔ جو سب اس کے لیے پاگل ہو رہے ہیں۔ سیدھے منہ سلام تو اس نے مجھے کیا نہیں۔ اب تھوں والے پراٹھے بناؤ اس کے لیے) وہ رات سے پھرکی کی طرح گھوم رہی تھی اور اب دل چاہ رہا تھا۔ اس پراٹھے میں زہر ملا دے۔ پراٹھا بیلتے بڑبڑاتے ہوئے اس نے سر اٹھایا تو چونکی۔

سعدی کندھے پہ بیگ لیے، چہرہ جھکائے کچن کے

باہر کھلتے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ ندرت ابھی ابھی لاؤنج میں گئی تھیں۔ (سعدی دوسری جانب سے آیا تھا) سو کسی نے اسے آتے نہیں دیکھا۔ حسینہ چند لمحے تو کھڑی رہی، پھر بیلن رکھ کر باہر نکلی۔ ندرت اور ابا مشترکہ طور پہ صداقت کو ڈانٹ رہے تھے۔ سیم زینے اترتا آرہا تھا۔ سر جھکا ہوا تھا۔ وہ آخری سیڑھی تک پہنچا تو حسینہ نے کمر پہ ہاتھ رکھے، آنکھیں گھما کر مزے سے اطلاع دی۔

"اسامہ بھائی... وہ تو چلا گیا سامان سمیت۔ اب ناشتہ بناؤں یا نہ بناؤں؟"

"کون؟" اسامہ سر اٹھا کر ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگا اور پھر جس لمحے اس کی سمجھ میں آیا... وہ ایک دم باہر کو بھاگا۔ لاؤنج ایک جست میں عبور کرتا وہ پورچ کے دروازے سے باہر جا نکلا۔ حسینہ نے (ہونہہ) سر جھٹکا۔ (پاگل!)

اسامہ نے باہر آکر گردن ادھر ادھر گھمائی۔ وہاں سعدی کہیں نہ تھا۔ صرف زمر جھولے پہ آنکھیں موندے، سر پیچھے گرائے بیٹھی تھی۔

"بھائی چلا گیا، پھپھو!" زمر نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ حواس باختہ سا اس تک پہنچا تھا۔

"آپ نے بھائی کو جاتے دیکھا؟"

"ہاں، دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ دھیان نہیں دیا... مگر وہ آیا کب؟ اور وہ چلا کیوں گیا؟" وہ حیران سی جگہ سے اٹھی۔ یاد آیا رات فارس فون پہ کچھ کہہ رہا تھا۔ اسامہ نے روہانسا ہو کر اسے دیکھا۔

"کیونکہ میں نے ان کو کہا تھا کہ..."

باہر گھنے درختوں کی قطار کے ساتھ سڑک پہ وہ سر جھکائے چلتا جارہا تھا۔ بیگ کندھے پہ تھا اور ہاتھ جینز کی جیبوں میں تھے۔

"سعدی!" اس نے وہ آواز سنی تو قدم زنجیر ہوئے۔ وہ ٹھہرا، پھر دھیرے سے مڑا۔

دور... دس بارہ گز کے فاصلے پر زمر کھڑی تھی۔ رات والے جھلملاتے سیاہ لباس پہ جیکٹ پہنے، گھنگھریالے بال آدھے باندھے، وہ بہت دل گرفتہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہیں دور کھڑی... ننگے پاؤں، اس سے چند قدم پیچھے اسامہ کھڑا تھا مگر اس نے چہرہ جھکا رکھا تھا۔

سعدی کے چہرے پہ کرب سا ابھرا۔ زمر پہ اپنائیت بھری نظریں جمائے وہ بار بار کچھ کہنے کو لب کھولتا پھر بند کر دیتا۔ پہلو میں گری مٹھیاں کبھی بھینچ لیتا، کبھی ڈھیلی چھوڑ دیتا۔ ننگے پاؤں کھڑی زمر نے سینے پہ بازو لپیٹے اور مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"خدا حافظ کہے بغیر جارہے تھے کیا؟ اور اس سلام کا کیا جو خدا حافظ سے پہلے کہنا تھا؟"

سعدی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ وہیں کھڑا اسے ان ہی مغموم نظروں سے دیکھتا رہا۔ دونوں کے درمیان کئی گز کا فاصلہ تھا۔

"سلام!" اس نے سر کے خم سے سلام کیا۔ آواز گیلی اور روکھی سی تھی۔

"تم ہماری سلامتی چاہتے ہو تو جا کیوں رہے ہو؟" وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں اونچی آواز کر کے بولی تھی۔

"نہیں رہ سکتا یہاں۔ وحشت ہوتی ہے مجھے۔ دل ٹوٹا ہوا ہے میرا۔" وہ جب بولا تو الفاظ سرگوشی میں ادا ہوئے، مگر نگاہیں زمر پہ جمی رہیں۔ ان میں بے چارگی، خود ترسی، شکستگی، سب کچھ تھا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب تین گولیاں لگتی ہیں اور سارے اپنے چھوڑ جاتے ہیں، ایسا ہی لگتا ہے۔" وہ پکار کر بولی تھی۔ "جیسے سب آپ کے بغیر مزے کر رہے ہیں اور صرف آپ تنہا اذیت کاٹ رہے ہیں۔ میں اس سے گزر چکی ہوں۔ تم گزر رہے ہو۔ چناؤ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ وہ کرنا ہے، جو میں نے چار سال پہلے کیا تھا؟ سب کو اپنی زندگی سے باہر دھکیل کر دروازے بند کر کے خود کو اکیلا کرنا ہے۔ یا پھر دروازہ کھولنا ہے؟ اور روشنی کو اندر آنے دینا ہے؟ کیونکہ کچھ لوگ اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے لیے پگھلا جائے۔" بولتے بولتے اس کو سانس چڑھنے لگی تھی مگر اس پہ نگاہیں جمائے وہ کہے جارہی تھی۔ "تم نے چننا ہے، تم نے فیصلہ کرنا ہے... اپنے خاندان سے دور رہ کر خود کو جوڑ لوگے تو جاؤ، خدا حافظ کہہ کر نکل جاؤ اور

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اگر میری غلطیوں سے سبق سیکھنا ہے تو واپس آؤ اور مجھے سلام کہو۔" وہ کہہ کر سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی منتظر سی اسے دیکھتی رہی۔ اس کا دل اندر بہت زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اگر وہ چلا گیا تو؟

"میرے اندر کا زہر سب کو ہرٹ کرے گا اگر میں یہاں رہا تو۔"

"نہیں سعدی! بات یہ ہے کہ تمہیں نفرت ہے اس کام سے جو حنین نے کیا کیونکہ تمہیں محبت ہے حنین سے۔ فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ اس کے کام سے نفرت زیادہ شدید ہے یا اس کی محبت زیادہ شدید ہے۔ جس میں زیادہ شدت ہوگی' تم اسے چن لوگے۔"

سعدی نے خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھا... اور اس کے عقب میں چہرہ موڑے کھڑے سیم کو۔

"مجھے نہیں لگتا' اب کسی کو میری ضرورت ہے۔ سب میرے بغیر رہنا سیکھ چکے ہیں۔" اسامہ کے جھکے چہرے پہ ایک آنسو لڑھکا تھا۔

"اسی لیے سب تمہیں اپنی زندگی میں واپس لانا چاہتے ہیں۔ ضرورت کے تحت نہیں۔ کسی کو تمہاری ضرورت نہیں ہے سعدی۔ مگر محبت کے تحت اور کیا تمہاری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا کہ وہ رشتے زیادہ خالص ہوتے ہیں جن میں محبت 'ضرورت' پہ حاوی ہو جائے۔"

اور اس لمحے... گھنے درختوں کی قطار کے قریب چھایا میں کھڑے سعدی یوسف کو اس دھندلی صبح سب کچھ صاف نظر آنے لگا تھا۔ ایک دم سے دماغ اور دل کے آئینے کی ساری گرد کسی نے ہاتھ پھیر کر صاف کر دی تھی۔ وہ چونک کر زمر کو دیکھنے لگا۔ وہ ابھی تک سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی' محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

سعدی نے بیگ نیچے ڈال دیا۔ پھر قدم قدم چلتا وہ فاصلہ عبور کرنے لگا۔ زمر وہیں کھڑی رہی۔ وہ آگے بڑھتا آیا۔ یہاں تک کہ اس کے بالکل مقابل آ کھڑا ہوا۔ پھر بھیگی آنکھیں اٹھائیں اور "السلام علیکم!" کہتے ہوئے اس کے گرد اپنے بازو لپیٹ کر اسے خود سے لگایا۔

"میں کہیں نہیں جا رہا۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔"

اسامہ خاموشی سے سعدی کی سابقہ جگہ تک آیا اور اس کا بیگ اٹھا کر گھر کی طرف بڑھ گیا۔ زمر نے اس سے علیحدہ ہو کر مسکرا کر نم آنکھوں سے اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے اسے دیکھا۔

"ویلکم ہوم!"

یہ وہ بچہ تھا جس کو اس نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا۔ جو رات کو کہانی سنے بغیر نہیں سوتا تھا۔ اسے آج بھی کہانیاں سنانے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ وہ صرف "باتوں" سے سمجھتا تھا۔ اسے صرف باتوں کا فن آتا تھا۔ اس کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر... ہسپتال کی رات جب سے وہ کھویا تھا... تب سے لے کر نو ماہ بعد تک... اس کو یوں اپنے سامنے کھڑے دیکھنا... اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرنا' اسے مسکرا کر تسلی دینا... زمر کو لگ رہا تھا اسے اس کی ساری دنیا واپس مل گئی ہے۔ وہ پہلے سے دبلا پتلا ہو گیا تھا۔ کمزور۔ منہ کا زخم بھی قدرے مندمل تھا مگر بہرحال موجود تھا۔

"سچ سچ بتاؤ' کیا اس نے بہت زور کا مارا تھا تمہیں؟" وہ اس کی کہنی تھامے گھر کی طرف ٹہلتے ہوئے واپس آتی' اس سے پوچھ رہی تھی۔

سعدی نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کس نے؟"

"فارس نے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ خفگی سے سر جھٹک کر سامنے دیکھتا' چلنے لگا۔ زمر نے گہری سانس بھری۔ اسے کیوں بھول گیا تھا کہ وہ چھ فٹ کا ایک نوجوان تھا جو کبھی اپنے گھر کی عورتوں کے سامنے مار کھانے کا تذکرہ نہیں کر سکتا تھا۔

اتنے عرصے بعد ملے تھے۔ وہ موقع کی مناسبت سے اس سے چھوٹی چھوٹی مگر محتاط سی باتیں کرتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ زیادہ جواب نہیں دے رہا تھا۔ بس چپ تھا۔

وہ دونوں گیٹ سے اندر چلے گئے مگر اسامہ اس کا بیگ لیے وہیں پورچ کے ایک کونے میں بیٹھا رہا۔ وہ

کسی گہری سوچ میں تھا جب باہر سے کار اندر آتی دکھائی دی۔ تب وہ جگہ سے اٹھا۔ فارس ڈرائیونگ ڈور کھولتا‘ چابی جیب میں اڑستا باہر نکل رہا تھا۔ اسے یوں بیٹھے دیکھ کر ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔

”اے.... تم ادھر کیا کر رہے ہو؟ اسکول نہیں جانا؟“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس تک آیا۔

”سعدی بھائی گھر چھوڑ کر جا رہا تھا۔ شکر ہے زمر پھپھو نے روک لیا۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز اور ہلکے دل کے ساتھ اطلاع دی۔ فارس کے ماتھے پہ بل پڑے۔ غصے سے اندر کھلتے‘ بند دروازے کو دیکھا۔

”جناب کا دماغ درست نہیں ہوا ابھی تک۔ دو ہاتھ اور لگنے چاہیے تھے اسے۔ اس کی تو آج میں طبیعت صاف کرتا ہوں۔“

”ماموں!“ سیم نے خفگی سے اسے دیکھا۔ مگر وہ سر جھٹک کر اندر چلا گیا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل پہ ناشتے کے برتن سجے تھے۔ ندرت تازہ پراٹھے لا کر رکھ رہی تھیں۔ سعدی اب مسکرا کر ابا سے دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔ فارس کو دور سے آتے دیکھا تو سر کو خفیف ذرا سا خم دیا۔ فارس لبوں پہ مسکراہٹ جمائے اس تک آیا۔ اس کے کندھے زور سے دبائے۔ ”ویلکم ہوم سعدی!“ مسکرا کر کہتا اس کی طرف جھکا اور اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔

”زیادہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں ہے‘ ہیرو۔ واپس آگئے ہو تو تمیز سے گھر میں رہو۔ ماں کا خیال ہے یا نہیں؟ اب کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو دیکھنا۔“ بڑہمی سے اسے آہستہ سے سنا کر وہ سیدھا ہوا اور مسکراہٹ دوبارہ سے لبوں پہ طاری کیے آگے بڑھ گیا۔ سعدی گہری سانس لے کر رہ گیا۔ (واقعی ویلکم ہوم!)

وہ اپنے کمرے میں آیا تو زمر کورٹ کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اسے نظر انداز کیے‘ آئینے کے سامنے کھڑی لپ اسٹک لگاتی رہی۔

”آہم!“ وہ ہلکا سا کھنکھارا۔ ”اس ناشتے کا کیا کیا؟“

زمر نے آواز کے ساتھ لپ اسٹک بند کی اور اس کی طرف گھومی۔

”تم فجر پڑھنے گئے تھے یا تراویح؟“

”کیوں میری عبادتوں کو نظر لگاتی ہو؟ استغفراللہ!“ اس نے کان کی لو کو چھوا۔

”کہاں گئے تھے؟“ وہ چبھتی نظریں اس پہ جمائے تفتیشی انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”تیسری بیوی کے پاس!“ زمر کے تاثرات بگڑے۔ ماتھے کی تیوریاں بڑھ گئیں۔

”تو پھر ادھر ہی رہتے نا۔“ وہ طنزیہ جھلا کر بولی تھی۔

وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا۔

”میں اس امر کو یقینی بنانے گیا تھا کہ وہ دوبارہ میرے اور تمہارے کسی ناشتے‘ کسی کھانے کے درمیان نہ آئے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اتنے اعتماد اور مان سے بولا کہ زمر کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ بھوری آنکھوں میں امید سی چمکی۔

”وہ اب کبھی بھی کوئی مسئلہ نہیں کرے گی۔ مجھ پہ اعتبار کرو۔“ اس کی آنکھوں کا بھروسا.... اور مان.... وہ پگھل گئی۔ اور پھر ہلکا سا مسکرائی۔

”وہ گئی ہے تو کوئی اور آجائے گی۔ تم بھی تو عادت سے مجبور ہو۔“

”آپ کی ان ہی اداؤں کو دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ.... بندہ جیل سے کبھی واپس ہی نہ آیا ہوتا۔“ وہ خفگی سے کہتا پلٹ گیا تو وہ بے اختیار ہنس دی۔ (دو نمبر آدمی)

وہ کمرے سے نکل گیا تو زمر نے ڈریسنگ ٹیبل کی اوپری دراز کھولی اور پیچھے ہاتھ ڈال کر کچھ باہر نکالا۔ سیاہ مخملیں ڈبیا جس پہ زمانوں کی گرد پڑی تھی۔ زمر نے گرد جھاڑی اور اسے کھولا۔ اندر رکھی دمکتی ہوئی ہیرے کی لونگ ہر گرد اور آلائش سے پاک تھی۔ وہ مسکرا دی۔ اس نے لونگ کی ڈبی پرس میں ڈالی اور بال برش کرنے لگی۔ (فارس غازی جب آج یا کل اسے یہ لونگ پہنے دیکھے گا تو اس کے کیا تاثرات ہوں گے؟ اف) وہ اس کی وہ شکل دیکھنے کے لیے بے تاب تھی۔

زمر باہر آئی تو فارس سمیت باقی سب ناشتہ کر رہے تھے۔ اسے پہلے دوا لینا تھی سو کچن میں آئی۔ گول میز پہ

حنین اکیلی چائے پی رہی تھی۔

"حنہ۔ تم ادھر؟" حنین نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"جی میں ادھر ہی ہوں۔ اسی گھر میں۔ لیکن کوئی بات نہیں اگر آپ مجھے بھول گئیں۔ کوئی بات نہیں اگر آپ کو میری کمی محسوس نہیں ہوئی۔ حنہ تو ہمیشہ سے پس منظر میں ہوتی ہے۔ یہ اتنے مہینے تو وہ آپ کی نظر میں سعدی یوسف کی یاد بھلانے کے طور پر موجود تھی۔ مگر اب وہ آگیا ہے تو میں بھی اپنی پرانی جگہ پہ واپس آگئی ہوں۔ رہیں آپ تو آپ کے لیے ہمیشہ سعدی سب کچھ تھا۔ صرف سعدی۔ سو آپ ناشتہ انجوائے کریں اور میرے لیے گلٹی فیل نہ کریں۔ مجھے اپنی بدصورت سچائیوں اور اپنے اندر موجود شیاطین کے ساتھ رہنا آگیا ہے۔" وہ چائے کا مگ اور سیل اٹھا کر' سادگی سے کہتی اس کے برابر سے نکل کر باہر چلی گئی۔ زمر بالکل خاموش سی ہو گئی تھی۔ اور کچھ خفا بھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ گھر کے ایک فرد کے راضی ہونے تک دوسرا کیوں ناراض ہو جاتا تھا؟

☼ ☼ ☼

اب ماہ و سال کی مہلت نہیں ملنے والی
آ گئے اب تو شب و روز عذابوں والے

ہارون عبید اپنے آفس میں کنٹرول چیئر پہ بیٹھے' چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے چند کاغذات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ عینک ناک پہ دھری تھی اور انہماک قابل دید تھا۔ موبائل بار بار بج رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے اسے اٹھا ہی لیا۔ "بولو بیٹا۔"

"آپ نے فارس سے کیا کہا ہے؟" وہ رو رہی تھی۔ انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے عینک اتاری۔

"جو امین نے مجھے کہا تھا کہنے کو۔ یہی کہ تم ہسپتال میں اس لیے ہو کہ.... خیر میں جانتا ہوں امین غلط بیانی کر رہا تھا' اور اگر تمہارے توجہ حاصل کرنے والے کام ختم ہو گئے ہوں تو گھر واپس چلی جاؤ۔ کسی کو معلوم ہوا تو نیا تماشا بنے گا۔" وہ سادہ اور مصروف انداز میں کہہ رہے تھے۔

"بابا! آپ ہمیشہ میرے ساتھ یہی کرتے ہیں۔" وہ روتے ہوئے چلائی تھی۔ "آپ نے کبھی مجھے کچھ نہیں دیا۔ ہمیشہ میرا راستہ روکا۔ ہمیشہ مجھے ہرٹ کیا۔ آئی ہیٹ یو بابا۔ آئی ہیٹ یو...." اور روتے روتے اس نے کال کاٹ دی تھی۔

ہارون کا فون پکڑا ہاتھ کان سے لگا رہا تھا گویا وہ شل سے ہو گئے تھے۔ ساکت۔ متعجب۔ پھر سر جھٹک کر وہ دوبارہ سے کام کرنے لگے مگر چہرے سے شدید ڈسٹرب لگ رہے تھے۔ بار بار فون اٹھاتے پھر رکھ دیتے۔

"تم اس حد تک گر سکتے ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" دروازہ دھاڑ سے کھلا اور جواہرات کار دار تیز تیز چلتی اندر آتی دکھائی دی۔ ہارون نے اکتا کر نظریں اٹھائیں۔ وہ میرون اور سفید لباس میں گہرے میک اور جیولری پہنے ایک طرف جتنی بنی سنوری ہوئی تھی' دوسری جانب آنکھوں میں اتنی ہی سرخی تھی۔ وہ اکتا سے گئے۔

"بیٹھ جاؤ جواہرات۔ آج کل تم لوگ کسی کو دھمکانے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی۔" میز پہ دونوں ہاتھ رکھے' جھک کر وہ غرائی۔ "تم لوگوں نے میری ویڈیو بنائی۔ اور اب تمہاری بیٹی اس ویڈیو کو استعمال کرنے کی دھمکی دے کر گئی ہے مجھے۔ میں نے تم پہ بھروسا کر کے تمہیں ایک کام کہا تھا اور فصیح نے اسے ریکارڈ کر لیا۔"

ہارون عبید تحمل سے پیچھے ہو کر بیٹھے۔ وہ عمر اور تجربے کے اس دور سے نکل چکے تھے جہاں "کیا؟ کون سی ویڈیو؟ مجھے نہیں معلوم" جیسے الفاظ فوراً "حیران ہو کر بولے جاتے ہیں۔ انہوں نے جواہرات کے الفاظ کو ذہن میں ترتیب دیا اور ساری تصویر واضح ہو گئی۔

"اور میری بیٹی نے یقیناً" یہ بھی بتایا ہو گا کہ کس صورت میں وہ اس ویڈیو کو استعمال نہیں کرے گی۔"

"ہاں بتایا تھا۔ ڈونٹ ٹیل می کہ تم نہیں جانتے۔

لیکن یاد رکھنا' میں ہاشم سے پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ اس نے اپنی مرضی سے آپی کو پرپوز کیا ہے۔" (میز پہ رکھی ہارون کی مٹھیاں زور سے بھینچ گئیں۔ ماتھے پہ بل در آئے۔) "اور میرے کہنے سے وہ نہیں رکے گا۔ اس لیے اپنی بیٹی کو سمجھاؤ' شادی سے انکار کرنا ہے تو خود کرے اور اس ویڈیو کو ضائع کردو ہارون۔ ورنہ جو میں کروں گی......"

"کیا کروگی تم؟" وہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آنکھوں میں غصہ لیے جواہرات کو دیکھا۔ "وہ ویڈیو ضائع نہیں ہوگی۔ اپنے بیٹے کو سمجھادو کہ وہ میری بیٹی سے دور رہے۔ ورنہ میں اس کو تمہاری آنکھوں کے سامنے تباہ کردوں گا۔ ناؤ گیٹ آؤٹ۔ آجاتے ہیں دھمکیاں دینے۔ جاؤ پہلے اپنے مسئلے سلجھاؤ۔"

جواہرات برہم سی واپس مڑ گئی اور جب تک وہ باہر نکلی' ہارون بلند آواز میں بولتے رہے۔

کرسی پہ واپس گرتے ہوئے انہوں نے بے اختیار ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ وہ شدید متفکر نظر آنے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

زندہ رہنے کی تمنا ہو تو ہو جاتے ہیں
فاختاؤں کے بھی کردار عقابوں والے

اس سنہری دوپہر حنین اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھی' مسکرا کر اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

"کاپی نہیں ہو پا رہا تو کیا ہوا؟ میموری کارڈ تو میرے پاس ہے نا۔" میموری کارڈ کی فائلز کاپی نہیں ہوتی تھیں' اس نے بہت کوشش کرکے دیکھ لی تھی۔ اس نے سلاٹ سے کارڈ نکالا' پھر ایک ننھی سی پلاسٹک کی ڈبی (جس کو اپنے کچھ میموری کارڈز سے اس نے خالی کر لیا تھا) میں اسے ڈالا۔ اپنی الماری کھولی۔ لاک والے دراز میں اسے رکھ کر مقفل کیا اور چابی جوتوں کے خانے میں پیچھے ـــ کرکے چھپادی۔ پھر مسکرا کر واپس لیپ ٹاپ پہ آبیٹھی۔ ان باکس کھولا۔ سیو سعدی یوسف کا پیغام ابھی تک ان باکس میں موجود تھا جس میں احمر وہاں نے ایڈمن بننے کی درخواست دی تھی۔

مسکراتے ہوئے حنین نے پیغام ٹائپ کیا۔ "یہ ہے میرا نمبر۔ مجھے کال کریں پلیز احمر۔ مجھے سلطان بنگش کے بارے میں بات کرنی ہے!" پیغام بھیج کر وہ کرسی پہ ٹیک لگائے مزے سے بیٹھ گئی۔ دو سیکنڈ بعد ہی seen (سین) لکھا آگیا۔

احمر آفس کی راہداری میں دو افراد کے ساتھ چلتا جا رہا تھا اور کچھ بول بھی رہا تھا جب موبائل بجا۔ چونکہ وہ اس کے ہاتھ میں ہی تھا اس لیے اس نے بات جاری رکھتے ہوئے اسکرین کو چھوا۔ پیغام پڑھ کر اس کی زبان رکی۔ چہرہ فق ہوا۔ ان لوگوں سے معذرت کرکے وہ تیزی سے اپنے آفس کی طرف واپس آیا اور فون کان سے لگایا۔ حنین نے تیسری گھنٹی پہ فون اٹھا لیا تھا۔

"کیسے ہیں آپ کاردارز کے میڈیا منیجر' امیج کنسلٹنٹ احمر شفیع صاحب یا مجھے یوں کہنا چاہیے کہ ....سل....طان...." وقفہ دیا تو وہ جلدی سے بولا۔

"فضول گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بتایئے' کیا مسئلہ ہے؟" ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے وہ پریشانی سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے یہ پوچھنا تھا کہ کیا کاردارز ابھی تک ہماری کالز ریکارڈ کررہے ہیں؟" وہ معصومیت سے بولی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے بچے۔ کوئی آپ کی کالز ریکارڈ نہیں کررہا۔"

"اچھا۔ یعنی پھر ہم تسلی سے بات کرسکتے ہیں۔ میں ایک صاحب کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ ان کا نام سلطان تھا......"

"حنین' پلیز!" اس نے آستین سے پیشانی پونچھی۔ سفید چہرہ لیے وہ مضطرب سا فون کان سے لگائے آفس میں ٹہل رہا تھا۔

"نہیں احمر شفیع۔ پلیز تو میں بولوں گی اب۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمارے تمام فونز اور کمپیوٹرز کی مانیٹرنگ ختم کردی جانی چاہیے ورنہ میں اپنے پی ٹی سی ایل سے اپنی پھپھو کو کال کروں گی اور ان کو وہ دلچسپ کہانی سناؤں گی' سلطان صاحب والی' اور میں روز یہی

کروں گی۔ روز اپنے ایک رشتے دار کو کال کر کے ان کو وہ کہانی سناؤں گی۔ اب ہماری کالز ریکارڈ کرنی ہیں یا نہیں یہ فیصلہ آپ کا ہے۔ بائے!" مسکرا کر کال کاٹی اور احمر فون رکھ کر تیزی سے باہر بھاگا۔ لفٹ میں سوار وہ نچلی منزل تک گیا اور بھاگتے ہوئے راہداری عبور کی۔ ایک آفس کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھے کانوں سے ہیڈ فون لگائے شخص کو "اٹھو۔ باہر جاؤ" کہہ کر اسے کالر سے اٹھا کر کھڑا کیا 'اور اس کی جگہ پہ بیٹھا۔

"باہر جاؤ!" وہ حیران پریشان سا جگہ سے نہ ہلا تو احمر دھاڑا۔ وہ فوراً" باہر لپکا۔ اب احمر تیزی سے کی بورڈ کے بٹن دبا رہا تھا۔ اس کی پیشانی سخت سردی میں بھی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ وقت آگیا ہے کہ ساحل کو چھوڑ کر
گہرے سمندروں میں اتر جانا چاہیے

ہاشم کے آفس میں باوجود سردی کے کسی ہیٹر کی ضرورت نہ تھی۔ ماحول خاصا گرما گرم ہو رہا تھا۔ ہاشم نے خراب موڈ کے ساتھ فون رکھا اور سامنے بیٹھی جواہرات کو دیکھا۔

"ایس ایچ او کا تبادلہ ہو گیا ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"اور یہ یقیناً" صاحبزادی صاحبہ نے کروایا ہو گا۔" جواہرات فکر مندی سے آگے ہوئی۔ وہ اسی صبح والے لباس میں تھی اور بے حد مضطرب لگ رہی تھی۔ گہرے میک اپ کے باوجود وہ بوڑھی لگنے لگی تھی۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نوشیرواں کو کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔" ہاشم نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"تم اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کروا لو پھر بھی۔"

"ممی کیا ہو گیا ہے؟ یہ ناقابل ضمانت ہے۔ ضمانت نہیں ہو سکتی۔"

"ہو سکتی ہے۔ تم نے رانا برکت والے کیس میں کروائی تھی نا۔"

"جی! وہ غیر معمولی حالات تھے 'وہاں بہت سی جائز وجوہات تھیں۔ یہاں نہ ہو سکتی ہے نہ اس چکر میں پڑنے کی ضرورت ہے۔ آپ بے فکر رہیں 'کوئی شیرو کو گرفتار نہیں کرے گا۔" ہاشم نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پورے وثوق سے کہا۔ جواہرات نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔

"وہ تب سے کمرے میں بند ہے۔ ہاشم! تم اس کی فکر کرو۔ فی الحال ہم کتنے کرائسز میں ہیں۔" ہاشم نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا مطلب؟ میں اس کی فکر کروں؟ کر تو رہا ہوں۔ میں ہی تو کر رہا ہوں۔ مگر آپ کے یہ الفاظ!! کہاں سے آ رہے ہیں 'ہاں؟" اس نے ایک تیز گہری نظر ماں پہ ڈالی۔ جواہرات نے چائے کا کپ آہستہ سے پرچ میں رکھا اور الفاظ ڈھونڈے۔

"آبی والے معاملے کو کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر کے..."

"ایک منٹ ممی!" اس نے سختی سے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ جواہرات کی سانس تک اٹک گئی۔ "میں نے اس کو پرپوز اس لیے نہیں کیا تھا کیونکہ آپ مجھے بار بار ترغیب دلاتی تھیں۔ میں نے یہ فیصلہ اپنی وجہ سے کیا تھا۔ میری بھی ایک زندگی ہے جسے میں آپ لوگوں کی غلطیاں درست کرنے میں ختم نہیں کر سکتا۔ وہ معاملہ جہاں ہے وہیں رہے گا۔ اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" جواہرات نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا 'البتہ اس کی رنگت پھیکی پڑ چکی تھی۔ وہ بے حد شکست خوردہ نظر آ رہی تھی۔

وہ پرس اٹھائے آفس سے باہر نکلی تو احمر چلا آ رہا تھا۔ وہ اس کے برابر سے گزرنے لگی تو احمر نے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

"مسز کاردار! میں یوسفز کے فون ٹیپ ہٹوا رہا ہوں۔" جواہرات نے چونک کر اسے دیکھا پھر آنکھوں میں غصہ در آیا۔

"یہ ہر کوئی اپنی من مانی کب سے کرنے لگا ہے 'تم

ہاشم سے پوچھے بغیر..."

"مسز کاردار!" وہ نرمی سے سرگوشی میں بولا۔ "وہ لڑکا سعدی... وہ کال کر کے کسی سے خاور کی بات کر رہا تھا۔ خاور کو پھنسانے کی۔ آپ کا نام لے رہا تھا۔ میں اسی لیے ٹیپ ہٹوا رہا ہوں' بے فکر رہیں' میں آپ کا وفادار ہوں۔" سمجھانے والے انداز میں وہ بولا تو جواہرات گہری سانس لے کر رہ گئی۔ رنگت مزید پھیکی پڑی۔ (ہر طرف سے گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ ہر شخص ٹائم بم بنا ٹک ٹک کر رہا تھا۔)

"ٹھیک ہے' تم نے درست کیا۔ ویسے بھی اب کال ٹیپنگ کی ضرورت نہیں رہی ہے۔" وہ تھکے تھکے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ احمر نے غور سے اسے دیکھا۔

"مسز کاردار' پریشان مت ہوں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

راہداری میں باریک ہیل کے چلنے کی آواز آئی تو وہ دونوں جو قدرے الگ تھلگ کھڑے تھے چونک کر دیکھنے لگے۔ سامنے سے شہرین چلی آرہی تھی۔ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس' بالوں کو الٹے سیدھے فیشن کے مطابق باندھے' وہ ان کو نظرانداز کر کے ہاشم کے آفس کی طرف بڑھ گئی۔ جواہرات کی چبھتی نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

"احمر...! مجھے خاور سے نجات چاہیے۔" وہ بے بسی سے دبی دبی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "ہاشم کہہ رہا تھا اس نے کال کی ہے اس کو۔ ہمیں کچھ کرنا ہوگا احمر۔"

☼ ☼ ☼

ہم کو اس عہد میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

شام کا نیلگوں اندھیرا ہر سو گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کالونی کے گھروں کے پورچ اور گیٹ کی بتیاں جلنے لگی تھیں۔ اذان مغرب کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ پرندے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ایسے میں فارس غازی کالونی کی مسجد میں موجود تھا۔ سنگ مرمر کی چوکی پہ بیٹھا' وہ جھک کر نل سے وضو کر رہا تھا۔ پانی اس کے کانوں کی لو اور ٹھوڑی سے ٹپک رہا تھا اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ پاؤں دھو کر وہ سیدھا کھڑا ہوا' پھر سویٹر کی آستینیں برابر کرتا صحن کی طرف بڑھ گیا۔

مسجد دھیرے دھیرے نمازیوں سے بھر رہی تھی۔ اسے پہلی صف میں جگہ نہیں مل سکی' شاید اس نے کوشش ہی نہیں کی۔ ابھی اتنی جلدی اتنے آگے کھڑے ہونے کی ہمت نہ تھی۔ تیسری صف میں وہ دو نمازیوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ پیر سے پیر ملا لیا۔ اردگرد موجود لوگوں کی اکثریت کو وہ جانتا نہیں تھا۔ علاقہ نیا تھا' ابھی جان پہچان میں وقت لگتا تھا۔ اس اجنبی ہجوم میں وہ تنہا تھا۔ لوگ بولتے' باتیں کرتے صفیں برابر کر رہے تھے۔ وہ بھی سر جھکائے کھڑا رہا۔ امام صاحب نے تکبیر تحریمہ پڑھی تو اس نے کانوں تک ہاتھ اٹھاتے اللہ اکبر کہتے' بازو سینے پہ باندھے۔ اب وہ قدرے پرسکون انداز میں آیات پڑھنے لگا تھا۔ دھیرے دھیرے بے چین دل کو قرار آرہا تھا۔

سلام پھیر کر جب ہر شخص کو جانے کی جلدی تھی' وہ دو زانو' سر جھکائے یونہی کتنی ہی دیر بیٹھا رہا۔

"میں اچھا آدمی نہیں ہوں' مانتا ہوں۔" سر جھکائے وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

"میرے ارادے برے تھے' یہ بھی مانتا ہوں۔ میں خاور کو قتل کرنا چاہتا تھا' اس نے میرے بے گناہ بھائی اور معصوم بیوی کو مارا تھا۔ میں ہاشم اور جواہرات میں سے کسی ایک... کسی بھی ایک کو قتل کرنا چاہتا تھا جس نے اس قتال کا حکم دیا تھا۔ اسی لیے میں کہتا تھا زمر سے کہ ہم الگ ہو جائیں گے مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں خاور کا فیصلہ اے اللہ' آپ پر چھوڑتا ہوں۔ نہ میں اس کے پیچھے جاؤں گا۔ نہ اس کے خلاف کچھ کروں گا۔ رہا ہاشم تو میں اس کی جان نہیں لوں گا۔ خیر آپ جانتے ہیں میں کیا کروں گا اس کے ساتھ' مگر اب... میں کسی کی جان نہیں لینا چاہتا۔ انصاف چاہیے مجھے۔ عدالت نہیں دے گی جانتا ہوں' خود لینا پڑے گا

مانتا ہوں۔ مگرہاں اب .... اب میں اس سے الگ نہیں ہونا چاہتا۔ اب میں خوش ہوں۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ اب روشنی نظر آنے لگی ہے۔ اب لگتا ہے کہ میرا ٹوٹا ہوا دل جڑ جائے گا۔ محبت کتنی محبت سے حیات کردیتی ہے ہمیں 'اے اللہ!" سر جھکائے چہرے پہ ہاتھ پھیر کر وہ اٹھا تو نمازیوں کا ہجوم تتر بتر ہوچکا تھا۔ وہ چپ چاپ مسجد سے نکل آیا۔ جوتے پہنے اور ٹھنڈی خوشگوار ہوا میں چلتا ہوا گھر کا فاصلہ عبور کرنے لگا۔ اس کا چہرہ پہلے سے پرسکون اور مطمئن لگتا تھا۔

اس کے جوگرز میں مقید پیر تارکول کی سڑک عبور کر رہے تھے۔ تیز تیز .... اور شاید گزرے برسوں کا فاصلہ بھی طے کر رہے تھے۔ نیلگوں اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔

تارے آسمان پہ نمودار ہونے لگے تھے .... ٹھنڈے میٹھے تارے....

وہ دونوں سینما کے ہال میں موجود تھے۔ اندھیرے کرسیوں پہ پیچھے کو ٹیک لگائے وہ کان کی لو مسلتا نگاہیں اسکرین پہ جمائے ہوئے تھا۔ گاہے بگاہے ساتھ بیٹھی زرتاشہ کو بھی دیکھ لیتا' جو بالوں کو ہیئر بینڈ میں مقید کیے' ہاتھ میں پکڑے نمکو وقفے وقفے سے کھاتی' انہماک سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ مرجائے گا۔" کچھ دیر بعد وہ بے چینی سے بولا فلم اسے بور کر رہی تھی۔ زرتاشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ نے دیکھ رکھی ہے پہلے؟" وہ ناراض ہوئی۔

"نہیں یار۔ صاف پتا چل رہا ہے۔ اچھا اب ایسی شکل مت بناؤ۔ اسے دیکھو....." زرتاشہ نے خفگی سے سر جھٹک کر چہرہ واپس موڑا تو وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

چند لمحے بعد انٹرمیشن کے الفاظ چمکے اور ہال کی بتیاں جل اٹھیں۔ لوگ اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے۔ وہ دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ تین چار لڑکوں کا گروہ ان کی قطار میں آگے بڑھتا ان تک آرہا تھا گویا اب ان کے سامنے سے تنگ سی جگہ سے گزر جائے گا۔ وہ فارس کی دائیں طرف سے آرہے تھے' سو فارس نے ٹانگیں لمبی کر کے نچلی قطار کی نشست پر رکھ دیں اور سینے پہ بازو لپیٹے' قدرے نیم دراز ہوگیا۔ لڑکے رک گئے۔ جان گئے کہ وہ نہیں چاہتا وہ اس کی بیوی کے سامنے سے گزر کر جائیں۔ وہ واپس مڑ گئے۔

"آپ کو میری بات یاد ہے! مجھ سے نہیں لڑیں گے۔ میرے لیے لڑیں گے۔" وہ مسکرا کر اس کو دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

فارس نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔ "لڑتا تو ہوں تم سے۔"

"جانتی ہوں مگر اس دن آپ نے روبینہ آنٹی کے سامنے میری حمایت کی کہ زرتاشہ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی' حالانکہ میں نے کہی تھی۔" وہ میکے میں کوئی بات سے بات نکالنے والے ایشو کا تذکرہ کرنے لگی۔

"مجھے پتا ہے تم نے کہی تھی اور تمہیں نہیں کہنی چاہیے تھی۔ زرتاشہ! ہر وقت دوسروں کے معاملات پہ کمنٹس نہیں دیتے۔ اور ٹیکسٹ اور فون کالز پہ تو یہ کام کبھی نہیں کرتے۔ فونز پہ باتیں صرف بگڑتی ہیں کیونکہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آتیں۔ لیکن جب کبھی تم خاندان میں کسی کے بارے میں کوئی بات کیا کرو تو اس کو اون کیا کرو' اس کے لیے لڑا کرو' اس پہ ڈٹ جایا کرو۔ کسی خالہ' پھپھی یا بھابھی کے ڈر سے مکر نہ جایا کرو کہ میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا' وغیرہ۔ بات کو اس کے گھر پہنچایا کرو۔"

"مانا کہ میری غلطی تھی مگر آپ نے ان کے سامنے میری حمایت کی تھی' مجھے اچھا لگا تھا۔" وہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ فارس نے پھر ہلکے سے کندھے اچکائے۔

"تم غلط کرو گی یا صحیح' میں دنیا کے سامنے ظاہر ہے تمہیں ہی سپورٹ کروں گا۔ اگر آپ اپنے گھر کی لڑکیوں کو ان کی غلطیوں کے لیے معاف کر کے ان کو سپورٹ نہیں کرسکتے' ان کا ہاتھ تھام کر ان کو ان کے پورے قد کے ساتھ کھڑا نہیں کرسکتے تو آپ کیسے مرد

ہوئے! آدمی تو بہت سے ہوتے ہیں۔ مرد کوئی کوئی ہوتا ہے۔"

"بس اتنا بتا دیں کہ یہ فلم والا مرد مرے گا تو نہیں؟" وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

"میں اول تو اسے مرد مانتا نہیں ہوں' دوم' ہاں یہ مر جائے گا۔ نہیں' میں نے یہ فلم نہیں دیکھ رکھی۔ میں نے صرف ریویو میں ساری کہانی صبح پڑھ لی تھی۔" وہ یونہی نیم دراز' ٹیک لگائے مسکراکرتا رہا تھا۔

"تاکہ آپ میری فلم خراب کر سکیں!" اس کی آنکھوں میں پھر سے ناراضی ابھری۔

"مجھے ایک قدم آگے رہنا اچھا لگتا ہے زرتاشہ!"

مغرب پوری طرح ڈھل چکی تھی۔ اس کے جوگرز سڑک کو گویا اپنے نیچے لپیٹتے تیز تیز فاصلہ عبور کر رہے تھے۔ سبز بیلوں سے ڈھکا بنگلہ سامنے تھا۔ وہ گہری سانس لے کر ماضی کی یادوں کو ذہن سے جھٹکتا اندر داخل ہوا۔

لاؤنج میں وہی لوگ تھے جو روز ہوتے تھے۔ مگر آج لگتا تھا سب کے چہروں پہ مسکراہٹ ہے۔ راہداری سے گزرتے' وہ کچن کے کھلے دروازے میں ذرا دیر کو ٹھہرا۔ سعدی سلیب کے ساتھ کھڑا تھا اور سر جھکائے مسکرا کر سامنے کرسی پہ بیٹھی زمر کو سن رہا تھا جو دھیرے دھیرے بتا رہی تھی۔ "پھر ہم نے فارس کے کیس کے دنوں میں...."

پرانی کتھائیں.... طویل قصے۔ زمر کی اس کی طرف پشت تھی۔ سعدی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک ثانیے کو ٹھہرا' پھر اسے آواز دی۔

"سعدی!" سعدی نے چونک کر سر اٹھایا۔ زمر نے بھی گردن موڑی۔ (فارس کو دیکھ کر اسے پرس میں رکھی لونگ یاد آئی۔ اوہ! ابھی تک نہیں پہنی۔ اپنی بھول پہ افسوس ہوا۔)

"اپنا پاسپورٹ مجھے دے دو۔" اس نے عجلت میں کہا گویا زیادہ دیر مخل نہیں ہونا چاہتا۔ مگر مخل ہونے کا بہانہ بھی چاہیے تھا۔

"وہ میں نے ڈسپوز آف کر دیا ہے۔ بے فکر رہیں۔" سعدی نے سر کو جنبش دے کر تسلی کرائی۔

فارس کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔

"کیا مطلب ڈسپوز آف کر دیا ہے؟ میں نے کہا تھا میں خود اسے ڈسپوز آف کروں گا۔ صباحت نے اپنا کیریئر داؤ پہ لگا کر وہ تمہارے لیے بنوایا تھا۔ تمہیں یقین ہے وہ کسی کے ہاتھ نہیں لگے گا۔" اس نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔

"اس کے اتنے ٹکڑے کیے تھے کہ اب وہ نہیں ملے گا کسی کو۔ فکر نہ کریں!" سعدی نے ہاتھ اٹھا کر تسلی دی۔

"مگر...."

"فارس! وہ کہہ رہا ہے تو اس پہ بھروسا رکھو۔" زمر کی بات پہ اس نے "اچھا جی!" کہہ کر سر کو خم دیا اور خراب موڈ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ وہ دونوں پھر سے باتوں میں لگ گئے تھے۔

"آپ اکیلے نہیں ہیں۔" دو قدم آگے بڑھا تھا کہ سیم کے کمرے کے دروازے پہ کھڑی حنین نے پکارا۔ وہ رکا۔ غور سے اسے دیکھا۔

"اگر تم سمجھتی ہو کہ میں جیلس ہو رہا ہوں تو...."

"میں سمجھتی نہیں ہوں' مجھے یقین ہے۔ خیر ہے۔ ہوتا ہے ایسے۔" الفاظ کے برعکس اس کا لہجہ شگفتہ نہ تھا۔ چہرے پہ عجیب ویرانی تھی۔ کہہ کر وہ پلٹ گئی اور سیم کے بیڈ پہ آبیٹھی۔ (وہ ٹیوشن جاتا تھا اس وقت۔) اداس اور ویران۔ یکایک دروازہ بند ہو کر لاک ہونے کی آواز آئی تو حنہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

فارس دروازہ مقفل کر کے کرسی لے کر اس کے سامنے آبیٹھا' اور آگے ہو کر غور سے اسے دیکھا۔

"حنین' کیا مسئلہ ہے؟ سیم نے مجھے نہیں بتایا۔ مگر تمہاری اور سعدی کی کیا لڑائی چل رہی ہے؟" ڈھیلی سی فرنچ چوٹی بنائے' کٹے بال ماتھے پہ بکھیرے' زرد چہرے والی حنین کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

"آپ تو ہمیشہ دو قدم آگے رہتے ہیں' آپ کو ابھی تک کسی نے نہیں بتایا؟"

"کیا؟ مجھے واقعی نہیں پتا!!" وہ ٹھٹکا تھا۔ حنہ بھیگی

آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

"وہ آپ کو بتا دے گا۔ بھائی بتا دے گا اور آپ مجھ سے نفرت کریں گے۔" فارس چند ثانیے بغور اس کی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔

"کیا کیا ہے تم نے؟" الفاظ ہموار اور پرسکون تھے، مگر سوال قیامت تھا۔

"ایسے ہی قیامت کے دن اور اس سے پہلے قبر میں پوچھا جائے گا نا کہ کیا کیا ہے تم نے حنین۔ کیا کر کے آئی ہو؟ میں کیا کہوں گی؟" آنسو اس کی آنکھوں سے پھسل رہے تھے۔

"کسی کو قتل کیا ہے؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔

"نہیں تو۔" حنہ کی گردن نفی میں ہلی۔

"پھر ہر چیز ٹھیک ہو سکتی ہے۔ بتاؤ مجھے۔ کیا کیا ہے تم نے؟" اس نے نرمی سے پوچھتے ہوئے حنہ کے ہاتھ تھامے۔ وہ ٹھنڈے یخ ہو رہے تھے۔ گویا برف کے ٹکڑے ہوں۔ اکیس سال کی دبلی پتلی کمزور، اداس سی وہ لڑکی دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ آنسو مسلسل ٹھوڑی سے نیچے لڑھک رہے تھے۔

"آپ مجھ سے نفرت کریں گے۔"

"نہیں کروں گا۔" اس نے تسلی دی۔

"میں نے ایگزام میں چیٹنگ کی تھی۔ میں نے اوسی پی صاحب کو..." وہ ہچکیوں کے درمیان سر جھکائے بتاتی رہی۔ وہ توجہ سے سنتا رہا۔ کتھا ختم ہوئی تو حنہ نے بھیگا چہرہ اٹھایا۔

"حنین!" وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "انسان زندگی میں بہت کچھ کرتا ہے۔ غلط صحیح، اچھے برے سب کام کرتا ہے انسان۔ ہر چیز کو تجربہ سمجھ لیا کرو۔ ٹھیک ہے تم سے غلطی ہوئی، لیکن تم نے توبہ کر لی نا، بات ختم ہو گئی۔" وہ سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

"احمر شفیع جانتا ہے۔ اس نے ہمارے گیٹ پہ آ کر مجھے دھمکی دی تھی۔" فارس ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا گویا بری طرح چونکا تھا۔ اس نے یہ کتھا بھی سنا ڈالی۔

"یہ کب کی بات ہے؟"

"جب آپ سری لنکا تھے۔" وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

"خیر میں اس سے لے لوں گا ہر چیز۔ وہ کسی کو نہیں بتائے گا۔"

"وہ آپ کو وہ سارے ثبوت نہیں دے گا۔"

"اس کا تو باپ بھی دے گا۔"

حنین چپ ہو گئی۔ "اس کا باپ... خیر کسی اور کے راز کھولنے سے پہلے... ایک اور بات..." اس نے اب کی بار سر نہیں جھکایا۔ اب سر اٹھا کر بات کرنی تھی۔ آنکھوں میں دیکھ کر۔ اس کے ہاتھ پہ اپنے کمزور ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر کے۔

"میں نے کچھ اور بھی کیا ہے۔ جس کی وجہ سے بھائی مجھ سے ناراض ہے۔"

"اور وہ کیا ہے؟" وہ بنا پلک جھپکے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے مجھے منع کیا تھا مگر میں بہت اکیلی تھی، مجھے کوئی اپنا دوست نہیں لگتا تھا۔ میں... میں ہاشم بھائی سے ٹیکسٹ پہ بات کرتی تھی... میں..."

اسے لگا فارس کے ہاتھ اس کے ہاتھ سے پھسلنے لگے ہیں، وہ ہلکا سا چونکا تھا، ڈھیلے اعصاب تن گئے تھے، حنین نے اپنے پسینے میں ڈوبے ہاتھوں کی اس کے ہاتھ پہ گرفت مضبوط کر دی۔ بس ان ہاتھوں کو وہ نہیں چھوڑ سکتی تھی، وہ نہیں کھو سکتی تھی۔

"آئی ایم سوری... مجھے نہیں پتا تھا میں کیا کر رہی ہوں... میں ان کو پسند کرنے لگی تھی۔ آئی ایم سو سوری... میں کبھی ان سے ملنے نہیں گئی... انہوں نے بلایا تب بھی نہیں... وہ سعدی بھائی کے ساتھ تھے... بھائی کو ٹارچر کرنے کے لیے مجھے کال کر رہے تھے، بھائی اسی لیے خفا ہے مجھ سے۔ میں نہیں گئی مگر کئی ماہ... کئی ماہ میں ان سے بات کرتی رہی... ٹیکسٹ پہ... ایک دو دفعہ کال پہ... مگر میں ان سے بات کرتی رہی... مجھ سے غلطی ہو گئی ماموں... میں غلط راستے پہ چلی گئی تھی... میں بہت بری ہوں۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ آنسو اس کے ہاتھوں پہ بھی گر رہے تھے، یا شاید وہ پسینہ تھا مگر وہ ابھی تک مضبوطی سے اس کو تھامے ہوئی تھی۔

وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ بالکل چپ پھر اس نے نظریں جھکا لیں۔ حنین وحشت سے اسے دیکھنے لگی۔ دل ڈوبنے لگا۔

اور پھر فارس نے آہستہ سے اپنے ہاتھ نکال لیے۔ اس کے گیلے ہاتھ تنہا رہ گئے۔ وہ بیٹھی رہ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر پھیلتے اندھیرے کو دیکھتے ہوئے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ حنین نے اپنے خالی ہاتھ اپنے تہی دامن میں رکھ لیے۔ ساری دنیا ویران ہو گئی تھی۔

"تم نے کبھی اسے کہا کہ تم اس کو پسند کرتی ہو؟" وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ آواز آہستہ تھی۔ بہت آہستہ۔

"انہیں اندازہ ہو گا۔ وہ ہاشم کاردار ہیں، میں نے..."

"میں نے پوچھا، تم نے اسے کہا یا نہیں کہا۔" وہ اب حنہ کی طرف گھوما۔ وہ ایک ٹک چہرہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

فارس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس باہر خارج کی اور پھر واپس کرسی کی طرف آیا۔

"سنو حنین!" وہ اس کے سامنے بیٹھا سنجیدگی سے کہنے لگا تھا۔ "انسان کا پسند ناپسند پہ اختیار نہیں ہوتا۔ وہ اس کے بعد کیا کرتا ہے اس پر اختیار ہوتا ہے۔ میں نے بھی جیل میں اچھے برے بہت سے کام کیے ہیں۔ اتنی عمر ہو چکی ہے کہ اب میں ایک چھوٹی بچی کو جج نہیں کر سکتا۔ میں اس بات کو دوبارہ ڈسکس بھی نہیں کرنا چاہوں گا۔ مجھے اب صرف اس بات کی پروا ہے کہ وہ کورٹ میں کیا پیش کرے گا۔"

"کورٹ؟" حنہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ کون سی کورٹ؟"

"اگر کوئی ٹرائل ہوا تو وہ تمہیں کورٹ میں بلائے گا اور تمہارے سارے میسجز پرنٹ کر کے وہاں پیش کرے گا۔ آئی ایم سوری حنہ اگر میں کبھی تمہیں یہ یقین نہیں دلا سکا کہ تم اکیلی نہیں ہو یا یہ کہ تم مجھ پہ اعتبار کر سکتی ہو۔ لیکن اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ مجھے اچھا نہیں لگا مگر میں تمہیں جج نہیں کروں گا۔ کوئی بھی چیز میرے دل میں تمہاری محبت کم نہیں کر سکتی۔ اور ابھی میں بھی کچھ بتاؤں گا تمہیں، تاکہ یہ ثابت کر سکوں کہ میں بھی تم پہ اعتبار کرتا ہوں۔ مگر پہلے مجھ پہ بھروسا کرو اور بتاؤ کہ ان میسجز میں کیا تھا؟ تم اس سے کیا بات کرتی تھیں؟"

اس نے دوبارہ سے حنہ کے ہاتھ تھام لیے تھے اور وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ نہ نرمی سے نہ سختی سے۔ ضبط اور تحمل سے۔ مگر حنین اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ یک ٹک گم صم سی خلا میں دیکھ رہی تھی۔

عرصہ بعد ایک گتھی سلجھ گئی تھی۔ ایک گرہ کھل گئی تھی۔ ایک سرا ہاتھ میں آ گیا تھا۔

وہ سوال قیامت تھا، اور جواب بھی قیامت سے کم نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

حشر کے دن کا غلغلہ، شہر کے بام و در میں تھا
نگلے ہوئے سوال تھے، اگلے ہوئے جواب تھے

اگلے چوبیس گھنٹے کہاں غائب ہوئے، پتا ہی نہیں چلا۔ ایک دن طلوع ہو کر ڈھل بھی گیا اور چھاتے اندھیرے نے دیکھا، نوشیرواں کاردار اس خوب صورت بنگلے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا ہے۔ جو کلب کے طور پہ استعمال ہوتا تھا۔ ادھر ادھر ٹولیوں کی صورت بیٹھے لوگ..... ٹہلتے لڑکے لڑکیاں..... سرو کرتے ویٹرز..... ہر کسی نے آنکھ اٹھا کر..... نظر بچا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ بڑے دن بعد نہا دھو کر تیار سا، پرفیوم کی مہک میں بسا، گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے، منہ میں چیونگم چباتا چلا آ رہا تھا۔ بار کاؤنٹر کا اسٹول کھینچ کر بیٹھا اور سیل فون نکالتے ہوئے بارٹینڈر کو اپنا آرڈر بتایا۔ سن گلاسز اتار کر گریبان پہ اٹکائے اور اسکرین پہ انگلی پھیر تا نیوز فیڈ چیک کرنے لگا۔

سرگوشیوں اور اونچی باتوں میں اسے اپنا نام واضح سنائی دے رہا تھا۔ وہ نظر انداز کر کے مشروب کے گھونٹ بھرنے لگا۔ اب وہ نہیں چھپے گا۔ نہیں ڈرے

گا۔ کون یقین کرے گا کہ اس نے کسی کو مارنا چاہا ہے؟ چند دن میں لوگ بھول بھال جائیں گے۔

دفعتاً" اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے آکھڑا ہوا ہے۔ شیرو نظر انداز کیے، گھونٹ بھرتا، موبائل دیکھتا رہا۔ وہ کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا مگر دھیرے دھیرے ایک عجیب سا احساس رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ کلب میں چھائی غیر معمولی خاموشی۔ جیسے سب سرگوشیوں میں بول رہے ہوں اور پھر چپ ہوگئے ہوں۔

"امریکہ میں ایسے موقعوں پہ مرینڈا رائٹس پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ آفیسر آف لاء کہتا ہے کہ تمہیں خاموش رہنے کا حق ہے، کیونکہ تم جو بھی کہو گے وہ تمہارے خلاف عدالت میں استعمال ہوگا۔"

نوشیرواں کاردار بجلی کی سی تیزی سے گھوما۔ اس کی پشت پہ.... سینے پہ بازو لپیٹے.... وہ کھڑا تھا۔ وہ جس کا آسیب اس زیر تعمیر گھر میں بہتے خون سے نکل کر نوشیرواں کے اندر آبسا تھا۔ وہ آج مجسم صورت اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور آنکھوں میں تپش تھی۔ جیکٹ اور جینز میں ملبوس چھوٹے کٹے بالوں والا لڑکا جس کے منہ پہ زخم کا نشان تھا، اس پہ نظریں گاڑے کہہ رہا تھا۔

"مگر پاکستان میں آرٹیکل تیرہ ہی کافی ہوتا ہے۔ دہرانے کی ضرورت پھر بھی نہیں ہے ہمیں کیونکہ تم خاموشی سے بھی گرفتاری نہیں دو گے۔"

کسی نے کلب کے لاؤنج کی سفید بتیاں جلا دی تھیں۔ مدھم روشنیوں والا خوابناک ماحول یکدم جیسے تیز روشنی میں نہا گیا تھا۔ بے رحم سفید روشنی نے سب عیاں کر دیا تھا۔ سعدی یوسف کے ساتھ سیاہ وردی والے چند افراد کھڑے تھے۔ نوشیرواں کا رنگ پھیکا پڑا۔ وہ آہستہ سے جگہ سے اٹھا۔

"میں سیکشن 161 سی آر پی سی کے تحت نوشیرواں اورنگ زیب کاردار کو اپنا حملہ آور اور اغوا کار نامزد کرتا ہوں۔ مجھے آٹھ ماہ حبس بے جا میں رکھنے اور جسمانی ذہنی اذیت دینے کا ذمہ دار یہی ہے۔ اور ان کے پاس تمہاری گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔" نوشیرواں نے فوراً" موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر آفیسر نے اپنی چھڑی اس کے ہاتھ پہ رکھ دی۔

"تم لوگ مجھے یوں گرفتار نہیں کر سکتے۔ میرے بھائی کو بلاؤ۔" وہ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ چلا کر بولا تھا۔ سعدی سینے پہ بازو لپیٹے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ایک سپاہی آگے بڑھا اور نوشیرواں کے ہاتھ تھامنے چاہے مگر اس نے رکھ کر سپاہی کے منہ پہ مکا جڑ دیا۔

اردگرد کے تماش بین لڑکے لڑکیوں نے موبائل کیمرے نکال لیے تھے۔ کلک کلک۔ تصاویر اور ویڈیوز بنائی جا رہی تھیں۔ تین سپاہیوں نے اس پہ حملہ کر دیا تھا اور وہ مزاحمت کرتا رہا، چلاتا رہا، گالیاں دیتا رہا، انہوں نے اسے سینے کے بل کاؤنٹر سے لگایا اور ہاتھ پیچھے سے باندھے۔

ایس ایچ او اب اس کو اس کے حقوق پڑھ کر سنا رہا تھا، اس کے اوپر لگی دفعات کی تفصیل بتا رہا تھا، اور وہ کف اڑاتا غصے سے خود کو چھڑاتا مسلسل چلا رہا تھا۔ ہر زاویے سے لوگ دلچسپی سے ویڈیو بنا رہے تھے۔

پولیس والے اس کو لے کر جا رہے تھے اور سعدی یوسف آخر میں.... ان سب کے پیچھے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ مناظر کی عکس بندی جاری تھی.... آوازیں اور شور بڑھتا جا رہا تھا....

باہر اسے پولیس وین میں ڈالا جا رہا تھا۔ سعدی وین سے ذرا فاصلے پہ کھڑا تھا۔ ہاتھ کمر پہ باندھے وہ سوچتی نگاہوں سے وین کو دیکھ رہا تھا جب ایس پی بخت آور چشتی اس کے ساتھ آکھڑا ہوا۔

"آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے اس موقع پہ آنے دیا۔" وہ نرمی سے سر کو خم دے کر بولا۔

"سعدی خان، میں ان لوگوں سے نہیں ڈرتا۔ ہم اپنے علاقے کے پیر ہیں، گدی نشین ہیں۔ ہمارے ساتھ بہت سے لوگ ہیں۔ صبح عدالت میں پیشی سے پہلے تک نوشیرواں کاردار کا بھائی کیا، اس کا باپ بھی قبر سے اٹھ کر آجائے تو اس کو نہیں چھڑا سکتا۔" پھر اس نے سعدی کے کندھے پہ تھپکی دی۔ "تمہیں انصاف

ضرور ملے گا۔ ہر پولیس والا ان کی طرح نہیں ہوتا جن
سے تمہارا پہلے پالا پڑا ہے۔ تم بے فکر رہو۔ پولیس
اس آدمی کو آج لاک اپ سے نکلنے نہیں دے گی۔"
وہ اسے تسلی دے رہا تھا اور سعدی اس پہ یقین کرنا
چاہتا تھا۔
مگر جانے کیوں اب کسی پہ یقین نہیں آتا تھا۔

☆ ☆ ☆

جب ڈوبنا ہی ٹھہرا تو پھر ساحلوں پہ کیوں
اس کے لیے تو بیچ بھنور جانا چاہیے

"میرا نام ہے سعدی یوسف۔" نے وہ تہلکہ نہیں
مچایا تھا جو نوشیرواں کاردار کی گرفتاری کی ویڈیو نے مچا
دیا۔ چند منٹوں میں وہ ویڈیو نیوز چینلز پہ نشر ہونے
لگی۔ مختلف زاویوں سے لیے گئے واضح شاٹس جیسے
جیسے اسکرین پہ چلتے گئے' کاردار اینڈ سنز کے شیئرز کی
مارکیٹ ویلیو گرنے لگی۔ ہاشم کاردار کی پچھتر سے زائد
ملکی کمپنیز سے ایک دم سرمایہ نکالا جانے لگا' اور پہلی دفعہ
ہاشم کو احساس ہوا کہ پانی سر سے اوپر ہو رہا ہے۔
وہ ہارون عبید کے ساتھ...... وکلاء کا ایک وفد لیے....
اس وقت تھانے میں موجود تھا..... اور نخوت اور غرور
سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر بیٹھا' تلخی سے ایس پی بخت
آور سے مخاطب تھا۔ بحث' دھمکیاں' باتیں' سب
گرما گرم ماحول میں بلند آواز میں ہو رہی تھیں۔
سامنے والا بھی اپنے علاقے کا پیر تھا۔ اونچی گدی کا
عادی تھا۔ گردن اس کی بھی نہیں جھکتی تھی' صرف
نفی میں ہلتی تھی۔
"اوپر سے دباؤ ہے کاردار صاحب۔ اب میں اس کو
نہیں چھوڑ سکتا۔ صبح فیصلہ عدالت میں ہو گا۔"
"ساری زندگی دیکھی ہیں میں نے عدالتیں۔
دلچسپ بات یہ ہے کہ ویڈیو میں تو اس لڑکے نے ہم
دونوں کا نام بھی لیا تھا' پھر حتمی ایف آئی آر میں صرف
میرے بھائی کو نامزد کیوں کیا؟" ان کی بحث جاری
تھی۔ ایف آئی آر کے مطابق صرف نوشیرواں کاردار
ذمہ دار تھا سعدی کے اوپر کیے گئے تمام مظالم کا۔

باہر سرد راہداری میں وہ دونوں کھڑے تھے۔ زمر اور
سعدی۔ دونوں خاموشی سے گہری ہوتی رات کو دیکھ
رہے تھے۔
"ہم ہاشم اور ہارون عبید کو کیوں نامزد نہیں کر رہے؟"
یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔
"ہاتھ والا پرندہ جھاڑی والے دو پرندوں سے بہتر
ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ تینوں کمزور کیس کی وجہ
سے بری ہو جائیں ہم صرف نوشیرواں پہ فوکس کرتے
ہیں۔ اس کے خلاف مضبوط کیس بناتے ہیں۔ اس کو
سزا ملی تو ہاشم جیتے جی مر جائے گا۔"
"لیکن وہ پھر بھی آزاد گھومے گا۔" سعدی نے تلخی
سے سر جھٹکا۔ اسی پل سامنے سے دو سپاہی نوشیرواں کو
ہتھکڑی لگائے چلے آرہے تھے۔ اس کے چہرے پہ بے
چینی تھی اور آنکھوں میں غصہ۔ سر جھٹک منہ میں کچھ
بڑبڑاتے ہوئے وہ چلتا جا رہا تھا' دفعتاً" ان دونوں کو
ستون کے ساتھ کھڑے دیکھ کر رکا۔
"میں سمجھا تھا مسز زمر کہ آپ مختلف ہوں گی۔ مگر
آپ سب ایک جیسے ہیں۔"
"تم اپنے وکیل کی غیر موجودگی میں ہم سے بات
نہیں کر سکتے۔" زمر نے سعدی کے سامنے بازو پھیلا کر
گویا دونوں کے درمیان آڑ سی بنائی۔
"تم نے مجھ پہ گولیاں چلائی تھیں۔" سعدی بھی
بپھر کر غرایا۔
"تم نے مجھے گالی دی تھی۔"
"تو گالی سے جواب دیتے نا۔ گولی سے کیوں دیا؟" وہ
اونچی آواز میں بولا تھا۔
"نوشیرواں! تم اپنے وکیل کی غیر موجودگی میں ہم
سے بات نہیں کر سکتے۔ اسے لے جائیں۔" وہ تحمل
سے سعدی کے سامنے آکھڑی ہوئی اور سپاہیوں کو ہاتھ
کے اشارے سے جانے کا کہا۔ وہ نوشیرواں کو ساتھ
لے جانے لگے مگر وہ مڑ مڑ کر سرخ چہرے سے اسے
دیکھتا' مغلظات بکے جا رہا تھا۔
"میں تم سب کو دیکھ لوں گا۔ عدالت میں تمہارے
سب گھر والوں کو گھسیٹوں گا۔ تمہاری بہن کو گھسیٹوں

گا۔" سعدی کی مٹھی بھنچی۔ اس نے دانت پیسے۔ تنفس تیز ہوا مگر زمر نے نرمی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"اس کی باتیں مت سنو۔ نظر انداز کرو۔"

"آپ نے سنا نہیں' وہ کیا بکواس کر رہا تھا۔" اس کی رنگت متغیر ہو رہی تھی۔ چہرے پہ بے بسی در آئی تھی۔

"جب عدالتوں میں معاملے چلے جاتے ہیں ناسعدی' تو پھر یہ تو ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ برا ہوگا۔ کیا تم واپس مڑنا چاہتے ہو؟"

"کبھی نہیں۔" اس نے پورے عزم سے نفی میں سرہلایا۔

"گڈ! میں تمہارے ساتھ ہوں۔" اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔ سعدی گہرے گہرے سانس لیتا خود کو پرسکون کرنے لگا۔

دور راہداری کے سرے پہ ایس ایچ او کے کمرے کے دروازے سے ہارون عبید نکلتے دکھائی دیے۔ وہ وہیں رک کر زمر کو دیکھنے لگے۔ زمر نے جواباً سعدی کو دیکھا۔

"تم گاڑی میں بیٹھو' میں آتی ہوں۔ جاؤ نا۔" وہ اپنے ذہنی خلفشار سے نہیں نکل پایا تھا' سو مضطرب الجھا الجھا سا آگے بڑھ گیا۔ تب ہارون قدم قدم چلتے' ستون کے قریب آٹھہرے۔ کلف لگی شلوار قمیص میں ملبوس' وہ چہرے پہ سوچ کی لکیروں کے باعث غیر مطمئن لگتے تھے۔

"مسز زمر۔۔۔ میں نے آپ سے کہا تھا ہم دوبارہ ملیں گے!" زمر نے بازو سینے پہ لپیٹ لیے اور تحمل سے ان کو سننے لگی۔ "آپ مجھے تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔ یہ مسئلے بہت تھکا دینے والے ہوتے ہیں۔"

"بلاشبہ ایسا ہی ہے لیکن میں آٹھ دس سال سے روز ایسے مسئلے نپٹاتی آئی ہوں' سو آپ میرے لیے فکر مند نہ ہوں۔" وہ پرسکون سی بولی تھی۔

"مسز زمر!" انہوں نے اب کے ترحم سے اسے دیکھا۔ "مجھے آپ سے ہمدردی ہے' اور میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میری مدد کے بغیر یہ کیس کبھی عدالت میں نہیں چل سکتا۔ آپ جج کو خرید بھی لیں تب بھی ہاشم۔۔۔" وہ مزید قریب ہوئے' آواز اب سرگوشی میں بدل گئی تھی اور نظریں زمر پر جمی تھیں۔

"کبھی تاریخیں نہیں لینے دے گا آپ کو۔ تاریخ پہ تاریخ دیتا جائے گا۔ لٹکاتا جائے گا۔ بارہ تیرہ سال تک کیس چلے گا۔ ہر سال میں دو پیشیاں ہوں گی۔ گواہ مرکھپ جائیں گے۔ سرکاری ریکارڈ کھو جائے گا۔ اخبارات و میڈیا اس قصے کو بھول چکا ہوگا۔ تیرہ سال آپ تو لڑیں گی' اور آپ لڑ سکتی ہیں لیکن آپ کا یہ پیارا سا معصوم سا بچہ نہیں لڑ سکے گا۔ آپ کو ابھی اندازہ نہیں ہوا مگر وہ ذہنی طور پر نارمل نہیں رہا۔ وہ یا تو تنگ آکر خودکشی کرلے گا یا کسی دن جا کر ہاشم کو گولی مار دے گا۔ وہ۔۔۔ اتنا لمبا۔۔۔ انتظار۔۔۔ نہیں کرے گا مسز زمر!"

زمر کی آنکھوں میں کرچیاں ابھریں' مگر گردن مزید اکڑ گئی۔ "یہ۔۔۔ آپ کا مسئلہ۔۔۔ نہیں ہے۔" ان ہی کے انداز میں بولی۔

"مگر آپ کا تو ہے نا۔ اور وہ کیا ہے کہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔" وہ نرمی سے ذرا جھک کر بولے تھے "تیرہ سال۔۔۔ چلیں دس سال بعد آپ کے ہاتھ میں کیا ہوگا؟ اولاد تو آپ کی ہو نہیں سکتی' میں واقف ہوں (زمر کی آنکھوں میں سرخی ابھری) لیکن جو بچے آپ کے لیے اولاد کی طرح ہیں' وہ رل جائیں گے۔ وہ کبھی دوبارہ زندگی شروع نہیں کرسکیں گے۔"

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ میں ہاشم کو راضی کرلوں' اور وہ کیس لڑنے کے لیے تیار ہو جائے۔ بار ایسوسی ایشن کے صدر کو پولیس گولیاں مارتی ہے تو سارے وکیل اکٹھے ہو جاتے ہیں' پولیس کے خلاف کیس لڑتے ہیں' اور چھ سات ماہ میں قاتلوں کو سزا دلواتے ہیں۔ چھ سات ماہ میں زمر صاحبہ فیصلہ آجاتا ہے وہ بھی پولیس کے خلاف اس ملک میں جہاں فیصلے آنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ مگر کیسے؟ کیونکہ وکیل چاہتے تھے کہ

فیصلہ آئے۔ اس ملک میں اگر وکیل نہ چاہے تو کوئی
فیصلہ نہیں آسکتا' چاہے اس کے حق میں ہو یا خلاف
ہو۔ ہاشم چاہے گا تو کیس چلے گا ورنہ نہیں چلے گا اور
ہاشم کو صرف میں راضی کرسکتا ہوں اور کوئی شخص یہ
کام نہیں کرسکتا۔ آپ کی وہ نئی رفیق صاحبزادی صاحبہ
بھی نہیں۔ اب آپ بتایئے کیا میں راضی کروں ہاشم
کو؟" اب کے وہ پرسکون لگتے تھے' ذرا مسکرا کر
ہمدردی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اور یقیناً" بدلے میں مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ بتایئے'
کیا کروں میں جس کے بدلے میں آپ یہ عنایت
کریں گے مجھ پر؟"

"آپ فارس کو چھوڑ دیں!"

آسمان سے کوئی تارہ زور سے ٹوٹ کر گرا تھا' گویا
کسی فرشتے نے کسی باتیں اچکنے والے شیطان کو دے
مارا ہو۔ تارہ تھا یا آگ کا گولہ۔ زمین پہ گر کر ہر شے کو
بھسم کر گیا تھا۔

"میں... فارس کو... چھوڑ دوں؟" وہ چند لمحے
سنجیدگی سے ان کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر ایک دم
ہنس دی۔ وہ بھی ہلکے سے ہنس دیے۔

"مگر میں سنجیدہ ہوں مسز زمر۔ فارس کو آپ کچھ
دے تو سکتی نہیں ہیں' ویسے بھی آپ گردے کی مریض
ہیں' آپ کی زندگی کم رہ گئی ہے' اللہ آپ کو زندگی
دے' میری تو یہ دعا ہے' مگر حقیقت پسندی کا مظاہرہ
کریں۔ آپ پہلے ہی جس شخص کی زندگی میں بوجھ بنی
ہوئی ہیں' اس سے نکل جائیں اور جس بچے سے آپ
کو محبت ہے' اس کو اس بوجھ سے آزاد کردیں۔"

"ہارون صاحب۔" اس نے مسکراہٹ دبائے
چمکتی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ "آپ اپنی بیٹی کے
لیے اتنی تگ و دو نہ کریں تو اچھا ہے۔ اس کی تو ہاشم
سے شادی ہو رہی ہے نا' نوشیرواں سے ذکر سنا تھا' سو
میرا خیال ہے اس کے مسئلے سنبھالنے کے لیے ہاشم
کا کردار کافی ہے' اور رہی میں تو..." بائیں کندھے سے
لٹکتے پرس کو اتار کر دائیں پہ منتقل کرتے وہ مسکرا کر
بولی۔ "جو میرا ہے... وہ میرا رہے گا!" ایک آخری
چمکتی نظر ان پہ ڈال کر وہ مڑ گئی۔

ہارون نرم مسکراہٹ کے ساتھ اسے جاتے دیکھتے
رہے۔

چند لمحوں بعد سڑک پہ گاڑی دوڑ رہی تھی۔
ڈرائیونگ کرتا سعدی کچھ کہہ رہا تھا۔ اور وہ کھڑکی کے
باہر بھاگتے' پولز اور بتیاں دیکھ رہی تھی۔ اس کی
آنکھوں کی جوت بجھ چکی تھی اور گود میں رکھے پرس
میں گھسا ہاتھ مسلسل اندر موجود ڈبی کھول بند کر رہا تھا۔
ٹک... ٹک... ننھے تارے جیسی ہیرے والی
لونگ کی ڈبی کا ڈھکنا بار بار گرنے اور اٹھنے کے باعث
مدھم سی آواز نکالتا تھا۔

ٹک... ٹک... ٹک...

ہاشم رات کے ڈیڑھ بجے تھانے سے گھر چلا آیا۔
پولیس اتنے دباؤ اور جنگل کی آگ کی سی پھیلتی خبر کے
بعد کسی صورت نوشیرواں کو رہا نہیں کرسکتی تھی۔ اب
مزید کوشش کرنا خود کو ایک جابر اور قانون شکن با اثر
آدمی ظاہر کرتا تھا اور فلانتھراپسٹ ہاشم کاردار کے
سفید کالر کو یہ گوارا نہ تھا۔

"ایک لڑکا جس کو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کی
طرح ٹریٹ کیا۔" باہر میڈیا کے نمائندوں کے
مائیکس کے سامنے چہرہ کیے' کار کا دروازہ کھولے کھڑا
وہ کہہ رہا تھا۔ "جس کی بازیابی کے لیے سب سے زیادہ
کوششیں میں نے کیں' وہ ذرا سے جائیداد کے
تنازعے کے باعث میرے بھائی کو اپنے کیس میں
دھکیل رہا ہے' مجھے سوچ کر بھی شرم آتی ہے۔ یو نو
واٹ' میں نے اپنی ساری زندگی قانون کی بالادستی کی نذر
کی ہے' میں اس موقعے پہ اپنے عہدے اور طاقت کا
ناجائز استعمال کرکے اپنے بھائی کو بغیر عدالت میں پیشی
کے نہیں چھڑواؤں گا۔ اگر اس کا نام ایف آئی آر میں
ہے تو پھر وہ اورنگ زیب کاردار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو' اس
کو قانون کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ ہم ان لوگوں
میں سے نہیں ہیں جو دولت یا طاقت کی فراوانی کے
باعث خود کو فرعون سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم
پیسے والے ہیں' ہمارے اوپر انگلی اٹھانا بہت آسان

ہے۔ پونو وانٹ اب مزید میں ان لوگوں کو "غریب کارڈ" نہیں کھیلنے دوں گا۔ صبح ہم عدالت جارہے ہیں اور اپنے بھائی کو وہیں سے چھڑوا کر لائیں گے۔ ہمیں انصاف چاہیے۔ انصاف صرف غریب کے بچے کو نہیں چاہیے ہوتا، ہمیں بھی... چاہیے۔"

اور ہاتھ ہلا کر "بس" کا اشارہ کرتا ہوا کار میں بیٹھ گیا۔ مائیکس اس کے تعاقب میں جھکے مگر گارڈ کار کا دروازہ بند کر چکا تھا۔ ٹائرز حرکت میں آئے اور کار زن سے آگے بڑھ گئی۔

مور چال کے لاؤنج میں وہ سب بیٹھے ٹی وی اسکرین پہ چلتا نوشیرواں کا کلپ دیکھ رہے تھے (حنین وہاں نہیں تھی) سعدی خاموش تھا اور زمر ابا کو بتا رہی تھی کہ کس طرح نوشیرواں اس وقت لاک اپ میں بیٹھا ہے۔

"ہفتے دس دن میں وہ رہا ہو جائے گا' دو دن بعد وہ ملک سے باہر ہو گا' اور اگلے پندرہ سال وہ واپس نہیں آئے گا اور تم دونوں پیچھے پیشیاں بھگتانا۔" فارس نے اپنا کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے نہایت پرسکون انداز میں اطلاع دی۔ "ویلکم ٹو پاکستان!" زمر اور سعدی پہ ایک "اچھا سوری" والی نظر ڈال کر کندھے اچکاتا مگر ہونٹوں سے لگاتا' وہ آگے بڑھ گیا تو زمر پہلو بدل کر رہ گئی۔

"نہیں نکلے گا وہ باہر!" سعدی اس کے جانے کے چند منٹ بعد ایک دم سے بولا تھا اور پھر اسی طرح اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے تاثرات عجیب سے ہو رہے تھے۔ زمر بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔ پھر بے اختیار سر جھٹکا جیسے کسی کی آواز کو۔ صور جیسی آواز کو ذہن سے جھٹکا ہو۔ (آپ اسے اس بوجھ سے آزاد کر دیں)۔

وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ سعدی ہے۔ وہ چند دن میں ٹھیک ہو جائے گا اور ہمیں انصاف ضرور ملے گا۔ وہ خود کو تسلی دینے لگی۔ دل سیاہ آسمان میں بار بار ڈوب کر ابھرتا تھا۔

☼ ☼ ☼

سارا جوار بھاٹا میرے دل میں ہے مگر

الزام یہ بھی چاند کے سر جانا چاہیے

سعدی نے اوپری منزل پہ بنے اس بیڈ روم کا دروازہ کھولا (جو امی نے اس کے لیے تیار کیا تھا) تو اندر اندھیرا تھا۔ موبائل جیب سے نکالتے ہوئے اس نے سر جھکائے سوئچ بورڈ پہ انگلی رکھی تو کمرہ روشن ہو گیا۔ کسی احساس کے تحت اس نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔

اس کے بیڈ کے کونے پہ حنین بیٹھی تھی۔ الجھے سے بال ڈھیلی چوٹی میں بندھے تھے۔ گود میں کاغذوں کا ایک پلندہ رکھا تھا اور زخمی نگاہیں سعدی پر جمی تھیں۔

"فارس ماموں نے مجھ سے پوچھا کہ... میں ہاشم سے کیا بات کرتی تھی۔"

"حنین میں یہ بات اب ڈسکس نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کچھ عرصے بعد میں اسے بھلا کر تمہیں معاف کر دوں گا اور..." بے زاری سے سر جھٹکتے وہ آگے آیا تو وہ کھڑی ہوئی۔ اٹھی گردن اور پورے قدم کے ساتھ۔

"معافی مانگی کس نے ہے آپ سے ہاں؟" کہنے کے ساتھ اس نے کاغذ سعدی کے قدموں میں پھینکے۔ کچھ نیچے گرے۔ کچھ اڑ کر بکھر گئے۔

"سعدی یوسف خان!" اس نے صدمے اور غصے سے بھری آنکھوں سے اسے دیکھ کر اونچی آواز میں دہرایا۔ "سعدی۔ یوسف۔ خان۔ یہ تھے وہ الفاظ جو ان انیس سو بہتر میسجز میں پانچ سو چھپن دفعہ استعمال ہوئے ہیں' یہ میرے ان تمام میسجز کا ریکارڈ ہے جو ان کو بھیجے تھے میں نے۔ بیک اپ سے نکالے ہیں میں نے اور آپ کو دکھانے لائی ہوں۔ دیکھیں اسے۔ پڑھیں اسے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ آپ کو کیا بتا رہا ہے' مگر میں اس سے آپ کی بات کرتی تھی۔ آپ کی' سعدی بھائی' آپ کی بات کرتی تھی میں۔" بولتے بولتے جذبات سے آواز بوجھل ہوئی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ بالکل خالی نظروں سے اسے دیکھے گیا۔

"آپ کا' آپ کا قصور ہے۔" آنسو اب خشک تھے اور وہ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتی غرائی تھی۔

"آپ تھے جو مجھے ان کے گھر لے گئے تھے اس رات جب نوشیرواں نے اغوا کا ڈراما کیا تھا۔ آپ تھے جو ہاشم کا لاکر کھولنے میں اور اس کا راز جاننے میں اتنے مصروف ہو گئے تھے کہ آپ کو خیال بھی نہیں گزرا کہ آپ کی بہن دوسرے کمرے میں ہاشم کے ساتھ ہے۔ آپ تھے جنہوں نے اس شخص کی اصلیت ڈیڑھ سال ہم سے چھپائی۔ ہمیں دوبارہ ان کے گھر پارٹی پہ لے کر گئے۔ پھر بعد میں آپ — کہتے ہیں کہ اس کو کیوں بلایا کالج؟ ہاں بلایا تھا میں نے ان کو کالج۔ کیونکہ سعدی بھائی.... وہ قاتل ہے' کریٹ ہے' جھوٹا' مکار ہے' مگر وہ جج مینٹل نہیں ہے۔ وہ گلٹی ہے تو دوسرے گلٹی لوگوں کو ایسے جج نہیں کرتا جیسے آپ نیک لوگ ہم گناہ گاروں کو جج کرتے ہیں۔ کیوں بلایا میں نے اسے کالج؟ اس لیے کہ مجھے اس سے امید تھی کہ وہ مجھے برا نہیں سمجھے گا۔ آپ سے یہ امید نہیں تھی مجھے۔ کیوں بات کرتی تھی میں اس سے؟ کیونکہ مجھے کسی نے.... آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ وہ اندر سے کیسا ہے۔ مجھے کیا پتا تھا وہ کیسا ہے؟ صرف یہ کہہ دینا کہ "اس کو کبھی نہیں بلانا آئندہ" کافی نہیں ہوتا۔ مجھے وجہ نہیں جتائی' مجھے اس کی اصلیت نہیں دکھائی.... پھر مجھ پہ الزام کیوں ڈالتے ہیں؟"

وہ شل کھڑا سن رہا تھا اور وہ آخر میں ٹھہر کے۔ اس کی آنکھوں پہ نظریں جمائے چبا چبا کر بولی۔

"میرے دل کا خون کرنے والے ہاتھ میرے نہیں تھے۔ آپ کے تھے!" پیر کی ٹھوکر سے ان کاغذوں کو مزید بکھیر دیا۔ "آپ کا فرض تھا مجھے بتانا' مجھے اس کی اصلیت دکھانا۔ میں انیس سو دس کی لڑکی نہیں ہوں جس کو دھونس زبردستی سے' ڈانٹ ڈپٹ کر آپ کچھ بھی کرنے پہ مجبور کر سکتے ہیں۔ میں اکیسویں صدی کی لڑکی ہوں۔ میرے پاس میرا ذہن ہے اور ذہانت ہے۔ میرے دور کی لڑکیوں کے بھائیوں کو یہ بھول جانا چاہیے کہ وہ غصہ کر کے' حکم دے کر یا پابندیاں لگا کر اپنی بچیوں کو کسی سے موبائل پہ بات کرنے سے روک سکتے ہیں۔ جب تک وہ برابری کے لیول پر آ کر' اپنی بہن کے ساتھ بیٹھ کر اس کو دلائل سے نہیں سمجھائیں گے' وہ ان کی بات نہیں مانے گی۔ باہر کے لوگ ہمارا دل ایسے نہیں توڑتے بھائی جیسے ہمارے اپنے مرد ہمیں توڑ جاتے ہیں۔"

آخری الفاظ پہ اس نے ہچکی لی اور پھر اس کے برابر سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ جا چکی تھی اور سعدی تنہا خاموش کھڑا تھا۔ پھر دفعتاً" وہ جھکا اور ایک ایک کاغذ اٹھانے لگا۔ سب کو اکٹھا کیا' برابر کیا اور پھر اسٹڈی ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا۔ بغیر پڑھے۔ بغیر دیکھے۔ اس کا چہرہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ سنجیدہ اور خاموش۔

☆ ☆ ☆

جلتی ہیں روز جس کے اشارے پہ بستیاں
اس آنکھ تک دھوئیں کا اثر جانا چاہیے

اگلی صبح دھند میں واضح کمی محسوس ہوتی تھی۔ سورج نکھرا نکھرا سا نکلا کھڑا تھا اور ہارون عبید کی رہائش گاہ کے سارے شیشے دھوپ سے چمک رہے تھے۔ لاؤنج میں ہارون شلوار سوٹ اور کوٹ میں ملبوس' صوفے پہ براجمان سوچتی نگاہوں سے ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہے تھے جہاں نوشیرواں کی گرفتاری کی کلپنگ بار بار دکھائی جا رہی تھی۔

"معروف آئی پی پی کا بیٹا نوشیرواں کاردار جس کو کل شام وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کے بعد اسلام آباد کے ایک ریسٹ ہاؤس سے گرفتار کیا گیا تھا' اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے اور آج اس کو عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ جہاں پولیس اس کے جسمانی ریمانڈ کے لیے درخواست دے گی اور قوی امکان ہے کہ ابھی چند دن تک نوشیرواں کاردار اپنے گھر نہیں جا سکیں گے۔"

ہارون نے ریموٹ اٹھا کر بٹن دبایا۔ اسکرین بجھ گئی۔ وہ کچھ دیر بیٹھے رہے۔ خاموش لاؤنج میں خاموشی کی چاپ سنتے رہے۔ پھر اٹھے اور پیچھے قمیص جھٹک کر برابر کرتے آگے بڑھ گئے۔

اوپر آکروہ آپی کے کمرے کے سامنے رکے۔ دروازہ کھٹکھٹایا' پھر دھکیلا۔

"آب دار۔ بچے تم نیچے کیوں بیٹھی ہو؟" وہ بیڈ کی پائنتی کے قریب زمین پہ اکڑوں بیٹھی تھی۔ سرخ بال بکھر کر کمر پہ گر رہے تھے اور آنکھیں گیلی تھیں۔ وہ ترحم سے اسے دیکھتے آگے آئے اور بیڈ کے کنارے آ بیٹھے۔ "آپی۔" انہوں نے دوبارہ پکارا۔

"اسے لگتا ہے میں ڈراما کرتی ہوں۔ اسے لگتا ہے میں اس کی نیک نامی کے لیے خطرہ ہوں۔" اس نے گیلی آنکھیں اٹھا کر گلہ آمیز نظروں سے باپ کو دیکھا۔ "بابا... مجھے ہر چیز سے وحشت ہونے لگی ہے۔ ہر شخص سے۔"

"آب دار... اتنا نہیں سوار کرتے کسی کو حواسوں پر کہ..."

"یہ اپنے اختیار میں نہیں ہوتا بابا..." اس نے شکستگی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔ "میں بہت بری طرح ٹوٹ گئی ہوں۔ میں سارا دن اس کی کال کا انتظار کرتی ہوں۔ میں نے اس کے نمبر کی رنگ ٹون بھی بدل دی ہے کہ اسکرین دیکھنے سے پہلے مجھے اس کی کال کی خبر مل جائے۔ میں ہر چند منٹ بعد واٹس ایپ پہ اس کا لاسٹ سین دیکھتی ہوں۔ اگر وہ آن لائن ہو تو لگتا ہے وہ میری دسترس میں ہے۔ جیسے کوئی ڈوری سی ہو میرے اور اس کے درمیان' مگر میں اسے میسج نہیں کر سکتی بابا۔ کیونکہ پھر وہ مجھے بلاک کر دے گا۔ میرا دل بہت ٹوٹا ہوا ہے بابا۔" اس نے اپنا سر ان کے گھٹنے پہ رکھ دیا اور رونے لگی۔ اس کی رنگت زرد تھی اور حلیہ بے ترتیب۔

"آپی... تم کیا چاہتی ہو؟" انہوں نے اس کا سر تھپکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آپ نے مجھے کبھی کچھ نہیں دیا۔ میری ماں کو بھی مجھ سے چھین لیا۔ مجھے وقت بھی نہیں دیتے۔ میری سالگرہ بھی یاد نہیں رکھتے۔ آپ مجھے "وہ" بھی نہیں دے سکتے۔" نفی میں سر ہلاتی وہ سیدھی ہوئی اور بند مٹھیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

"سوائے ہاشم کاردار کے' تم دنیا میں جس کو بھی میرے سامنے لے آؤ گی' میں اسے قبول کر لوں گا۔"

"مجھے ہاشم سے کوئی سروکار نہیں ہے بابا۔" وہ غصے سے سر جھٹک کر بولی تھی۔ "مجھے جو چاہیے وہ غیر دستیاب ہے۔ وہ شادی شدہ ہے۔ اور آپ... آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے میرے لیے۔ میں بابا اب ساری زندگی تکلیف میں رہوں گی۔"

اس کی سبز سرمئی آنکھوں کے کٹورے پھر سے بھرنے لگے۔ ہارون کچھ دیر غور سے اسے دیکھتے رہے۔

"وہ تمہیں مل جائے گا' میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ اب اٹھو بچے۔ کھانا کھاؤ' اور کپڑے بدلو' پھر اپنے کلائنٹ جاؤ' خود کو کام میں مصروف کرو۔"

مگر وہ ان کے پہلے الفاظ پہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔ "آپ... وعدہ کرتے ہیں؟" مایوسی کے آسمان پہ امید کا تارہ سا چمکا تھا۔

"ہاں میں وعدہ کرتا ہوں۔" انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر یقین دلایا تھا۔ آبدار کی آنکھوں سے آنسو غائب ہونے لگے' اور ان کی جگہ الجھن نے لے لی۔

"مگر... کیسے؟"

"تم مجھے بتاؤ... کیسے؟ وہ کیسے آئے گا تمہاری زندگی میں؟"

"وہ جب تک اس کی زندگی میں رہے گی' وہ مجھے نہیں ملے گا بابا۔" تارہ ڈوبنے لگا۔

"وہ اس کی زندگی سے چلی جائے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں وہ چلی جائے گی۔"

آب دار کی ان پہ جمی آنکھوں میں کچھ چمکا تھا۔ "کیسے؟ آپ کو کیسے پتا؟"

"میں نے رات اس کو دیکھا تھا۔ زمر کو۔ میں نے اس سے بات کی تھی۔ سعدی یوسف کے کیس سے متعلق۔ چہرے پڑھنے آتے ہیں مجھے۔ وہ اسے چھوڑ دے گی' بہت جلد۔"

"آپ نے اسے کچھ کہا تو نہیں؟ بابا پلیز آپ ان کو کوئی دھمکی وغیرہ نہیں دیں گے۔ وہ اچھے لوگ ہیں۔"

میں......"

"نہیں' میں کیوں کچھ کہوں گا؟ مگر میں تمہیں بتا رہا ہوں' وہ اس کو چھوڑ دے گی۔"

"کیا اس نے خود ایسا کہا؟" آبی کا دل اٹک گیا تھا۔

"نہیں' اسے ابھی خود بھی معلوم نہیں' مگر میں تمہیں بتا رہا ہوں بیٹے' میں لوگوں کو اخبار کی طرح پڑھتا ہوں' ساری زندگی پڑھتا آیا ہوں۔ وہ...... اسے...... چھوڑ دے گی۔" پھر اس کا سر تھپکتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اب فریش ہو جاؤ' میں ڈائننگ ٹیبل پہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ کھانا اکٹھے کھاتے ہیں۔"

آب دار کے لبوں پہ نرم مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ سر ہلاتے ہوئے اٹھنے لگی۔ قدموں میں بالکل جان نہیں تھی۔ جانے کب سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ہارون اب اسے سہارا دے کر کھڑا کر رہے تھے۔ چند دن میں ہی وہ اتنی کمزور نظر آنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

وحشتیں بڑھتی گئیں ہجر کے آزار کے ساتھ
اب تو ہم بات بھی کرتے نہیں غم خوار کے ساتھ

دانتے کی جہنم جیسا احاطہ عدالت آج بھی لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ نوشیرواں کاردار کو سپاہی ہتھکڑیوں میں مقید کیے اپنے ساتھ چلا کے لا رہے تھے۔ وہ اسی ویسٹ میں ملبوس تھا جس میں ساری رات لاک اپ میں بیٹھے کاٹی تھی۔ سردی کے باوجود آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ چہرے پہ سنجیدہ تاثر تھا اور آنکھیں شب بیداری کے باعث گلابی پڑ رہی تھیں۔ سامنے سے انسان چلے آ رہے تھے۔ بے نیاز' تیز تیز چلتے ہوئے۔ عجیب خوف ناک لوگ۔ اور پھر ان کا شور ہی شور۔ وہ سامنے دیکھ کر نہیں چل رہا تھا' نظریں جھکی تھیں۔ اسے راہداری میں چلتے اپنے قدم نظر آ رہے تھے۔ ساتھ میں ہاشم کے چمکتے بوٹ بھی۔ سپاہیوں کے رگڑ رگڑ کر پالش کیے جوتے بھی۔ آوازیں تبھی سنائی دیتی تھیں۔ وکلا کی فوج ان کے ہمراہ تھی۔ سامنے کھڑے صحافی اور کیمرہ مین سوالوں کی بوچھاڑ کرتے اکٹھے

"ہاتھ اٹھا کر وکٹری کا نشان بناؤ اور مسکرا کر یہاں سے گزرو۔" ہاشم نے قریب میں سرگوشی کی۔ اس نے ایک نظر اٹھائی اور جبراً" مسکراہٹ لاتے ہوئے وکٹری کی دو انگلیاں اوپر اٹھائیں۔ ایک رات لاک اپ میں کاٹنے کے بعد اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس برزخ سے اسے ہاشم کے علاوہ کوئی نہیں نکال سکتا' اس لیے وہ اس کا ہر حکم ماننے کا پابند تھا۔

صحافیوں کا ہجوم ایک جگہ آ کر رکتا تھا' رک گیا۔ وہ لوگ آگے بڑھتے گئے۔ شیرو نے وکٹری کی انگلیاں گرا دیں۔

"یہ ہمارے انویسٹرز کے لیے تھا' ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم پر اعتماد ہیں۔" ہاشم اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ سن نہیں رہا تھا۔ نظریں پھر سے جھکا دی تھیں۔

"زیادہ سے زیادہ سات دن تک رہنا پڑے گا تمہیں لاک اپ میں' پھر جیل بھیج دیں گے۔ اس کے بعد میں ضمانت کروا لوں گا' مگر ان سات یا دس دن میں تمہارا اندر رہنا بہتر ہے۔ آپٹکس کے لیے یہ اچھا ہے۔ کوئی بھی خبر میڈیا پہ اس سے زیادہ نہیں شور مچاتی۔ خبر دب جائے گی۔ لوگ تھک کر چپ ہو جائیں گے۔ ان سات دنوں میں ہم تین پارٹیز دیں گے' مختلف جگہ چیریٹی گیدرنگز میں جا کر پیسہ لٹائیں گے۔ یو نو۔ آپٹکس کے لیے۔ چند ایک فوٹو آپس کے بعد ہمارا امیج اور ہماری خیرات اس ساری گند کو دبا دے گی۔ صرف سات دن شیرو......"

الفاظ مدھم ہو رہے تھے...... کٹے کٹے سنائی دے رہے تھے۔ وہ بالکل سر جھکائے چلتا رہا۔ وہ ہاشم کو نہیں بتا سکتا تھا کہ لاک اپ کی ایک رات نے اسے ذہنی طور پہ کتنا پیچھے دھکیل دیا ہے۔ وہ رات کتنی ڈراؤنی تھی۔ کتنی خوف ناک تھی۔ ہر جگہ زیر تعمیر گھر میں بہتا خون کا تالاب نظر آتا تھا۔ اور...... وہ چہرہ...... وہ نیچے گرے' بوٹ کی ٹھوکروں سے زخمی لڑکے کا لہولہان چہرہ کے ساتھ کہنا...... "اللہ حساب لے گا......"

نوشیرواں نے چہرہ اٹھایا۔ فضا میں مانوس سی خوشبو

تھی۔ کافور کی سی۔ باسی گلاب کی خون آلود پتیوں کی سی مہک۔ اس نے سر اٹھایا۔

سامنے ایک دروازے کے ساتھ وہ دونوں کھڑے تھے۔ زمر اور سعدی۔ وہ دونوں چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کی نظریں سعدی سے ملیں۔ ان میں نفرت تھی۔ تپش تھی۔ اور ایسے زخم تھے جن کو مندمل ہونے میں صدیاں بیت جاتی ہیں۔

"میں دیکھ لوں گا تم سب کو۔" ہاشم نے انگلی اٹھا کر تنفر سے کہا تھا۔ سعدی اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ "تم لوگوں کو بیس سال عدالت میں نہ لٹکایا تو دیکھنا۔" اور شیرو کا منظر بدلتا گیا۔ راہداری آگے بڑھتی گئی۔ وہ دونوں خاموش کھڑے مجسمے پیچھے رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

ایسا ہے کہ سینے میں سلگتی ہیں خراشیں
اب سانس بھی ہم لیں گے تو اچھا نہ کریں گے

سردی کا زور ہر گزرتے دن کے ساتھ کم ہوتا جا رہا تھا۔ جیل کے احاطے پہ گرتی سنہری روشنی سلاخوں سے لپٹ لپٹ کر ان کو چمکا رہی تھی۔ چند اہلکاروں اور سادہ لباس میں موجود افسران کی معیت میں نوشیرواں کاردار چلتا ہوا صحن میں آگے بڑھ رہا تھا۔ جیل کا اے بلاک اصولاً صرف اے کلاس قیدیوں کے لیے ہونا چاہیے تھا مگر یہاں ہر طرح کے قیدی تھے اور وہ اتنے پڑھے لکھے اور خاندانی نہیں لگتے تھے۔ برآمدوں میں کھڑے قطار در قطار سفید پیلے لباس والے قیدی سرگوشیاں کرتے اس نوجوان کو اندر آتے دیکھ رہے تھے۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ ان کو نہ دیکھے مگر پیشانی پسینے میں تر تھی اور دل کی دھڑکن تیز تھی۔ اسے شدید گرمی لگ رہی تھی مگر وہ اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔

راہداری میں سے گزرتے اس نے سلاخوں والے دروازوں کے ساتھ ٹولیوں میں کھڑے لوگوں کو چبھتی آنکھوں سے خود کو دیکھتے پایا۔ اور جانے کہاں سے وہ آواز کان میں پڑی۔

"اس نے فارس غازی کے بھانجے پہ گولی چلائی تھی۔"

نوشیرواں کے حلق میں کچھ اٹکا۔ قدم لڑکھڑائے مگر وہ چلتا رہا۔

"اس نے غازی کے بھائی اور بیوی کو مارا تھا۔"

وہ کہہ نہیں سکا کہ ایسا نہیں تھا۔ مگر اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

مختلف راہداریوں اور برآمدوں سے گزرتے ہوئے اس نے لوگوں کی بہت سی باتیں سنیں۔ وہ اس پہ ہنس رہے تھے' غصہ کر رہے تھے' اسے غازی کا مجرم گردان رہے تھے۔ وہ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ ماں کی۔ بہن کی۔ بیٹی کی۔ وہ اس کا تمسخر اڑا رہے تھے۔

اس کی ہیرک آگئی تھی۔

وہ صاف ستھرا کشادہ سا کمرہ تھا۔ بیڈ' صوفے' روم ریفریجریٹر' اے سی' اٹیچ باتھ' ایل سی ڈی ٹی وی' ڈی

وی ڈی پلیئر، سب میسر تھا وہاں۔ اہلکار اس کو بستر پہ آرام کرنے کا کہہ کر اپنے مکمل تعاون کی یقین دہانی کروا رہا تھا۔ نوشیرواں سرخ پڑتی آنکھوں سے اسے دیکھتا بیڈ پہ بیٹھ گیا۔ وہ خاموش تھا۔ گونگوں کی طرح بالکل خاموش۔

مصلحتاً" ایک گالی کا برداشت کرلینا انسان کو کتنی گالیوں سے بچالیتا ہے۔ کاش وہ ایک گالی برداشت کرلیتا۔

☼ ☼ ☼

اے دل ذرا سی جرات رندی سے کام لے
کتنے چراغ ٹوٹ گئے احتیاط میں

ڈاکٹر سارہ اپنے آفس میں گردن جھکائے بیٹھی' میز پہ رکھی نوٹ بک میں کچھ لکھ رہی تھی جب دروازہ ذرا سی آہٹ سے کھلا۔ سارہ نے قلم دانتوں میں دبائے' آنکھیں اوپر اٹھائیں تو ٹھہر گئی۔ قلم دانتوں سے نیچے گرا۔ چہرہ ساکت ہو گیا۔

چوکھٹ میں سعدی کھڑا تھا۔ اور وہ پرانا سعدی بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ جینز کے اوپر جیکٹ پہنے' وہ آنکھوں میں چبھتی ہوئی تپش لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"سعدی!" اس کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔

"تو یہاں چھپی ہوئی تھیں آپ؟" اس کا لہجہ بھی بدلا ہوا تھا۔ سارہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ رنگت پھیکی پڑی۔

"سعدی!"

"مجھے کچھ نہیں سننا۔ میں یہاں اپنی جاب واپس لینے بھی نہیں آیا۔" وہ اس پہ برہم نگاہیں جمائے چند قدم آگے آیا۔ "میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں ڈاکٹر سارہ غازی! کہ آپ میرے حق میں گواہی دیں گی یا نہیں؟"

"تم مجھ سے میرا حال بھی نہیں پوچھو گے؟" اس کو دکھ ہوا۔

"نہیں' کیونکہ مجھے معلوم ہے آپ عافیت سے ہیں۔ یہ عافیت جو آپ نے خاموش رہنے کے عوض چنی تھی۔ یقیناً" دیرپا ہو گی۔ میں ادھر قید میں مر رہا تھا' اس سے آپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سو میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آپ.... گواہی.... دیں گی.... یا نہیں؟" وہ زور دے کر بولا۔ اتنے مہینے بعد ملاقات ہو رہی تھی اور پہلے جیسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

"میں تمہاری طرح بہادر نہیں ہوں سعدی!"

"میں بھی بہادر نہیں ہوں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے میں نے کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہیں وہ بھی خوف کے عالم میں۔ سو مجھ سے بہادری کی بات مت کیجئے۔ میں صرف یہی بتانا چاہتا تھا۔ کورٹ آپ کو بلائے گی۔ اور آپ کو آنا ہو گا۔ اگر آپ اپنی مجرمانہ خاموشی کا مداوا کرنا چاہتی ہیں تو آپ آئیں گی' ورنہ میرے خاندان اور خود مجھ سے آپ کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔"

"تم اتنے سخت دل کیسے ہو سکتے ہو سعدی!" وہ افسوس سے بولی تھی۔

وہ ایک دم تیزی سے آگے آیا۔ "میں نے.... بھروسا کیا آپ پر.... آپ کو ایک قیمتی چیز دی۔ آپ نے اس کو بھی کھو دیا۔ آپ نے میرے لیے گواہی بھی نہ دی۔ اگر اس وقت آپ کچھ بول دیتیں تو حنین.... میرے گھر والے.... وہ اتنے ماہ ماتم کے قریب نہ رہتے۔ اس لیے دل کی سختی کی بات مجھ سے مت کریں اور فیصلہ کریں۔"

ایک قہر آلود نگاہ اس پہ ڈال کر وہ باہر نکل گیا اور اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کر دیا۔ سارہ فکرمند سی وہیں کھڑی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پہ گزر گئی
دنیا تو لطف لے گی مرے واقعات میں

تیز دھوپ میں بینک کی عمارت جھلس رہی تھی۔ بیرونی سیڑھیاں اترتا' پی کیپ سے چہرے پہ سایہ کیے کرنل خاور والٹ جیب میں ڈالتا چلا آ رہا تھا جب اس

کا موبائل بجا۔ اس نے زینہ اترتے ہوئے جیب سے
موبائل نکالا پھر دھوپ کے باعث اسکرین پہ ہاتھ کا چھجا
بنا کر دیکھا۔

جلتا بجھتا نمبر شناسا سا تھا۔ بہت شناسا۔ اس کا دل
اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ تیزی سے فون کان سے
لگاتا مگر محتاط سا ''ہیلو'' کہتا کار کی طرف آیا۔

''خاور! میں بول رہا ہوں۔'' ہاشم کی سنجیدہ آواز
سنائی دی تھی۔ خاور کے چہرے پہ بہت سے رنگ
ابھرے۔ جذبات۔ دکھ۔ مگر جب بولا تو لبوں سے بس
اتنا نکلا۔

''یس سر!''

''میں جانتا ہوں تم کہاں ہو' تمہارا نمبر بھی ٹریس
کروالیا ہے' لیکن۔۔۔ میں کسی کو تمہیں پکڑنے نہیں
بھیج رہا۔'' وہ رکا۔ اس کی آواز دھیمی تھی اور تاسف
انگیز تھی۔

''خاور۔۔۔ میں بہت اکیلا ہوں۔ مجھے تمہاری
ضرورت ہے۔ شیرو جیل میں ہے اور معاملات میرے
ہاتھ سے نکلتے جارہے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں سر!'' وہ چلتے چلتے سایے میں کھڑی
کار تک آگیا تھا۔ ایک دم اسے سکون سا آگیا' جیسے
جھلساتی دھوپ میں سائبان مل گیا ہو۔

''مجھے ہر حالت میں اس کیس کو۔۔۔ یوسف خاندان
کو۔۔۔ کچلنا ہے۔ تم میری مدد کرو گے؟ ہر بات بھلا کر۔
جو میں نے تمہارے ساتھ کیا۔ میں جانتا ہوں تم مجرم
نہیں تھے' اگر تم اس سب کو بھلا سکو تو میں تمہارا انتظار
کررہا ہوں۔ ایو یہ والے کاٹیج میں۔۔۔ کل شام پانچ
بجے کے قریب۔۔۔ اگر تم دوبارہ میرے لیے کام کرنا چاہو
تو میں انتظار کروں گا تمہارا۔''

''جو حکم سر!'' خاور کی آواز بھیگ گئی تھی۔ ہاشم کی
کال بند ہوچکی تھی اور وہ اس سائبان میں کتنی ہی دیر
کھڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گلابی نمی تھی' مگر
چہرے پہ طمانیت تھی۔ سر اٹھا کر اس نے ایک تشکر
آمیز نظر آسمان پہ ڈالی' پھر کار میں بیٹھا۔

کار چلانے کے بجائے وہ موبائل پہ ای میل چیک
کرنے لگا۔ دو دن قبل کی موصول ہوئی ای میل جسے وہ
بارہا پڑھ چکا تھا' ایک دفعہ پھر کھولی۔

''میں جانتا ہوں تم میری میل ضرور پڑھو گے۔
وقت تمہارے ہاتھ میں ہے خاور' چوائس تمہارے
ہاتھ میں ہے۔ اگر تم اپنے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کرنا
چاہتے ہو تو کاردارز کے خلاف گواہی دو۔ میرے حق
میں گواہی دو۔ ہم تمہارے دو قتل معاف کردیں گے۔
تمہارا دامن صاف ہوجائے گا۔ وقت ابھی تمہارے
ہاتھ میں ہے۔ سعدی یوسف خان۔''

''تم سے معافی مانگی کس نے ہے؟'' اس نے نفی
میں سر جھٹکتے ہوئے تنفر سے کہا اور اگنیشن میں چابی
گھمائی۔ گاڑی ایک دم بیدار ہوئی تھی جیسے منجمد ہوئی
وفا ایک لمحے میں جاگ اٹھتی ہے۔

✡ ✡ ✡

یہ بستی ہے ستم پروردگاں کی
یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

شام میں شہر کے دوسرے حصے پہ بھی ٹھنڈی سی پھیل
رہی تھی۔ اس آفس میں خاصا رش تھا۔ لوگوں کی
چہل پہل' کیبن کے ساتھ ٹولیوں میں کھڑے ورکرز'
شور' آوازیں۔ ایک آفس کے شیشے کے دروازے بند
تھے اور اندر سفاری سوٹ میں ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا'
ریسیور کان سے لگائے تیز تیز پنجابی میں کچھ کہے جارہا
تھا۔ سامنے دو کرسیوں میں سے ایک پہ سعدی بیٹھا
تھا۔ آگے ہو کر۔ مضطرب' بے چین۔ دوسری پہ
فارس پیچھے ہو کر ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' آرام دہ انداز
میں بیٹھا' مسلسل دو انگلیوں سے کان کی لو مسل رہا تھا۔

''ہاں جی' میں فائل ملتے ہی آپ کو خبر کرتا ہوں۔
اچھا جی۔'' اس نے ریسیور رکھا اور دونوں ہاتھ باہم
پھنسائے' آگے کو ہو کر سعدی کو مخاطب کیا۔

''ہاں جی۔ سعدی یوسف صاحب۔ یہ شو شروع
ہونے سے پہلے کا ایک گھنٹہ ہے اور اس وقت میں
عموماً'' کسی سے ملتا نہیں' لیکن خصوصی طور پہ آپ کو
بلایا ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اہم بات کرنی ہوگی۔''

وہ عینک اتار کر میز پہ رکھتے مصروف مگر خشک سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے آپ کے سیکریٹری نے فون پہ کہا تھا کہ آپ میرا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔" سعدی نے سنجیدگی سے کہا۔ بار بار وہ فارس کو دیکھتا تھا جو بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

"ہاں جی' ایسا ہی ہے۔ دس بجے کے شو کے ٹی آر پی ز آپ جانتے ہیں کیسے آسمانوں سے بات کرتے ہیں' اوپر سے ملک کا نمبرون چینل ہے اور میری شکل اور ساکھ سے ملک کا بچہ بچہ واقف ہے۔"

"جیلانی صاحب! مجھے دوسرے چند چینلز سے بھی کال آئی ہے۔" سعدی درمیان میں تیزی سے بولا۔ "لیکن میں آپ سے ملنے اس لیے آیا ہوں کیونکہ میں اپنی کہانی صرف ایک دفعہ سنانا چاہتا ہوں اور کسی ایسے شو اور ایسے چینل پہ جہاں مجھے لگے کہ واقعی پورا ملک مجھے دیکھ اور سن رہا ہے۔"

"بالکل جی' ویسے بھی اگلے ہفتے سے قومی اسمبلی کا اجلاس شروع ہو رہا ہے' آپ کی کہانی کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں ہوگا' بعد میں اگر کیس چلتا ہے تو عدالت میڈیا ٹرائل پہ پابندی لگادے گی' اور آپ انٹرویو نہیں دے سکیں گے' یہی وقت ہے آپ کو اپنی کہانی بیچنی ہے۔ میرے دو شو۔۔۔ ایک میں بات کور نہیں ہوتی نا سو دو شوز کریں گے ہم۔ اس منگل اور بدھ کو۔۔۔ دو شوز میں آپ اسٹار بن جائیں گے۔ سوشل میڈیا سے نکل کر آپ ہر شخص کے گھر تک جا پہنچیں گے۔"

"اوکے!" سعدی نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ پھر فارس کو دیکھا۔ وہ خاموش بے نیاز سا لگ رہا تھا۔ شاید منہ میں کچھ چبا بھی رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ پھر تیس لاکھ جمع کرادیں' لیکن کیش کی صورت میں۔ بینک اکاؤنٹ ڈیٹیلز میں کسی کو دیتا نہیں ہوں' مسئلے ہو جاتے ہیں بعد میں۔ یہ میرا ایڈریس ہے' آپ ادھر پیسے لے آئیے گا اسی ہفتے' پھر ہم منگل اور بدھ کے دو شوز کرلیں گے۔" کاغذ پہ پتا لکھ کر اس نے سعدی کی طرف بڑھایا جو پلک جھپکے بنا اس کو دیکھ رہا تھا۔

"تیس لاکھ کس چیز کے؟"

"چلو جی!" جیلانی نے اکتا کر پہلو بدلا۔ "دیکھو بیٹا' میرے شو کا وقت ہونے والا ہے' اب فضول کی بحثوں اور جائز ناجائز کے چکروں میں پڑنے کا وقت نہیں ہے میرے پاس' نہ توانائی ہے۔ بغیر پیسوں کے یہاں کوئی تمہیں شو میں نہیں بلائے گا' میرے جیسا اینکر تو کبھی بھی نہیں۔ اوہ بیٹا۔۔۔" پھر سمجھانے والے انداز میں کہنے لگا۔ "اس میں کوئی غلط بات نہیں ہے' پرائم ٹائم پہ اشتہار چلوانے ہیں نا۔۔۔ تیس سیکنڈ کے اشتہار کو ایک دفعہ چلانے کی تین لاکھ سے کم فیس نہیں ہوتی۔ صرف ایک دفعہ کی بات کر رہا ہوں میں۔ یہ موبائل کمپنیاں' شیمپو والے' یہ لوگ روز کے کروڑوں کے اشتہار چلواتے ہیں۔ میں تمہیں پرائم ٹائم کے دو گھنٹے دے رہا ہوں' تیس لاکھ اس لحاظ سے کم ہیں مگر چونکہ تم نے جرأت کا مظاہرہ کیا ہے' اتنا ظلم ہوا ہے تمہارے ساتھ اس لیے رعایت ہے تمہارے لیے۔ آگے تم سوچ لو۔ کاردارز کے خلاف اپنی کہانی بیان کرنے نکلو گے تو بغیر پیسوں کے کوئی اسٹوڈیو میں گھسنے بھی نہیں دے گا۔"

سعدی اٹھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ فارس دھیرے سے کھڑا ہوا۔ مسکرا کر جیلانی صاحب سے ہاتھ ملایا۔ "میں اسے سمجھا دوں گا۔ ہم پیسوں کا بندوبست کرلیں گے۔ آپ شو کی تیاری رکھیں۔" متانت سے کہہ کر وہ اس کے پیچھے آیا۔

وہ تیز تیز پارکنگ ایریا میں چلتا جارہا تھا۔ باہر آسمان اب گہرا سیاہ ہو رہا تھا۔ اکا دکا تارے بھی ابھرنے لگے تھے۔

"سعدی!" وہ کار تک پہنچا تو فارس تیز تیز چلتا اس سے آملا۔ "ہم پیسے دے سکتے ہیں' ہمارے پاس ہیں پیسے۔"

سعدی نے بے یقینی اور دکھ سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ "میں اس شخص کا دوبارہ نام بھی نہیں سننا

چاہتا۔ اور کیوں دیں ہم پیسے؟ میں انصاف لینے اس لیے نکلا تھا تاکہ مجھے کوئی غلط کام نہ کرنا پڑے' تاکہ میں قانون کا راستہ اپناؤں' فرنٹ ڈور سے اپنی منزل میں داخل ہوں۔ نہیں استعمال کرنے مجھے یہ بیک ڈورز۔" شدت غم سے اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔ "اور آپ وہاں بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ ایک لفظ نہیں بولے اور نہیں تو دو چار مکے تو جڑ ہی سکتے تھے اس اینکر کو۔"

"استغفر اللہ' میں شریف آدمی ہوں۔ ایسا کیوں کرتا؟" وہ خفا ہو کر کہتا گھوم کر ڈرائیونگ ڈور کی طرف بڑھ گیا۔ سعدی غم و غصے سے پیر پٹخ کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

سیل کی رہ گزار ہوئے' ہونٹ نہ پھر بھی تر ہوئے
کیسی عجیب پیاس تھی' کیسے عجیب سحاب تھے!

اوائل مارچ کی وہ شام اپنے نیلے اندھیروں میں ڈھیروں تارے ٹانکے چھایا بنی کھڑی تھی۔ موسم سرد اور خشک تھا۔ ساکت۔ جامد۔

ہاشم کاردار خوبصورتی سے آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ صوفے شام کے اندھیروں جیسے نیلے تھے اور ان پہ سنہرے اجلے اجلے سے کشن رکھے تھے۔ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے' گرے سوٹ میں ملبوس' وہ گاہے بگاہے کلائی کی گھڑی دیکھ رہا تھا۔

ایوبیہ کی اس آبادی سے دور گھنے درختوں سے ڈھکی وادی میں اونچائی پہ بنا وہ خوب صورت بنگلہ گہری شام میں روشن نظر آتا تھا۔ خاور نے باہر سڑک پہ کھڑے' گردن اٹھائے اس بنگلے کی روشن کھڑکیوں کو دیکھا۔

ہاشم کاردار منتظر خاموش سا صوفے پہ بیٹھا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ وال کلاک کو بھی دیکھتا تھا۔ چہرہ سنجیدہ اور سپاٹ تھا' مگر وقت نکلا جا رہا تھا۔ جانے کتنی دیر لگے اسے آنے میں۔ وہ سوچ رہا تھا۔

سڑک پہ کھڑا خاور بہت امید سے اس گھر کو دیکھ رہا تھا۔ ذہن کے کسی نہاں خانے میں یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے ہاشم اس کو صرف اس لیے دوبارہ رکھنے پہ مجبور ہو تاکہ وہ گواہی نہ دے ڈالے۔

ہاشم اب صوفے سے اٹھا اور ایک دفعہ پھر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے ڈرائنگ روم میں ٹہلنے لگا۔ دائیں سے بائیں' دائیں۔۔۔۔

"نہیں!" خاور نے دور نظر آتے بنگلے کو دیکھتے ہوئے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔ "ہاشم کو اس کی بے گناہی کا یقین آگیا ہے۔ وہ اس کو اس کے لیے چاہتا ہے۔ وہ اس کو اس کی خدمات کے عوض واپس بلا رہا ہے وہ اس کا مالک ہے۔ اور اس غلامی پہ اسے فخر ہے۔" خاور کی گردن اکڑ گئی۔ دل میں سکون سا اتر گیا۔

ڈرائنگ روم میں ٹہلتا ہاشم اب سوچتے ہوئے دو انگلیاں گال کے زخم پہ پھیر رہا تھا جہاں صبح شیو کے دوران کٹ لگا تھا۔ وہ گہری سوچ میں تھا' گویا درد کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

خاور سڑک پہ قدم قدم آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ بنگلے کا آہنی گیٹ آن پہنچا۔ وہ کھلا تھا۔ کوئی ملازم' کوئی گارڈ نہ تھا اور ایسا صرف تب ہوتا تھا جب گھر کا کوئی فرد وہاں ہوتا تھا۔ خاور ہلکا سا مسکرایا۔ اپنائیت سی محسوس ہوئی۔ اس خاندان کو وہ کتنا اچھے سے جانتا تھا۔

ہاشم ابھی تک دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہا تھا۔ جب وہ رکا۔ باہر لابی سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ بڑھتے قدم سنائی دے رہے تھے۔ ہاشم نے گہری سانس لی۔ انتظار ختم ہوا۔۔۔۔

خاور بنگلے کے برآمدے تک آپہنچا تھا۔ اسے اب کسی کا ڈر نہ تھا۔ ہاشم کی آواز کا وثوق' یقین' مان۔۔۔۔ اسے اس پہ بھروسا تھا۔ اس نے مرکزی دروازہ کھول کر دھکیلا۔ لکڑی کا پٹ چرچراتا ہوا دوسری طرف جا لگا۔ اندر روشنی تھی' مگر سامنے کوئی نظر نہ آتا تھا۔ خاور سر سے اونی ٹوپی اتارتا اندر داخل ہوا۔۔۔۔ اسی لمحے پیچھے سے اس کی گردن میں کوئی نوکیلی شے آکر لگی۔ وہ بے یقینی سے واپس پلٹا' مگر ٹرینکولائزر ڈارٹ کا اثر روشنی کی رفتار سے اس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔

وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ گھٹنوں کے بل' بے یقین' دنگ چہرہ اٹھایا تو دھندلا سا نظر آیا۔ سامنے سٹنگ روم سے کوئی چلتا آرہا تھا۔۔۔ خاور نے پلکیں جھپکائیں۔
"ہاشم!" لبوں سے بدقت نکلا مگر وہ دیکھ سکتا تھا کہ آنے والا ہاشم نہ تھا۔
"ہیلو کرنل خاور۔ مجھے احمر شفیع کہتے ہیں۔ اور رہے ہاشم صاحب' تو وہ اس وقت اسلام آباد میں ہیں۔۔۔ اور ان کو اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ سونی کی دوست کی سالگرہ میں شرکت کرنے جانا ہے۔"

☆ ☆ ☆

ادھر اسلام آباد میں شہرین کے گھر کی سٹنگ ایریا میں ٹہلتا ہاشم آوازیں سن کر ٹھہر گیا تھا۔ دفعتاً" دروازہ کھلا اور دو ملازموں کے ہمراہ شہری اور سونی آتی دکھائی دیں۔ دونوں بجی سنوری' خوب صورت لگ رہی تھیں۔ سونی بابا کہتے ہوئے فوراً" سے اس کی طرف بھاگی۔
"اتنی دیر لگادی تم نے۔ میں کب سے انتظار کر رہا تھا۔" وہ سونی کو اٹھا کر اس کے گال چومتا بظاہر مسکرا کر' مگر در حقیقت دبے دبے غصے سے شہری سے بولا تھا۔
"میری اسٹائلسٹ کی وجہ سے دیر ہوئی ہے۔ اب چلیں۔" وہ بے نیازی سے کہہ کر اپنا سیل فون بیگ میں ڈال رہی تھی۔ وہ سونی کو اتار کر اس کے قریب گیا۔
"آئندہ اس طرح کے دعوت نامے قبول کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لینا۔"
شہری نے اچنبھے سے مسکارے سے لدی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "کیوں؟"
"کیونکہ لوگ ہمارے بارے میں۔ شیرو کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ سونی کچھ سنے۔" وہ دبی آواز میں کھرک کر بولا تھا۔
"ایسے کام کرنے سے پہلے سوچا کرونا۔" وہ ناک سکیڑ کر بولتی آگے بڑھ گئی۔ وہ جو کوفت زدہ کھڑا تھا' سونی کے خود کو دیکھنے پہ مسکرایا اور اس کے ہمراہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

خاور کی آنکھ کھلی تو منظر چکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھنا چاہا' مگر۔۔۔ دھندسی دھند تھی۔ نمی سی نمی تھی۔ وہ کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ ڈکٹ ٹیپ سے۔ کہنیوں سے گھٹنوں تک سلور ٹیپ لپیٹ لپیٹ کر اس کو جکڑا گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بار بار جھپکتے گردن جھکائی۔ سخت سردی میں وہ بغیر سوئیٹر حتیٰ کہ بغیر شرٹ کے بیٹھا تھا۔ جینز' جوتے جرابیں' سب اسی طرح پہنے ہوئے تھے' مگر کندھے برہنہ نظر آتے تھے۔ اس نے پھر سے چہرہ اٹھایا۔
آج بھی سامنے۔۔۔ دور۔۔۔ ایک مرد اور عورت کھڑے تھے۔۔۔ مگر آج وہ فوڈلی اوور آفٹر کے پکن میں دشمن کے سامنے قیدی بن کر نہیں کھڑا تھا۔ آج مقابل اپنے تھے۔
"ہاشم!" اس کے لبوں سے پھنسا پھنسا سا نکلا۔ آنکھوں میں' دل و دماغ میں ابھی بھی بے یقینی تھی۔
"ہاشم کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو' خاور!" مسکراتی ہوئی جواہرات آگے چلتی آئی۔ احمر وہیں کھڑا رہا۔ ہاتھ باندھے۔ خاموش۔
"ہاشم نے۔۔۔ مجھے بلایا تھا۔"
"ہاشم نے تمہیں نہیں بلایا تھا۔" وہ شیرنی کی سی آنکھیں اس پہ جمائے مسکرا کر بولی تھی۔ احمر قدم قدم چلتا سامنے آیا۔
"وہ کال میں نے کی تھی۔ ہاشم کی چند ریکارڈنگز سے الفاظ توڑ توڑ کر نکالے' ان کو جوڑا' اور تمہیں سنوادیا' کرنل خاور۔ کمال طریقہ تھا۔ اور تمہارا ہی تھا۔ تم سے ہی سیکھا ہے۔ ایسے ہی کبھی تم نے زمر کو بھی کال کیا تھا نا۔ کال پہ کسی اپنے کی پورے یقین سے کہی ہوئی بات پہ سب یقین کرلیتے ہیں۔ آج تم نے بھی کرلیا۔" وہ کہہ رہا تھا اور خاور۔۔۔ اس کی مندی مندی آنکھیں سوچ سے مزید سکڑ رہی تھیں۔
"مارنا۔۔۔ مارنا چاہتے ہو تم لوگ مجھے؟ تاکہ تم۔۔۔ تم

میری جگہ لے لو۔ اور آپ..." اس نے سرخ آنکھوں کا رخ جواہرات کی طرف پھیرا۔ "میں تہیہ کر چکا تھا' ہاشم کو سب بتادوں گا۔ سعدی یوسف گواہی دے گا۔ پھر وہ مان جائے گا کہ تم نے... جواہرات کاردار... تم نے مارا تھا اپنے شوہر کو۔"

جواہرات کی مسکراہٹ میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ احمر بھی سپاٹ چہرہ لیے کھڑا رہا۔

"میں سمجھ گیا تھا۔ قید میں اتنے دن رہ کر میں سمجھ گیا تھا۔ تم تھیں اس رات ان کے ساتھ اور اگر تم مجھے زمین بھر سونا بھی پیش کرو' میں تب بھی ہاشم کو ضرور بتاؤں گا اور اگر تم..." حقارت سے احمر کو دیکھا۔ "تم مجھے مار بھی دو تب بھی مجھے فخر ہے کہ میں اپنے مالک کی وفا میں جان دوں گا۔"

جواہرات نے مسکرا کر احمر کو دیکھا اور پھر باہر نکل گئی۔ احمر اس کے پیچھے آیا۔ باہر شام گہری تاریک ہو چکی تھی۔ آسمان پہ جھلملاتے ہوئے تارے افشاں کی طرح بکھرے تھے۔

برآمدے میں کھڑی جواہرات نے سنجیدگی سے اسے دیکھ کر کہا۔

"اس کو خاموش کرنا ضروری ہے۔ کرلو گے؟"

"آپ فکر نہ کریں' جواہرات!" اس نے سر کو خم دے کر کہا۔ پھر ملکہ کی آنکھوں پہ نظریں جمائے پورے یقین سے بولا۔ "اتنا بوجھ دل پہ لے کر نہ پھرا کریں مادام۔ اگر راز شیئر کیا ہے تو مجھ پہ بھروسا بھی کریں۔"

"بھروسا تھا تو بتایا ہے نا!" اس نے جھرجھری لی۔ "اب میرے سر کا تاج بہت بھاری ہوتا جارہا ہے۔"

"میری بات سنیں دھیان سے۔" اس نے آگے بڑھ کر مضبوطی سے جواہرات کے شانوں کو تھاما۔ "اس بات سے نہ ڈریں کہ ہاشم اور نوشیرواں یہ جان جائیں گے تو کیا ہوگا؟ بلکہ اس دن کی تیاری کرنی ہے ہمیں۔ آپ نے... ایک اچھا کام کیا تھا۔ وہ آدمی ایک درندہ تھا اور درندے کو مار کر آپ نے اپنے بیٹوں کو بچایا تھا۔ آپ نے اپنے بیٹوں کے لیے قربانی دی تھی۔"

جواہرات کی آنکھوں میں نمی در آئی۔ "وہ دونوں مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

"تو میں کس مرض کی دوا ہوں؟" وہ بڑا مان کر بولا تھا۔ "ہم مل کر اورنگ زیب کاردار کے ایسے ایسے کالے کرتوت ان کے سامنے لائیں گے' ان کے کردار کو اتنا مسخ کردیں گے' ان کے خلاف اتنا زہر اگلیں گے کہ وہ دونوں ان سے نفرت کرنے لگ جائیں گے اور اگر کبھی ان کو معلوم ہو بھی جاتا ہے تو وہ آپ کی پوزیشن سمجھ جائیں گے اور یہ سوچیں گے کہ اچھا ہی ہوا' ان کو نجات دلادی۔ آپ نے۔"

جواہرات کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔ آنکھ سے ایک قطرہ ٹوٹ کر گال پہ لڑھکا۔ "کیا ایسا ممکن ہے؟"

"یہ بھی تو ممکن نہیں لگتا تھا۔ آج یہ دردسر بھی ختم ہوجائے گا۔" اس نے مسکرا کر بنگلے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مسکرا کر رہ گئی۔

جواہرات کاردار کے جانے کے بعد وہ اس تنہا بڑے بنگلے کے اندر آیا۔ کچن میں فریج سے ایک باکس نکالا اور اس کمرے میں آیا جہاں خاور بندھا پڑا تھا۔ احمر نے مصروف سے انداز میں ڈکٹ ٹیپ کا ایک بڑا ٹکڑا کاٹا۔

"اب کیا مجھے مار کر پھینکنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ ہونہہ۔ یہ کاردارز میرے نہیں ہوئے' تمہارے کیا ہوں گے۔" اس نے تنفر سے سر جھٹکا تھا۔ احمر اسی طرح آگے آیا اور ڈکٹ ٹیپ کا ٹکڑا اس کے منہ پہ رکھ کر زور سے چپکا دیا۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"میں تمہاری بک بک' تمہارے OMG's اور "کیا کیوں کیسے" نہیں سننا چاہتا' ان باتوں پہ جواب میں تمہیں بتانے جارہا ہوں' اس لیے کتنا اچھا ہو کہ تم یوں چپ ہو کر بیٹھو۔ خاموش اور بے بس ہاں' ایسے ٹھیک ہے۔" سامنے آکر سراہتی نظروں سے اس منظر کو دیکھا' پھر واپس اپنی کرسی پہ آبیٹھا اور باکس کھولا۔ اندر مختلف شیشیاں' چند کاغذ اور چند سرنجیں رکھی

تھیں۔

"تم نے کبھی ہیری پورٹر پڑھی ہے خاور؟ سوری' میں ایسے موقعے پہ اس داستان سے کچھ نقل کررہا ہوں' اب جب کہ تم اپنی یہ خوب صورت زندگی کھونے والے ہو' یونو۔" ایک سرنج کی سوئی شیشی میں چبھو کر وہ اسے اوپر اٹھائے بھر رہا تھا۔ "مگر اس میں ایک ٹرم استعمال ہوتی تھی۔ اس کا پہلا چیپٹر اسی نام سے ہے۔

The Boy Who Lived۔ (وہ لڑکا جو زندہ بچ گیا) اونلی سروائیور۔" پھر نگاہیں اٹھا کر ان میں زمانوں کی تپش بھر کر خاور کو دیکھا۔ "کہتے ہیں انتقام کے سائیکل میں ہمیشہ ایک سروائیور بچ جاتا ہے اور وہ انتقام لیتا ہے' یوں چکر پہ چکر چلتا رہتا ہے.... چلتا رہتا ہے.... میں.... کرنل خاور.... میں ہوں وہ لڑکا جو بچ گیا تھا۔"

خاور کا منہ ٹیپ سے بند تھا' مگر کھلی آنکھوں میں اچنبھے اور حیرت کے سارے الفاظ سمٹ آئے تھے۔

"وہ بریگیڈیر یاد ہے تمہیں کرنل خاور جس کو اس کے پورے خاندان سمیت تم نے قتل کیا تھا؟ تمہیں شک تھا کہ امریکا میں اس کی ایک اور اولاد بھی ہے' کسی دوسری عورت سے جسے وہ چھپا کر رکھتا ہے اور تمہیں یقین تھا کہ وہ بیٹی ہوگی' مگر تم غلط تھے۔ وہ بیٹا تھا۔ سلطان بنگش۔ اور وہ میں تھا۔"

اس نے شیشی سرنج کی سوئی سے نکالی' جھک کر کاغذ سے کچھ پڑھا' پھر دوسری شیشی اوپر اٹھا کر' سوئی اس میں گھسا کر احتیاط سے اس میں موجود مائع سرنج کے بطن میں بھرنے لگا۔

خاور کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور وجود بالکل ساکت ہوگیا تھا۔

"جب تم نے میرے باپ اور میری ہاف فیملی کو قتل کیا تھا تو میں ایک ٹین ایج لڑکا تھا جو بورڈنگ اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ میرا باپ اپنی حساس جاب کے باعث اپنی اولاد اور خاندان والوں کے ویئرا باؤٹس مخفی رکھتا تھا' لیکن تم اس رات ہمارے گھر گئے جب سب وہاں موجود تھے' چھٹیوں پہ سب آئے ہوئے تھے۔ میں نہیں تھا۔ سو میں بچ گیا۔ ابا کے رشتے داروں نے ساری پراپرٹی ہتھیالی اور بابا کے دوستوں نے مجھے واپس آنے سے روک دیا۔ وہ کہتے تھے سلطان' تم بھاگ جاؤ' چھپ جاؤ۔ وہ آدمی تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ آدمی کون تھا۔ میں اتنے برس ایک ان دیکھے دشمن سے چھپتا رہا۔ بھاگتا رہا۔ شہر بدلے' اسکول بدلے' پھر جاب بدلی اور اس ہر مہینے کے ادل بدل نے مجھے احمر شفیع بنادیا۔"

وہ احتیاط سے شیشی اوپر اٹھائے قطرہ قطرہ سرنج میں بھر رہا تھا۔ نظریں اوپر سرنج کے بھرتے بیٹ پہ جمی تھیں۔

خاور کا چہرہ سرخ تھا' آنکھوں میں خون اتر آیا تھا' وہ سختی سے نفی میں سر ہلاتا خود کو چھڑانے کی کوشش کررہا تھا' مگر گرفت مضبوط تھی۔

"برسوں کی محنت اور کھوج نے مجھے اتنا بتادیا کہ ساری گتھیاں اور نگ زیب کاردار کے گرد جاکر کھلتی ہیں۔ میں نے خود کو ان سے متعارف کروایا' ایسے کہ وہ مجھے ملازمت کی پیش کش کریں۔ Con Man کبھی کچھ نہیں مانگتا' وہ ایسے مواقع پیدا کرتا ہے کہ آپ کو لگے' یہ سب آپ کا ہی آئیڈیا تھا۔ وہ خود ہی مجھے سب دیتے گئے۔ اور ان کے پاس اتنا عرصہ کام کرکے جانتے ہو مجھے کیا معلوم ہوا؟ وہ سب جو تمہیں خود نہیں معلوم!"

شیشی رکھی' کیس بند کیا اور سرنج پکڑے' اسٹول اٹھائے اس کے سامنے آکر اسٹول رکھا' اور اس پہ بیٹھا۔ پھر اس کی خون آشام آنکھوں میں دیکھ کر سادگی سے بولا۔

"تم نے ہاشم کے کہنے پہ زمر یوسف کو زخمی کیا' اس سے اس کے تمام رشتے چھینے' اس کی شادی کینسل کروائی' اس کا ہر راستہ بند کیا۔ ویسے یہ ہر راستہ بند کرنے والا کام۔ یہ کاردارز نے پہلی دفعہ زمر کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ چند برس پہلے جب جواہرات کاردار اور ہاشم کاردار کے سیکورٹی ہیڈ کا انتقال ہوا تھا تو

انہوں نے سوچا کیوں نا ایک نیا سیکورٹی ہیڈ ڈھونڈا جائے؟ پھر اسے تراشا جائے۔ پھر اس کا ہر راستہ بند کیا جائے تاکہ وہ ان ہی کا ہو کر رہ جائے؟" اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔ خاور کا مزاحمت کرتا وجود ٹھہر گیا۔ ساکت۔ ساکن۔

"یہ بڑے لوگ ایسی بڑی بڑی پوسٹیں دینے سے پہلے امیدوار کا ہر راستہ' ہر دروازہ بند کرتے ہیں۔ انہوں نے آٹھ ماہ تم پہ انویسٹ کیا۔ ایک بہادر' دلیر اور زیرک کرنل پہ الزام لگوایا' پھر اسی کے مدعی بن کر' وکیل بن کر اس کو عدالت سے چھڑوایا اور پھر..."

اس کی آواز یاسیت سے دھیمی ہوئی۔ خاور سکتے میں تھا۔

"اور پھر ہاشم کاردار اور جواہرات کاردار نے تمہارے بیٹوں کو مروایا' کیونکہ تم بری ہونے کے بعد ملک سے باہر جانے کا سوچنے لگے تھے۔ یہ ٹھیک نہیں تھا' ان کو ایک وفادار آدمی چاہیے تھا۔ جس کا کوئی نہ رہے اور وہ ان کا ہو کر رہے۔ اور الزام ڈالا انہوں نے میرے باپ پہ۔ کرنل خاور' میرا باپ ایک ایمان دار اور اچھا آدمی تھا۔ وہ تمہیں گرفتار ضرور کرنا چاہتا تھا' مگر اس نے تمہارے بیٹوں کو نہیں مارا تھا۔ ان کو جواہرات کاردار نے مروایا تھا۔ یہ سارے مافیا باسز' یہ ایسے ہی ڈھونڈتے اور تراشتے ہیں اپنا دایاں ہاتھ۔ انہوں نے تمہیں تراشا اور جب تم نے اپنی زندگی کا پہلا قتل کر ڈالا تو وہ تمہارے سب سے بڑی سپورٹرین کر سامنے آگئے۔ انہوں نے تمہیں اپنی چھایا تلے لے لیا اور تم ان کے کہنے پہ ساری زندگی دوسروں کو قتل کرتے آئے' زندگیاں برباد کرتے آئے۔ ان کے کہنے پہ جنہوں نے تمہارے بچوں کو مروایا تھا۔ اور یقیناً" ان کے پاس اس عمل کی بھی جسٹی فکیشن ہوگی۔ تم حیران تھے ناکہ ہاشم نے کیوں یقین کر لیا کہ تم نے اورنگ زیب کاردار کو مارا ہوگا؟ کیونکہ اسے لگا تم ان کی حقیقت جان گئے ہو' مگر اورنگ زیب کو قصوروار سمجھتے ہو۔ وہ یہی پوچھتا تھا تم سے اتنے ماہ۔ وہ یہی جاننا چاہتا تھا کہ تم کیا جانتے ہو۔ میں اپنی باتوں کا کوئی ثبوت تمہیں نہ بھی دوں' تب بھی جب ان کو سوچو گے تو خود ہی ساری کڑیاں ملتی جائیں گی۔ سب واضح ہو جائے گا۔" احمر اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا۔

خاور اسی طرح سکتے کے عالم میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے' مگر وہ نیچے ٹپک نہیں رہے تھے۔ وہ بھی ساکت تھے۔

احمر اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا تھا۔

"تمہارے پاس چوائس تھی' تم ہاشم کے پاس واپس آنے کی بجائے عدالت چلے جاتے' اس کے خلاف گواہی دیتے' لیکن تم نے وہی کیا جو تمہاری خصلت تھی۔ اگر تمہارے اندر کوئی خیر ہوتی تو میں تمہیں چھوڑ دیتا' تو تم خود بھی اس رات فوڈلی ایور آفٹر کے کچن میں اس عورت پہ پستول نہ تانتے جس نے فارس کو ٹھنڈا کر کے تمہاری جان بچائی تھی' مگر وہ کیا ہے خاور کہ میں ان جیسا نہیں ہوں۔ نہ میں تمہارے جیسا ہوں۔ میں وہ نہیں کروں گا جو تم سمجھ رہے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کرنے جا رہا ہوں۔ ایک تیز' بنا درد کے موت؟ کیا تمہیں واقعی لگتا ہے اتنا رحم میں تمہارے اوپر کھاؤں گا۔"

اور خاور کو محسوس ہوا کہ اس کے برہنہ کندھوں پہ احمر شفیع نے گلوز والے ہاتھ رکھے ہیں اور پھر... گردن کے نیچے... قدرے نیچے... سوئی کی نوک چبھی... درد... تکلیف... اور پھر... جیسے ہر شے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔

یہ وہ دن تھا جب کرنل خاور مظاہر حیات کی "زندگی" کا باب' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

دلوں کی روشنی بجھنے نہ دینا
وجود تیرگی محکم نہیں ہے

سبز بیلوں سے ڈھکے مور چال کی بالائی منزل کی کھڑکیوں سے مارچ کی ٹھنڈی دھوپ سیدھی ٹکرا رہی تھی۔ اندر جھانکو تو کمرے ٹھنڈے لگتے تھے۔ ایسے میں حنین کا کمرہ عجیب نمونہ پیش کر رہا تھا۔ فرنیچر جو

دیواروں سے لگا تھا' ذرا آگے کھسکا کر چادروں سے ڈھک دیا تھا' اور کونے میں ایک چھوٹی سیڑھی رکھی تھی۔ فرش پہ نیچے ایک بڑی بالٹی' دو پینٹ کے ڈبے رکھے تھے۔ وہ خود معمولی شلوار قمیص پہنے' بالوں کو کشمیری انداز میں اسکارف میں لپیٹے' آستین پیچھے چڑھائے سیڑھی کے اوپر کھڑی تھی اور سوکھے برش کو بازو اونچا کر کے چھت سے ٹکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میرا ہاتھ جا رہا ہے' میں دیوار کے اوپری کونے تک پینٹ کرلوں گی۔" اس نے چہک کر اطلاع دی۔ نیچے فرش پہ آلتی پالتی کے بیٹھے اسامہ نے بہت ضبط سے کھنکھار کر اسے متوجہ کیا۔

"حنہ! یہ تم کل شام کیا اچانک سے ریسٹورنٹ کے بچے ہوئے ڈبے لے آئی ہو اور اب کہہ رہی ہو کہ تم نے پینٹ کرنا ہے کمرہ۔"

حنہ نے گردن گھما کر نیچے بیٹھے اسامہ کو خفگی سے دیکھا۔ "تم کیا جانو ادرک کا مزہ۔ جتنی ہوم ڈیکور کی ویب سائٹس میں نے دیکھی ہیں نا' پتا ہے ان کے کمرے اتنے خوب صورت کیوں ہوتے ہیں؟ کیونکہ ان میں یہ سفید چٹا پینٹ نہیں ہوتا۔ گورے ہمیشہ اپنی دیواروں کو ٹنٹ ضرور دیتے ہیں۔ دروازے وہ سفید رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں الٹا حساب ہے۔" ناک سکیڑ کر وہ واپس دیوار کی طرف متوجہ ہوئی۔

"مگر حنہ! یاد ہے جب ریسٹورنٹ پینٹ ہوا تھا؟ وہ لوگ ایسے ہی منہ اٹھا کر پینٹ نہیں کر رہے تھے' بلکہ پہلے دیوار پہ کچھ رگڑتے تھے' اور بھی بہت کچھ کرتے تھے۔ تم نیٹ پہ پینٹ کے ٹیوٹوریل کیوں نہیں پڑھ لیتیں؟" سیم نے ہار نہیں مانی تھی۔

"میں نے کوشش کی تھی' وہ اتنے لمبے چوڑے اسباق دہرا رہے تھے' میں نے چھوڑ دیے' ایویں گوروں کے نخرے' یہ کرو وہ کرو' اس طرح تو بندہ سال بھر کمرہ ہی تیار کرتا رہے۔ پینٹ کب کرے؟" پھر لاپروائی سے سر جھٹکا۔ "میں تو ایسے ہی کروں گی پینٹ۔ یہ کون سا مشکل ہے۔ بس برش کو پینٹ میں ڈبو کر دیوار پہ اوپر نیچے لگاتے جاؤ۔ واؤ۔"

آنکھیں میچ کر اس نے وہ کارٹون یاد کیے جن میں یوں ہی مزے سے پینٹ ہو جاتا تھا۔ "اور پھر دیکھنا' کتنا خوب صورت رنگ چڑھے گا۔"

"مگر کیا وہ رنگ دیرپا بھی ہوگا؟" چوکھٹ میں قدموں کی آواز آئی' اور پھر اس کی آواز۔ حنین وہیں ٹھہر گئی۔ برش والا ہاتھ نیچے گرا دیا۔ مڑی نہیں۔ ساکت کھڑی رہی۔ اسامہ جو نیچے بیٹھا تھا' وہ بھی نہیں ہلا' بس سر جھکا دیا۔ وہ سعدی سے ابھی تک نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔

"گورے ایک بہت اچھی' بہت قابل قوم ہیں' اور جب وہ کہتے ہیں کہ یوں منہ اٹھا کر پینٹ نہیں کرتے تو وہ صحیح کہتے ہیں۔ وہ ہماری طرح سست اور کام چور نہیں ہوتے۔ اپنا ہر کام خود کرنے اور احسن طریقے سے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔" وہ گردن اٹھائے حنین کے کمرے کی دیواروں کو دیکھتا' دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اسامہ اور حنین اپنی جگہ چپ تھے۔ ساکت جامد۔

"خوب صورت رنگ ایسے نہیں چڑھ جاتے۔ ان کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ جان مارنی پڑتی ہے۔ ایک ایک بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہ دیواریں... یہ گھر کی دیواریں اپنے اوپر کسی اجنبی رنگ کو ایسے ہی نہیں چڑھنے کی اجازت دے دیتیں۔" وہ ہنوز گردن اونچی کیے سادگی اور نرمی سے کہہ رہا تھا۔ بس کی طرف کمر کیے اونچائی پہ کھڑی حنین کی آنکھوں کے کٹورے لبالب بھرتے گئے۔ مگر لب ایک دوسرے میں سختی سے پیوست کر کے ضبط کیا۔ سیم کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔

"دوسری کسی بھی چیز کو رگڑو تو وہ خراب ہوتی ہے' اس کی چمک اور خوب صورتی ماند پڑ جاتی ہے۔ مگر دیواروں کی نہیں۔ گھر کی دیواروں کو رگڑیں کھانی پڑتی ہیں۔ سخت ریگ مال سے ان کو رگڑ رگڑ کر چھلنی کیا جاتا ہے' مگر یہ ہر رگڑ کے بعد پہلے سے زیادہ اسموتھ ہو جاتی ہیں' پھر ان کے سوراخ اور دراڑیں بھری جاتی

ہیں۔ فلر ان کے زخموں کو مرہم لگایا جاتا ہے۔"

حنین نے آنکھیں بند کرلیں۔ آنسو ٹپ ٹپ گرتے چلے جارہے تھے۔ سیم سر جھکائے ہولے ہولے سسک رہا تھا۔ چوکھٹ میں کھڑا لڑکا جس کے بال اب پہلے جیسے چھوٹے نہ رہے تھے' اور قدرے بڑھنے کے باعث ان کا اصل قدرتی گھنگھریالا پن نظر آنے لگا تھا' اسی طرح ملائمت سے بول رہا تھا۔

"ان دیواروں کو بھی اتنا رگیدنے اور رگڑنے سے درد ہوتا ہوگا' مگر یہ برداشت کرلیتی ہیں۔ جانتی ہیں کہ یہی اچھا ہے ان کے لیے۔ پھر ان کے اوپر پرائمر (Primer) پینٹ کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں اسے ڈسٹیمپر یا چونا وغیرہ بھی کہتے ہیں۔ گورے اس کو پرائمر یا سیڈر کہتے ہیں۔ وہ ساری دیوار کو ڈھانک لیتا ہے۔ اس کا پردہ بن جاتا ہے۔ سارے عیوب ڈھک جاتے ہیں' پرانے پینٹ اور نئے پینٹ کے درمیان کی آڑ ہوتا ہے وہ۔ ماضی کو مستقبل پہ اثر انداز ہونے سے روک دیتا ہے۔"

اونچی سیڑھی پہ کھڑی حنہ نے گردن جھکادی۔ ہاتھ اسی طرف دیوار پہ جما تھا اور آنسو ٹپ ٹپ گرتے جارہے تھے۔

"وہ پرائمر پینٹ اگر نہ لگایا جائے تو نئے آنے والے ہر پینٹ کو دیوار کا پلستر اپنے اندر جذب کرلیتا ہے۔ اس مستقبل کے ہر رنگ کو ماضی کے سوراخ کھا جاتے ہیں۔ لیکن اچھے سے پرائمر لگادو تو اوپر جو رنگ بھی کرو۔ وہ ایسا خوب صورت چڑھے گا کہ سارا گھر چمک اٹھے گا۔ پھر زمین سے رس رس کر خراب چور دراڑوں سے داخل ہوتے پانی سے بھی دیواریں خراب نہ ہوں گی' نہ موسم اثر کرے گا' نہ کسی کا میلا ہاتھ گدلا کرسکے گا اس رنگ کو۔ گھر کی دیواروں کے ایسے پکے اور خوب صورت رنگ یونہی نہیں آجاتے۔ ان کے لیے بنیاد کو ایک دفعہ تو چھلنی کرنا پڑتا ہے۔"

حنین نے برش کہاں گرایا' وہ کیسے سیڑھی سے جست لگا کر اتری' اسے خبر نہیں ہوئی۔ بس وہ روتی ہوئی دوڑتی ہوئی آئی اور سعدی کے گلے لگ گئی۔

"بھائی' آئی ایم سوری۔ آپ کا قصور نہیں تھا۔ بھائی آئی ایم سو سوری۔"

سیم بھی ایک دم اٹھا اور بھاگ کر ان دونوں کے گرد بازو حمائل کیے سعدی کے کندھے سے لگ گیا۔ وہ بھی روئے جارہا تھا۔

"بھائی! میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ پلیز آپ دوبارہ مت جانا۔"

وہ دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے جن کے صرف قد بڑے ہوگئے تھے۔ سعدی ان دونوں سے اونچا تھا' اس کے بازو دونوں سے زیادہ مضبوط تھے۔ وہ دونوں کے گرد بازو حمائل کیے' بیک وقت دونوں کو تھپک رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ نرمی' آنکھوں میں نمی اور لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔

"مجھے بھی تم سے لڑنا نہیں چاہیے تھا۔ ایک غلطی کے پیچھے مجھے یہ نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ جہاں کتنے لوگ بزدلی سے میرے معاملے سے جان بچاکر نکل گئے اور کتنے لوگ صرف لالچ میں میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں' وہاں اتنے ماہ تم لوگ میرے لیے کھڑے تھے۔"

مگر وہ دونوں اس کو بولنے نہیں دے رہے تھے۔ حنین روتے ہوئے نفی میں سرہلاتی بولے جارہی تھی اور سیم اس کے کندھے پہ ماتھا ٹیکے ہچکیوں کے دوران کہہ رہا تھا۔

"بھائی! آپ کا حق تھا مجھ سے لڑنے کا۔ میں نے غلط کیا تھا۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سب سے زیادہ سفر آپ نے کیا تھا۔"

"بھائی! میں کبھی آئندہ یوں نہیں بولوں گا۔ حنہ سے لڑنے کا حق تھا آپ کو۔ وہ ہماری برابر کی بہن ہے۔ موٹی' کالی' بدصورت ہے تو کیا ہوا' وہ ہماری برابر کی بہن ہے۔ مجھے درمیان میں نہیں آنا چاہیے تھا۔" اور سیم یہ سب بچوں کی طرح بلکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ اس کا سر تھپکتے تھپکتے ہنس دیا تھا مگر حنین نے تو جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

"ہم نے بھی اتنا نہیں سوچا کہ آپ کو اتنے ماہ خوشی کا ایک لمحہ بھی نہیں ملا۔ ہمارے پاس تو پھر بھی خوشی

کے مل بیٹھنے کے لمحے آئے تھے، مگر آپ نے سفر کیا سب سے زیادہ۔"

"اور میں یوں بولا بھائی جیسے آپ کسی لگژری ٹرپ سے لوٹے ہیں۔ مجھے یوں نہیں۔" وہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ لگے نیچے بیٹھتے گئے تھے۔ وہ "کوئی بات نہیں۔ آئندہ ہم ان باتوں کو اپنے درمیان نہیں آنے دیں گے۔" بار بار یہی بات دہراتا جا رہا تھا، کبھی جھک کر حنہ کا ماتھا چومتا، کبھی سیم کے بال سہلاتا۔ وہ بڑا تھا۔ اسے ہی تسلی دینی تھی۔ اسے ہی زیادہ ظرف کا مظاہرہ کرنا تھا۔ بڑوں کی قربانیاں بھی بڑی ہونی چاہئیں نا۔

مور چال کے باہر دھوپ ڈھلتی گئی، یہاں تک کہ بنگلے پہ چھایا سی تن گئی۔ اب حنہ کی کھڑکی سے جھانکو تو وہ تینوں چوکڑی مارے فرش پر بیٹھے تھے۔ درمیان میں کوک سے بھرے تین گلاس، کوک کی بڑی بوتل، اور چند ڈبے کھلے پڑے تھے جن میں سے برگر اور فرنچ فرائیز جھلک رہے تھے۔ سعدی سر جھکائے کوک کے گلاس میں اسٹرا ہلا کر دھیرے دھیرے بول رہا تھا اور وہ دونوں کھاتے ہوئے سن رہے تھے۔

"ہاشم سمجھا ہم باہر برآمدے کے ہجوم میں گم ہونے والے ہیں، سو اس کے سارے بندے اسی طرف بھاگے، مگر ہم ایک باتھ روم کے نیچے مین ہول سے سرنگ میں اترے۔ اور وہاں سے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "سیدھا باہر دو گلیاں چھوڑ کر سڑک پر نکل آئے۔" سر جھکائے بولتے اس کے چہرے پہ یاسیت تھی۔

"واؤ!" سیم برگر کا بھاری نوالہ منہ میں چباتا آنکھیں پھیلا کر بولا تو حنین نے آنکھیں دکھائیں۔

"موٹے آلو! چپ کرو وہ تمہیں تکلیف دہ واقعے کا منظر نامہ بتا رہا ہے، کسی ایڈونچر کا نہیں۔"

سیم نے جلدی سے نوالہ نگلتے ہوئے چہرے پہ مسکینیت طاری کی۔ "اوہ!"

سعدی اس کے بدلے انداز پہ نرمی سے مسکرا دیا اور کہنے لگا۔ "پھر ہم وہاں سے ایک ٹک ٹک میں بیٹھے اور......"

"پتا ہے بھائی، کتنا اچھا ہوتا اگر آپ مسز کاردار کو یرغمال بنا کر ساتھ لے آتے۔ چوبیس گھنٹے بعد جو میک اپ اترنے سے ان کی حالت ہوتی...." حنہ خود بھی بولی بغیر نہ رہ سکی اور بول کر ہنستی چلی گئی۔ سعدی نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر ہلکا سا تھپڑ لگایا۔

"یوں کرو تم بول لو، میری خیر ہے۔"

"اللہ! میں نے کیا کیا ہے؟"

اور زمر جب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تو اس نے دیکھا وہ تینوں اسی طرح ایک ساتھ بیٹھے برگر کھا رہے تھے اور ایک دوسرے کو لقمے دے رہے تھے۔ چہروں پہ سوکھے آنسوؤں کے نشان ابھی بھی موجود تھے، اور لبوں سے مسکراہٹیں پھوٹ رہی تھیں۔

"سعدی!" زمر نے دھیرے سے دروازے پہ دستک دی۔ تینوں نے سر گھما کر دیکھا۔ حنہ نے فوراً برگر بڑھایا مگر وہ مسکرا کر نفی میں سر ہلاتی کام کی بات پوچھنے لگی۔ "انٹرویو کا کیا بنا؟ فارس نے کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"انٹرویو۔ ہونہہ۔" سعدی نے سر جھٹکا۔ "تیس لاکھ مانگ رہا تھا وہ اینکر۔ اور فارس ماموں کو دیکھیں، خود کہا تھا کہ تمہارے ساتھ چلوں گا، مگر وہاں جا کر بالکل چپ بیٹھے رہے، اتنا نہیں ہوا کہ دو تھپڑ لگا دیتے اس اینکر کو۔ ایک مارنے کا کام ہی تو آتا ہے ان کو، وہ بھی نہیں کیا۔" خفگی سے واپس گردن موڑلی۔

زمر اور حنین نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر حنہ کھنکھاری۔

"بھائی.... فارس ماموں چپ ہوں تب بھی بہت کچھ کر جاتے ہیں۔ ان کو ہلکا نہ لیں۔"

"بالکل۔" زمر مسکراہٹ چھپاتی واپس چلی گئی۔

نیچے آئی تو وہ کچن میں بیٹھا تھا۔ موبائل پر بٹن دبا رہا تھا۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے فارس۔" اس نے کرسی کھینچی تو فارس نے نظریں اٹھائیں۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"زہے نصیب۔ آپ کو میرا نام بھی یاد ہے!"
"تھوڑا بہت تو یاد ہے۔" وہ ہنس دی۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "سعدی کا انٹرویو ہونا ضروری ہے' وہ اس کے لیے بہت اپ سیٹ ہے اور......"
"ہو جائے گا انٹرویو۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ انداز میں لاپروائی تھی۔
"مگر کیسے؟" زمر نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔
"پیسے دیں گے اور کیا۔ مگر اس کے لیے سعدی راضی نہیں ہے سودا کریں گے۔ کوئی اور حل ہے تو بتائیں مجھے۔"
وہ چپ ہو گئی۔ "مگر... کوئی اور طریقہ ہے کیا؟" محتاط سے انداز میں پوچھا۔
"کیوں پراسیکیوٹر صاحبہ' قانون پہ یقین ہے نا آپ کو' تو بس میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ اب قانون نہیں توڑنا اور شریف آدمی بن کر رہنا ہے۔ ایسے مشکوک نظروں سے کیا دیکھ رہی ہیں مجھے؟ سچ کہہ رہا ہوں۔"
وہ خفگی سے کہتا باہر کی جانب بڑھ گیا۔ زمر سوچتی نظروں سے اسے جاتے دیکھے گئی۔

☼ ☼ ☼

چند دن بعد۔

☼ ☼ ☼

چاک دامن تو خیر سل جاتا
چاک ہستی کہاں رفو کرتے

سفید دیواروں والے کمرہ عدالت میں دھوپ چھن چھن کر آرہی تھی۔ موسم بتدریج تبدیل ہو رہا تھا۔ سردی بہت کم رہ گئی تھی اور خزاں رسیدہ درختوں پہ نئے شگوفے اور پتے کھلنے لگے تھے۔ چبوترے کے سامنے پراسیکیوشن کے بینچ پہ زمر بیٹھی' قلم انگلیوں میں گھماتی بغور کٹہرے میں کھڑے نوشیرواں کو دیکھ رہی تھی۔ دوسری میز پہ ٹیک لگا کر آرام دہ انداز میں بیٹھے ہاشم کاردار کی سنجیدہ نظریں بھی وہیں جمی تھیں۔ عزت ماب اختر مرتضیٰ صاحب بھی اسی سے مخاطب تھے اور کرسی کا رخ ذرا ترچھا کیے' کاغذ سے پڑھ کر اسے چارجز سنا رہے تھے۔ وہ کٹہرے کے جنگلے پہ ہاتھ رکھے کھڑا' ساکت سا نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر زخموں کے تازہ نشان تھے اور ایک آنکھ نیلوں نیل تھی۔
"کیا آپ نے تمام چارجز سن اور سمجھ لیے؟"
"جی یور آنر!"
"کیا آپ نوشیرواں کاردار' اکیس مئی 2015 کی شام پلاٹ نمبر پندرہ میں سعدی یوسف سے ملنے گئے تھے اور آپ نے ان پہ تین گولیاں چلائیں۔ پھر بوٹ کی ٹھوکروں سے ان کو زخمی بھی کیا؟"
زمر کے ساتھ بیٹھے سعدی کی چبھتی نظریں شیرو کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ نوشیرواں نے نگاہیں اٹھا کر حاضرین کو دیکھا پھر بلند آواز میں بولا۔
"یہ غلط ہے۔ میں اس روز دبئی میں تھا۔"
"کیا آپ تمام الزامات سے انکار کرتے ہیں؟"
"جی' میں انکار کرتا ہوں۔ مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔" وہ میکانکی انداز میں نیچے بیٹھے ہاشم کو دیکھ کر بولا تھا۔
"کیا اپنے آپ (بے گناہ ظاہر کرنے) کرتے ہیں۔"
"جی میں انوسینٹ پلیڈ کرتا ہوں۔"
(اس موقع پہ اگر ملزم صحت جرم کا اقرار کر لے تو اس کے خلاف فیصلہ سنا دیا جاتا ہے' اسی وقت سزا بنا دی جاتی ہے۔ اگر وہ انکار کرے تو اسے شفاف مقدمے کا حق دیا جاتا ہے جہاں وہ استغاثہ (الزام لگانے والوں) کے ثبوت و شواہد کا دفاع اپنے وکیل کے ذریعے کرے۔)
"او کے۔ آپ کو فیئر ٹرائل کا حق دیا جاتا ہے۔ کیا آپ اپنے خلاف گواہ بننا چاہیں گے۔" نیچے بیٹھے ہاشم نے نفی میں سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ نظریں شیرو پہ تھیں۔
"نہیں یور آنر۔ میں خاموشی اختیار کروں گا۔" اس نے اسی انداز میں کہا تھا۔

چند منٹ بعد باہر راہداری میں زمر اور سعدی چلتے جا رہے تھے اور جب وہ بولا تو بہت دل گرفتہ تھا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا جج نے کیسے اس کی ضمانت کی درخواست قبول کرلی۔ وہ اب گھر چلا جائے گا اور پھر ملک سے باہر۔“

زمر نے نگاہیں پھیر کر اسے دیکھا۔ یوں لگتا تھا وہ برسوں پہلے یونیورسٹی کے موک ٹرائل سے نکلے تھے اور وہ ہیری کے خلاف فیصلہ آنے پہ شدید تلملا رہا تھا۔

”سعدی۔ اس کو جیل میں پیٹا گیا ہے‘ اس کی جان کو خطرہ ہے‘ جج کو اسے جیل سے نکالنا ہی تھا۔“

”ہاشم نے اسے خود پٹوایا ہے۔ مجھے یقین ہے۔“

”ظاہر ہے ہاشم نے اسے پٹوایا ہے‘ سماعت سے پچھلی رات۔ مگر ہم یہ باتیں جج کو کہیں گے کہ تم ہم خود ہی جھوٹے لگیں گے۔ اس کی ضمانت ہونی ہی تھی۔“ وہ تسلی دے رہی تھی۔

”اگلے ماہ کی تاریخ ملی ہے۔ کیسا نظام ہے یہ۔ ہم کتنا انتظار کریں گے۔ وہ تاریخ پہ تاریخ دیتے جائیں گے۔ زمر ایسے تو کبھی انصاف نہیں ملے گا۔“ وہ شدید تکلیف میں لگ رہا تھا۔ زمر یک ٹک اس کی زخمی نظروں کو دیکھے گئی۔

”یہ معاملات لمبے چلتے ہیں سعدی۔ کوئی بات نہیں ہم لڑتے رہیں گے۔“

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ سر جھٹک کر خفا خفا سا چلتا گیا۔ زمر کے اندر کچھ ڈوب گیا تھا۔ وہ بار بار اس پہ ایک فکر مند‘ تحیر سی نظر ڈالتی تھی۔

حنین اور اسامہ کا بھائی گھر آ گیا تھا‘ یہ تو طے تھا‘ مگر کیا سعدی یوسف گھر آ گیا تھا؟ وہ کیا کرے؟ اور کیا وہ کبھی گھر آپائے گا؟ اسے یقین نہیں رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک تو خواب لیے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
اس پہ تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ

ہارون عبید کی رہائش گاہ پہ دھوپ بہ سر دی پیش لیے سارے ماحول کو جھلسا رہی تھی۔ سبزہ زار کی طرف کھلتی کھڑکی سے اندر جاؤ تو اپنے کلینک میں آب دار مخصوص کرسی پہ بیٹھی نوٹ پیڈ پہ کچھ لکھ رہی تھی۔ کھڑکی کی طرف اس کی کرسی کی پشت تھی اور یہاں سے اس کا نیم رخ دکھائی دیتا تھا۔ سرخ رومال میں بندھے بال‘ جھکی آنکھیں‘ زرد رنگت‘ سوکھے ہونٹ۔ وہ اداسی سے سر جھکائے لکھتی جا رہی تھی جب دروازہ کھلا۔

”میں آج مزید کلائنٹس نہیں.....“ اکتا کر بولتے اس نے نظریں اٹھائیں تو رک گئی۔ یہاں سے دکھائی دیتے آدھے چہرے پہ واضح حیرانی ابھری۔

”بابا! خیریت؟“ سامنے چوکھٹ میں ہارون کھڑے تھے۔ کلف لگے شلوار سوٹ میں ملبوس‘ وہ مطمئن نظریں اس پہ جمائے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ آگے آئے۔ ”تم ٹھیک ہو آبی؟“

آبی نے کرسی پہ پیچھے کو ٹیک لگائی تو اب اس کا چہرہ زیادہ واضح ہوا۔ اس پہ اداس مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ ”جی۔ آپ نے وعدہ کیا تھا ناں اس لیے اب ٹھیک ہوں۔“

”او کے۔ تمہیں ایک کام کرنا ہے اب۔“ وہ سامنے کرسی پہ براجمان ہوتے سادگی سے بولے تھے۔ آب دار کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ ”جی؟ کیا؟“

”ہاشم نے نوشیرواں کی ضمانت کروالی ہے۔ اب وہ ٹرائل کو لٹکائے گا‘ تاریخ پہ تاریخ لیتا جائے گا۔ یوں فیصلہ نہیں آئے گا۔ تم نے صرف اس کو کنوینس کرنا ہے تاکہ وہ اس کیس کو جلد انجام تک پہنچانے پہ رضامند ہو جائے۔“

”مگر بابا‘ اس نے مجھے پرپوز کیا تھا‘ میں اس دن سے اس کی کالز اٹینڈ نہیں کر رہی‘ اس کو اگنور کر رہی ہوں تاکہ وہ مجھ پہ دباؤ نہ ڈالے۔ اب میں کیسے اس کے پاس جاکر.....“

”یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ تم اس کو کچھ بھی کہو۔ مگر اس کو راضی کرو۔ تم چاہو تو کہہ دینا کہ اس پرپوزل پہ تم صرف تب غور کرو گی جب وہ اور اس کا خاندان تمام الزامات سے بری ہو جائے گا۔“ وہ زور دے کر بولے۔

"بابا!" اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ "میں اس پروپوزل پہ غور نہیں کروں گی۔ پھر میں اسے جھوٹی امید کیوں دلاؤں؟"

"بعد میں جو ہوگا میں سنبھال لوں گا۔ ابھی اس کے لیے تمہیں اس کو راضی کرنا ہے۔" وہ زور دے کر بولے آب دار کے لب بھینچ گئے۔ وہ کتنی دیر صدماتی نظروں سے انہیں دیکھے گئی۔

"اوہ! میں سمجھی تھی کہ بالآخر آپ میرا خیال کرنے لگ گئے ہیں۔ مگر وہ سب... وہ وعدہ' وہ فارس کے متعلق کہی ہر بات... وہ سب آپ اپنے مفاد میں کر رہے تھے۔ آپ مجھے استعمال کر رہے تھے اور فارس کو بھی استعمال کرنا چاہتے ہیں (جواہرات پوائنٹ) آپ اسے صرف میرا باڈی گارڈ بنانا چاہتے ہیں نا۔"

"آب دار!" وہ قمیص جھاڑتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چہرے پہ سنجیدگی تھی۔ "ہاشم سے تمہاری جان صرف تب چھوٹے گی جب وہ اپنے خاندان سمیت نیست و نابود ہوگا۔ اس کے لیے تمہیں وہ سب کرنا ہوگا جو میں کہوں گا۔ اب فیصلہ تمہارا ہے۔"

"آپ کو اندازہ ہے کہ ہاشم کے ساتھ اتنا خطرناک کھیل شروع کرکے آپ مجھے کتنے بڑے خطرے میں ڈال رہے ہیں؟" اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے انسان کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ تمہیں بھی دینی ہوگی۔ جیسے زمر صاحبہ دیں گی۔"

آخری الفاظ زیر لب کہے تھے اور پھر وہ مڑے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ آب دار کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

☆ ☆ ☆

ہم کو اس عہد میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

وہ ایک پوش علاقے کی خوب صورت صاف ستھری کالونی تھی۔ قطار در قطار بنے اونچے بنگلے جدید تزئین و آرائش کا نمونہ پیش کرتے نظر آتے تھے۔ رات تاریک ہو چکی تھی۔ آسمان پہ تارے جگمگا رہے تھے۔ ایسے میں ایک لمبی سی لش چمکتی بی ایم ڈبلیو ایک کھلے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ پورچ میں آکر وہ رکی' ڈرائیونگ ڈور کھلا اور سفاری سوٹ میں ملبوس منظور جیلانی باہر آتا دکھائی دیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے وہاں کھڑے گارڈز کو واپس جانے کا کہا اور تیز تیز چلتا لان چیئرز کی طرف آیا جہاں کوئی اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں غازی صاحب' مجھے دیر ہوگئی اور آپ کو انتظار کی زحمت سے گزرنا پڑا۔" خوش خلقی سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہاں کھڑے فارس نے مسکرا کر گرم جوشی سے ہاتھ تھاما۔ جیلانی نے ایک نظر میز پہ رکھے دو بریف کیسز کو دیکھا اور پھر کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ فارس بھی اپنی کرسی پہ واپس بیٹھا۔ وہ سردی میں کمی کے باعث جینز کے اوپر سیاہ ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ چہرے پہ ہلکی مسکراہٹ تھی اور سنہری گہری آنکھیں جیلانی پہ جمی تھیں۔

"میں معذرت کرنا چاہتا تھا۔ میرا بھانجا' بہت جلد باز اور جذباتی ہے۔ ان معاملات کے رموز نہیں سمجھتا۔" کان کی لو مسلتے ہوئے اس نے معذرت خواہانہ انداز میں بات شروع کی۔ منظور جیلانی نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ جھلایا۔

"ہم سب اس عمر میں ایسے تھے۔ مگر جب انسان کی عمر بڑھتی ہے تو ترجیحات اور کام کرنے کے طریقے بدل جاتے ہیں' خیر آپ مطلوبہ رقم لے آئے۔"

"میں لے آیا ہوں مگر چاہتا ہوں کہ آپ سعدی یوسف کو یہ بات نہ بتائیں۔ اس کو یوں کال کریں گویا ہم یہاں ملے ہی نہیں تھے اور اس سے معذرت کر کے تھوڑا بہلا کر اسے انٹرویو کے لیے بلالیں۔ اس کو اعتماد دیں کہ یہ انٹرویو صرف اس کی سچائی کو دنیا کے سامنے لانے کے لیے کیا جارہا ہے۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ کوئی چائے پانی دیا یا نہیں آپ کو۔" وہ فون نکالتے ہوئے بولا تو فارس نے اسی طرح ٹیک لگائے بیٹھے ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔

"آپ ان کو گن لیں اور انٹرویو کنفرم کردیں تو میں گھر جاتا ہوں۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ کوئی کمی بیشی ہوئی تو میرا پی اے صبح آپ کو فون کرکے۔" بریف کیس کھولتے ہوئے اینکر کہہ رہا تھا اور پھر یکایک اس کے الفاظ لبوں پہ ٹوٹ گئے۔ ہاتھ ٹھہر گئے۔ اس نے ڈھکن پورا کھولا اور پھر چونک کر فارس کو دیکھا۔

وہ اسی طرح ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" اور پیسے کہاں ہیں؟" اینکر نے ڈھکن میز تک الٹ دیا تو بریف کیس کا اندرونی حصہ روشنی میں واضح ہوا۔ اس میں کئی درجن سی ڈیز رکھی تھی جو سفید پلاسٹک کور میں مقید تھیں۔

"پیسے تو خیر میرا باپ بھی نہیں دے گا۔ اور گارڈ کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سعدی یوسف نہیں ہوں۔ دو دفعہ قتل کے جرم میں جیل جا چکا ہوں، بغیر آواز نکالے بندہ مارنا مشکل نہیں ہے میرے لیے۔ نہیں، تمہیں نہیں مارنا میں نے۔ ورنہ پھر سعدی کا انٹرویو کون کرے گا؟"

اینکر نے بریف کیس ہاتھ مار کر نیچے گرایا اور غصے سے اس کو دیکھا۔ "یہ دھمکیاں مجھ جیسے آدمی کو نہیں ڈراتیں۔ اگر میرا مزید وقت ضائع نہیں کرنا تو تم جاسکتے ہو۔" اور ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ نتھنے پھلائے وہ غصے سے فارس کو دیکھ رہا تھا۔

"جیلانی صاحب!" فارس بھی پورے قد سے اٹھا اور جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کو بہت سکون سے دیکھا۔ "اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ایسے نہ کرتا۔ ذرا تحمل سے ٹھہر کر پوچھتا ضرور کہ ان سی ڈیز میں کیا ہے۔ اور جانتے ہو ان میں کیا ہے؟"

کہنے کے ساتھ اس نے جیب سے ایک پین نکال کر میز پہ رکھا۔ سعدی کا پین کیمرہ۔

"مجھے معلوم تھا تم سعدی کو پیسے مانگنے بلا رہے ہو، تو میں نے سوچا ان لمحات کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ سو تمہاری اور سعدی کی گفتگو کی ویڈیو HD کوالٹی میں محفوظ کرلی میں نے۔ صرف یہی نہیں تمہارے آفس میں جو تمہاری وال فوٹو لگی ہے، وہی جس میں امریکہ میں تم کوئی ایوارڈ لیتے دکھائی دے رہے ہو، اس کے اوپر ننھا وال اسٹیکر چپکا ہے، جو تمہارے آفس کی Live فیڈ مجھے دیتا ہے۔ اس بریف کیس میں بہت سے لوگوں کے ساتھ تم گفتگو کرتے دکھائی دے رہے ہو۔ کسی کے ساتھ فون پہ، کسی کے ساتھ آمنے سامنے۔ تمہاری کلین سوئپ ٹیم جو ہر جمعرات کو تمہارا آفس ڈی بگ کرتی ہے، ان کے آلات بہت پرانے ہیں، وہ میرے وال اسٹکرز کو نہیں پکڑ سکتے۔"

منظور جیلانی کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ پہلے وہ چونکا تھا، پھر متحیر ہوا، پھر بے یقین اور آخر میں..... اس کی رنگت سفید پڑنے لگی تھی۔

"یہ مختلف قابل ذکر واقعات کی سی ڈیز ہیں۔ جن میں تم صاف دکھائی دیتے ہو۔ اب میرے پاس دو راستے ہیں، پہلا میں تمہیں یہ سب دے دوں۔ اور تم سعدی یوسف کے اوپر ہفتے کے پانچ دن پانچ شوز کرو۔ نتیجہ سعدی کی کہانی پورا ملک سن لے گا۔"

وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا اس کی آنکھوں پہ اپنی آنکھیں جمائے، چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔

"دوسرا راستہ یہ ہے کہ میں تمہارے مخالف چینل کو یہ ٹیپ دے دوں۔ جس سے تم فون پہ پچاس لاکھ مانگ رہے ہو، ورنہ اس کی بہن کی رہائی کے لیے شو نہیں کروگے۔ جب یہ ویڈیو بار بار میڈیا پہ چلائی جائیں گی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ سعدی یوسف کی کہانی پوری دنیا جان لے گی۔ بنا پیسوں کے گھنٹوں کا ایئر ٹائم ملے گا اس کو۔ چاہوں تو میں یہ کرلوں، مگر تمہارے گھر والوں نے چائے پلائی ہے مجھے، اب مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ تمہارا دل توڑ دوں اس لیے۔"

وہ ایک دم آگے بڑھا اور جیلانی کو گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور بدلے ہوئے لہجے میں غرایا۔

"تم کل صبح سعدی کو فون کروگے، اس کو عزت سے بلاؤ گے، اس سے معافی مانگو گے اور جلاد میں ہی ہوں۔"

جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑا۔ وہ بالکل ہکا بکا اور شل سا تھا۔ فارس نے کیمرہ پین اٹھایا اور جانے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ دو قدم اٹھائے، پھر مڑا اور پوری قوت سے اس کے جبڑے پہ مکا رسید کیا۔ جیلانی لڑکھڑا کر پیچھے کو گرنے لگا، مگر کرسی کو تھام لیا۔ اس کا ہاتھ اپنے منہ پہ تھا، جس سے خون بھل بھل بہنے لگا تھا۔ تلملاتا ہوا چہرہ اٹھا کر اس نے دبے دبے غصے سے فارس کو دیکھا، مگر بولا کچھ نہیں۔

فارس اپنی مٹھی کو چہرے کے قریب لے کر گیا، اس میں پھونکا اور پھر کالر جھٹکتے جانے کے لیے مڑ گیا۔

اینکو اپنا زخمی چہرہ لیے دہرا ہوئے کھڑا اس کھلے بریف کیس کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

دل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے
اتنا بے سمت نہ چل، لوٹ کے گھر جانا ہے

اس تاریک رات زمر اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اسٹڈی ٹیبل پہ لیپ ٹاپ کھلا رکھا تھا اور ساتھ میں سیاہ مخملیں ڈبی بھی کھلی پڑی تھی۔ وہ گھنگھریالے بال جوڑے میں لپیٹے کہنیاں میز پہ رکھے، ہتھیلیوں میں چہرہ گرائے یاسیت سے ہیرے کی لونگ کو دیکھ رہی تھی۔ چناؤ اس کے سامنے تھا، مگر فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

اس نے پھر سر جھٹکا اور لیپ ٹاپ اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی۔ آن لائن ترجمہ کھلا رکھا تھا سامنے۔

آج دل اتنا بکھرا بکھرا، بے کیف تھا کہ وہ کچھ لکھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ پھر اس نے توجہ اور دھیان کو اسکرین کی جانب مجتمع کرنا چاہا۔

میں اللہ کی پناہ چاہتی ہوں شیطان مردود سے.....

اللہ کے نام کے ساتھ جو بہت مہربان، بار بار رحم کرنے والا ہے۔

"بھلا کون ہے جو تمہیں جنگل اور دریا کے اندھیروں میں راستہ بتاتا ہے اور اپنی رحمت سے پہلے کون خوش خبری کی ہوائیں چلاتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔ اللہ ان کے شرک کرنے سے بہت بلند ہے۔"

"بھلا کون ہے جو از سر نو خلقت کو پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ بنائے گا اور کون ہے وہ جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے، کہہ دو اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔ کہہ دو اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا اور انہیں اس کی بھی خبر نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔"

زمر نے کی بورڈ پہ رکھے اپنے زرد ہاتھ دیکھے، پھر جھکے چہرے کے ساتھ ٹائپ کرنے لگی۔

"اس دنیا میں انسان..... ہم انسان، بہت سے کاموں کے لیے بہت سے لوگوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ نوکری کے لیے..... پڑھائی کے لیے..... کورٹ میں کیس چلانے اور انصاف لینے کے لیے....." تلخی سے سر جھٹکا۔ "ہم انسان" "آزاد نہیں ہیں۔"

آزادی صرف ایک Myth (تصور) ہے۔ نہ مرد آزاد ہیں، نہ عورتیں۔ سب مجبوریوں سے بندھے دوسروں پہ انحصار کرتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہمیں اندھیروں میں جب سمجھ میں نہیں آرہا ہوتا کہ کیا کریں، کیا فیصلہ لیں، کون سا راستہ اپنالیں، تب ہمیں راستہ دکھانے والا صرف اللہ ہوتا ہے اور کون ہوتا ہے؟ کوئی بھی نہیں..... یہ جو لوگوں کی خوف ناک آوازیں اور باتیں ہمیں ڈراتی ہیں نا، ہمیں مستقبل کا خوف دلاتی ہیں، آندھی طوفان جیسی آوازیں اور ہم کان لپیٹ لیتے ہیں، یہ رحمت کی بارش سے پہلے کی ہوائیں ہوتی ہیں۔ یہ بھی اللہ بھیجتا ہے۔ اچھے دنوں کے آغاز سے پہلے شدید بری باتیں سننی پڑتی ہیں، بس ہمارے ضبط کا امتحان ہوتا ہے۔ لوگ نہیں لے رہے، یہ امتحان بھی اللہ لے رہا ہے۔

مگر کیا ہمیں اس پہ اتنا بھروسا ہے کہ صرف اسی پہ انحصار کر سکیں؟ اور اگر ہم نہیں کرتے صرف اسی پہ توکل، تو اس کو فرق نہیں پڑتا۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے موازنوں اور مقابلوں سے بہت اوپر بہت بلند ہے۔ وہ

پھر بھی انسانوں کو پیدا کرتا رہے گا' ان کو مارنے کے بعد دوبارہ بھی اٹھائے گا۔ ان کو روزی بھی دے گا۔ ہماری قسمتوں میں کیا لکھا ہے' ہماری شادیاں کب تک چلیں گی' بچے کیسے ہوں گے' بڑے ہو کر کیا ہو گا ان کا' ہمیں موت کس زمین پہ آئے گی' یہ سب ہمیں نہیں پتا۔ اسے پتا ہے۔ پھر بھی ہم لوگ اتنے کمزور ہیں کہ صرف اس پہ بھروسا نہیں کرتے۔

انسانوں کو سہارا بناتے ہیں۔ انسانوں کو سبب بنانا چاہیے' مدد لینی چاہیے' مگر سہارا نہیں بنانا چاہیے۔ ان کے دیے گئے چناؤ کے آپشنز کے آگے ہاتھ باندھ کر مجبور نہیں ہو جانا چاہیے۔"

ایک آنسو آنکھ سے ٹوٹا اور گال پہ لڑھکتا گیا۔ وہ جھکے چہرے کے ساتھ ٹائپ کرتی جا رہی تھی۔

"مگر ہم یہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ! ابھی ایمان اتنا مضبوط نہیں ہوا ہمارا کہ سر پہ کفن باندھ کر نکلیں اور صرف تیری مدد کا یقین رکھیں۔ کچھ غلط قدم اٹھانے پڑتے ہیں' ہم بہت کمزور ہیں۔"

"بلکہ آخرت کے معاملے میں تو ان کی سمجھ گئی گزری ہے۔ بلکہ وہ اس سے شک میں ہیں' بلکہ وہ اس سے اندھے ہی ہیں۔"

"ہم کیوں خود کو ان لوگوں کا محتاج کر لیتے ہیں جن کو آخرت کا کوئی خوف نہیں ہے۔ انسان کے دل سے آخرت کا خوف نکل جائے' کیسے پتا چلتا ہے اس کا؟"

اس نے رک کر سوچا۔ آنسو سوکھ چکا تھا' مگر نشان گال پہ ہنوز موجود تھا۔

"پہلے انسان کی سمجھ بوجھ ختم ہوتی ہے۔ پھر وہ اللہ کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ وہ دل پہ بوجھ اور دماغ کے لیے کوفت بننے لگتی ہیں۔ پھر شک پیدا ہوتا ہے۔ دل کا آئینہ آلودہ ہو جاتا ہے اور جب انسان وسوسوں کا علاج نہیں کرتا' ان کو جھٹکتا نہیں ہے اور ان کے مدلل جواب تلاش نہیں کرتا کہ صرف جھٹکنا کافی نہیں ہوتا' تو وہ اس شک کا پیچھا کرنے لگ جاتا ہے۔ شک اسے دور اندھیروں میں بھٹکا دیتا ہے اور وہ اندھا ہو کر بھٹکتا چلا جاتا ہے' بہتا چلا جاتا ہے اور پھر..."

اس نے پچھلی آیت دیکھی' گویا الٹا چکر کاٹا ہو۔

"اور پھر کون ہے جو انسان کو اندھیروں سے نکال سکتا ہے' راستہ بتا سکتا ہے سوائے اللہ کے؟ او اللہ... میں کیا کروں؟"

اس نے بازو بچھا کر ان پہ سر رکھ لیا اور آنکھیں بہت کرب سے بند کر لیں۔ سعدی... یا فارس... بار بار دو نام ذہن میں ابھرتے تھے۔ چناؤ مشکل تھا... ناممکن تھا... دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو وہ سیدھی ہوئی اور سنجیدگی سے کان کے پیچھے بال اڑستی کی بورڈ پہ انگلیاں چلانے لگی۔ اپنا لکھا گروپ پہ پوسٹ کیا اور دوسری ونڈو کھول لی۔ کن اکھیوں سے وہ دیکھ سکتی تھی کہ فارس کمرے میں داخل ہوا تھا۔ آستین کے کف موڑتا وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف چلا آیا۔

"اب خوش ہیں آپ؟ ہو گیا ہیرو کا انٹرویو؟" وہ اس کے کندھوں پہ جھک کر اس کے کان کے قریب کہہ رہا تھا۔ وہ اس وقت بے زار تھی' بہت بے زار۔ سنجیدگی سے ماتھے پہ بل لیے ٹائپ کرتی رہی۔ بس "ہوں" کہا۔

"تو پھر کیا کھلائیں گی آپ مجھے؟ ایک بہت اچھا آئس کریم پارلر ہے۔" وہ پیچھے سے جھک کر کھڑا اس کی کرسی کے دائیں بائیں ہاتھ رکھے کہہ رہا تھا۔

"جو اس وقت تک کھلا ہوتا ہے۔ آپ کی فیورٹ آئس کریم ملتی ہے وہاں۔ چلیں گی؟"

"میں... کام کر رہی ہوں فارس!" وہ اسکرین پہ نگاہیں جمائے سنجیدگی سے بولی تھی۔ گویا اسے نظر انداز کیے رکھا۔ مگر اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

"اور اگر آپ چاہیں تو ہم اس کے قریب ایک دوسرے اچھے ریسٹورنٹ میں بھی جا سکتے ہیں جہاں یہ..." اس کے بالوں پہ ٹھوڑی رکھے وہ اپنی دھن میں کہہ رہا تھا جب زمر نے جھٹکے سے اسکرین نیچے گرائی اور گھومی۔

"ہم ریسٹورنٹس اور کافی شاپس نہیں جا سکتے

فارس..... "کیا تمہیں احساس ہے کہ سعدی کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ بیمار ہو چکا ہے' وہ مسخ ہو چکا ہے۔ ہم عدالت میں ایک آئی پی پی کے خلاف کیس لڑنے جا رہے ہیں۔ ہمیں کیس کی تیاری کرنی ہے۔ آئس کریم اور کھانوں کے لیے وقت ہے ہمارے پاس.....؟"

غصہ کسی اور کا تھا' نکلا کسی اور پہ تھا۔ دل کسی اور نے توڑا تھا۔ چھپا کسی اور سے لیا تھا۔ وہ سرخ چہرے اور جذبات سے کانپتی آواز سے بولی تھی۔

فارس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ کرسی سے ہاتھ ہٹا کر تیزی سے سیدھا ہوا۔ ایک خاموش مگر برہم نظر اس پہ ڈالی' پھر سرعت سے میز پہ رکھی چابیاں اٹھاتا باہر نکل گیا۔ دروازہ دھاسے بند کیا۔

وہ کرسی پہ اکیلی بیٹھی رہ گئی۔ زور سے بند ہوئے دروازے کی کپکپاتی آواز سنتی رہی۔ چند لمحے گہرے سانس لیتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں پانی تھا۔ اور چہرہ جھکا ہوا تھا۔ یک دم اس نے چہرہ اٹھایا۔

جو فیصلہ اتنے دن سے ہو نہیں پا رہا تھا' چناؤ ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور ننگے پاؤں باہر کو بھاگی۔

وہ پورچ میں کھڑا خفگی سے بڑبڑاتا کار کا لاک کھول رہا تھا۔ اس کے کان سرخ تھے اور ماتھے پہ سلوٹیں پڑی تھیں' جب وہ دوڑتی ہوئی بیرونی دروازے کی چوکھٹ تک آئی۔

"آئی ایم سوری....." فارس نے ایک سپاٹ نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر سر جھکا کر دروازے کھولنے لگا۔ وہ دوڑ کر آگے آئی اور گاڑی کا دروازہ پکڑ لیا۔ فارس نے رک کر ان ہی برہم نظروں سے اسے دیکھا۔ اور پھر وہ چونکا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

"آئی ایم سوری کہ میں نے تمہیں جانے دیا۔ میں کام کر رہی تھی..... کر رہی ہوں..... کیس پہ..... کیونکہ وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو گا' اگر ہم یہ کیس نہ جیتے تو..... آئی ایم سوری کہ میں نے تمہیں جانے دیا۔ مگر میرے پاس اختیار تھا۔ تمہیں جانے دوں یا کیس پہ کام نہ کروں۔"

وہ دروازے کے اوپر دونوں ہاتھ جمائے بہتے آنسوؤں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ فارس کے ماتھے کی سلوٹیں ڈھیلی ہی تھیں' البتہ تاثرات کی سختی کم تھی۔

"میرے پاس چوائس تھی۔ تم یا سعدی..... میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔" تاروں جیسے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی گردن پہ لڑھک رہے تھے۔ موٹی خوب صورت گھنگھریالی لٹوں کے ہالے میں اس کا زرد چہرہ بہت دکھی لگتا تھا۔ فارس کی پیشانی کی شکنیں کم ہوتی گئیں۔

"میں تمہیں نہیں جانے دے سکتی تھی۔ میں سعدی کو بھی واپس لانا چاہتی تھی۔ میں ایک وقت میں ایک کا چناؤ کر سکتی تھی۔" فارس نے ترحم سے اسے دیکھا۔

"زمر! تم لوگ خواہ مخواہ اتنا خوار کر رہے ہو خود کو۔ ٹرائل کبھی نہیں چلے گا۔ ایک سال سے پہلے تو شروع نہیں ہو گا۔ ہاشم کبھی کیس نہیں چلنے دے گا۔" مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔

"میرے پاس چناؤ کا اختیار تھا..... مگر فارس..... میں تمہیں نہیں چنوں گی۔" وہ نفی میں سر ہلا کر کہہ رہی تھی۔ اس کی بھیگی آنکھیں زخمی تھیں۔ "کیونکہ تم میرے ہو..... جو میرا ہے' وہ میرا رہے گا۔ میں تمہیں نہیں چنوں گی' کیونکہ کوئی بھی تمہیں مجھ سے دور نہیں کر سکتا۔"

اس کے چہرے کی آخری شکن بھی جاتی رہی۔ گہری سانس لے کر وہ اسے دیکھے گیا۔ "تو کون تمہیں مجھ سے دور کر رہا ہے سوائے تمہارے اپنے؟"

"اور میں سعدی کو بھی نہیں چن رہی۔" وہ اسی طرح روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں کیوں چنوں اس کو؟ میں مجبور نہیں ہوں۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ میں کسی انسان کے سامنے مجبور نہیں ہوں۔ انسان اندھیروں میں راستہ نہیں دکھا سکتے۔ میں نے اپنا چناؤ کر لیا ہے۔"

ہتھیلیوں کی پشت سے گال رگڑتے ہوئے اس نے چند گہرے سانس لے کر خود کو سنبھالنا چاہا۔ آنسو پھر بھی ابل ابل رہے تھے اور ناک اور گال گلابی پڑ رہے تھے۔

"میں فارس کو نہیں چنوں گی۔ میں سعدی کو نہیں

چنوں گی۔ میں زمر کو چنوں گی۔ میں خود کو چنوں گی۔"

اٹھی گردن اور مضبوط آواز سے وہ چہرہ صاف کرتے ہوئے بولی تھی۔

"میں وہ کروں گی جو زمر کو کرنا چاہیے۔ ظلم زمر کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ سب اپنی زندگی شروع کر سکتے ہیں' سوائے میرے۔ زمر کو انصاف چاہیے۔ یہ صرف سعدی کے لیے نہیں ہے۔ یہ زمر کے لیے بھی ہے۔ مجھے بھی تب تک سکون نہیں ملے گا جب تک میں ان لوگوں کو تباہ ہوتے نہ دیکھ لوں۔ میں زمر کو چن رہی ہوں اور زمر بہت اچھی اداکارہ ہے۔"

اب کے وہ آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھ رہا تھا۔

"زمر! اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔ ایک دفعہ پہلے بھی تم روتے ہوئے کمرے میں آئی تھیں' تمہیں دمے کا اٹیک ہوا تھا اور تم درختوں کی باتیں کر رہی تھیں۔" وہ آگے بڑھا اور نرمی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"بعد میں عدالت میں تم نے بتایا مجھے کہ اس رات تم نے حقیقت جان لی تھی۔ میں اب نہیں سمجھ پا رہا کہ کیا ہوا ہے' مگر کچھ ہوا ضرور ہے۔ مجھے بتاؤ۔" وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ بھیگے چہرے کے ساتھ مسکرا دی اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"میرا ڈپریشن' میرا ذہنی دباؤ بہت بڑھ گیا تھا۔ مجھے لگتا تھا میں کیس کی وجہ سے تم سے دور ہو جاؤں گی' مگر نہیں۔" اب کے وہ دھلے دھلائے چہرے اور گلابی آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر بولی تھی۔ "جو میرا ہے' وہ میرا رہے گا۔ مجھے تمہیں نظر انداز یا ناراض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اچھی امید' اچھی تیاری کے ساتھ بھی یہ کیس لڑ سکتے ہیں اور تم جب کہو گے ہم ڈنر پہ بھی جا سکتے ہیں۔"

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ وہ جو لمحے بھر کے لیے ڈر گیا تھا کہ کچھ ہوا ہے' وہ واہمہ بھی ذہن سے جاتا رہا۔ اس نے نرمی سے اسے اپنے قریب کیا اور اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر چند لمحے تھپکتا رہا اور پھر بہت محبت سے دھیرے سے بولا۔

"آئی ہیٹ یو چڑیل!"

وہ ایک جھٹکے سے الگ ہوئی۔ بھیگی گلابی آنکھوں میں ایک دم ڈھیر سارا غصہ عود آیا تھا۔ "کیا کہا؟" وہ بے یقین بھی تھی۔

"احمر شفیع نے تمہارا نام چڑیل رکھا تھا۔ قوی اطلاع ہے کہ کچہری میں' بہت سے لوگ تمہیں اسی نام سے پکارتے ہیں اور میں ہر نماز میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ ان لوگوں کو نیک اجر عطا کرے۔" وہ کار کا دروازہ کھولتا کہہ رہا تھا۔ زمر نے بہت مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ چہرے پہ خفگی طاری کیے وہ چیخ کر بولی تھی۔

"اگر تمہیں مجھ سے ذرا سی بھی محبت ہوتی تو تم میرے بارے میں ایسی باتیں کرنے والوں کے دانت توڑ دیتے۔"

"آپ کو کس نے کہا کہ مجھے آپ سے محبت ہے؟ میں نے تو آپ کی دولت کے لیے آپ سے شادی کی تھی۔"

"دولت سے یاد آیا' میرے پیسے کہاں ہیں؟ ہاں؟" وہ اندر بیٹھ چکا تھا اور وہ اس کی کھڑکی پہ جھکی ناراضی سے پوچھ رہی تھی۔

"جن پیسوں کو ہاشم کاردار ٹریس نہیں کر سکا' آپ نے سوچا بھی کیسے کہ وہ آپ کو مل جائیں گے۔ جائیے زمر بی بی! جوتے پہن کر آئیں' پھر میں آپ کو ڈنر پہ لے کر جاؤں گا۔"

"ہاں... وہ بھی میرے پیسوں سے ہوگا۔" وہ سیدھی ہوتے ہوئے خفا خفا سی بولی اور مڑ گئی۔ پیچھے سے اس نے اس کی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔

"لالچی وکیل نہ ہو تو۔" اس دفعہ اصلی والا غصہ چڑھا' مگر سر جھٹکتی اندر چلی گئی۔ اس کا ٹوٹا دل جڑنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

خوابوں کے چاند ڈھل گئے' تاروں کے دم نکل گئے
پھولوں کے ہاتھ جل گئے' کیسے یہ آفتاب تھے!

وہ صبح پگھلے سونے کی سی حدت لیے ہوئے طلوع ہوئی تھی۔ سورج کی ترچھی کرنیں قصرِ کاردار کے

ستونوں سے ٹکرا کر پلٹ رہی تھیں۔ اندر اونچی کھڑکیوں سے چھن کر آتی روشنی نے ڈائننگ ہال کو منور کر رکھا تھا۔ سربراہی کرسی پر ہاشم بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ نوشیرواں ہنوز کمرے میں بند تھا' اس کا ساتھ دینے کو دائیں ہاتھ جواہرات بیٹھی تھی۔ جانے دونوں کی کرسیوں کی جگہ کب بدلی تھی' مگر جواہرات نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ جانتی تھی کہ اب خاندان کی ڈرائیونگ سیٹ پہ وہ نہیں تھی۔ مگر وہ مطمئن تھی۔ کانٹے میں پھل کا ٹکڑا پھنساتے وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی تھی۔

"تم نے خاور کے متعلق سنا؟"

"ہوں!" اس نے سر ہلایا۔ "اس کے بیٹے کا فون آیا تھا۔ میں مالی طور پہ مدد کرتا رہوں گا اس کی فیملی کی۔ کچھ عرصے تک۔"

"تمہارا بڑا ظرف ہے' ہاشم!" اس نے جھرجھری لی۔ وہ خاموشی سے کھاتا رہا تو وہ ذرا پینترا بدل کر بولی۔

"مگر جو بھی ہے' مجھے بہت افسوس ہوا اس کا سن کر۔"

"اپنے کیے کا پھل ملا ہے۔" اس نے سر جھٹکا تھا' پھر نیپکن رکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ جواہرات نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ آفس کے لیے تیار لگ رہا تھا۔ ٹائی' کف لنکس' سب اپنی جگہ پہ تھے۔ "ٹرائل کا کیا بنے گا؟"

"کوئی ٹرائل نہیں چلے گا ممی۔ ایک ایک پیشی کے لیے ترساؤں گا انہیں۔" موبائل اسکرین پہ انگلی پھیرتے وہ قریب سے نکل کر چلا گیا۔ جواہرات نے طمانیت کا گہرا سانس لیا اور مسکرا کر جوس لبوں سے لگا لیا۔ خاور کا باب تو ختم ہوا....

☼ ☼ ☼

چند میل دور.... اس پرشکوہ عمارت کے ایک وسیع آفس میں ہارون عبید اپنی مخصوص کرسی پہ براجمان تھے' ٹیک لگا کر بیٹھے' گال تلے انگلی رکھے وہ محظوظ نظروں سے سامنے بیٹھی زمر کو دیکھ رہے تھے' جس کی گردن اٹھی ہوئی تھی اور چبھتی ہوئی نظریں ان پہ جمی تھیں۔

وہ درمیان میں حائل میز کے باعث یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ زمر نے کرسی کی نشست ایک ہاتھ سے مضبوطی سے تھام رکھی ہے۔ اور وہ بار بار تھوک نگل کر خود کو پرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"

"اگر آپ واقعی ہاشم کا ردار کو ہمارے ساتھ ٹرائل لڑنے پہ آمادہ کر لیتے ہیں تو ٹھیک ہے۔" ہلکے سے کندھے اچکا کر خود کو بے نیاز ظاہر کرنا چاہا۔ "میں فارس کو چھوڑ سکتی ہوں۔"

"اچھا۔" وہ ذرا سا مسکرائے۔

"اور میں جانتی ہوں کہ آپ یہ اپنی بیٹی کے لیے نہیں کر رہے۔" بھی ذرا سا مسکائی تھی۔

"آپ فارس کو استعمال کرنا چاہتے ہیں' سے اپنی بیٹی کا باڈی گارڈ بنانا چاہتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہو پائے گا۔ وہ کبھی بھی ایسے کسی دام میں نہیں آئے گا۔ میں نہیں وارن کروں گی اسے۔ مگر وہ خود اتنا سمجھ دار ہے کہ آپ کا ہر وار خطا جائے گا۔"

"یہ میرا مسئلہ ہے' اس لیے کیوں نا ہم وہ بات کریں جو آپ کا مسئلہ ہے۔" آگے ہوتے ہتھیلیاں باہم پھنساتے ہوئے انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "آپ نے اچھا فیصلہ کیا' اپنے بوجھ کو کسی کی زندگی سے نکال کر اسے ہلکا کرنے کا فیصلہ بہت اچھا رہتا ہے۔ آپ کو اور کچھ نہیں کرنا۔ بس اس کی زندگی سے نکل جانا ہے۔"

"مگر ٹرائل کے بعد۔ ہم ٹرائل جیتیں یا ہاریں' اس وقت کا انتظار نہیں کروں گی میں' مگر کم از کم جب اتنا کیس چل چکا ہو گا کہ مجھے لگے آپ نے اپنا وعدہ ایفا کر دیا ہے' تو میں اسے چھوڑ دوں گی۔"

"اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو؟" کمرے میں لمحے بھر کو سناٹا چھا گیا' مگر زمر نے اداکاری جاری رکھتے ہوئے اسی بے نیازی سے شانے اچکائے۔

"جب میں آپ پہ اعتبار کر رہی ہوں تو آپ کو بھی مجھ پہ یقین کرنا چاہیے۔"

"مگر ہو سکتا ہے کہ یہ صرف آپ کی چال ہو۔ آپ صرف وعدہ کرنے کی اداکاری کر رہی ہوں' اور اپنا

مطلب نکل جانے کے بعد آپ اپنی بات سے پھر جائیں۔ ایسے میں مجھے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا نا۔" ان کی زیرک نگاہیں اندر تک اتر رہی تھیں۔ زمر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا مگر چہرے پہ مسکراہٹ برقرار رہی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ نے یقیناً" کوئی کانٹریکٹ بنوا رکھا ہوگا۔ لائیے' میں دستخط کر دیتی ہوں۔"

"آپ وکیل لوگ ہر کانٹریکٹ سے نکلنے کے سوراخ ڈھونڈ لیتے ہیں' میں ایسی غلطی نہیں کروں گا۔"

"تو پھر آپ میری یہ گفتگو ریکارڈ کر رہے ہوں گے یقیناً" تاکہ مجھے بلیک میل کر سکیں۔"

"ایسا بھی نہیں ہے۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "کیونکہ آپ بہت محتاط الفاظ کا چناؤ کر رہی ہیں' اگر اس منظر کی ویڈیو بنا کر میں فارس کو دکھا بھی دوں تو آپ وکٹم لگیں گی اور میں ولن۔ یوں فیصلہ آپ کے حق میں ہو جائے گا۔ مگر میں ایسا نہیں چاہتا۔"

پہلی بار زمر کو محسوس ہوا کہ کمرے میں تناؤ اور گھٹن بڑھ گئی ہے۔ خطرے کا سائرن دور کہیں زور زور سے بجنے لگا۔ کوئی آواز مگر سنائی نہیں دیتی تھی' صرف سرخ بتی جلتی بجھتی دکھائی دیتی تھی۔ کسی نے اندر کہا کہ اٹھو اور چلی جاؤ' لعنت بھیجو اس کیس پہ' سعدی کو سنبھالنا' مگر جس کا اندر زیادہ زور چلتا تھا' اس نے اس آواز کو دبا لیا۔ کیونکہ "زمر" کا انتخاب زمر نے کر لیا تھا۔

"تو پھر کیسی ضمانت چاہیے آپ کو مجھ سے؟"

انہوں نے جواب دینے کے بجائے میز پہ کھڑا کر کے سیدھے رکھے ٹیبلیٹ کی طرف توجہ مبذول کی اور اسکرین کو چھو کر کچھ دیکھنے لگے۔

"جب آپ اس عمارت میں داخل ہوئی تھیں تو آپ نے اپنا پرس ایکس رے سے گزارا تھا۔ آپ کے پرس کے اندر کی تصویر... اندر تک کا خاکہ میرے پاس کھلا رکھا ہے۔ اس میں ایک چھوٹی چوکور شے نظر آ رہی ہے' جس کے اندر ایک ننھا سا ہیرا موجود ہے۔ یہ تصویر چونکہ پرس کا ایکس رے امیج ہے' یہ صرف ایک خاکہ دے سکتا ہے' مگر میں جانتا ہوں کہ وہ ہیرا اس نوزپن کا ہے' جو کسی زمانے میں فارس غازی نے آپ کو دی تھی۔"

کرسی کی نشست پہ جیسے اس کے ہاتھ نے زور سے لیدر کو بھینچا۔ اس کے کندھے قدرے سیدھے ہوئے۔ لب پھڑپھڑائے۔ آنکھوں میں استعجاب ابھرا۔

"اور جب آپ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ گفٹ دینے والا فارس تھا تو آپ غصے سے گھر چھوڑ کر جنگل کی طرف نکل گئی تھیں۔ اس دن کے بعد سے آپ نے اس کو نہیں پہنا۔ حیران مت ہوں۔ کچھ تو معلومات ہوں نا میرے پاس بھی!"

"یقیناً" یہ میرے ملازم نے کاردارز کے گارڈ کو بتایا ہوگا' سب نوکروں کو خبر ہو گئی تھی اس رات اور ملازم کانوں کے جتنے پکے ہوتے ہیں' زبان کے اتنے ہی کچے ہوتے ہیں۔ خیر' آپ اس نوزپن کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟"

وہ بولی تو آواز میں دبا دبا غصہ سا لگتا تھا۔

"اگر یہ آپ کے پرس میں نہ ہوتی تو مجھے خیال بھی نہ آتا' مگر میری قسمت اچھی تھی۔" وہ ٹیبلیٹ نیچے رکھتے ہوئے مسکرا کر بولے۔ "آپ اسے خود ہی میرے پاس لے آئیں۔" پھر باہم مٹھیاں پھنسائے مزید آگے کو ہوئے اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"مسز زمر... اپنی بات پہ اعتبار دلانے کے لیے آپ مجھے اس سے اچھی ضمانت نہیں دے سکتیں۔ اس ڈبی کو میرے پاس چھوڑ جائیے۔"

آسمان کے سارے تارے ایک دم سمندر میں جا گرے تھے۔ اس کا سانس تک رک گیا تھا۔ "یہ ڈبی؟"

"جی۔ جب آپ یہ وعدہ پورا کریں گی تو میں اسے واپس کر دوں گا۔ نہیں کریں گی تو میں... بلکہ میں کیا کروں گا؟ میری ملکیت میں یہ ڈبی دیکھ کر وہ خود ہی آپ کو چھوڑ دے گا۔ اسی کو ضمانت کہتے ہیں نا۔ اسی کو

کانٹریکٹ اور اگریمنٹ کہتے ہیں نا اور جب آپ نے اسے چھوڑ ہی دینا ہے تو پھر یہ ڈبی کوئی حیثیت تو نہیں رکھتی ہو گی آپ کے لیے۔ سو۔ اسے مجھے دے دیں۔"

تارے سمندر کی سطح پہ چند لمحے تیرتے رہے، مگر تنکے جیسا سہارا بھی نہ ملا تو اندر گرتے چلے گئے... ڈوبتے چلے گئے۔ اس کی بھوری آنکھوں کی جوت بجھ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہارون منتظر سے اسے دیکھے گئے۔ وہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ ان کو بجھی بجھی نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن میں دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی۔ اور دل بند ہونے کو تھا۔

"میں آپ کے ساتھ کسی قسم کی اداکاری نہیں کر رہی۔ لیکن اگر آپ کو صرف اس طرح یقین آئے گا تو اسی طرح سہی۔" پرس سے وہ ڈبی نکال کر اس نے کھول کر میز پہ پٹخی۔ اندر جگمگاتا ننھا ہیرا ڈھیر ساری روشنی منعکس کرنے لگا۔

"یہ لیجیے۔ اگر آپ نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو میں ہاشم کو بتا دوں گی کہ آپ کی بیٹی میرے شوہر کے لیے کیا جذبات رکھتی ہے' اور جب اسے پتا چلے گا تو وہ اس کا کیا حشر کرے گا، آپ کو معلوم ہے سو اب آپ بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

ہارون واقعی چونکے تھے۔ اس کے الفاظ پہ نہیں' اس ڈبی کو دیکھ کر۔ پھر انہوں نے ایک سراہتی نظر زمر پہ ڈالی۔ گویا وہ امتحان میں پاس ہو گئی تھی۔

"وہ بہت جلد خود آپ سے کہے گا کہ اسے یہ کیس لڑنا ہے' یہ میرا وعدہ ہے۔ اسی میں ہم سب کا فائدہ ہے۔"

زمر نے پرس اٹھایا اور ایک کٹیلی نظر ان پہ ڈال کر باہر نکل گئی۔ دروازہ زوردار آواز سے بند کیا تھا۔

باہر راہداری میں چلتے ہوئے اس نے ابلتے آنسو روکنے چاہے مگر وہ نہیں رکے۔ قطرے ٹپ ٹپ چہرے پر لڑھکنے لگے۔ اس نے رک کر دیوار کا سہارا لیا۔ گویا خود کو ڈھے جانے سے روکا ہو۔ بچایا ہو۔ کچھ کھو دیا تھا اور اب دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا تھا۔ چند گہرے سانس لیے۔ چند آنسو بہے اور پھر دوبارہ چلنے لگی۔ اب کی دفعہ آنکھوں کی جوت بجھ چکی تھی۔ مگر چال ویسی ہی تھی۔ محتاط سی۔ ذرا سی پھسلن گرا سکتی تھی اور اسے اب کوئی غلطی نہیں کرنی تھی۔

چند میل دور ہاشم کے آفس کے باہر کھڑی آب دار نے موبائل پہ آیا پیغام دیکھ کر اسے واپس پرس میں ڈالا۔ دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ مگر وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

دروازے کا ہینڈل پکڑتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑائی۔ "اتنا بڑا خطرہ مول لے لوں کیا؟"

پھر سر جھٹکا اور اداسی سے مسکرائی۔

"وہ تمہارے لیے ایسا کبھی نہیں کرے گی فارس۔"

اور پھر اندر داخل ہو گئی۔ آفس ابھی خالی تھا اور حلیمہ کے بقول ہاشم کے آفس آنے میں آدھا گھنٹہ تھا۔ آب دار کو اب آدھا گھنٹہ بیٹھ کر انتظار کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼
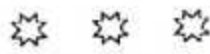
"مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔" حنین یوسف نے اس صبح اس سے کہا تو جواب میں فارس نے سر ہلا کر کہا۔

"مجھے بھی تمہیں کچھ بتانا ہے۔"

وہ دونوں مور چال کے پورچ میں کھڑے تھے۔ اور وہ باہر جانے کی تیاری میں تھا۔

"میں جانتی ہوں۔ آپ کو خاور کے بارے میں بتانا ہے۔ میں بھی وہی بتانا چاہ رہی ہوں۔"

وہ چمکتی آنکھوں اور مغموم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"اس کا ایک بیٹا ہے جو اب واپس اپنی ماں اور دادی سمیت خاور کے گھر آکر رہنے لگا ہے۔ میں نے اس کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کے باپ نے کیا کیا اور کن کے لیے یہ سب کیا۔ اس کا دل بدل گیا ہے اپنے باپ کی طرف سے اور کسی کے لیے اس سے بڑی کیا سزا ہو گی کہ اس کی اولاد کا دل بدل جائے۔ اس کے لیے؟

میرا خیال ہے آپ کو....." وہ جوش سے جلدی جلدی بول رہی تھی۔

قریباً" گھنٹے بھر بعد وہ اس بنگلے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ جینز اور شرٹ میں ملبوس وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، سنجیدگی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سامنے بیٹھا نو عمر لڑکا خاموش تھا۔ وہ الجھا ہوا بھی تھا مگر مقدس خاموشی کو توڑ نہیں پا رہا تھا۔

دفعتاً" چوکھٹ پہ آہٹ سی ہوئی۔ وہ دونوں اس طرف دیکھنے لگے۔ پہلے ایک عورت نمودار ہوئی۔ اس کے دونوں ہاتھ ایک وہیل چیئر کی پشت کو تھامے ہوئے تھے۔ جس کو دھکیلتی ہوئی وہ اندر لا رہی تھی۔ فارس کی نظریں وہیں جم گئیں۔ وہ بس اسے دیکھتا رہا۔

وہ خاور تھا۔

اس کا اکڑا ہوا فالج زدہ جسم وہیل چیئر پر اس طرح رکھا تھا گویا اس میں روح نہ ہو۔ گردن ترچھی، منجمد سی تھی، اور چہرے پر آکسیجن ماسک چڑھا تھا۔ ساتھ ہی چند نالیاں جڑی تھیں۔ اس کے ہونٹ ٹیڑھے میڑھے سے ہو کر ایک ہی زاویے پر جم گئے تھے۔ اور آنکھیں.... صرف وہی حرکت کر سکتی تھیں۔ ان کی سیاہ پتلیاں گھوم گھوم کر فارس کے چہرے سے آ ٹکراتی تھیں۔ ان میں بے بسی تھی۔ خوف تھا۔ دکھ تھا۔

"کیا ان کی بہتری کی کوئی امید ہے؟" اس نے سادگی سے لڑکے کو مخاطب کیا۔ لڑکے نے نفی میں سر ہلایا۔

"ان کا جسم قطعی طور پر مفلوج ہو چکا ہے۔ ہاتھ کی صرف ایک انگلی ہلا سکتے ہیں۔ ایک دفعہ ہلائیں تو مطلب ہے ہاں، دو دفعہ تو ناں۔ بول بھی نہیں سکتے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ قدرتی فالج اٹیک ہے۔ اور ایسی صورت حال میں ہمیں اب سمجھوتا کرنا پڑے گا۔" وہ دبی آواز میں بتا رہا تھا۔

فارس بس گردن موڑے اسے دیکھتا رہا۔ جو سمٹا سمٹا سا وہیل چیئر پر پڑا تھا۔ زرد بے جان چہرہ، انتہائی لاغر، بے حد کم وزن۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ سا انسان۔ اس کی بھیگی نظریں فارس پہ جمی تھیں۔ بہت سے ماہ و سال دونوں کے درمیان فلم کی طرح چلنے لگے تھے۔

"بول نہیں سکتے تو کیا ہوا، سن تو سکتے ہیں نا۔" وہ بہت دیر بعد بولا تھا اور آواز سرد تھی۔

سرد اور سپاٹ....

"جی! سن سکتے ہیں۔" لڑکے نے سر ہلا دیا۔

"تو پھر آج کرنل خاور تمہارے ساتھ کچھ سنیں گے۔ ایک کہانی، جو میں سنانے جا رہا ہوں۔" فارس نے نگاہوں کا رخ اس لڑکے کی طرف پھیرا۔ "اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس کہانی کو ساری عمر یاد رکھو اور روز ان کو یہ کہانی سنایا کرو۔" خاور کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

"میں سمجھا نہیں۔" اب کے لڑکا الجھا۔

"جب میں شروع کروں گا تو سمجھ جاؤ گے۔ پھر بتاؤ شروع کروں؟" اس نے اسی سکون اور اطمینان سے پوچھا۔ لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔

خاور نے بہت کوشش کی کہ وہ چیخے چلائے، گردن ادھر ادھر مارے، اس کی منت کرے، اسے روکے، روئے پیٹے اس کے قدموں میں گر جائے اور اسے منع کرے۔

"میرے بیٹے کو مت بتاؤ۔ خدارا اسے مت بتاؤ۔" مگر اختیار اب اس کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔

"اور اگر کوئی تمہیں کہے کہ انسان کے کیے گئے ظلم گھوم پھر کے اس کے پاس ضرور لوٹتے ہیں تو یقین کر لینا، کیونکہ ایسا ضرور ہوتا ہے۔"

☆ ☆ ☆

ادھر حنین مورچال کے لاؤنج میں بیٹھی، ٹی وی دیکھتے ہوئے خشک میوہ کھا رہی تھی۔ زمر ابھی لوٹی تھی اور خاموش سی ادھر بیٹھی تھی۔ گویا ذہن کہیں دور الجھا ہو۔ سعدی لیپ ٹاپ لیے بیٹھا کچھ پوائنٹس کاغذ پر لکھ رہا تھا۔ وہ انٹرویو کی تیاری کر رہا تھا۔ دفعتاً" حنین اٹھی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ مٹھی میں خشک

میوے بکھرے ان کو وقفے وقفے سے پھلانگتی زینہ چڑھتی اوپر آئی۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور پھر... اس کی دل خراش چیخ سب نے سنی تھی۔

زمر اور سعدی کے خیالات ٹوٹے۔ جیسے انہیں ہوش آیا۔ وہ دونوں اوپر کی طرف بھاگے۔

"حنین کیا..." چوکھٹ تک آتے سعدی کے الفاظ ٹوٹ گئے۔ کمرے کی حالت بتا رہی تھی کہ کیا ہوا تھا۔

ہر شے بکھری ہوئی تھی۔ الماریاں اور اس کی درازیں تک کھلی پڑی تھیں۔ جوتوں والے خانے سے سارے ڈبے نکلے ہوئے تھے۔ لاک والی دراز میں چابی لگی ہوئی تھی اور وہ کھلی ہوئی تھی۔ حنین حواس باختہ سی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ شل ہکا بکا۔ کھڑکی بھی پوری طرح کھلی تھی۔

"حنہ! تم ٹھیک تو ہو؟ کیا ہوا؟" زمر نے بے اختیار اسے کندھوں سے پکڑا۔ اور اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔

"وہ میرے سامنے کھڑکی سے کودا... اور... اور۔" وہ اپنی گردن موڑ کر باہر دیکھ رہی تھی۔ "اس نے دیوار پھاندلی۔"

"کون؟ کون تھا؟" سعدی تیزی سے بالکونی کی طرف بھاگا۔

"ایک آدمی تھا۔ اس نے چہرے پر سرخ مفلر لپیٹ رکھا تھا اور... اور اس کے لمبے بال تھے اور چھوٹا سا قد تھا۔" وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بتانے لگی۔

سعدی واپس اندر آیا۔ اور سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ اسے نیچے جا کر اس آدمی کو پکڑنا تھا۔

"کیا کر رہا تھا وہ یہاں؟ بتاؤ حنین؟"

"اس کے ہاتھ میں میرا میموری کارڈ تھا۔ وہ علیشا والا میموری کارڈ لے کر چلا گیا۔"

"اوہ! میرے اللہ۔" حنین نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ پھر بے ساختہ کھلی دراز کو دیکھا اسے زور کا چکر آیا تھا۔

میرے پاس تو اس کی کاپی بھی نہیں ہے زمر! اب کیا ہو گا؟" زمر نڈھال سی کاؤچ پر گر سی گئی۔ "اب کیا ہو گا؟"

قطر کاردار کے برآمدے کے اونچے ستونوں پہ دھوپ کی پہلی کرنیں گرتی نظر آ رہی تھیں۔ ہاشم موبائل دیکھتا' زینے اترتا' نیچے آ رہا تھا۔ اس کی کار سامنے منتظر سی کھڑی تھی۔ شوفر دروازہ کھولے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ جیسے ہی کار کے قریب آیا۔ ایک گارڈ سامنے تیز تیز چلتا اس طرف آتا دکھائی دیا۔

"سر...!" اس نے عجلت میں پکارا۔ ہاشم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیا ہے؟"

"ایک ملاقاتی ہے آپ کے لیے' ان کا کہنا ہے کہ آپ ان سے واقف ہیں سو ان سے مل لیں۔"

"اس وقت۔" اس نے نخوت سے ابرو اٹھائی مگر پھر وہ ٹھہر گیا۔ گارڈ کے پیچھے آتے ذی نفس کو وہ پہچان گیا تھا۔ پاسپورٹ' انجان کالز' بہت سی کڑیاں ایک ساتھ ذہن میں ملی تھیں۔

"ہیلو مسٹر کاردار!" وہ قدم قدم چلتے ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور ہیروں کی انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ سے کان کے پیچھے بال اڑستی نرمی سے بولی۔ "میں یہ جانے بغیر کہ کس کے لیے کام کر رہی ہوں' آپ کے لیے بہت کچھ کر چکی ہوں پہلے۔ اب بھی فارس غازی کے متعلق آپ کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"آپ کی تعریف؟" وہ انجان بن کر بولا البتہ چہرے کی تمام بے زاری اور کلفت غائب ہو چکی تھی۔ مسکرا کر دلچسپی سے وہ نووارد کو دیکھ رہا تھا۔

"مجھے ڈاکٹر ایمن کہتے ہیں۔ فارس غازی نے میرا ہسپتال جلایا تھا۔ اس نے مجھے تباہ کر دیا۔ تو کیوں نا ہم مل کر اس سے بدلہ لیں؟"

ہاشم کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ "تو وہ آپ تھیں۔ سعدی یوسف کا پاسپورٹ چرانے والی اور یقیناً" پاسپورٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو گا آپ کے پاس۔" مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتا کہہ رہا تھا۔ "وہ آپ تھیں! ہے نا!"

(باقی آئندہ ماہ)

تمثیلہ زاہد

روشنی کا سفر

تاریکی میں بھاگتے بھاگتے اس کے پاؤں شل ہونے لگے تھے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بہت دور نکل آئی ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو صرف تاریکی اور ایک جان لیوا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سامنے ستارے کی طرح چمکتی دور سے نظر آنے والی روشنی اپنی سمت اسے بلا رہی تھی۔ وہ بہت دیر سے اس روشنی کی سمت بھاگ رہی تھی۔ تھکن سے چور جسم اور پھولی سانسوں نے اسے شل کر دیا تھا۔ وہ بے بسی سے اپنے بے جان وجود کو دیکھ رہی تھی جو مزید آگے بڑھنے سے انکار کر رہا تھا۔

اچانک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا اور اس کے جسم سے ٹکراتا ہوا گزر گیا۔ ناکامی کے خوف میں جکڑے بے جان جسم میں اس نے ایک نئی توانائی محسوس کی۔

وہ انجانی قوت کے احساس سے پھر سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے سامنے دور سے نظر آتی امید کی کرن کی طرف دیکھا جو اب بھی ستارے کی طرح ٹمٹما رہی تھی۔ روشنی کو پا لینے کی خواہش نے اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔

تیز... بہت تیز...

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

☼ ☼ ☼

وہ جلدی جلدی معمول کے کام نمٹا رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر برآمدے میں ایک کونے میں رکھے منی پلانٹ پر پڑی۔ نئے پتے تیزی سے نکل رہے تھے۔ چند دن پہلے لایا گیا یہ منی پلانٹ جب آیا تھا تو پانچ پتوں کا مالک تھا۔ اب بیل اونچی ہو گئی تھی اور گملے کے ایک جانب سہارا نہ ہونے کی بنا پر پڑی تھی۔ اس نے ایک موٹی سی ڈنڈی ڈھونڈ ڈھانڈ کر گملے کے بیچ میں گاڑ دی اور بیل کو اس ڈنڈی کے گرد لپیٹ دیا۔ اب منی پلانٹ کے پتے ادھر ادھر بکھرنے کے بجائے ڈنڈی کا سہارا پا کر خوب صورت لگ رہے تھے۔ اس نے محبت سے گملے کو پانی دیا۔ اس منی پلانٹ سے اسے انسیت سی ہو گئی تھی، شاید اس لیے کہ وہ خود اسے خرید کر لائی تھی۔

برآمدے کی جھاڑو دے کر اس نے سوچا آج پانی سے اسے دھو لیا جائے۔ کل دھول مٹی سے ہر چیز اٹ گئی تھی۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ساس کی آواز آنی شروع ہو گئی وہ اسے برآمدے کو دھونے کی تلقین کر رہی تھیں۔ اس نے مسکرا کر اپنا سر جھٹکا اور پانی کی بالٹی بھر لائی اور جھاڑو سنبھال کر برآمدہ دھونے لگی۔ وہ اپنا کام دھیان سے کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی ساس ہر معاملے میں نفاست پسند تھیں۔ کوتاہی کی صورت میں نتیجہ برا بھگتنا پڑتا تھا۔ وہ ایسا کوئی رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

ایک ماہ ہونے والا تھا وہ اپنی بیٹی ماہا کے پیپرز کی وجہ سے امی کے ہاں نہیں جا سکی تھی۔ ساس کا کسی بات پر منہ بگڑ جاتا تو مزید ایک ہفتے کے لیے میکے جانا ٹل جاتا۔ وہ یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ جھاڑو دیتے ہوئے اسے اپنی امی کی ڈانٹ ڈپٹ یاد آنے لگی۔

امی کی ڈانٹ بھی سخت ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس ڈانٹ میں اس کی اصلاح ہوتی تھی۔ طنز کے نشتر نہیں ہوتے تھے۔ امی کی باتوں سے اس کی روح زخمی نہیں ہوتی تھی۔ موڈ خراب ہونے کی صورت میں جب وہ امی کے گلے میں بانہیں ڈالتی تو وہ اس کے ہاتھوں کو بے دردی سے جھٹکتی نہیں تھیں۔ مسکرا کر معاف کر دیتی تھیں۔ کاش اس کی ساس کا لہجہ بھی۔۔۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اس نے جلدی سے دوپٹے سے رخسار کو رگڑ ڈالا۔

وہ ان رویوں کی جلد ہی عادی ہو گئی تھی۔ ساس کا موڈ ہمیشہ ہی ایک جیسا نہیں رہتا تھا۔ جب ان کا کسی بات پر موڈ خراب ہوتا تو وہ خود کو ڈھیروں تسلیاں دے کر وقت گزارنے کی کوشش کرتی۔ شروع شروع میں تلخ رویے برداشت نہ ہوتے لیکن شوہر کا رویہ اس کے ساتھ اچھا تھا۔ وہ اسی بات پر خوش ہو جایا کرتی کہ اس کی زندگی میں کہیں تو روشنی ہے، مکمل اندھیرا تو نہیں۔

☼ ☼ ☼

حسن کے ساتھ اس کی شادی پانچ سال قبل بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ حسن نے اسے ایک شادی کی تقریب میں دیکھ کر اپنی دونوں بہنوں سے اپنی پسند کا اظہار کر دیا۔ دونوں بہنوں کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے ارمان تھے بھائی کی پسند کا سن کر ان کی انا کو شدید ٹھیس پہنچی۔ حسن کے اصرار پر اپنی قریبی سہیلی کے سسرالی رشتہ داروں سے وہ ایمن کو دلہن بنا کر گھر تو لے آئیں لیکن دل سے تسلیم نہ کر سکیں۔

بیوگی کی چادر نے ساس کے لبوں کو خاموش کر دیا تھا۔ اب بیٹے کی بہو پر لٹاتی والہانہ نظروں نے مزید چپ لگا دی تھی۔ حسن ان کی اکلوتی اولاد تھا اور نہایت فرماں بردار بھی۔ اس کا رویہ دونوں کے درمیان صلح جو ہی رہتا۔ اسے ایمن پر مکمل اعتماد تھا کہ وہ اپنی خدمت سے اس کی ماں کا ایک دن دل جیت ہی لے گی لیکن ایمن شادی کے بعد پرت، در پرت پیاز کی مانند کھلتی ساس سے اکثر گھبرا جاتی۔

شادی کے دوسرے دن وہ خود ناشتہ بنانے کچن میں آئی۔ ساس معمول کے کام میں مگن تھیں اس کے سلام کے جواب میں خاموشی سے لب سیئے چائے کا پانی چڑھا رہی تھیں۔ ایمن کا کام کرتی ساس کا خشک رویہ دیکھ کر

دل ہونے لگا۔ ساس پرانے خیالات کی وضع دار خاتون تھیں۔

"میں آپ کا ناشتہ بنادوں امی.... جی۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"بہت شکریہ۔ تم اپنا ہی بنالو۔ کافی ہے میں اپنا ہر کام خود کرتی ہوں۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے میں جاچکی تھیں۔

"کیا ہوا بیگم صاحبہ طبیعت تو ٹھیک ہے۔" حسن، ایمن کو منہ بنا کر ناشتہ ٹیبل پر لگاتے ہوئے دیکھ کر پوچھ رہا تھا۔ ایک دن کی دلہن حنائی ہاتھوں سے کام کر رہی تھی۔

"وہ.... امی کا شاید موڈ کچھ خراب ہے۔" اس کا گلا رندھنے لگا۔

حسن معاملے کی نزاکت کو سمجھ گیا تھا۔ اس نے نرمی سے اس کے حنائی ہاتھوں کو تھام کر اپنے قریب بٹھالیا۔

"تمہیں ان تمام تلخیوں سے نمٹنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا۔ امی کی طبیعت کچھ ایسی ہی ہے۔ وہ تو نہیں بدلیں گی لیکن تم نے خود کو اپنے آپ کو بہتر انتخاب ثابت کرنا ہے۔ جانتی ہو کن حالات میں ہماری شادی ہوئی ہے۔ دونوں بہنیں خالہ زاد میں انٹرسٹڈ تھیں اور.... میں تم میں۔" وہ تھوڑے لفظوں میں اسے بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

ایمن نے اس کا دوسرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے اپنے ساتھ ہونے کا یقین دلا دیا تھا۔ حسن کی روح سرشار ہوگئی۔ وہ بہت جلد حالات کی نزاکتوں سے سمجھوتا کرنے پر تیار ہوگئی تھی۔

✡ ✡ ✡

"کیا ہوا، باجی کی دعوت میں جانے کے لیے تیار کب ہوگی؟" وہ واش روم سے اپنا گیلا سر جھاڑتا ہوا نکلا تھا۔ ایمن بستر پر منہ پھلائے دراز تھی۔

"دعوت آپ کی بہن کی ہے، آپ ہی جائیے۔" اس نے رخ پھیر لیا۔

"محترمہ! یہ دعوت باجی نے اپنی نئی بھاوج کے لیے رکھی ہے۔ ہم بیچارے تو ویسے ہی...." وہ شوخ ہوتے ہوتے اس کے قریب آکر ہاتھ تھامتے ہوئے بول رہا تھا کہ ایمن نے تیزی سے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"دعوت میری ہے اور مجھے ہی خبر نہیں۔" وہ منہ چھپائے دھاڑیں مار کر رونے لگی تو حسن گھبرا گیا۔

"اچھا چپ ہوجاؤ، بات کیا ہے۔"

"بات صرف اتنی ہے کہ آپ کے گھر میں میری کوئی عزت نہیں۔" وہ بھڑکی۔

"اچھا ٹھیک ہے ہم دعوت پر نہیں جانا چاہتیں، مت جاؤ مگر اپنا موڈ درست کرلو پلیز۔ چلو، تمہیں سنانے کے لیے آج میرے پاس ایک قصہ ہے۔"

"کیسا قصہ۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بچوں کی طرح منمنائی۔

"ایک بہت خوب صورت عورت تھی جس کا نام تھا مہو، مہو چار بھائیوں کے بعد پیدا ہوئی تھی اس لیے گھر کی بے حد لاڈلی تھی۔ مہو گاؤں کے سادہ ماحول میں پلی بڑھی۔ کچھ بڑی ہوئی تو مولوی صاحب سے دینی تعلیم مدرسے میں جاکر حاصل کی اس کی اماں نے اپنی مہو کو ہر ہنر میں طاق کر رکھا تھا۔ وہ سترہ برس کی ہوئی تو بیٹھک کے بیٹے سے مہو کی شادی کردی گئی۔

مہو کے شوہر شکیل نے شہر سے بی اے کیا تھا۔ وہ وہیں نوکری بھی کر رہا تھا۔ مہو کو لے کر شہر چلا آیا۔ شادی کے شروع کے دن مہو پر بڑے سخت گزرے۔ اس کا شوہر ایک کمپنی میں کلرک اور کرائے کے ایک کمرے کے مکان میں رہتا تھا۔ مہو اس قلیل آمدنی میں گزارہ کرتی رہی لیکن جب بیٹی دنیا میں آئی تو گزارہ مشکل ہوگیا۔ آمدنی کم اور اخراجات زیادہ۔ اس نے لوگوں کے کپڑے سینے شروع کردیے۔

لوگ مہو کا ہنر دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ مہو کی دن رات کی محنت رنگ لائی اور کچھ آمدنی ہونے لگی جس سے گزر بسر آسانی سے ہوجاتی۔ مہو کا شوہر شکی مزاج تھا اس لیے اس کے کہیں آنے جانے پر پابندی تھی۔ مہو پڑوس میں بھی بلا اجازت نہیں جاسکتی تھی۔ مہو کا اثاثہ اس کے بچے تھے جو ایک کے بعد ایک اس کی

چھوٹی میں آتے رہے۔ پھر ایک دن جس فیکٹری میں شکیل کلرک تھا' وہ بند ہو گئی سارے مزدور اور ملازم ملازمت سے محروم ہو گئے۔

شکیل ملازمت کے لیے روز دھکے کھاتا۔ جب بے روزگاری میں چھ ماہ گزر گئے تو نوبت فاقوں تک آ گئی۔

ایک دوست کے کہنے پر وہ دوسرے شہر بیوی اور تین چھوٹے بچوں کے ہمراہ آ گیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لیا اور ایک فیکٹری میں چھوٹی موٹی ملازمت گزارے لائق کرنے لگا۔ کراچی ایک بڑا شہر تھا جہاں کوئی فقیر بھی سڑک پر بھوکا نہیں سوتا۔ فیکٹری کی ملازمت شکیل ایمانداری سے کرتا رہا۔ مالک نے اس کی تعلیمی قابلیت دیکھتے ہوئے اسے کیش کاؤنٹر پر رکھ لیا جہاں وہ ایمانداری سے حساب کتاب کا کام سنبھالنے لگا۔ بچے بڑے ہونے لگے اور اسکول جانے لگے تھے۔

سرکاری اسکول میں بچوں کا داخلہ کرایا گیا۔

مہو نے یہاں بھی اپنی ہنرمندی کے جوہر دکھائے۔ وہ اپنے شوہر کا ہر مشکل میں ساتھ دیتی رہی۔ ساری زندگی مہو نے مصیبت' پریشانی اور زندگی کی مشکلوں سے نمٹنے میں لگا دی۔ مگر اللہ کا شکر کہ اس کے تینوں بچے لائق نکلے۔

جب مہو نے اپنی کمر سیدھی کرنی چاہی تو شکیل نے زندگی کی بازی ہار دی۔ لیکن زندگی کی بازی ہارنے سے پہلے وہ مہو کو ایک چھت دے گیا۔ جس کی آرزو اس نے عمر بھر کی تھی۔ وہ ساری زندگی کرائے کی چھتوں کے نیچے گزارتی رہی' جب اپنی چھت نصیب ہوئی تو اس کا ساتھی سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔ مہو پھر اکیلی رہ گئی۔

حسن خاموش ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا۔" وہ سحرزدہ جیسے کسی طلسم سے آزاد ہوئی تھی۔

"کیسی لگی یہ کہانی؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"بہت اچھی۔"

اور مہو؟" حسن نے اشتیاق سے پوچھا۔

"مجسم قربانی' سچ پوچھیں تو عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ گھر گرہستی کے پیچھے اپنی ہستی مٹا دیتی ہیں۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی طلب گار۔"

"اور اگر ان کے مزاج میں تلخی ہو تو؟"

"وہ تو حالات کا نتیجہ ہوتی ہے' اگنور کر دینا چاہیے۔"

"بالکل' میں بھی تو یہی کہتا ہوں۔ کیا جاننا نہیں چاہو گی کہ مہو کون ہے۔"

"کون ہے؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"مہو تمہاری ساس ہیں' ان کا پورا نام مہرالنساء ہے اور ہم ان کے تینوں بچے' ان کی پرمشقت زندگی کے گواہ ہیں۔"

ایمن نے چونک کر حسن کی طرف دیکھا۔ پھر شرمندگی سے نظریں جھکا لیں۔

وہ نہ جانے کیا کیا کچھ حسن سے کہتی رہی تھی۔ ساس کی شخصیت کا یہ رخ تو اس سے پوشیدہ تھا۔ اس کا دل و دماغ تاریکی سے روشنی تک کا سفر طے کرنے لگا۔

"آپ کی امی بہت عظیم ہیں۔" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"کیا واقعی؟" حسن خوش تھا کتنی آسانی سے اس نے ماضی کے پردے کھول دیے۔

"جی۔" اس نے سر ہلا دیا۔

"اور میری بہنیں۔" حسن نے اس کا حنائی ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھاما۔

"وہ عظیم ماں کی بیٹیاں ہیں اور مجھے اتنی ہی عزیز ہیں جتنی میری ساس کو۔" اس نے اپنے مضبوط سائبان کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

وہ پچھلے کئی دنوں سے خود کو تاریکی میں بھاگتے دیکھ رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ حسن ہوا کا ٹھنڈا جھونکا بن کر اس کی زندگی میں آیا ہے اور وہ خود کو اب روشنی کے ہالے میں دیکھ رہی تھی۔ وہ اکیلی نہیں تھی' اس نے حسن کے ساتھ ساتھ اپنی ساس کا بھی ہاتھ تھام رکھا تھا۔

☆

کل اور آج

میں جب چھوٹا سا اک بچہ تھا
میری زندگی کے دو مراکز تھے
میرا گھر اور میرا بستہ
مرے گھر میں مرے ماں باپ کی شفقت کے
اجلے پھول کھلتے تھے
کبھی میں دیر سے آتا تو میری منتظر ملتی تھی میری ماں
سرد ہلیز، دروازے پہ پھیلائے ہوئے باہنیں
کڑکتی سردیوں میں وہ سدا گیلی جگہ سوتی
مجھے سوکھا ہوا، آرام دہ بستر عطا کرتی
مرے ابا مجھے ہر عید پر اچھے سے اچھا بوٹ پہناتے
اور ان کے پاؤں کے بوسیدہ جوتے مسکرا دیتے
وہ عیدیں جا چکیں، وہ دن مرے ماضی کا حصہ ہیں
میں اب خود باپ ہوں
اور عید سے دو چار دن پہلے
خریداری کی خاطر گھر سے جب باہر نکلتا ہوں
تو نظریں سب سے پہلے ڈھونڈتی ہیں وہ دکانیں
جن میں اچھے بوٹ ملتے ہیں
تصور میں مرے ابا کا چہرہ مسکراتا ہے

اعتبار ساجد

تھے خواب ایک ہمارے بھی اور تمہارے بھی
پر اپنا کھیل دکھاتے رہے ستارے بھی

سوال یہ ہے کہ آپس میں ہم ملیں کیسے!
ہمیشہ ساتھ تو چلتے ہیں دو کنارے بھی

کسی کا اپنا محبت میں کچھ نہیں ہوتا
کہ مشترک ہیں یہاں سود بھی خسارے بھی

یہی سہی تیری مرضی سمجھ نہ پائے ہم
خدا گواہ! کہ مبہم تھے کچھ اشارے بھی

وہ اب جو دیکھ کے پہچانتے نہیں امجد
ہے کل کی بات یہ لگتے تھے کچھ ہمارے بھی

امجد اسلام امجد

شگفتہ نگاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

" اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، پھر جب اسے پکڑتا ہے تو چھوڑتا نہیں۔"

پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

ترجمہ۔ آپ کے پروردگار کی پکڑ کا یہی طریقہ ہے۔ جب وہ بستیوں میں رہنے والے ظالموں کو پکڑتا ہے۔"

فوائد ومسائل ،۔

مجرم کو اللہ کی طرف سے فوری سزا نہ ملے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ چھوٹ گیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ایک خاص وقت تک مہلت دیتا ہے پھر اچانک پکڑ لیتا ہے۔ مجرموں کو مہلت دینے میں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا اظہار ہے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر ہدایت قبول کرلیں اور اس طرح وہ عذاب سے بچ کر انعام کے مستحق بن جائیں۔

حضرت موسیٰ ؑ،

موسیٰ قدیم مصری زبان کا لفظ ہے جو دو کلمات (مو + شا) کا مرکب ہے۔ مو کا مطلب پانی جبکہ شا کا مطلب شجر یعنی درخت ہے۔ آپ کو موسیٰ اس لیے کہا گیا کیونکہ آپ کی والدہ نے آپ کو فرعون کے ڈر سے پانی میں ڈال دیا تھا۔ اس طرح آپ صندوق میں بند فرعون کے محل پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے آپ کو نکال لیا۔ اور آپ کو موسیٰ یعنی پانی سے نکلا ہوا کہا جانے لگا۔

فرزانہ مغل۔ واہ کینٹ

علم،

ایک چھوٹا لڑکا بھاگتا ہوا شیوانا (قبل از اسلام کے ایران کا ایک مفکر) کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

" میری ماں نے فیصلہ کیا ہے کہ معبد کے کاہن کے کہنے پر عظیم بت کے قدموں میں میری چھوٹی، معصوم سی بہن کو قربان کردے گی۔ آپ مہربانی کر کے اس کی جان بچالیں۔"

شیوانا لڑکے کے ساتھ فوراً معبد میں پہنچا اور کیا دیکھتا ہے کہ عورت نے بچی کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے جکڑے ہوئے ہیں اور چھری ہاتھ میں پکڑے آنکھ بند کیے کچھ پڑھ رہی ہے۔ بہت سے لوگ اس عورت کے گرد جمع تھے اور بت خانے کا کاہن بڑے فخر سے بت کے قریب ایک بڑے پتھر پر بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔

شیوانا جب عورت کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ اسے اپنی بیٹی سے بے پناہ محبت ہے اور وہ بار بار اس کو گلے لگا کر والہانہ چوم رہی ہے۔ مگر اس کے باوجود معبد کدے کے بت اور اس کی خوشنودی کے لیے اس کی قربانی بھی دینا چاہتی ہے۔

شیوانا نے اس سے پوچھا۔" وہ کیوں اپنی بیٹی کو قربان کرنا چاہ رہی ہے"؟ تو عورت نے جواب دیا۔

" کاہن نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں معبد کے بت کی خوشنودی کے لیے اپنی عزیز ترین ہستی کو قربان کر دوں تاکہ میری زندگی کی مشکلات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔"

شیوانا نے مسکرا کر کہا۔" مگر یہ بچی تمہاری عزیز ترین ہستی تھوڑی ہے۔ جسے تم نے ہلاک کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ تمہاری جو ہستی سب سے زیادہ عزیز ہے وہ تو پتھر پر بیٹھا یہ کاہن ہے کہ جس کے کہنے پر تم ایک پھول سی بچی کی جان لینے پر تل گئی ہو۔ یہ بت احمق نہیں ہے۔ وہ تمہاری عزیز ترین ہستی کی قربانی چاہتا ہے۔ تم نے اگر کاہن کے بجائے غلطی سے اپنی بیٹی قربان کر

دی تو یہ نہ ہو کہ بت ہم سے مزید خفا ہو جائے اور تمہاری زندگی کو جہنم بنادے۔"

عورت نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بچی کے ہاتھ پاؤں کھول دیے اور چھری ہاتھ میں لے کر کاہن کی طرف دوڑی مگر وہ پہلے ہی وہاں سے جا چکا تھا۔ کہتے ہیں اس دن کے بعد وہ کاہن اس علاقے میں پھر کبھی نظر نہ آیا۔"

اس سے بڑا دکھ اور کوئی نہیں کہ ہم جس پر اعتماد کرتے ہیں وہ ہمیں دھوکا دے جائے۔ دنیا میں صرف آگاہی کو فضیلت حاصل ہے اور واحد گناہ جہالت ہے۔

(مولانا جلال الدین محمد بلخی کی کتاب "مثنوی معنوی" سے ایک حکایت)

عشق،

ایک صاحب عشق کے موضوع پر لمبا چوڑا لیکچر دے رہے تھے۔ لیکچر کے دوران کئی بار انہوں نے عشق کی نشانیاں بتائیں کہ جب کسی شخص کو عشق ہو جاتا ہے تو اس کی نیند اڑ جاتی ہے۔ بھوک ختم ہو جاتی ہے اور اسے دن رات کا بالکل پتا نہیں چلتا کہ کب صبح ہوئی اور کب شام۔

سامعین میں ایک شخص جسے بہت نیند آرہی تھی اور بھوک بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ کھڑے ہو کر بولا۔

جناب یہ تو بتائیے اس کے برعکس جب کسی کو بہت زیادہ نیند آئے اور بھوک بھی زیادہ لگنے لگے تو کیا ہوتا ہے؟"

تقریر ختم کرنے والے صاحب نے بھی جمائی لی اور آرام سے بولے۔

"اس نے عشق کرنے کا انجام دیکھ لیا ہوتا ہے۔"

تصور،

ایک دفعہ جنگل میں دن کے وقت۔ ایک چیتے اور گدھے کی بحث ہوئی۔ چیتے نے کہا۔ آسمان کا رنگ نیلا ہے اور گدھے نے کہا کہ کالا ہے۔ حالانکہ بات چیتے

کی ٹھیک تھی تو چیتے نے کہا۔

"چلو جنگل کے بادشاہ شیر کے پاس چلتے ہیں۔" دونوں شیر کے پاس گئے اور واقعہ سنایا تو شیر نے کہا۔

"چیتے کو جیل میں ڈالو۔"

چیتے نے احتجاج کیا "بادشاہ سلامت! بات میری ٹھیک ہے اور جیل مجھے جانا پڑ رہا ہے تو بادشاہ نے کہا۔

"بات سچ اور جھوٹ کی نہیں، تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے ایک گدھے سے بحث کی۔"

الوینہ دانش، فرینہ دانش۔ حیدر آباد

حماقت

پانی سے آگ بجھ سکتی ہے۔ چھتری سے دھوپ رک سکتی ہے۔ لکڑی سے دوسرے جانور رک سکتے ہیں۔ ہر بیماری کی ایک دوا ہے۔ ہر گناہ کی تلافی کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ ہے لیکن احمقوں کی حماقت کسی طرح دور نہیں ہو سکتی۔

(فرینکلن)

فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

ہم سنائیں دل کی کتاب

- تجربات کا، لوگوں کا، حادثات کا کچھ طے نہیں ہوتا ہے۔ وہی تجربہ جو ایک شخص کو کندن بناتا ہے، کسی دوسرے کو چکنا چور کر دیتا ہے۔
- اس دنیا میں شاید آدمی اسی کا رشتے دار ہوتا ہے جس کو وہ یاد کرے، کرتا رہے، کرتا ہی چلا جائے۔
- نہ آدمی آنسوؤں کا بوجھ اٹھا سکے نہ بادل پانی کا۔
- چیزیں خریدنے میں کتنی لذت ہوتی ہے چاہے وہ پرانی ہوں۔
- منزلوں کو پالینا کتنی بڑی قباحت ہے۔ سب کچھ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ خود منزل بھی۔
- شارٹ کٹ کتنا بھی صاف کیوں نہ ہو، اس کا میلا پن آنکھوں سے اور دل سے کبھی نہیں جاتا۔

آمنہ اجالا۔ ڈہرکی

حکمت عملی

ایک مشہور طبیب بیان کرتا ہے کہ ایک نوجوان بغداد سے رے کی طرف آرہا تھا کہ راستے میں بیمار ہو گیا۔ بیماری یہ تھی کہ جب پانی پیتا۔ اس کے حلق سے تھوڑا سا خون نکل آتا تھا۔ رے پہنچ کر وہ حکیم محمد بن زکریا کی خدمت میں حاضر ہوا اور مرض کا حال بیان کیا۔

محمد بن زکریا نے نبض دیکھی تو مرض کی کوئی علامت نہ پائی۔ سمجھ گئے کہ یہ عارضی خرابی ہے۔ مریض سے پوچھا۔ "راستے میں کیسا پانی پیا تھا؟"

مریض نے جواب دیا۔ "تالاب کا۔ کیونکہ اس راستے میں تالاب کا پانی ملتا ہے۔"

محمد بن زکریا بولے۔ "علاج تو کروں گا، مگر اس شرط پر کہ تمہارے خادم میری ہدایتوں کی پوری پوری تعمیل کریں۔"

نوجوان نے وعدہ کر لیا۔ حکیم صاحب نے اس کے غلاموں کو حکم دیا کہ تھوڑی سی کائی لے کر آؤ۔

وہ کائی لے آئے تو حکیم صاحب نے مریض سے کہا کہ اسے کھاؤ۔

مریض نے بہت تھوڑی سی کائی کھائی۔ زیادہ کھانے کو جی نہ چاہا۔ زکریا نے اس کے غلاموں کو حکم دیا کہ اسے لٹا کر زبردستی کھلاؤ۔

غلاموں نے تعمیل کی۔ اس کے بعد مریض کو بٹھا دیا گیا۔ چند لمحوں کے بعد اسے متلی ہو کر قے ہوئی اور طبیعت کو سکون حاصل ہو گیا۔

محمد بن زکریا نے فرمایا کہ قے میں کوئی جونک ہو گی۔ اسے نکالو۔"

غلاموں نے دیکھا تو واقعی جونک نکلی۔ معلوم ہوا کہ تالاب کے پانی کے ساتھ یہ جونک مریض کے معدے میں چلی گئی تھی اور معدے سے چمٹ گئی تھی۔ چونکہ جونک اور کائی دونوں پانی کی چیزیں ہیں اس لیے مریض کو کائی کھلائی گئی اور کائی دیکھ کر وہ معدے سے الگ ہو گئی۔

ارم کمال کی ڈائری سے

میری ڈائری میں مرتضیٰ برلاس کی ایک شاندار غزل جو میں اپنی بہنوں کی نذر کرتی ہوں۔

جب لوگ ہی جذبوں کی توقیر نہیں کرتے
ہم بھی کوئی دکھ اپنا تحریر نہیں کرتے

دل چیر جاتا ہے لہجے کا یہ روکھا پن
کرتی ہے زباں وہ کچھ، جو تیر نہیں کرتے

موسم اگر اکساتے جب چاہے چلے آنا
ہم رات کو دروازہ زنجیر نہیں کرتے

اس دور میں ہم ان کو کہتے ہیں مفکر جو
تنقید تو کرتے ہیں، تدبیر نہیں کرتے

نوال افضل گھمن کی ڈائری سے

انسان کو زندگی میں سب کچھ نہیں مل جاتا۔ زندگی سمجھوتوں کا نام ہے۔ اعتبار ساجد نے اس غزل میں اسی نارسائی کا شکوہ کیا ہے۔

ایسا نہیں کہ ہم کو محبت نہیں ملی
ہم جیسی چاہتے تھے وہ قربت نہیں ملی

ملنے کو زندگی میں کئی ہمسفر ملے
لیکن طبیعتوں سے طبیعت نہیں ملی

چہروں کے بے کراں ہجوم میں ہم ڈھونڈتے رہے
صورت نہیں ملی، کہیں سیرت نہیں ملی

وہ یک بیک ملا تو بہت دیر تک ہمیں
الفاظ ڈھونڈتے کی بھی مہلت نہیں ملی

ہر شخص زندگی میں بہت دیر سے ملا
کوئی بھی چیز حسب ضرورت نہیں ملی

ثوبیہ قطب کی ڈائری سے

جب دل کا شور حد سے سوا ہو جائے لیکن باہر ایک سناٹا سا آپ کو گھیرے ہوئے ہو اور آپ اپنے جذبات کا اظہار نہ کر پا رہے ہوں تو پھر کسی شاعر کی غزل یا نظم میں اسے تلاشتے ہیں۔ مرزا آثم کی یہ غزل میری ڈائری سے اپنے احساسات کے ساتھ۔

آنسوؤں میں ہنسی کے جیسا ہے
اپنا غم بھی خوشی کے جیسا ہے

ایک بس تم ہمارے جیسے ہو
کون ورنہ کسی کے جیسا ہے

اک خوشی موت کی علامت ہے
ایک غم زندگی کے جیسا ہے

ہر کوئی آپ کے نہیں جیسا
ہر کوئی آپ ہی کے جیسا ہے

کون سنتا ہے شورِ دل آثم
شور یہ خامشی کے جیسا ہے

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

زینت محبوب علی..... کراچی

پہلے ہی سال سے آپ کے پرچوں کی قاری ہوں خاموش قاری مگر آپ کو خط لکھنے پر نعیمہ ناز کی تحریر "میری ماں" نے مجبور کیا۔ آج سے کئی سال پہلے خواتین میں یا شعاع میں نعیمہ ناز نے ہی یہ افسانہ لکھا تھا اور مجھے یہ افسانہ نہیں سچی داستان لگی۔ اور اب جون کے ڈائجسٹ میں یہ شک یقین میں بدل گیا کہ وہ کہانی واقعی نعیمہ ناز کی والدہ کی کہانی تھی۔ کیونکہ وہی مشرقی پاکستان کے دریاؤں کا ذکر وہی ایک ایک من کٹھل لگے درختوں کا ذکر۔ شاید اس کہانی سے میں زیادہ اس لیے متاثر ہوئی کہ میری والدہ بھی برما کے شہر (رنگون) میں پیدا ہوئیں وہیں جوان ہوئیں اور جب جرمن جاپان کی جنگ چھڑی تو میری نانی جو کہ برمی مسلمان 'نانا مسلمان اور بلوچ تھے۔ نانا کی سب جائداد برما میں ہی تھی۔ ربڑ کے باغات تھے بہت بڑے بڑے دس دس میل کے رقبے تک پھیلے ہوئے۔ دھان چھڑنے کے کارخانے تھے کرشر مشین تھی۔ کئی بنگلے برما کے مختلف شہروں میں بنے ہوئے تھے۔ جنگ چھڑنے سے نانا 'نانی سب کچھ وہیں چھوڑ کر آگئے۔ تو نانی سب بچوں کو لے کر تین مہینے کا سفر پیدل کر کے لکھنؤ اسٹیشن پہنچیں۔ وہاں پر نانا پہلے سے ہی موجود تھے۔ پھر لکھنؤ سے ریل کا سفر کر کے کئی رشتہ داروں کے ساتھ کراچی پہنچے۔ پھر اماں جب تک زندہ رہیں' رنگون کو یاد کرتی رہیں۔

۔ پھر یہ داستان ہم کسی سے نہیں سنیں گے۔ رنگون' میں آج تک بھی وہ (ربڑ اسٹیٹ) موجود ہے۔ نامولے روڈ رنگوں میں ان کا گھر موجود ہے۔ مگر وہاں جو رشتے دار رہ گئے تھے ان کے بچوں نے وہ گھر چینی لوگوں کو بیچ دیا۔ وہ گھر جہاں دن رات نانا اور ان کے دو بھائی تلاوت کلام پاک کرتے 'سب گھر والے نماز پڑھتے' سنا ہے کہ وہ گھر اب سؤر کا فارم بن گیا ہے۔ اور آخر میں نعیمہ ناز کا ایک اور افسانہ تھا۔

میرے خیال میں انہوں نے سابقہ چیف جسٹس کی ایمان داری 'اخلاق اور رحم دلی سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ کہ انہوں نے جیل میں پھنسی ایک بے گناہ عورت کو انصاف دلایا تھا۔

ج : زینت جی! کسی پرچے کی اس سے بڑی کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ بیک وقت تین نسلوں کا پسندیدہ پرچا ہو آپ جیسی قارئین کے خط ملتے ہیں تو خواتین سے وابستگی کے بارے میں جان کر دل بے اختیار اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ یہ صرف رب کا کرم ہے۔ اسی کی عطا کردہ عزت ہے۔ بے شک وہی عزت دینے والا ہے۔

نعیمہ ناز کی جس کہانی کا آپ نے ذکر کیا' آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ انہوں نے اپنی والدہ کی کہانی لکھی تھی۔ لیکن چیف جسٹس والی کہانی نعیمہ ناز کی نہیں تھی وہ نمرہ احمد نے لکھی تھی اور اس کہانی کا عنوان تھا۔ "پہاڑی کا قیدی" اس کہانی کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ نمرہ احمد نے یہ کہانی صرف ایک دن میں لکھی تھی کیونکہ اس وقت یہ خیال تھا کہ پیپلز پارٹی حکومت میں آکر فوراً" ججوں کو بحال کردے گی۔ اگرچہ ایسا نہیں ہوا پیپلز پارٹی اقتدار میں آکر اپنے تمام وعدے بھول گئی اور چیف جسٹس کو بحال کرانے کے لیے نواز شریف کو احتجاج کے لیے باہر نکلنا پڑا۔

صحانہ یسن نے سوہاوہ سے لکھا ہے

میری نقل کر کے مت لکھو اچھا! اوہو بھئی یہ آپ کو نہیں 'اپنی کزن کو کہہ رہی ہوں جو میری طرح آپ کو اپنا پہلا خط لکھ رہی ہے۔ ویسے میرا تو خیال تھا کہ پہلے کے بجائے ڈائریکٹ آٹھواں نواں خط ہی لکھتی کیونکہ آٹھواں نواں جلدی نظر میں آجاتا ہے۔ اب بات ہو جائے۔ اپنے جیتے کی یعنی نمل "اللہ اللہ" نمرہ جی کیا خوب صورت لکھتی ہیں۔ اللہ کریم اجر عطا فرمائے۔ آمین آب حیات ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا۔

سائرہ رضا اپنے نام کی طرح ہمیشہ ہی خوب صورت لکھتی ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں ایمل رضا اور بنت سحر اچھا اضافہ ہیں لیکن سحر۔۔! لفاظی تھوڑی کم کیا کرو پلیز۔ انٹرویوز میں شوبز کے علاوہ مذہبی شخصیات کو بھی سامنے لائیں نا آمنہ ریاض کا ناول بھی اچھا جا رہا ہے باقی مستقل سلسلے بھی سب اچھے ہیں۔

پیاری صحانہ! خط آٹھواں نواں ہو یا پہلا وہ ہماری پیار بھری نظروں سے بچ کے کہیں جا نہیں سکتا۔ یہ الگ بات کہ وہ پرچے میں شامل ہو پاتا یا نہیں۔ خط شائع ہونے کے لیے اس کا جان دار اور شمارے سے متعلق ہونا ضروری ہے۔

سیدہ سعدیہ اشرف۔۔۔۔ ملیر کراچی

ایک نظر "کرن کرن روشنی" پر' رمضان کے حوالے سے بہترین ٹاپک تھا ہمیں اس کی ضرورت تھی۔ مجھے اعتکاف میں بیٹھنا ہے ان شاء اللہ 'اس کے لیے اللہ آپ کو جزائے خیر دے کہ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتکاف سے واقف کیا۔ دعا کیجیے گا اللہ میرا اعتکاف قبول فرمائے۔ صلوۃ تسبیح کا طریقہ آپ نے لکھا ۔ایک رکعت میں 75 کلمہ مکمل ہو گا لیکن اس طرح 65 ہو رہے ہیں۔

غزالہ روشن کا ناول "انصاف" شروع سے آخر تک اچھا لگا۔ بہت الگ انداز تھا لکھنے۔ "نمل" ناول بہت گڈمڈ ہو گیا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کسی نے "فاورڈ" کا بٹن دبا کر کہانی کو جلدی جلدی آگے بڑھا دیا ہے اور سب مکس کر دیا ہے۔ "آب حیات" تو ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا۔ عمیرہ احمد لکھنا کیا چاہ رہی ہیں۔ "دشت جنوں" ہمیشہ کی طرح بہترین تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی بدروح نہیں ہے اور بسامہ کو ڈرانے کا کام کسی انسان کا ہے اور الماری میں دم گھٹنے کی وجہ سے اس کی موت ہوئی آمنہ ریاض سے گزارش ہے کہ کہانی کے صفحات بڑھا دیں ابھی پڑھنا شروع کرو اور ابھی ختم ہو جاتی ہے۔

ج۔ سعدیہ !صلوۃ التسبیح کی نماز کا جو طریقہ ہم نے لکھا ہے' وہ بالکل درست ہے۔ ہم نے اسے حدیث کی مستند کتابوں سے نقل کیا ہے' آپ نے جو طریقہ لکھا ہے' وہ درست نہیں ہے۔

نماز میں جب پہلا سجدہ کر کے بیٹھتے ہیں تو اسے جلسہ کہتے ہیں۔ پہلے سجدہ کے لیے جب بیٹھیں تو دعائیں پڑھنے کے بعد یہ کلمات دس بار پڑھیں۔

پھر دوسرے سجدے میں چلے جائیں اور یہ کلمات دس بار پڑھیں پھر سجدہ سے سر اٹھائیں اور (جلسہ استراحت) میں بھی یہ تسبیحات پڑھیں۔ جلسہ کی دعا نہ پڑھیں۔ آپ شاید دوسرے سجدہ کے بعد کی تسبیحات گننا بھول گئی ہیں۔

خالدہ قمرالدین۔۔۔۔ فیصل آباد

"نمل" بہت اچھی کہانی ہے۔ سعدی نے بھگا بھگا کر میرے گھٹنوں میں درد کر دیا۔ فارس کی جگہ ندرت جاتیں اور دو جوتے لگا کر لے آتیں۔ میں نے تو شکر ہی کیا کہ بچہ آگیا۔ اب نمل کا اختتام ہو جانا چاہیے بلاوجہ طوالت مزہ کر رہی ہے۔ غزالہ روشن کا انصاف اچھی محنت تھی 'کوئی نئی مصنفہ لگتی ہیں پہلی ہی بار نام سنا۔ ناولٹ سائرہ رضا نے اچھا لکھا۔ اچھا ہی لکھ لیتی ہیں۔ اور حیا بخاری کا "بارش کے بعد" بہت ہی اچھا لگا بہت عرصے بعد لکھا مگر کمال لکھا۔ پھر شعاع میں بھی نظر آئیں شاباش۔ افسانے بس ٹھیک سے تھے۔

اچھا ایک بات بتائیں' سیدھی سادی کہانی کو پیچ دار الفاظ 'مشکل اصلاحات 'متروکہ اردو استعمال کر کے کیا بڑی مصنفہ بن جاتے ہیں۔ یہ چند نئی رائٹرز عجیب ہی لکھ رہی ہیں۔ خوامخواہ خود کو مشکل میں ڈال کر مشکل الفاظ ڈھونڈتی ہیں پھر کہانی میں بھر دیتی ہیں حالانکہ عام فہم اور سادا اصلاح زیادہ پر اثر ہوتی ہے۔

اب آسیہ بھی تو لکھتی ہیں۔ ان کا کتنا نام ہے۔ مجال

ہے۔ جو کوئی الجھے الجھے لفظ ہوں۔ جیسی کہانی ویسی بات اور سائرہ کتنا سادہ لکھتی ہیں۔ بچیوں! ایسی کوشش کیا کرو۔ نمرہ کی کہانیاں کتنی پیچ دار ہوتی ہیں لیکن اصطلاح عام فہم ہوتی ہے اس لیے سمجھ میں آجاتی ہے۔ خاموشی کو بیاں ملے اس میں ثوبیہ نور کا تعارف اچھا لگا۔ گفتگو سے سیدھی سی پیاری سی بچی لگ رہی ہے۔ اور یہ سروے میں مصباح علی، بھئی میں تو اس سے ناراض ہوں کرن میں بھی سروے یہاں بھی دے دیا۔ کہا جاتا ایک کہانی بھی لکھ دیتیں اور جس کہانی کا انہوں نے ذکر کیا "جنون قلب" ہاں بھئی بھلے وہ ٹریجک تھی مگر تھی واقعی خوب لکھ دو ایک اور ویسی ہی۔ اور یہ میری بہو سنعیہ، کہہ رہی ہے اسے افسانہ "رنجش ہی سہی" رمشہ ناز کا بہت پسند آیا۔ سلام دے رہی ہے۔۔

پیاری بہن خالدہ! یقین جانیں آپ کا خط پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔ بہت سیدھے سادے انداز میں بڑا دلچسپ تجزیہ کیا ہے آپ نے۔ نئی رائٹرز کے لیے جو کچھ آپ نے لکھا ہے ہم تو سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ ہمارے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اپنی بہو اور بچوں کو ہماری طرف سے پیار دیجیے گا۔ اور ندرت کی جگہ فارس نے دو جوتے لگائے تو تھے سعدی کو۔ اصل میں ندرت بھی اس عمر میں اپنے بچوں کی ناراضی مول نہیں لے سکتیں۔

ارم کمال...... فیصل آباد

اس دفعہ کا ٹائٹل خواتین کے خوب صورت ترین ٹائٹلز میں سے ایک تھا۔ اسد محمود سے ملاقات خوب رہی۔ دشت جنوں بہت ہی دلچسپ جارہا ہے۔ کیف اور خوش نصیب کی نوک جھونک۔ اس ناول کی جان ہے آب حیات کا دائرہ کافی دیر سے بچوں کے گرد ہی گھوم رہا ہے۔ امامہ اور سالار کی چبھتی گفتگو کہاں غائب ہوئی۔ سائرہ رضا کا نام پڑھتے ہی دل جوش سے بھر جاتا ہے۔ "پس آئینہ" نے یہ جوش تین گنا زیادہ کردیا اور سب کو آف شور کمپنیوں کا مطلب اچھی طرح سے سمجھ میں آگیا۔ دیگر کہانیوں میں "رشتے ناتے" اور "وقت سے پہلے" بہت ہی جاندار اور سبق آموز تحریریں تھیں۔ "میڈا اوی تے کوئی ہووے" ثمینہ عظمت کی ہنستی مسکراتی اور گدگداتی ہوئی تحریر تھی۔ پڑھنے کے دوران ہونٹ پھیلے ہی رہے۔ "دیوی کا درجہ" جیسی کہانیاں مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔ اتنا صبر اور درگزر دراصل ظلم کی ہی ایک قسم ہے۔ "بارشیں مقدر کی" حیا بخاری کی بہت ہی دل سے لکھی گئی تحریر تھی جس نے دل جیت لیا۔ نعیمہ ناز کا "میری اماں" دل کے چاروں کونوں کو نم کر گیا۔ باجی اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں مستقل تبصرہ لکھوں تو آپ کو اس خط کو ہر صورت شائع کرنا پڑے گا ورنہ.....

ج۔ ورنہ کیا؟ بھئی ارم! آپ کے خطوط تو اکثر و بیشتر شامل ہوتے ہیں پھر بھی ورنہ دھمکی؟

نادیہ صدیقہ...... بونگہ بلوچاں

اس ماہ پورے کا پورا شمارہ ہی بہت بہترین ہے۔ "کرن کرن روشنی سے" دل کو منور کیا۔ انٹرویوز میں مصباح علی! کا انٹرویو بہت بہت اچھا تھا۔ مصباح کا انداز اتنا پیارا ہوتا ہے کہ بے ساختہ ان پہ بھی پیار آنے لگتا ہے۔ کتنی کیوٹ ہیں مصباح علی آپ! خاموشی کو بیاں ملے میں ثوبیہ نور کا انداز اچھا ہے۔ مزاحیہ اور شگفتہ سا۔

"پس آئینہ" میں سائرہ آپی نے سب کو جو آئینہ دکھانے کی کوشش کی اس میں وہ کامیاب رہیں۔ سائرہ رضا جو کچھ کہنا چاہتی ہیں بے دھڑک، بے تکلفی سے کہہ ڈالتی ہیں۔ جو سیدھا ہم تک پہنچتا ہے۔ کوئی بل شل نہیں۔ کوئی سجاوٹ و آرائش نہیں زبردست بھئی آپی۔

"دشت جنوں" آمنہ آپی کا ناول بہت اچھا ہے۔ ناول میں مکالمے بڑے کمال کے ہوتے ہیں۔ آمنہ آپی کا "ماہ تمام" بھی میرا فیورٹ ناول ہے۔ آمنہ آپی آپ کی کہانیوں کو ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو میں یہی کہوں گی "دلچسپ" ثمینہ عظمت، آپ جب بھی آتی ہیں تو اس انداز میں کہ "کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے"۔

"اعتراف" کے بارے میں کیا کہوں۔ مجھے "بنت سحر" کا انداز بہت اچھا لگتا ہے۔ نمرہ احمد اور عمیرہ احمد میں یہ کہوں گی کہ آپ دونوں کے لیے ابھی میرے پاس وہ الفاظ نہیں آتے ہیں۔ بہرحال.....

میں اب نمرہ کی ہر آنے والی قسط کے اینڈ میں ضرور دیکھتی ہوں کہ کہیں ناول ختم تو نہیں ہوگیا۔ اور پھر شکر ادا کرتی ہوں کہ ابھی آخری قسط نہیں آئی۔ خیر یہ وہ واحد رائٹر ہیں جن کی کہانی دل چاہتا ہے کہ ختم نہ ہو۔

ج: پیاری نادیہ! آپ نے تفصیلی تبصرہ کیا، بہت اچھا

لگا۔ پورا شائع نہیں کر سکتے مجبوری ہے۔ ثمرہ تک آپ کی ڈھیر ساری تعریف ضرور پہنچا دیں گے۔ آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں گئی ہیں۔

ثمرہ احمد بٹ..... پتوکی

جی جناب اب آپ کی خدمت میں بہت بہت محبت بھرے کئی زمانوں کے اکٹھے سلام۔ نمرہ احمد نمل کے ساتھ قراقرم کا تاج محل ' بیلی راجپوتاں کی ملکہ سے بھی بہت آگے نکل گئی ہیں یہ ان کے ناول جنت کے پتے سے بھی زیادہ میرا فیورٹ ناول ہے زمر' فارس ' سعدی' حنین ' ندرت ' آبدار ' ہارون اور ہاشم فیملی سب بہت اہم اور جاندار ترین کردار مزید ابھر کر سامنے آرہے ہیں۔ ساتھ ساتھ قرآنی تفسیر کے ذریعے پیغامات کا سلسلہ لوگوں کی اصلاح کے لیے۔ اس کے بعد آئے کت کی طرف آتے ہیں ۔فلک بوس کی طرف۔ نجانے کون سا آسیب یہاں منڈلا رہا ہے۔ بڑی انٹرسٹنگ اسٹوری ہے۔ آمنہ ریاض اسے دھیرے دھیرے لے کر کامیابی سے آگے بڑھیں گی لیکن باجی جان ہم سنہری شاموں میں انتظار کرتی سجنی ساجن کی کہانیاں چاہتے ہیں۔ پیاری پیاری یادوں بھری' رومانٹک' ہمیں اس دنیا کی تلخیوں سے تھوڑا تھوڑا نہیں بلکہ زیادہ دور کریں تاکہ سال بھر ذہن مہکتے رہیں شکریہ۔

ج : پیاری ثمرہ! بہت سارے اکٹھے سلاموں کا وعلیکم اسلام۔ نئی نویلی قارئین کو کچھ نہ کہیں' جب وہ آپ کی طرح اولڈ از گولڈ ہو جائیں گی نا تو بچاری ردی کی ٹوکری کی' آپ ہی کی طرح ہماری سائیڈ لیا کریں گی۔ ہاہاہ! اب یہ سجنی اور ساجن کی کہانیاں کہاں سے لائیں کہ وہ دونوں فیس بک اور ٹوئیٹر کی دنیا کے راہی بن چکے۔ رومانس کے لیے صفحات نہیں موبائل کام آنے لگا۔ دیکھیں' پھر بھی کوئی بھولا بھٹکا راہی پکڑا گیا تو آپ کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔

اور ثمرہ آپ سے ایک درخواست ہے' آپ سطر چھوڑ کر لکھا کریں۔ آپ کی تحریر گڈمڈ ہو جاتی ہے ہمارے کمپوزر کو پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔

مسز فرحانہ طاہر..... اسلام آباد

افسانے سارے ہی اپنے اندر "تلخی اور چڑچڑا پن" لیے ہوئے تھے خشک اور بہ مشکل ہضم ہونے والے۔ چلو گزارا ہو گیا' پڑھ لیے تھے۔

"دشت جنون" کی اس دفعہ کی قسط بھی اچھی لگی "وسامہ" کی موت کا بے حد افسوس ہوا اب "آیوشمتی" کی گتھی بھی سلجھا ہی دیں۔ آمنہ ریاض سے کہوں گی "ویلڈن" اور "کیپ اٹ اپ" یہ دونوں بہنیں آمنہ ریاض' تنزیلہ ریاض کم لکھتی ہیں مگر شاندار بلکہ جاندار لکھتی ہیں۔ نعیمہ ناز کا میری اماں پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔

ایک میرا مسئلہ بھی حل کر دیں مجھے انڈا بنانا نہیں آتا۔ نہ ہاف فرائی نہ فل فرائی نہ آملیٹ پہلے تو ابالنا بھی نہیں آتا تھا جب بھی ابالتی انڈا اندر سے کچا ہی ہوتا اب آگیا ہے مگر فرائی وغیرہ کے چکر میں انڈا صحیح بنتا نہیں ہے بلکہ انڈے کی سمیل ہی ختم نہیں ہوتی۔ پتا نہیں کیا وجہ ہے۔ بیوٹی بکس میں اگر آپ "سفید بالوں" کا حل بتائیں تو اچھا ہو گا۔

آپ اکثر کہتی ہیں کہ خط شائع ہو یا نہ ہو' ہم پڑھتے ضرور ہیں اس لیے ہمیں بلا جھجک خط لکھا کریں۔

میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ لو اس میں کیا مزہ ہے میں نے آپ کو خط لکھا آپ نے پڑھا اور ایک سائیڈ پہ ڈال دیا۔ چلو جی بات ہی ختم ہو گئی۔ اور یہ عائشہ فیاض کہاں غائب ہو گئی ہیں۔

ج : فرحانہ! انڈا بنانے کی ترکیب ہم کیسے بتا سکتے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مرغی کو بھی پتا نہیں ہو گا کہ انڈا بنتا کیسے ہے۔ ویسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ آپ سے انڈا صحیح نہیں بنتا یوسفی صاحب تو کہتے ہیں کہ انڈے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پھوہڑ سے پھوہڑ عورت بھی مزے دار بنا لیتی ہے۔

آپ کا سات صفحات پر مشتمل خط پڑھ لیا۔ اتنا ٹیلنٹ کافی نہیں۔ یہ مفت کے مشورے بہت جمع ہو گئے ہیں ہمارے پاس۔ اس پر تو ایک کتاب شائع ہو سکتی ہے۔

بیوٹی بکس والے تو آپ کو بعد میں بتائیں گے۔ پہلے ہم بتا دیں کہ سفید بالوں کا ایک ہی حل ہے کہ ان کا احترام کریں اور کس نے کہا کہ ہم خط پڑھ کر سائیڈ پہ ڈال دیتے ہیں۔ سچ ان کا تعویذ بنا کر گلے میں لٹکاتے پھرتے ہیں۔

زندگی دھوپ' ہم گھنا سایہ مریم عزیز نے لکھی تھی۔

عفت سعید' ندا عمران..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

سرورق کی ماڈل دوپٹہ لیے پیاری لگ رہی تھی۔ اس دفعہ تعریف تو صرف نمل کی ہے کیونکہ اس کے علاوہ ابھی کچھ پڑھا نہیں۔ عید قرباں پہ مہندی کے ڈیزائن بھیجنا چاہتی ہوں اس کا طریقہ کار بتادیں۔

ج : پیاری عفت سعید! اب تک تو عید قرباں پر گوشت بھیجا جاتا تھا۔ یہ نئی روایت ہے کیا کہ آپ مہندی کے ڈیزائن بھیجنا چاہتی ہیں۔ خیر! جس طرح یہ خط بھیجا ہے' اسی طرح مہندی کے ڈیزائن بھیج دیں۔ آپ کا نہ سہی ہمارا دل تو بڑا ہے کہ جو بھی بھیجیں گی قبول کرلیں گے۔

مہ جبیں' جویریہ' آصفہ..... ملتان

ایک تو ہم بھائی کی منتیں کرکے خواتین شعاع اور کرن منگواتے ہیں۔ لیکن جب ان کی اسٹوریز پڑھتے ہیں تو دل بیٹھ جاتا ہے کہ ہماری رائٹرز کو کیا ہوگیا ہے کہ کہانی کے مین تھیم سے لے کر اس کے گرد گردش کرتے کرداروں کے ناموں تک میں یکسانیت ہے۔ یہ کہانیاں اس لیے پڑھی جاتی ہیں کہ ریلیکسیشن ہو اور ساتھ ہی دور حاضر کے حالات بھی پتا چل جائیں۔ اور انسان اپنی زندگی کی تلخیوں کو بھلا کر اس کہانی کی رنگینی اور دلکشی میں کھو کر سکون محسوس کرے۔

ج : پیاری مہ جبین! جویریہ اور آصفہ! امید ہے کہ ان سطور کے ذریعے آپ کی فرمائش اور فہمائش ہماری رائٹرز اور قارئین دونوں تک پہنچ جائے گی۔

سحر فاطمہ' نور فاطمہ..... گ۔ب سونڈھ

غزالہ آپی کا ناول انصاف بہت پیارا تھا پر نہ میکو شمبھ نی آئی (مجھے سمجھ نہیں آئی) کہ وہ جو بزرگ تھا۔ وہ انصاف والی بات کس پہ فٹ کی گئی ہے۔ کرن کرن روشنی' خبریں وبریں اور آمنہ الیاس اور اسد محمود سے باتیں بھی بہت اچھی لگیں۔ "میڈا ابھی کوئی ہووے" پڑھ کے ہنس ہنس کے برا حال ہوگیا۔ اور سائرہ آپی تو ہمیشہ کی طرح بہت ہی اچھا لکھتی ہیں پس آئینہ زبردست تحریر تھی۔ افسانے بھی اچھے تھے دیوی کا درجہ اور اعتراف نے تو رلا ہی دیا اب ذرا بات ہو جائے میرے فیورٹ ناول "نمل" کی نمرہ آپی کو کہیں نظر ہی نہ لگ جائے۔ ویسے تو میں آیت الکرسی پڑھ کر آپ پہ پھونک دیتی ہوں تصور میں۔ اور پلیز آبدار کو بھی کوئی برا مت کہا کرے۔ وہ بے چاری اتنی اچھی تو ہے' اتنا ساتھ دیتی ہے فارس ماموں کا۔ اور پلیز نمرہ آپی آبدار کی شادی ہاشم سے بالکل مت کروایئے گا۔ فارس اور سعدی بھی ضروری نہیں ہیں ان کے لیے کوئی اور ہوگا اچھا سا جو اللہ نے ان کے لیے بنایا ہے۔ آپی آپ نے کہا تھا۔ ہاشم کی خوب صورتی کی وجہ سے کوئی جلاد اسے پھانسی نہیں دیتا تو میں حاضر ہوں ہاشم اور جواہرات کا قیمہ بنانے کے لیے۔

ج : سحر اور نور! جس طرح آپ کو آبدار اچھی لگتی ہے۔ اسی طرح ہاشم کے چاہنے والے بھی بہت ہیں۔ اپنی حسنین بی بی ہی انہیں بہت پسند کرتی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ہاشم جیسے لوگوں کو دنیا میں سزا بہت کم ملتی ہے۔ ان کا انصاف تو روز قیامت ہی ہوگا اور ہم خود بھی تو نہیں چاہتے کہ کوئی بے گناہ ان کے خون میں ہاتھ رنگے اور قاتل کہلائے۔ اور جواہرات کا قیمہ بنا کر کیا کریں گی۔ جب اسے پکا کر کھا ہی نہیں سکیں گی۔

انصاف والی بات کا مطلب یہ تھا کہ کوئی بھی غلطیوں اور گناہوں سے مبرا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور سب کے لیے صرف رحم مانگیں۔ انصاف نہیں۔

ثناعابد..... قلعہ احمد آباد

سرورق پر ماڈل گرل دیکھ کر بھی ایک خوشگوار احساس ہوا۔ صلوٰۃ تسبیح کا صحیح طریقہ جان کر اپنی غلطی کی اصلاح ہونے پر بے حد خوشی ہوئی۔ اس کے لیے آپ کا بہت شکریہ۔

"اعجاز کا رنگ" میں مصباح علی سے ملاقات بہت زیادہ پسند آئی۔ ان کا انداز بہت دوستانہ لگا۔ "رنگا رنگ پھول" میں تمام اقتباسات اقوال پسند آئے پکوان میں ہر دفعہ ساری تراکیب بہت پسند آتی ہیں۔ اس دفعہ قاری بہنوں کے تبصرے مزے کے لگے خاص طور پر "ام سعدی" کا لکھا خط اور اس پر آگے سے آپ کا جواب۔ "دیوی کا درجہ" بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔ اور صرف اس میں عورت کی اس قدر مظلومیت معصومیت دکھانے کی وجہ ہے۔ صرف اس دکھ کی وجہ سے لگ رہا تھا اور تو جیسے دنیا میں دکھ ہی ختم ہوگئے۔

"اعتراف" بنت سحر کی بہت عمدہ تحریر تھی۔ انداز بیان

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بہت زبردست دل چھو لینے والا تھا۔ رنجش ہی سہی بھی ہلکی پھلکی سی شاعرانہ انداز میں بیان کی گئی مختصر تحریر اچھی تھی۔ "وقت سے پہلے" اور "رشتے ناتے" سب سے زیادہ یہ دونوں تحریریں پسند آئیں۔

ناولٹ میں "پس آئینہ" لاجواب رہی۔ سائرہ رضا کا اسٹائل واقعی میں بڑا منفرد اور انوکھا ہے "میڈا بھی کوئی ہووے" پڑھ کر تو موڈ فریش ہو گیا۔

خاندان کی تمام خواتین کے ہاتھ کی بریانی کا ایک جیسا ذائقہ والی بات تو ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ بارشیں مقدر کی سادہ سی ہلکی پھلکی کہانی اچھی تھی مگر ایسا حقیقت میں کہاں ہوتا ہے مکمل ناول انصاف بہت اچھا لگا۔

ج : پیاری ثناء! خوش رہیں۔ شمارے کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں ہمیں آپ کی محبت کا بخوبی احساس ہے کہ کیسے مصروفیات سے وقت نکال کر لکھتی ہیں اور پھر کتنی دقتوں اور دشواریوں سے گزر کر پوسٹ کرواتی ہیں۔ پھر خط شائع ہونے کا انتظار اور شائع نہ ہونے پر مایوسی سے دل مسوس کر رہ جانا۔

عورت ہو یا مرد دنیا میں دکھ تو اتنے ہیں کہ شمار ہی نہیں کیے جاسکتے لیکن اس معاشرے میں عورت کے صبر، مظلومیت اور بے بسی کی کوئی حد ہے نہ حساب۔

بنت حوا..... چوک سرور شہید

ستمبر 2015ء سے اپریل 2013ء تک رسالوں سے میرا تعلق، کہانیوں میں صرف "نمل" اور "آب حیات" تک محدود ہو گیا۔ خطوط ہر ماہ پڑھتی تھی۔ باقی رسالے بالکل چھوڑ رکھے تھے۔ پھر کرن میں پھر شعاع میں میرے سامنے کچھ کہانیوں کے منظر ایسے آئے .... جو کہ ہماری سوچ کے لیے اچھے نہیں تھے۔

یہ باتیں کچے ذہنوں پہ غلط اثر ڈالتی ہیں اگرچہ سچ ہے کہ خواتین و شعاع لڑکیوں کی سوچ کو بہتر بنانے زندگی کے حقائق سبق سکھانے میں مثبت کردار ادا کر رہے ہیں....

کچھ عرصہ پہلے 2011ء میں ایک سدرہ سحر عمران ہوتی تھیں اب ایک بنت سحر نظر آرہی ہیں کیا یہ ایک ہی مصنفہ ہیں؟ اصل میں مجھے شعاع و خواتین سے بہت پیار ہے ان ہی کی وجہ سے میری زندگی بدلی تو میں یہ چاہتی ہوں کہ اب بھی یہ ویسے ہی رہیں اچھے اور پراثر (مثبت)...

"جنت کے پتے" کی قسط پڑھی اکتوبر 2012ء اور اگلے دن عبایا اور نقاب میں اکیڈمی گئی اور اللہ کا شکر ہے یہ پردہ (سب نامحرم سے)

ج : پیاری بنت حوا! اس سے پہلے بھی آپ کے خطوط شامل اشاعت رہے ہیں۔ اور رہی بات تنقید کی تو مثبت اور تعمیری تنقید کے تو ہم خود بہت بڑے قدردان ہیں۔ لہٰذا آپ سب قارئین دل کھول کر اور اپنی آرا کا بے دھڑک اظہار کر سکتی ہیں۔ پرنٹ میڈیا ہو کہ الیکٹرونک میڈیا وہاں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے 'اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے پرچے اس وبا سے محفوظ ہیں اگر آٹے میں نمک کے برابر برائی دکھائی بھی جاتی ہے تو اس کے پس پردہ بھی یہی سوچ کار فرما ہوتی ہے کہ جب تک برائی اور اس کا انجام سامنے نہیں ہو گا۔ نیکی و بھلائی کا تصور کھل کے سامنے نہیں آئے گا۔ باقی مزید احتیاط برتیں گے۔

سدرہ سحر عمران اور بنت سحر دو مختلف شخصیات ہیں۔ سائرہ رضا کے ناول میں آپ کو بے باکی نظر آئی لیکن حمیرا نے جو کچھ کہا وہ عشق و محبت کا سلسلہ نہیں تھا۔ بلکہ احسان شناسی' رشتوں سے محبت' پاس وفا کا سلسلہ تھا۔ اس کے چچا نے اسے بیٹی سمجھا تھا۔ باپ کا پیار دیا تھا چچا زاد سے بچپن سے رشتہ طے تھا۔ اب کچھ بننے کے بعد ان سے نظریں پھیر لینا کیا مناسب تھا؟

سرورق کی شخصیت

ماڈل	---فریحہ اعجاز، رانیا خان اور نینا بتول
میک اپ	---------روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی	---------موسیٰ رضا

فوزیہ ثمر بٹ ________ گجرات

ثبوت ڈھونڈو گے تو عمریں بیت جائیں گی
کہا نا یاد آتے ہو تو... بس یاد آتے ہو

فرحین ظفر، سیمی ظفر ________ کراچی

کبھی کسی روز یوں بھی ہوتا
ہماری حالت تمہاری ہوتی
جو رات ہم نے گزاری مر کے
وہ رات تم نے گزاری ہوتی

صدف عمران ________ کراچی

ہزار راتیں مڑ کے دیکھیں کہیں سے کوئی صدا نہ آئی
بڑی وفا سے نبا ہی تم نے ہماری تھوڑی سی بے وفائی

ماریہ شیخ ________ نامعلوم مقام

اتنا آسان بھی نہیں اپنی ہستی سے گزر جانا
اترا جو سمندر میں تو دریا بہت رویا
جو شخص نہ رویا تھا تپتی ہوئی راہوں میں
سایۂ دیوار میں بیٹھا تو بہت رویا

بریرہ اکرام ________ اورنگی ٹاؤن

تمہارا ساتھ تسلسل سے چاہیے مجھ کو
تھکن زمانے کی کب لمحوں میں اترتی ہے

ندا طارق ________ فیصل آباد

دنیا تو کیا خود سے بھی کرتے رہے گریز
جب تک ملے کسی سے نہیں سے ملے
جو بے طلب تھا اس کی ہمیں جستجو رہی
جو ملنا چاہتا تھا اس سے نہیں ملے

قرۃ العین عباسی ________ کراچی

ڈوبتا جاتا ہے بے وصل چراغوں کا دھواں
پھیلتا جاتا ہے اک ہجر مسلسل جاناں
ہم سے کچھ تیرے مراسم ہی بڑے گہرے تھے
ورنہ صحراؤں میں رکتے نہیں بادل جاناں

نازیہ سرور ________ لاہور

زندگی رین بسیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ نفس عمر کے پھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
جس کو نادان کی بولی میں صدی کہتے ہیں
وہ گھڑی شام سویرے کے سوا کچھ بھی نہیں

شائستہ رشید ________ لاہور

تو محبت کی زمیں سے مجھے آواز تو دے
آسماں پر بھی ہوا میں تو اتر آؤں گا

سعدیہ ارشد ________ لاہور

کرم کی بھیک کسی سے کبھی نہیں مانگی
کہ سرکشوں میں ازل سے شمار ہے میرا
میرے خلوص نے بخشا ہے تیرے دل کو گداز
مجھے فخر ہے کہ تو غمگسار ہے میرا

فہمیدہ کوثر ________ چینچل والا

حقیقتوں کے جہاں میں ہے صرف تاریکی
بہشت زار تو خوابوں میں پائے جاتے ہیں
تیرا یہ شوق سلامت مگر جہاں میں رہوں
وہاں چراغ نہیں دل جلائے جاتے ہیں

سیما خالد ________ احمد پور شرقیہ

اب یہ سوچوں تو بھنور ذہن میں پڑ جاتے ہیں
کیسے چہرے ہیں جو ملتے ہی بچھڑ جاتے ہیں
کیوں تیرے درد کو دیں تہمت ویرانی دل
زلزلوں میں تو بھرے شہر اجڑ جاتے ہیں

سائرہ خان ________ بہاولپور

ہماری چپ بھی ان کے واسطے نہ مسئلہ ٹھہرے
وضاحت سے یہ بہتر ہے قبیلہ چھوڑ دیتے ہیں
اگر ان کا یہ کہنا ہے تو دل پہ جبر کر کے ہم
جو ان کے گھر کو جاتا ہے وہ رستہ چھوڑ دیتے ہیں

ڈراما سیریل شہر کی اتنی کا عکس

عاصم محمود سے باتیں

شاہین رشید

1 ”پورا اور اصلی نام؟“
”عاصم محمود۔“

2۔ ”پیار کا نام؟“
”عاصم ہی ہے کوئی نک نیم نہیں ہے۔“

3۔ ”تاریخ پیدائش / شہر؟“
”16 جنوری 1988ء / سیالکوٹ۔“

4۔ ”قد / ستارہ؟“
”5 فٹ 9 انچ / کیپری کورن۔“

5۔ ”بھائی / بہن۔۔۔ آپ کا نمبر؟“
”تین بھائی ایک بہن اور میرا تیسرا نمبر ہے۔“

6۔ ”تعلیمی قابلیت؟“
”ایم بی اے۔۔۔۔ اے پی ایس پروفیشنل ڈگری ہے۔“

7۔ ”شادی؟“
”ابھی اس سوال کو رہنے دیں۔“

8۔ ”آپ بننا چاہتے تھے؟“
”میرا ارادہ تھا کہ میں آرمی میں جاؤں یا بزنس کی طرف آؤں۔۔۔۔ مگر قدرت یہاں لے آئی۔“

9۔ ”شوبز میں آمد؟“
”اپنے ٹیلنٹ کی وجہ سے آیا ہوں۔“

10۔ ”پہلا ڈراما سیریل / وجہ شہرت؟“
”قرض“ تھا اے آر وائی سے آن ایئر ہوا تھا / ”جنت“ وجہ شہرت بنا۔“

11۔ ”پہلی بار کمائے؟“
”سات ہزار تھے جو امی کو دے دیے تھے انہوں نے ہی خرچ کیے۔“

12۔ ”آپ کا سورج کب طلوع ہوتا ہے؟“
”اگر شوٹ پہ جانا ہو تو جلدی اٹھ جاتا ہوں۔ ورنہ ذرا آرام سے ہی اٹھتا ہوں۔“

13۔ ”صبح اٹھ کر پہلا کام؟“
”برش کرنا۔۔۔۔ نہانا۔۔۔۔ پھر ناشتہ۔“

14۔ ”ناشتہ ہیوی ہوتا ہے؟“
”نہیں جی۔۔۔۔ ڈائیٹ پہ ہوں ‘جم جاتا ہوں اور پھر کچھ کھانا ہو تو خود ہی کچھ پکا لیتا ہوں۔ ویسے دلیہ صبح کے وقت کھاتا ہوں۔“

15۔ ”مادری زبان؟“
”پنجابی۔“

16۔ ”بھوک اور دھوپ برداشت ہو جاتی ہے؟“
”بھوک ہو تو کچھ نہ کچھ کھا لیتا ہوں۔ نخرے نہیں دکھاتا۔ اور دھوپ بہت اچھی لگتی ہے مگر سردیوں

میں" (قہقہہ)

17۔ "ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟"

"تعلیم اسپتالوں کا اچھا نظام اور انصاف۔"

18۔ "فخر کا کوئی لمحہ؟"

"ہر وہ لمحہ فخر کا ہوتا ہے جب میرے والدین کے سامنے لوگ میری تعریف کرتے ہیں۔"

19۔ "بھول نہیں سکتے؟"

"جب میں نے "ہیرو بننے کی ترنگ" جیتا تھا۔ کئی ہزار لوگوں میں سے۔"

20۔ "بچپن کی کوئی بری عادت جو ابھی تک موجود ہو؟"

"جذباتی ہوں بچپن سے۔"

21۔ "تھکن میں بھی کہاں جانا مشکل نہیں لگتا؟"

"دوستوں میں۔"

22۔ "آپ کو انتظار رہتا ہے؟"

"اس دن کا جب مجھے "چیک" ملنا ہوتا ہے۔"

23۔ "خوشی کا لمحہ؟"

"جب چھٹیوں میں یا ویسے ہی اپنی فیملی کے ساتھ سیالکوٹ میں ہوتا ہوں۔۔۔۔"

24۔ "ضدی ہیں؟"

"بہت زیادہ نہیں۔ جہاں احساس ہو جائے کہ یہ کام نہیں ہو سکتا۔ میں اسے سرانجام دینے کی کوشش نہیں کرتا۔"

25۔ "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"سیل فون۔"

26۔ "غصے میں کیفیت؟"

"غصہ کم آتا ہے۔۔۔۔ اور جس پر غصہ آتا ہے پھر اس سے بات نہیں کرتا۔"

27۔ "سات دنوں میں پسندیدہ دن؟"

"جمعہ۔"

28۔ "بارہ مہینوں میں پسندیدہ مہینہ؟"

"سردیوں کے سارے مہینے۔"

29۔ "خواتین میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"

"ہر خاتون مختلف ہوتی ہے۔ لیکن پڑھی لکھی اور ڈیسینٹ خواتین اچھی لگتی ہیں۔"

30۔ "لڑکیوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"

"خوب صورت لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔"

31۔ "کوئی لڑکی بدتمیزی کرے تو؟"

"تو بس۔۔۔۔ ختم میری کتاب سے وہ خارج ہو جاتی ہے۔"

32۔ "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"ابو کے غصے سے۔"

33۔ "کچھ وقت سے پہلے ملا؟"

"نہیں یا تو تھوڑی دیر میں ملا ہے یا پھر جو کچھ ملا وقت پہ ہی ملا ہے۔"

34۔ "بچت کا بہترین طریقہ؟"

"یا تو پراپرٹی لے لیں یا کسی کے ساتھ شراکت داری کر لیں۔"

35۔ "سیاحت پسند ہے؟"

"بہت زیادہ۔۔۔۔ پوری دنیا گھومنے کی خواہش ہے۔ مگر رہنا اپنے ملک میں ہی ہے۔"

36۔ "بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی آپ کے پاس ہو؟"

"ساتویں یا آٹھویں کلاس میں تھا تو میرے ابو نے ایک بیٹ لا کر دیا تھا وہ ابھی بھی میرے پاس محفوظ ہے۔"

37۔ "بچپن کی کوئی غلطی جس کی سزا آج تک یاد ہو؟"

ہنستے ہوئے۔ "دادی کی پلی پلائی ایک مرغی میری وجہ سے مر گئی تھی تو دادی اماں نے بہت مارا تھا۔"

38۔ "شاپنگ میں آپ کی پہلی ترجیح؟"

"کپڑے خریدتا ہوں۔"

39۔ "پیسہ خرچ کرتے وقت خیال آتا ہے کہ؟"

"کہ فضول خرچ نہ کرو بلکہ کسی ضرورت مند کو دے دو۔"

40۔ "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"

"لاہور کی انار کلی والی فوڈ اسٹریٹ۔"

41۔ "برا وقت گزارہ؟"

"بالکل..... بچپن میں مجھے یاد ہے کہ والد صاحب کا بزنس پارٹنر کافی سارا پیسہ لے کر بھاگ گیا تھا تو گھر میں سب کو پریشان دیکھا تھا میں نے۔"

42۔ "موڈ اچھا ہو جاتا ہے جب؟"

"جب کوئی لطیفہ سنا دے۔ یا کوئی اچھا شو دیکھ لوں تو۔"

43۔ "پسندیدہ پروفیشن؟"

"آرمی اور ڈاکٹر۔"

44۔ "تحفے میں کیا دیتے ہیں؟"

"سامنے والے بندے کے مزاج کے مطابق تحفہ دیتا ہوں۔"

45۔ "آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتے ہیں؟"

"کام ہو تو جلدی اٹھ جاتا ہوں ورنہ الارم ایک ایک گھنٹے کا لگاتا رہتا ہوں۔"

46۔ "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"

"وہ آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔"

47۔ "عورت ذہین ہو یا حسین؟"

"ذہین.... اکثر حسین خواتین بے کار ہوتی ہیں۔"

48۔ "آپ کے والٹ کی تلاشی لیں تو؟"

"پیسے' ابو کی تصویر۔ وزٹنگ کارڈز آئی ڈی کارڈ.... کریڈٹ کارڈز وغیرہ۔"

49۔ "گھر میں عموماً" کس لباس میں دستیاب ہوتے ہیں آپ؟"

"ہنستے ہوئے.... نارمل شارٹس اور ٹی شرٹ۔"

50۔ "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"اپنے کمرے میں۔"

51۔ "چھٹیاں کس طرح گزارتے ہیں؟"

"زیادہ تر تو میں سیالکوٹ اپنی فیملی کے پاس چلا جاتا ہوں اور پھر فیملی کے ساتھ آگے کہیں گھومنے پھرنے نکل جاتا ہوں۔"

52۔ "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتے ہیں؟"

"اپنی فیملی کے۔"

53۔ "فارغ اوقات کے مشاغل؟"

"مووی دیکھ لیتا ہوں۔ مطالعہ کرتا ہوں۔"

54۔ "کس کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"

"کوئی بہت ہی جذباتی فین مل جائے اور اس کو نمبر دے دوں تو پھر وہ بہت تنگ کرتے ہیں۔ تب افسوس ہوتا ہے کہ نہ دیتا۔"

55۔ "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"

"بچپن میں سکے جمع کرنے کا شوق تھا۔ مگر اب کپڑے جمع کرتا ہوں کہ ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔"

56۔ "نعمت جو بری لگتی ہے؟"

"ایسی نعمت جس کا میری ذات سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔"

57۔ "زندگی کا سنہری دور؟"

"بچپن کا دور۔ کہ بے فکری ہوتی ہے۔ بندہ مست ملنگ ہوتا ہے۔ کھیلنا کودنا پڑھنا لکھنا اور کھانا پینا۔"

58۔ "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"

"بہت زیادہ..... بہت زیادہ۔"

59۔ "اپنے لیے ایک قیمتی چیز جو خریدی؟"

"کار۔"

60۔ "کھانا کھانے کا مزہ آتا ہے ڈائننگ ٹیبل پہ۔ چٹائی پہ یا اپنے بیڈ پہ۔"

"چٹائی..... بہت اچھا لگتا ہے چٹائی پہ بیٹھ کر کھانا۔"

61۔ "دنیا سے کیا لینا چاہتے ہیں؟"

"مجھے حوصلہ افزائی چاہیے..... میرا کام پسند آئے تو میری تعریف کریں۔"

67۔ "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"

"کافی ہے.... کیونکہ ہمارا کافی کام فیس بک سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔"

68۔ "کھانا کھاتے وقت سنت پہ عمل کرتے ہیں یا چھری کانٹے استعمال کرتے ہیں؟"

"ماحول دیکھ کر کھاتا ہوں۔ عموماً" گھر میں تو ہاتھ سے ہی کھانا کھاتا ہوں۔"

69۔ "اپنے آپ کو ساتویں آسمان پہ محسوس کیا؟"

"ابھی نہیں..... ابھی تو بہت کام کرنا ہے' ساتویں آسمان کو

چھونے کے لیے وقت چاہیے۔"

70۔ "عورت بہترین کک ہوتی ہے یا مرد؟"

"مرد..... بہت بہترین کک ہوتے ہیں اور میں خود بہت اچھا کک ہوں۔ بلکہ بہت اعلا۔"

71۔ "نرم دل کون ہوتا ہے؟"

"عورت نرم دل ہوتی ہے۔"

72۔ "کس شخصیت کو اغوا کرنا چاہیں گے اور پھر تاوان میں کیا وصول کریں گے؟"

"کسی بڑے ڈائریکٹر کو اغوا کروں گا اور بہت اچھے کردار کی ڈیمانڈ کروں گا۔"

73۔ "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"بالکل اندھی بہری سب ہوتی ہے۔"

74۔ "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"سانپ بچھو۔ بہت نقصان پہنچانے والے جانور اور کیڑوں سے ڈر لگتا ہے۔"

75۔ "شادی کی رسومات میں پسندیدہ رسم؟"

"مہندی۔"

76۔ "تحفہ یا کیش۔ کیا دینا چاہیے؟"

"تحفہ..... یادگار رہتا ہے۔"

77۔ "ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"

"کراچی میں اکیلا ہوتا ہوں تو خود ہی بنا لیتا ہوں جبکہ سیالکوٹ میں تو امی کے ہاتھ کے پراٹھے بہت پسند ہیں۔"

78۔ "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش تھی؟"

"سلطان راہی صاحب سے۔ اور منور ظریف۔"

79۔ "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"

"ایک بار بھی نہیں۔"

80۔ "کس چیز کا فوبیا ہے؟"

"مجھے اونچائی کا فوبیا ہے..... کیونکہ میں ایک بار چھت سے گر پڑا تھا۔ تب سے۔"

81۔ "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"

"اپنا والٹ 'لائسنس' آئی ڈی کارڈ پیسے اور موبائل۔"

82۔ "ماں ناراض ہو جائے تو؟"

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری ماں آج تک مجھ سے ناراض نہیں ہوئیں۔ اور اگر ہوئیں تو فوراً" منالوں گا۔"

83۔ "اپنی غلطی مان لیتے ہیں؟"

"ہاں..... بہت آرام سے۔"

84۔ "آپ کی اچھی عادت؟"

"لوگوں کا بہت خیال رکھتا ہوں اور اپنی طرح ہی سب کو سمجھتا ہوں۔"

85۔ "بری عادت؟"

"اعتماد بہت جلدی کر کے اپنا آپ سب کچھ کھول کر سامنے رکھ دیتا ہوں۔"

86۔ "دل کی سنتے ہیں یا دماغ؟"

"شروع میں دل کی سنتا ہوں پھر دماغ پر زور دیتا ہوں کیونکہ میرے خیال میں دماغ زیادہ اچھا رائے دیتا ہے۔"

87۔ "موڈ خراب ہو تو کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں؟"

"نہیں ہرگز نہیں..... کھانے کا کیا قصور ہے۔"

88۔ "دو لوگ بات کر رہے ہوں تو اگنور کرتے ہیں؟"

"کرتا تو ہوں پھر بھی دھیان چلا ہی جاتا ہے کہ آخر یہ کیا بات کر رہے ہیں۔"

89۔ "نیند آسانی سے آجاتی ہے؟"

"نہیں..... نیند کو لانا ہوتا ہے۔ کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔"

90۔ "مارننگ شو کیسے لگتے ہیں؟"

"کچھ حد تک اچھے لگتے ہیں..... بہت زیادہ اچھے نہیں۔"

92۔ "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ لازمی رکھتا ہوں؟"

"موبائل پانی۔ والٹ اور کھانے پینے کی کوئی چیز۔"

93۔ "خدا کی حسین تخلیق؟"

"انسان۔"

94۔ "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"جب بہت زیادہ پریشان ہوتا ہوں تب۔"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"محنت کروں گا تاکہ دوبارہ اپنا مقام حاصل کرلوں۔"

✡

مہندی کے ڈیزائن

ادارہ

خبریں ، ٹوکریں

واصفہ سہیل

خزانہ

تربوز ایک ایسا پھل ہے جو بہ آسانی دستیاب ہے۔ صحت و تندرستی کا خزانہ ہے اس میں لائکوپین کی اتنی زیادہ مقدار ہے۔ جس کی وجہ سے فالج کا خطرہ بیس فیصد گھٹ جاتا ہے۔ تربوز میں لائکوپین کی وجہ سے سرطان کا خطرہ بھی کم ہو جاتا ہے۔ تربوز میں پوٹاشیم کی مقدار بھی قابل ذکر ہوتی ہے۔ جو اعصاب اور پٹھوں کے کھنچاؤ کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ اس کے علاوہ پوٹاشیم جسم میں کیلشیم کو دیر تک برقرار رکھنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ یوں ہڈیاں اور جوڑ مضبوط رہتے ہیں۔ تربوز میں ایک امینو ایسڈ ہوتا ہے جو دوران خون کو بہتر کرتا ہے یہ جسم کو پانی سے لبریز بھی رکھتا ہے۔ تربوز میں بیٹا کروٹین بھرے ہوتے ہیں جو جلد کو شاداب رکھتے ہیں۔ تربوز کھانے سے جسم سے فاسد اور زہریلے مادوں کو خارج کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اگر ہاتھ پاؤں پر سوجن آ گئی ہے تو تربوز کھانے سے دُور ہو سکتی ہے۔

اگر آپ بے خوابی کا شکار ہیں تو تربوز کھا کر آپ اس شکایت کو دور کر سکتے ہیں۔ یعنی تربوز غذائیت اور صحت کا بھرپور خزانہ ہے۔

کوشش

کیلی فورنیا کی برکلے یونیورسٹی کا شمار دنیا کی مؤثر ترین جامعات میں ہوتا ہے اپنے تعلیمی معیار کے حساب سے وہ دنیا کی چھٹی اور امریکہ کی تیسری بہترین جامعہ ہے جبکہ امریکہ کی سرکاری جامعات میں اس کا پہلا نمبر ہے۔

1868ء میں قائم ہونے والی اس یونی میں اڑتیس ہزار سے زائد طلبہ زیر تعلیم ہیں یہاں کے 79 اساتذہ نوبل انعام یافتہ ہیں، یہ یونی ہر سال ایک ارب ڈالر اپنے شعبہ تصنیف و تعلیم پر خرچ کرتی ہے۔ اس یونی ورسٹی میں پاکستان کے جن لوگوں نے تعلیم حاصل کی ان میں ذوالفقار علی بھٹو اور جسٹس ایس جواد خواجہ شامل ہیں۔ جامعہ برکلے میں مسلمان اساتذہ اور طالب علموں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ افغانستان اور عراق پر حملوں کی اس یونی نے شدید مذمت کی۔

داخلہ مہم اور جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر یہاں کے مسلمان طلبہ بہت فخر سے اپنی ثقافت کی نمائش کرتے ہیں۔ گزشتہ دنوں ہونے والے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر مسلمان طلبہ نے اپنے اسٹول (گاؤن کے اوپر پڑا ہوا دوپٹا نما کپڑا) پر جلی حروف میں کلمہ طیبہ تحریر کروایا۔ کلمہ طیبہ اپنے سینوں پر سجائے یہ طلبہ جب اسٹیج پر پہنچے تو خود ڈین کلیہ ڈاکٹر اسٹیو مارٹن بھی اس کا نوٹس لیے بغیر نہ رہ سکے۔ اپنے خطاب میں ڈاکٹر اسٹیو مارٹن نے کہا کہ ہمارا میڈیا 'جنگ' بم باری 'ڈرون حملوں اور مہاجرین کی خوب تشہیر کرتا ہے لیکن جامعات کی تشہیر نہیں کی جاتی جہاں ساری دنیا اور ہر مذہب یا لسانی یا نسلی اکائی سے وابستہ لوگ

اختلافات کے باوجود مل کر کام کرتے ہیں۔

کاش

کچھ فنکار ایسے ہوتے ہیں جو ڈوب کر اداکاری کرتے ہیں اور اپنے کردار میں اس طرح رچ بس جاتے ہیں کہ اصل کا گماں ہو۔ اب ثروت گیلانی کو ہی دیکھ لیں آج کل ہندی سیکھ رہی ہیں (وجہ بھئی محنت) عدنان صدیقی کی پروڈکشن میں بننے والے پہلے ڈرامے کے لیے ثروت ایک ہندو لڑکی کا کردار ادا کر رہی ہیں۔ یہ ڈراما پاکستان میں بسنے والے غریب ہندو قبیلے کو درپیش مسائل کی عکاسی کرے گا۔ اس میں بشریٰ انصاری بھی ایک ہندو خاتون کا کردار کر رہی ہیں۔ عدنان صدیقی اپنی پروڈکشن کے تحت بننے والے پہلے ڈرامے پر بہت محنت کر رہے ہیں اس کے لیے انہوں نے ایک ہندو لڑکی کو ابھی کاسٹ کے صحیح تلفظ سے ہندی بولنے کے لیے رکھا ہے۔ (کاش عدنان! آپ بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کو درپیش مسائل پر ڈراما بناتے تو پاکستان کے لوگوں کو پاکستان کی قدر محسوس ہوتی لیکن۔۔۔؟)

طریقہ

ہمارے اکثر فنکار یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ انہیں بولی وڈ میں کام مل گیا ہے، لیکن ایک پاکستانی فنکار ایسا بھی ہے جو اس بات کی تردید کر رہا ہے کہ اسے بھارتی فلم میں کام مل گیا ہے۔ جی جناب یہ مصنف و اداکار یاسر حسین ہیں۔ پچھلے دنوں ایک ایوارڈ کی تقریب کے دوران یاسر حسین نے بتایا کہ ان دنوں میڈیا میں یہ خبر پھیلی ہوئی ہے کہ میں ممبئی جاکر کسی بولی وڈ فلم میں کام کر رہا ہوں جبکہ ایسا ہے کہ ایک فلم ممبئی میں شوٹ ضرور ہو رہی ہے اس میں کچھ بھارتی ڈائریکٹر بھی کام کر رہے ہیں اور میں بھی ایک بھارتی کا کردار کر رہا ہوں (ہائیں، تو باقی کیا بچا۔۔۔؟) مگر اس فلم کا ڈائریکٹر رضوان پاکستانی ہے اور یہ ایک پاک بھارت مشترکہ پروڈکشن کہی جاسکتی ہے ویسے یاسر حسین جتنے اچھے اداکار ہیں تو ناممکن ہے کہ وہ بھارت میں کام کریں اور بھارتیوں کی جوہر شناس نگاہیں ان پر نہ پڑیں یقیناً واپسی میں یاسر کے پاس بھی بھارتی فلم ہوگی۔ (ویسے یاسر یہ شہرت کا طریقہ کار تو نہیں کہ۔۔۔۔؟)

بددعا

آپ کو یاد ہوگا ایک اداکارہ تھیں نرما۔ ان کے کریڈٹ پر کوئی خاص فلم تو نہیں ہے مگر اپنے متضاد بیانات و حرکات کی وجہ سے وہ خبروں میں ان رہتی تھیں پھر اچانک وہ غائب ہوگئیں، اب اچانک ہی وہ واپس آئی ہیں۔ اس بیان کے ساتھ کہ وہ گھریلو مصروفیات کے باعث شوبز سے علیحدہ تھیں اور اب جلد ہی واپس آئیں گی (تو اب گھریلو مصروفیات ختم ہوگئی ہیں جو وہ واپس۔۔۔؟) نرما نے واپسی کے اعلان کے ساتھ ہی ایک متضاد بیان بھی داغ دیا کہ "پنجابی فلموں کو جو زوال آچکا ہے وہ ہمیشہ رہے گا (بھئی آپ لوگوں کے طفیل ہے یہ سارا۔۔۔ زوال بھئی۔) اور اب پنجابی فلمی صنعت اپنا بہترین دور کبھی واپس نہیں لاسکے گی (یہ بددعا ہے کیا۔۔۔؟) سید نور، حسن عسکری، فیصل بخاری اور جونی ملک کی ہدایت کاری کو نرما نے زبردست انداز میں سراہا۔ (بھئی یہ تو مسکہ ہے)

عید کے پکوان

خالدہ جیلانی

کوئی بھی تہوار یا خوشی اس وقت تک ادھوری ہی رہتی ہے۔ جب تک نت نئے کھانوں کا اہتمام نہ ہو' مزے دار خوش ذائقہ کھانوں سے نہ صرف گھر والے خوش ہوتے ہیں' بلکہ مہمان بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ عید کی ساری تیاریاں' اہتمام ہو اور دستر خوان سجانہ ہو تو عید کے رنگ پھیکے ہی رہتے ہیں۔ اس روز سعید کی مناسبت سے ہم نے آپ کے لیے چند خصوصی پکوانوں کو منتخب کیا ہے۔ امید ہے آپ کی پسند پر پورا اتریں گے۔

کھوپرے والی سویاں

ضروری اشیاء :

دودھ	دو کلو
چینی	حسب ضرورت
چھوٹی الائچی	چار سے پانچ عدد
سویاں	آدھا پیکٹ
پسا ہوا کھوپرا	حسب پسند
چھوہارا	دس سے بارہ عدد
بادام' پستہ	حسب منشا

ترکیب :

دودھ میں الائچی ڈال کر ابالنے کے لیے رکھ دیں جب دودھ اچھی طرح ابل جائے تو اس میں سویاں ڈال کر پکائیں' پھر اس میں چینی' کھوپرا اور چھوارے (چھواروں کی گٹھلیاں نکال دیں) ڈال دیں اور دھیمی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ جب سویاں گاڑھی ہو جائیں تو سرونگ ڈش میں نکال کر بادام' پستہ اور کھوپرے سے گارنش کر کے ٹھنڈی کر کے کھائیں۔

کھڑا مسالا کڑاہی

ضروری اشیا :

چکن	آدھا کلو
لہسن ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
پسے ہوئے ٹماٹر	ڈھائی کھانے کے چمچے
ادرک	سجانے کے لیے
ہری پیاز	ایک عدد
ثابت لال مرچ	چار سے پانچ عدد
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
یخنی	آدھا کپ
لیموں کا رس	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	دو عدد
پسی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچیں	دو سے تین عدد
نمک	حسب ذائقہ
پسی کالی مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

کڑاہی میں تیل گرم کر کے چکن تل کر نکال لیں۔ اسی تیل میں پیاز ڈال کر گلابی کر لیں پھر لہسن ادرک'

پسے ہوئے ٹماٹر' یخنی' ثابت لال مرچیں' ثابت دھنیا' نمک اور پسی لال مرچ ڈال کر پکائیں اور تلی ہوئی چکن ڈال کر بھون لیں۔ جب چکن گل جائے اور تیل اوپر آجائے تو ہری پیاز اور ہری مرچیں ڈال کر دو منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ سرونگ پلیٹ میں نکال کر لیموں کا رس اور ادرک چھڑک کر نان کے ساتھ تناول فرمائیں۔

مرغی بادامی رائس

ضروری اشیا :

چاول باسمتی	ایک کلو
ثابت چکن	ایک عدد
پیاز	آدھا کپ
بادام	بارہ عدد
لہسن کا پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ٹماٹر	ایک پاؤ
ثابت ہری مرچ	آٹھ عدد
پودینہ	آدھی گٹھی
ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
سیاہ زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پسا ہوا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
چائنیز نمک	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سفید سرکہ	دو کھانے کے چمچے
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
کارن فلور، چاول کا آٹا، میدہ	دو کھانے کے چمچے
پسی کالی مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	تلنے کے لیے
گھی	آدھا کپ
پسی ہوئی ہلدی	دو کھانے کے چمچے
پسا ہوا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
انڈے	دو عدد

ترکیب :

چکن ثابت لے کر (کٹ لگائیں) پھر اس میں سفید سرکہ، لیموں کا رس، تھوڑا سا نمک اور تھوڑی سی ہلدی اور تھوڑی سی لال مرچ کا آمیزہ بنا کر چکن میرنیٹ کرلیں۔ ایک گھنٹہ رکھنے کے بعد بھاپ میں بنا لیں۔ پھر اس میں میدہ، چاول کا آٹا، کارن فلور، انڈا لگا کر، تیل میں تل لیں ———— اب ایک پتیلی میں گھی گرم کرکے تمام ثابت گرم مسالا، سیاہ اور سفید زیرہ ڈال کر پیاز ڈال دیں۔ جب پیاز بھن جائے تو پسا ہوا لہسن، ادرک، ہلدی، پسا ہوا دھنیا، پسی ہوئی لال مرچ اور ٹماٹر (باریک کٹے ہوئے) ڈال کر مسالا بھون لیں، پھر نمک اور چائنیز نمک شامل کردیں۔ ہری مرچ، پودینہ، گرم مسالا، کالی مرچ ڈال کر پہلے سے بھگوئے چاول ڈال دیں۔ اتنا پانی ڈالیں کہ چاول دم پر آجائیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر اس کے اوپر تلی ہوئی چکن رکھ دیں۔ تلی ہوئی پیاز چھڑک دیں اور بادام تل کر گارنش کرکے پیش کریں۔

شاہی ڈیلائٹ

ضروری اشیا :

ڈبل روٹی کے سلائس	چھ سے آٹھ عدد
دودھ	ایک کپ
چینی	دو کھانے کے چمچے
مکس مربے	آدھا کپ
کھویا	سو گرام
گھی	تلنے کے لیے
چینی	ایک کپ
پانی	ایک کپ
بادام، پستے	سجانے کے لیے

ترکیب :

ڈبل روٹی کے سلائس کو چوکور ٹکڑوں میں کاٹ لیں اور پین میں گھی گرم کرکے تل لیں۔ چینی اور پانی سے شیرہ بنالیں۔

دودھ میں دو چمچے چینی ڈال کر دودھ پکالیں اور گاڑھا کرلیں۔ ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کو شیرے میں ڈبو کر نکال لیں۔ اس کے بعد دودھ میں ڈال دیں۔ پھر سرونگ پلیٹ میں رکھ کر اس پر مربے، کھویا اور میوہ چھڑک کر سرو کریں۔

ت۔ الف..... ڈی جی خان

جو کچھ میں لکھ رہی ہوں۔ اسے لکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیسے لکھوں.... لیکن کوئی ایسا نہیں ہے۔ جس سے یہ سب کہہ سکوں۔

ہم تین بہنیں، دو بھائی ہیں۔ بھائی، تین بہنوں سے چھوٹے ہیں۔ ہوش سنبھالا تو ابو کو بیمار دیکھا' وہ مزدور تھے۔ کبھی مزدوری مل جاتی کبھی نہیں ملتی۔ امی کو پہننے اوڑھنے ' بننے سنورنے کا شوق تھا۔ پتا نہیں وہ یہ شوق کیسے پورا کرتی تھیں۔ ہمیشہ بنی سنوری نظر آتیں۔ گھر میں ہمیشہ اچھا کھانا پکتا باوجود یہ کہ ابو کئی کئی دن بے کار رہتے تھے لیکن کبھی یہ نوبت نہیں آئی کہ گھر میں چولھا نہ جلا ہو۔ ابو کے مقابلے میں امی بہت خوب صورت تھیں۔ ہم تینوں بہنیں امی پر ہی گئی ہیں۔ بڑی بہن سولہ سال کی تھی جب امی نے اس کا رشتہ طے کردیا۔ بہنوئی چالیس سال کے تھے۔ بہن کی اور ان کی عمر میں بہت فرق تھا لیکن امی کا کہنا تھا کہ وہ اچھا کماتا ہے اور یہ سب سے بڑی خوبی ہے۔ عمر کے فرق کو کیا دیکھنا' ابو تو ویسے بھی امی کے سامنے کچھ نہیں بولتے تھے۔ اب بھی تھوڑی سی بحث کے بعد خاموش ہوگئے۔

بہن کی شادی ہوگئی تو بہنوئی نے ہمارے گھر میں ہی ڈیرے ڈال لیے۔ روزانہ موسم کے پھل اور کھانے پینے کی طرح طرح کی چیزیں لے کر آجاتے۔ کبھی رات میں بھی رک جاتے' بہن بظاہر تو خوش نظر آتی تھی لیکن بہت خاموش رہنے لگی تھی۔ ایک دن میں نے بہنوئی کو امی کے ساتھ بے تکلفی کی حالت میں دیکھا جو مجھے اچھا نہیں لگا' میں نے بہن کی توجہ اس طرف دلائی تو وہ طنزیہ ہنس کر چپ ہوگئی۔ مجھے لگا جیسے وہ پہلے ہی بہت کچھ جانتی تھی۔ میں نے اس سے بہت پوچھا۔ اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اب بہن کی شادی کو چار سال گزر چکے ہیں' اس کے دو بچے ہیں لیکن بہنوئی اسی طرح باقاعدگی سے ہمارے گھر آتے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں محسوس کررہی ہوں کہ ان کی نظریں بدلی بدلی سی ہیں' میں نے ان کے سامنے آنا بند کردیا تو انہوں نے امی سے شکایت کی جس پر امی نے الٹا مجھے ڈانٹا۔ میں نے امی کو بتایا تو انہوں نے میری بات پر توجہ نہیں دی۔ بہنوئی کی ہمت بڑھ گئی۔ اب وہ بہانے بہانے سے میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نازیبا اور فضول باتیں کرتے ہیں لیکن امی کو تو جیسے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ کچھ کہوں تو بہنوئی کے احسان گنوانے لگتی ہیں۔ ابو کی حیثیت ایک عضو معطل کی ہے' بہنوئی کے ارادے مجھے ٹھیک نظر نہیں آتے اور ایسا لگتا ہے اس میں امی کی ایما بھی شامل ہے۔ ان حالات میں میں چاہتی ہوں جتنی جلد ممکن ہو میری شادی ہو جائے لیکن مسئلہ رشتے کا ہے۔ رشتہ دار اور جاننے والے ہمارے گھرانے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ بڑی پھوپھو نے اپنے بیٹے کا رشتہ مانگا تھا۔ وہ لڑکا رکشہ چلاتا ہے۔ امی نے انکار کردیا۔ محلے والے بھی ہمیں اچھا نہیں سمجھتے۔ ان حالات میں جبکہ نہ جہیز کی امید ہے نہ تعلیم ہے۔ اچھا رشتہ کہاں سے آئے گا۔ صرف اچھی صورت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟

ج : اچھی بہن! جب ڈاکو گھر میں ہی ہوں تو انسان کیسے بچ سکتا ہے۔ آپ واقعی مشکل حالات کا شکار ہیں۔ آپ کی امی کی آنکھوں پر لالچ نے پٹی باندھ رکھی ہے اور بہن کی زبان بھی مجبوریوں نے بند کررکھی ہے۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی زبان بندی پر مجبور ہے۔ والد صاحب کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ آپ نے صحیح سوچا ہے آپ کے مسئلہ کا واحد حل یہی ہے کہ آپ اس گھر سے رخصت ہوجائیں۔ کیونکہ اپنے گھر کی بات نہ کسی کو بتا سکتی ہیں اور نہ ہی کسی سے مدد طلب کرسکتی ہیں۔ بہنوئی کے بارے میں یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ وہ انتہائی غلط شخص ہے۔ محلے والے اچھا نہیں سمجھتے اس کا مطلب ہے کہ وہ بھی کچھ نہ کچھ جانتے ہیں۔

آپ نے پھوپھی کے بیٹے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا' رکشہ چلانا کوئی عیب یا بری بات نہیں ہے۔ اگر وہ محنتی اور

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماءے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

شریف ہے تو اپنی بہن سے نہیں وہ آپ کے والد سے بات کرے اور ان کو بتائے لیکن موجودہ حالات میں آپ کا اس گھر سے باعزت طریقے سے رخصت ہو جانا ہی بہتر ہے۔

شاہدہ..... لیہ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ذہن میں ہر وقت خیالات کا ہجوم رہتا ہے۔ سوچ سوچ کر دماغ پک جاتا ہے۔ چھوٹی باتیں دل و دماغ میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ خاص طور پر جب عبادت کی طرف زیادہ رجحان ہوتا ہے تو اللہ اور پاک ہستیوں کے خلاف انتہائی گستاخانہ خیالات آتے ہیں۔ کسی مریض کو دیکھوں تو لگتا ہے مجھے بھی یہی بیماری ہونے والی ہے۔ کسی حادثے کا پڑھ لوں تو ڈر لگا رہتا ہے کہ گھر میں سے کسی کو یہ حادثہ نہ پیش آجائے۔ ابنارمل بچوں کو دیکھ کر اپنے بچوں کے حوالے سے الٹے سیدھے خیالات آتے ہیں۔ تنہا بھی نہیں رہ سکتی۔ ڈر لگتا ہے۔

ج: اچھی بہن راستہ اس کا روکا جاتا ہے جس کے منزل پر پہنچ جانے کا خدشہ ہو' شیطان اسی کو بھٹکاتا ہے جو نیکی کے 'اللہ کے راستے پر چلتا ہے۔ عبادت اللہ کا راستہ ہے 'سیدھا راستہ ہے' منزل تک لے جاتا ہے۔ اس لیے شیطان راستہ روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر عبادت میں وسوسے یا غلط خیالات آئیں تو اسے شیطان کی طرف سے سمجھیں۔ دھیان نہ دیں نہ انہیں روکنے کی کوشش کریں عبادت جاری رکھیں۔ ایک دن خود بخود خیالات آنا بند ہو جائیں گے۔

خیالات کا ہجوم اور بیماری کا وہم ہونے کا مسئلہ دماغی اور اعصابی کمزوری کی وجہ سے ہے۔ اگر آپ شوگر کی مریض نہیں ہیں تو ہفتہ میں دو دن شہد کا استعمال ضرور کریں۔ سبزیاں' پھل زیادہ کھائیں۔ قبض نہ ہونے دیں۔ جب کوئی برا خیال آئے تو لاحول یا تعوذ پڑھ لیا کریں۔

رفیعہ..... کراچی

ہم آٹھ بہن بھائی ہیں۔ بڑی بہن بہت خوب صورت ہے۔ ہم معمولی شکل و صورت کے ہیں۔ بڑی بہن کی' والدہ نے جان بوجھ کر ایسے شخص سے شادی کردی جو پہلے سے شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ امیر ہے۔ اور والدہ کا خیال تھا کہ بہن کے حسن سے متاثر ہو کر وہ پہلی بیوی کو چھوڑ دے گا۔ مگر شادی کے چھ ماہ بعد اس نے بہن کو چھوڑ دیا۔ طلاق نہیں ہوئی۔ بس ایسے ہی گھر بٹھا رکھا ہے۔ اس واقعہ کو بارہ برس بیت گئے ہیں۔ نہ ہم چھوٹی بہنوں کی شادی ہوتی ہے نہ بھائیوں کی۔ کوئی رشتہ ہی نہیں آتا۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بھائیوں کی بھی زیادہ عمر ہو گئی ہے۔

ج: بہن کا مسئلہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ آپ نے وضاحت نہیں کی کہ وہ بہن کو خرچ دیتا ہے یا ویسے بھی گھر بٹھا رکھا ہے۔ جب تک آپ کی بہن اس کے نکاح میں ہے۔ وہ نان نفقہ دینے کا پابند ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ شادی کے بعد آپ کی بہن صرف چھ ماہ اس کے گھر رہی اور اب اس بات کو بارہ سال بیت گئے ہیں۔ ساڑھے گیارہ سال سے آپ کی بہن اور گھر والے صبر سے برداشت کر رہے ہیں۔ انہیں کس بات کی سزا دی جا رہی ہے؟

کوئی رشتہ نہیں آتا۔ اس کی وجوہات بھی ہوں گی۔ کیا آپ نے اس سلسلے میں کوئی کوشش کی۔ آج کل شادی کرانے کے لیے بہت سے ادارے کام کر رہے ہیں جو نیک نام ہیں۔ آپ وہاں کوشش کر سکتی ہیں۔ آپ کے خط میں بہت سی باتیں مبہم ہیں۔ بارہ برس سے بہن کا آپ کے گھر بیٹھے رہنا اپنے حقوق کا مطالبہ نہ کرنا۔ آپ سب کے رشتے نہ ہونا' جب تک اس کی وجوہات پتا نہ چلیں کوئی مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔

بیوٹی بکس

امۃ الصبور

کرن فاطمہ۔۔۔۔ میلسی

س ۔ میری عمر 22 سال ہے اور نظر 16 سال کی آتی ہوں۔ اس کی وجہ میرا جسم انتہائی دبلا پتلا ہے۔ کمزوری بہت زیادہ ہے۔ پٹھوں' بازوؤں اور کمر میں اکثر درد رہتا ہے' اور کبھی کبھی پیٹ میں کھانے سے پہلے یا بعد میں درد ہونے لگتا ہے' ٹانگوں میں بھی درد رہتا ہے۔ سانس بھی پھول جاتا ہے۔ غصہ بہت آتا ہے۔ کھانا نہیں ۔ کھایا جاتا بھوک ہونے کے باوجود جی متلانے لگتا ہے۔ بلاوجہ دوسروں پر غصہ آنے لگتا ہے۔ پیٹ کمر سے لگا ہوا ہے اور سیدھا ہو کر چلا بھی نہیں جاتا۔ جس کی وجہ سے دوسروں کی تنقید کا اکثر نشانہ بنی رہتی ہوں۔ میری وجہ سے میری امی جان بہت پریشان ہیں۔ ڈاکٹروں کو دکھایا۔ پیروں کے پاس بھی لے کر گئیں' کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ سب کہتے ہیں بیماری نہیں ہے' مجھ میں اعتماد کی بہت کمی ہے۔ دوسروں کے سامنے آنے جانے سے کتراتی ہوں۔ گھر والوں سے بھی ہر وقت نروس رہتی ہوں کہ کوئی مجھ پر تنقید نہ کردے۔ میں شادی شدہ بھی ہوں۔ سوا سال ہو گیا ہے شادی کو اور میرے شوہر شادی کے ایک ماہ بعد ملک سے باہر چلے گئے تھے اور ابھی تک نہیں آئے۔

میں بہت خوف زدہ ہوں۔ مجھے لگتا ہے چند سال اور زندہ رہ سکوں گی۔ پلیز مجھے میری صحت کی بہتری کے لیے اچھا سا مشورہ دیں جو آسانی سے کر سکوں۔ میرا جسم تھوڑا موٹا ہو جائے اور میری صحت بہتر ہو جائے۔

ج ۔ کرن بہن! آپ کا مسئلہ بہت آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ بڑھا ہوا وزن کم کرنا مشکل ہے لیکن وزن بڑھانا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کے دبلاپے اور دوسری شکایتوں کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو غذا آپ استعمال کرتی ہیں۔ وہ ٹھیک سے ہضم ہو کر جزو بدن نہیں بنتی۔ بھوک کی کمی کی وجہ سے آپ کھانا بھی کم کھاتی ہیں۔ بھوک ہونے کے باوجود کھانا نہیں کھایا جاتا' جی متلاتا ہے۔ اس کی وجہ تیزابیت ہے۔ خالی پیٹ رہنے سے تیزابیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ آپ مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کریں تو ایک ماہ میں نمایاں تبدیلی محسوس کریں گی۔

1 ۔ پوری نیند لیں۔ نیند کا صحت اور خوب صورتی سے گہرا تعلق ہے۔ بھرپور نیند سے صحت بہتر ہو جاتی ہے۔ چہرہ کھل اٹھتا ہے۔ جبکہ نیند کی کمی کی وجہ انسان کا مزاج چڑچڑا سا ہو جاتا ہے۔ جسم میں ہر وقت دباؤ اور تھکن محسوس ہوتی ہے۔ اگر آپ پوری نیند لیں گی تو وزن میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ اچھی اور خوش گوار نیند کے لیے آپ رات کھانے سے پہلے جسم پر سرسوں کے تیل کی مالش کریں' پھر نیم گرم پانی سے غسل کریں' اس کے بعد کھانا کھائیں۔ کھانے کے ایک گھنٹہ بعد تھوڑی دیر چہل قدمی کریں۔ سونے اور رات کے کھانے کے درمیان دو گھنٹے کا وقفہ ہونا چاہیے' سونے سے پہلے ایک گلاس گرم دودھ کا پئیں ۔ اس سے آپ کو گہری اور پرسکون نیند آئے گی۔

2 ۔ ٹینشن اور ذہنی تناؤ سے دور رہیں' خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کریں۔ شوہر کی دوری تکلیف دہ ہے' لیکن اس کو مسئلہ نہ بنائیں' ذہن کو مصروف رکھنے کے لیے مطالعہ کریں۔ ذہن پرسکون ہو گا تو آپ کو کھل کر بھوک لگے گی اور جو کچھ آپ کھائیں گی۔ وہ صحیح طریقے سے ہضم ہو کر خون بنائے گا۔ ذہنی تناؤ کی کیفیت میں کچھ کھانا فائدے کے بجائے الٹا نقصان پہنچاتا ہے۔

3 ۔ کوشش کریں کہ آپ کی غذا میں مرغن غذاؤں کے بجائے سبزیاں اور پھل زیادہ شامل ہوں۔ ہلکی مرچ مسالے میں پکی ہوئی سبزیاں صحت کے لیے فائدہ مند ہیں۔

4 ۔ صبح اٹھ کر کھلی فضا میں گہرے سانس لیں۔ اس سے آپ کے جسم کو آکسیجن ملے گی۔

5 ۔ دودھ سے بنی ہوئی اشیا دہی' پنیر زیادہ استعمال کریں۔

6 ۔ ڈاکٹر کے مشورے سے آئرن یا وٹامن کی ٹیبلٹ لے لیں تو اس سے بھی آپ کی صحت پر بہتر اثرات مرتب ہوں گے۔

7 ۔ دودھ کو پانی کی طرح ایک گھونٹ میں نہ پئیں' بلکہ آہستہ آہستہ مزہ لیتے ہوئے پئیں۔ کھانے کو بہت آہستہ چبا کر دیر تک کھائیں۔ ان ہدایات پر عمل کرنے سے فوری اثرات تو نمایاں نہیں ہوں گے لیکن کچھ عرصہ باقاعدگی سے عمل کرتی رہیں تو فرق محسوس کریں گی۔